فوق الکشمیر

محمد الدین فوق کشمیری کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی

2098

فوق کشمیر

محمد الدین فوق کشمیری کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی

سنگِ میل پبلی کیشنز ◎ چوک اُردو بازار - لاہور

۱۹۹۰

نیاز احمد نے

معراج دین پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت ۲۱۰/۰۰ روپے

فہرست

تعارفی کلمات	ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی	۷
	ڈاکٹر سید یوسف بخاری	
	کلیم اختر	
دیباچہ		۱۶
حالاتِ زندگی اور شخصیت		۲۹
فوق — مورخ کشمیر و لاہور اور سوانح نگار		۱۰۱
فوق — شاعرِ کشمیر		۳۴۷
فوق کا افسانوی ادب (ناول، حکایات، ڈرامہ)		۴۰۵
کشمیری صحافت میں فوق کی خدمات		۴۰۷
فوق اور تحریکِ حریتِ کشمیر		۵۲۳
متفرقاتِ فوق		۵۶۱
کتابیاتِ فوق		۶۳۹
کتابیات		۶۵۲

ارضِ کشمیر کے مجاہدینِ آزادی کے نام

جن کا نام بھی ہیں نہیں جانتا۔ جو اپنے لیے صرف ایک نام پسند کرتے ہیں

شہید

تعارفی کلمات

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

ڈاکٹر سید یوسف بخاری

کلیم اختر

"فوق الکشمیر" کا مطالعہ کر کے معلوم ہُوا کہ میرا علم فوق کے عہد اور کشمیر کے بارے میں پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ پُورے مقالے میں جائزہ اور تجزیہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اب تک فوق کے بارے میں یہ سارا مواد اُن رسالوں اور کتابوں میں "دفن" تھا جن تک پڑھنے والوں کی رسائی نہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے محمد الدین فوق کے شخصی حالات، صحافیانہ خدمات، تحریکِ حُریت کشمیر سے اُن کے رشتہ کو اس تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ماضی مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے فوق کی اَدبی حیثیتوں کو بھی سلیقہ سے اُبھارا ہے۔ فوق کی تاریخ نویسی، سوانح نگاری، شاعری اور افسانوی اَدب کا جائزہ بھی لیا ہے اور اُن کی ان حیثیتوں کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا ہے ___ لکھنے والا اپنے موضوع کے سلسلہ میں اعتدال اور عدل کے راستے سے ہٹ سکتا ہے۔ عام طور پر ہم جس شخصیت کو "دریافت" کرتے ہیں اُسے بالعموم جذباتی انداز میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں، لیکن محمد اجمل نیازی نے اس باب میں گہرے تنقیدی شعور سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر فوق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہُوئے اجمل نیازی نے آزاد،

حالی اور اکبر کے اثرات اور اِن "اکابرِ ثلاثہ" سے فوق کے رشتہ کو تنقیدی دیانت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے فوق کے تنقیدی خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔ جس دَور میں انگریزی اُدب و تنقید کے غیر متوازن اثرات کے تحت ہماری شاعری اور بالخصوص غزل کو گُل و بُلبل کی داستان قرار دے کر مشرقی ذہن، اقدار اور شاعری کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا اس وقت محمد الدین فوق اور چکبست نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ بات عام کی کہ گُل و بُلبل، قفس و آشیاں یہ سب رموز و علائم ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا یہ مقالہ تحقیق کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اِس میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کے عناصر نہایت تناسب کے ساتھ موجود ہیں۔ اِسی کے ساتھ ساتھ اس مقالہ کی زبان بھی توجہ طلب ہے۔ اِس میں نہ افسانوی انداز ہے اور نہ وہ خشک اور پیوست زدہ اسلوب ہے جس کی وجہ سے ہمارے بیشتر ایسے مقالے پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ محمد اجمل نیازی ایسے شاعر ہیں جو اپنا انفرادی اسلوب رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُن کا سفرنامہ "ہند" مندر میں محراب" تخلیقی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مضامین کی کتاب "تشخص" تخلیقی تنقید کی ایک نئی جہت ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالہ میں تحقیق کی زبان کا حق ادا کیا ہے اور اِس سے اُن کی شخصیت کا ایک نیا پہلو ہمارے سامنے آیا ہے۔

ہماری جامعات میں جو مقالے لکھے جا رہے ہیں اُن کا معیار قابلِ رشک نہیں۔ ہمارے پڑوسی مُلک ہندوستان میں "السنہ شرقیہ" میں تحقیق کا حال اور زیادہ ابتر ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر محمد اجمل نیازی جیسا کوئی صاحبِ ذوق اور صاحبِ جستجو اُمید کی کرن بن کر سامنے آتا ہے۔ اِس پس منظر میں اِس مقالے کی اہمیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے بعد کی نسل میں اَب محمد اجمل نیازی محققین کے اُس گروہ میں شامل ہو گئے ہیں جو ادبی تاریخ، اَدبی روایات و تحقیق کے تقاضوں سے باخبر ہیں۔ خدا کرے اُن کا یہ سفر جاری رہے۔

ڈاکٹر سید ابو الخیر کشفی
صدر شعبۂ اُردو
کراچی یونیورسٹی

اجمل نیازی سے میری ملاقات کشمیر سے محبت کے دائرے میں ہوئی۔ پھر یہ دائرہ وسیع ہوتا گیا تب اجمل نیازی کشمیر کے ایک بطلِ جلیل بہت بڑے صحافی، مؤرخ اور ادیب و شاعر محمد دین فوق کی علمی و ادبی خدمات پر تحقیقی کام کر رہے تھے فوق صاحب کی علمی و ادبی خدمات کشمیر کی تاریخ و تہذیب میں بے حد نمایاں اور اہم ہیں فوق صاحب کثیر التصانیف بزرگ تھے مگر اُن کی تحریریں دور حاضر کے علمی و ادبی حلقوں میں اتنی معروف نہ تھیں اجمل نیازی نے گم ہوتی ہوئی اس دولت کو نئے سرے سے تلاش کیا اور ادبی تحقیق کے جدید و قدیم اصولوں کے مطابق ترتیب دے کر ایک بڑی اور خوبصورت کتاب لکھی۔

انہی دنوں اجمل نیازی پاکستان ٹیلی وژن پر ادبی پنجابی پروگرام نواں رنگ کے کمپیئر تھے۔ انھوں نے کئی یادگار پروگرام کیے ایک پروگرام کشمیری زبان اور پنجابی زبان کے روابط کے حوالے سے بھی کیا۔ اس پروگرام میں خصوصی گفتگو

کے لیے انھوں نے مجھے بُلایا جناب کلیم اختر اور مس زاہدہ ملک نے بھی اس گفتگو میں شرکت کی۔ اجمل نیازی نے جب کشمیری اور پنجابی زبان و ادب کی رشتے داریوں پر تعارفی کلمات کہے تو میں حیران رہ گیا اُنھوں نے جہلم کے نامور شاعر میاں محمدؒ کا حوالہ دیتے ہُوئے کہا کہ میاں محمد نے کشمیر اور پنجاب کے سنگھم پر کھڑے ہو کر شاعری کی ہے علمی و ادبی حوالے سے کشمیر اور پنجاب کی سرحدوں کو جس سلیقے سے اجمل نیازی نے ملا دیا ایک عجب محبت بھری کیفیت کا تاثر میں نے محسوس کیا۔ اجمل نیازی نے فوق اور کشمیر کو اُن تمام لوگوں کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی جنھوں نے اس ضمن میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہے پھر اُنھوں نے ایک ایسے مقام پر اُن دونوں شخصیات کو پہنچا دیا کہ اب کوئی بھی دیکھنے والا اس مقام پر ٹھہرے بغیر نہ رہ سکے گا اجمل نیازی نے فوق کی وساطت سے کشمیر کو بھی ایک شخصیت کا درجہ دلانے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے بلاشبہ "قابلِ قدر کام کیا ہے جس کو اہالیانِ کشمیر اور محبانِ کشمیر کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ یہاں میں تفصیل کے ساتھ اجمل نیازی کی تحقیقی کاوشوں کو بیان نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ شخص جو ایک شاعر ہے اور ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہے اُس کی نثر بھی تخلیقی سطح پر ظاہر ہُوئی ہے وہ جب تحقیقی میدانوں میں اُترا تو اُس نے یہاں بھی اپنی اہلیتوں کا لوہا منوایا۔ ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ میانوالی کے رہنے والے ہیں ایسے میں کشمیر کی محبت کی خوشبو اپنے دِل میں محسوس کرنا اور اِس محبت کو عام کرنے کی کوشش کرنا ایک کارنامے سے کم نہیں۔ اُنھوں نے وہ کام کیا ہے جو کشمیریوں سے بھی کم کم ہو سکے گا۔ سُرخ و سفید اجمل نیازی پکے پٹھان ہیں اب تو کچھ کچھ کشمیری بھی لگتے ہیں۔ انھوں نے تخلیقی سطح پر اپنے آبائی شہر میانوالی کو لاہور سے مربُوط کرنے کی کوشش کی ہے اب اُنھوں نے فوق کے حوالے سے تحقیقی سطح پر پنجاب اور کشمیر کو مربُوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ پاکستان اور کشمیر کے الحاق کی ایک دیرینہ آرزو ہے۔ فوق کا خاندان

بھی کشمیر سے پنجاب میں آیا تھا پھر فوق نے لاہور کو اپنا مستقل مُستقر بنایا۔ اُنھوں نے لاہور میں کشمیر کی تاریخ اور تقدیر لکھی مگر وہ ہمیشہ کشمیر کی جُدائی میں مبتلا رہے اِس جُدائی کی کسک مَیں نے اجمل نیازی کے دِل میں بھی دیکھی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کشمیریات کے شعبے کے قیام پر اجمل نیازی بہت خوش ہُوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں آکر مجھے دو سچّی مسترّتیں ملتیں ہیں ایک یہ کہ یہاں کشمیر کا ذکر ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ یہاں فوق کی تصویر آویزاں ہے۔ میرے ساتھ اجمل نیازی کی محبت بھی فوق اور کشمیر کی نسبت سے ہے اجمل نیازی روابط کے لحاظ سے بڑے مستقل مزاج اور استقامت والے جوان ہیں اس دَورِ منافقت میں وہ دوستی اور دشمنی میں کھرے اور سچے اِنسان ہیں۔ اُنھوں نے ایسے ہی سچے اعتماد کے ساتھ تحقیق کے شعبے میں موجود روایت اور مروجہ معیار کو ہم آہنگ کر کے ایسا اسلوب اختیار کیا جو ایک زندہ مثال بن گیا ہے۔

فوق اپنے زمانے کی ایک متحرک علمی شخصیت تھے علامہ اقبال کے علاوہ اُن کے روابط پُورے ہندوستان کے معروف لوگوں کے ساتھ تھے اہلِ کشمیر برصغیر میں اور پُوری دُنیا میں جہاں کہیں تھے۔ فوق کے احاطۂ محبت میں سمٹ آئے جو لوگ یہ بھُول چُکے تھے کہ وہ کشمیری ہیں، اُنھیں بھی کشمیر کی یاد ستانے لگی۔ علامہ اقبال نے فوق کو مجددِ کشامرہ کا خطاب یونہی تو نہیں دے دیا تھا۔ اجمل نیازی نے علامہ اقبال کے اِس خطاب کو ایک بار پھر سچ کر دکھایا ہے اُن کی یہ علمی اور ادبی خِدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

ڈاکٹر یُوسف بخاری
صدر شعبہ کشمیریات

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

خطۂ جموں وکشمیر ہمیشہ ہی اہلِ فکر و نظر کی توجۂ خاص کا مرکز و محور رہا ہے اور تاریخ اس اَمر کی شاہد ہے کہ ہر دَور میں، ہر مذہب اور ہر نظریہ کے پیروکار اور مفکر، کشمیر اور اہلِ کشمیر کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے!

ریاست جموں وکشمیر جسے جنتِ ارضی اور فردوسِ بریں کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ اپنی گوناں گوں خوبیوں اور حسن وجمال کی وجہ سے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں کی تہذیب، وتمدن کا شمار دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے اور یہاں کے بکینوں نے قرنہا قرن سے اِن مذاہب اور تہذیبوں کو دیکھا ہے جو آج مختلف اقوام کے روحانی اور سماجی اعتقادات ہیں ـــــ ہندو مت۔ بُدھ مت۔ جین مت۔ رِشی مت ـــ عیسائیت۔ یہودیت اور دینِ مبین کے ماننے والے اس ارضِ جمیل میں بستے ہیں ـــ لہٰذا یہاں کی تاریخ بھی قدیم ترین تاریخوں میں ایک ہے اور

جہاں تک برِصغیر ہند وپاک کا تعلق ہے "راج ترنگنی" جو ایک کشمیری مؤرخ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے آج اس علاقہ کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہے — بلکہ جدید محقق سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ قرآن حکیم کا اوّلین ترجمہ کشمیر ہی میں ہندیہ زبان میں ہُوا تھا — !

اس خطّہ کی تاریخ وجغرافیہ — تہذیب وثقافت — علم وادب — سیاست و صحافت پر جس اہلِ قلم نے سب سے زیادہ محنت وریاضت — تحقیق وجستجو اور توجہ و خلوص سے کام کیا اور اِس موضوع پر بیسیوں کتب تصنیف کردیں وہ مؤرخ کشمیر منشی محمّد الدین فوق مرحوم ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ فوق اور کشمیر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں تو غلط نہیں ہے —

مؤرخ کشمیر منشی محمّد الدین فوق مرحوم، ترجمان حقیقت، شاعرِ مشرق علاّمہ محمّد اقبال کے ہم عمر اور ہم عصر تھے۔ دونوں کشمیری نژاد تھے۔ دونوں نے تازیست کشمیریوں کی آزادی کے لیے جدّوجہد کی اور اپنی عمر کا بہترین حصّہ ان کے لیے وقف کیے رکھا — منشی محمّد الدین فوق نے کشمیر کی تاریخ پر وہاں کے مشاہیر اور ان کے حکایات پر ان کے خوبصورت شہروں اور دیہاتوں پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اور یوں اُن کتب کی وساطت سے ہندوستان کے بسنے والوں کو کشمیر اور اہلِ کشمیر سے آگاہی حاصل ہُوئی — !

یہ کتب خود وہ شائع کرتے تھے۔ مگر اُن کی وفات کے بعد کسی نے اس طرف توجہ نہ دی حالانکہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ان کتب ورسائل کی دوبارہ اشاعت بے حد ضروری تھی — اس عدم توجہگی سے نہ صرف کتب، ناپید ہوگئیں بلکہ خود نئی نسل منشی محمد الدین فوق مرحوم کے نام سے ناآشنا رہی — اور یہ لوگ بھول گئے کہ ان کا محسن کون ہے — بہرحال یہ شرف اور اعزاز ڈاکٹر محمّد اجمل نیازی کو جاتا ہے جنھوں نے ایک گم شدہ شخصیت کو دوبارہ زندہ کردیا ہے اور ان کی تخلیقات اور تصنیفات

کو ڈھونڈ نکالا ہے اور پانچ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد فوق اور ان کی شخصیت و فن پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے جس پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں پی - ایچ - ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے — ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے فوق مرحوم پر کام کرکے درحقیقت کشمیر اور اہلِ کشمیر سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ بحیثیت ایک دانش ور یہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان سے الحاق نہ صرف کشمیریوں کی آزادی کے لیے ضروری ہے بلکہ پاکستان کی سالمیت و بقاء کا ضامن بھی ہے — اجمل نیازی جو خود میانوالی کے ایک سنگلاخ علاقہ کے مکین ہیں، کشمیر کے فطری نظاروں — بہتے ہوئے چشموں — فلک بوس پہاڑوں کے باشندوں کی آزادی کے لیے تڑپ اٹھے اور بقول علامہ اقبال ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی

یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں جب تحریکِ حریت کشمیر کے انقلابی دَور کا آغاز ہوا اور علامہ محمد اقبال آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے سیکرٹری جنرل بنے تو ان کے دوست پروفیسر محمد علم الدین اور محمد الدین فوق ان کی خدمتِ کشمیریاں سے بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ ایک روز محمد علم الدین سالک مرحوم سے کہا کہ آپ کشمیری ہونے کے ناطے کشمیریوں کے لیے بہت کام کر رہے ہیں — اس پر سالک مرحوم نے فرمایا — علامہ صاحب میں تو کشمیری نہیں ہوں بلکہ میرا تعلق تو آرائیں قبیلہ سے ہے — اس پر علامہ محمد اقبال نے بے ساختہ کہہ دیا تو پھر آپ آج سے "اعزازی کشمیری" ہیں — ان کے علاوہ مولانا عبداللہ قریشی کو بھی اعزازی کشمیری سمجھا جاتا ہے — اگر آج علامہ محمد اقبال زندہ ہوتے اور ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا اپنے ہمدم دیرینہ جنھیں آپ "مجدد الکشامرہ" کہا کرتے تھے، پر کام دیکھتے تو یقیناً ان کے لیے بھی ایسی ہی محبت کا اظہار فرماتے — بہرحال

یہ کہنا درست ہے کہ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کی اِس محنتِ شاقہ سے اقبال اور فوق کی روحیں جنت الفردوس میں شاداں و فرحاں ہوں گی — اور اہلِ کشمیر کی نئی نسل — اپنے ایک بہت بڑے محسن فوق مرحوم کی شخصیت اور فن کو زندہ کرنے پر ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کی، احسان مند رہے گی!

کلیم اختر

دیباچہ

محمد الدین فوق بیسویں صدی کے نصف اول میں، ادب و صحافت کے شعبے میں، ایک اہم اور ممتاز شخصیت کے طور پر معروف ہوئے۔ وہ مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، ناول نگار اور صحافی تھے۔ علمی و ادبی مصروفیات کے علاوہ کئی تحریکوں میں سرگرمی سے شریک رہے۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر علامہ اقبال نے انھیں "مجدد کشامرہ" کا خطاب دیا۔ فوق نے اپنے مرتب کردہ شعری انتخاب "گلشن نوبہار" میں اقبال کے کلام کے ساتھ ایک مختصر تعارف تحریر کیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ فوق نے اپنے رسالوں اور کتابوں میں اقبال کے بارے میں متعدد گراں قدر مضامین تحریر کیے۔ جس پر اقبال نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود" میں فوق کے ان مضامین سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اور مطالعۂ اقبال

کے سلسلے میں اِن تحریروں کو بہت اہم قرار دیا ہے۔

فوق، اقبال کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے۔ اقبال نے ان کی کئی کتابوں کے دیباچے تحریر کیے ہیں۔ فوق کے نام اقبال کے بائیس خطوط ملتے ہیں جو "روحِ مکاتیبِ اقبال" میں شائع ہو چکے ہیں، جن سے فوق کے ساتھ اقبال کے گہرے روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس روشنی میں حیاتِ اقبال کی کئی گمشدہ کڑیاں سامنے آتی ہیں۔

فوق نے سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں۔ جن میں سے کئی دستیاب نہ تھیں اور ملک کی مختلف لائبریریوں، فوق کے دوستوں، عزیزوں اور دوسرے علم دوست حضرات سے حاصل کی گئیں۔ اس سلسلے میں راقم نے بھارت کا سفر بھی اختیار کیا تاکہ اپنے زمانے کی ایک بے حد ممتاز، سرگرم اور اہم شخصیّت کی حیات اور علمی و ادبی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا جا سکے اور ان کے مختلف النوع کارناموں کو سامنے لایا جا سکے۔ فوق کی دس بارہ غیر مطبوعہ کتابیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کا مطالعہ تحقیقی نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ فوق نے مختلف وقتوں میں چھ رسالے بھی جاری کیے۔ جن کے ذریعے فوق نے پنجاب اور بالخصوص کشمیر کی فلاح و اصلاح اور آزادی و خوشحالی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ سرینگر سے اُردو اخبار "کشمیر جدید" جاری کیا۔ فوق کے اخبار "کشمیری میگزین" کو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے "تہذیب الاخلاق" کے انداز کا رسالہ قرار دیا ہے۔ فوق کی یہ جدوجہد علم و عمل کے ایک مشترک رویے کی نشاندہی کرتی ہے جس کا آغاز سرسید کی ہمہ گیر شخصیت کی بدولت ممکن ہوا۔ اس طرح بالواسطہ طور پر فوق کو سرسید کے رُفقا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ "انجمن کشمیری مسلمانان" کے سیکریٹری کے طور فوق کی خدمات بے مثال ہیں۔ اقبال

اس انجمن کے جنرل سیکریٹری تھے۔ شیخ عبداللہ نے اپنی خودنوشت "آتش چنار" میں فوق کی ان خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ تاریخ حریت کشمیر کے آئینے میں فوق کے اس کام کو سامنے لانے کی ضرورت تھی۔ جو کسی حد تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اُردو صحافت کے تذکروں اور مختلف کتابوں میں فوق کا ذکر موجود ہے مگر اس سلسلے میں ذرا تفصیل سے جائزہ لینے کے لیے اس مقالے میں "فوق کی صحافت" کے نام سے ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔ فوق کی ادبی و صحافتی خدمات ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اس اعتبار سے فوق کے اسلوب صحافت اور اندازِ بیان کا تجزیہ بہت بامعنی ہے۔ فوق نے صحافت کو ایک مقدس فریضہ سمجھا اور اسے ایک باوقار پیشے کی حیثیت بھی دی۔ انھوں نے عمر بھر حصولِ معاش کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش نہیں کیا۔ اسی جذبے سے انھوں نے اپنا ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا، اور نہ صرف اپنی کتابیں شائع کیں بلکہ برصغیر کے دیگر اہم ادیبوں کی تصنیفات بھی شائع کیں۔ فوق کا یہ عمل بھی آگے چل کر بڑے دُور رس نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہُوا۔ اس کے ساتھ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فوق نے مضامین، شاعری اور اقوال پر مبنی کئی کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ یہ تحریریں اپنے زمانے کے مخصوص اور معروف اسلوب اور نقطۂ نظر کی عکاس ہیں۔ فوق کے مرتبہ شعری مجموعوں میں چند ایک ایسے شعراء کا کلام بھی جمع کیا گیا ہے جن کا تذکرہ اُردو شاعری کے کسی تذکرے میں موجود نہیں۔ ان کی ایسی ایک کتاب "اذانِ بتکدہ" ہندو شعراء کی نعتوں پر مشتمل ہے۔ فوق کی ایک اور مرتبہ کتاب "اخبار نویسوں کے حالات" میں برصغیر بالخصوص پنجاب کے اخبار نویسوں کے خود نوشتہ حالات مضامین کی صورت میں جمع کیے گئے ہیں۔ کچھ مضامین فوق نے فراہم کردہ کوائف کی بنیاد پر خود مرتب کر دیے تھے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر شاہ علی نے اس کتاب کو

فوق کی سوانح عمریوں میں شمار کیا ہے۔ اُردو میں اس طرح کی کتاب کی مثال کم کم ملتی ہے۔ اس طرح اُردو صحافت اور اُردو ادب کی تاریخ میں فوق کی یہ کتاب یکساں اہمیت کی مالک ہے۔ اس مقالے میں یہ جائزہ بھی لیا گیا ہے کہ فوق کی صحافیانہ سرگرمیوں کے اثرات ان کی ادبی مصروفیات پر کس طرح مرتب ہُوئے۔ اس ضمن میں ممکنہ نتائج کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

فوق کے حالاتِ زندگی کے لیے اِن کی خود نوشت غیر مطبوعہ "سرگزشت فوق" سے بڑی مدد ملی ہے۔ اِن کے ذاتی تاثرات کے آئینے میں کشمیر، پنجاب اور برِصغیر کے حالات کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔ "سرگزشت فوق" آپ بیتی اور جگ بیتی کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔ اس میں علامہ اقبال کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا حالی، داغ دہلوی، محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، خواجہ حسن نظامی، آغا حشر کاشمیری اور کئی دوسرے اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کے ساتھ فوق کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے زمانے کے فکری رجحانات اور ان کے بارے میں فوق کے ذاتی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ فوق کثیر الاحباب آدمی تھے۔ انھوں نے ایک بھرپور زندگی بسر کی۔ راجوں مہاراجوں، نوابوں اور انگریز افسروں سے بھی ان کے مراسم تھے۔ انھوں نے برِصغیر کے مختلف مقامات کا سفر اختیار کیا۔ کشمیر کا تو انھوں نے چپہ چپہ دیکھا تھا۔ ان کا "سفر نامۂ کشمیر" اُردو کے چند ابتدائی سفر ناموں میں سے ایک ہے۔ جب کہ ان دِنوں سفر ناموں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے مطالعے سے فوق کی نظر سے دیکھے ہُوئے خطۂ کشمیر کی تصویر نظر آتی ہے۔ کشمیر کے حُسن بخش نظاروں کے علاوہ وہاں کی زبوں حالی کا نقشہ بھی اُبھرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی کئی اور کتابیں بھی ہیں۔ غیر مطبوعہ "نہرو کا سفر نامۂ کشمیر" میں ہمسفری کی واردات

کو ذاتی مشاہدات کی روشنی میں بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سفرنامے کی اشاعت سے جدید سفرنامہ نگاری کے اسلوب و انداز پر منفرد اثرات مرتب ہونے کے امکانات ہیں۔ ہندوستان اور تحریک حریت کشمیر کے حوالے سے اس کتاب کے ذریعہ ہندو قیادت کے ذہن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ سفرنامے میں مؤرخانہ کمالات کے گہرے رنگوں کی آمیزش فوق کا نمایاں اسلوب ہے۔

فوق کی بڑی حیثیت مؤرخ کی ہے۔ مؤرخ کشمیر کے طور پر وہ بہت مشہور ہوئے کہ یہ خطاب ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ فوق نے سب سے پہلے اُردو میں تاریخ کشمیر لکھی۔ ان کی یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ فوق کی یہ اولیت تحقیق و تنقید کے اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مؤرخ کے طور پر فوق کا اسلوب بہت حد تک ایک دیانت دار محقق کا ہے۔ اب بیسویں صدی کے آخر میں، تاریخ کشمیر کے ضمن میں فوق کو ایک پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ محققین اور مؤرخین نے اس سلسلے میں مزید قابلِ قدر اضافے کیے ہیں، تاہم فوق کی تصانیف سے علمی استفادہ اب تک جاری ہے، ان کی تاریخی اہمیت کو قبول کیا جاتا ہے۔ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ نے تاریخ کشمیر کے ایک انتہائی اہم ماخذ "راج ترنگنی" کے ترجمے پر مبنی ایک ضخیم کتاب دو حصوں میں تالیف کی ہے۔ جو ۱۹۷۶ء میں دِلّی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے حواشی میں ٹھاکر صاحب نے بعض تاریخی امور کی وضاحت کے لیے فوق کا حوالہ دیا ہے۔ تاریخ کشمیر کے علاوہ فوق نے تاریخ لاہور بھی لکھی ہے۔ "لاہور عہد مغلیہ میں" ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ تاریخ لاہور کے حوالے سے فوق نے تاریخ پنجاب بھی لکھی ہے۔ ان کی ایک کتاب "مآثر لاہور" "نقوش" لاہور نمبر میں شائع ہوئی ہے جو ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی۔ فوق نے اس کتاب میں پرانی قبروں

کے آثار ڈھونڈ کر تاریخی حقائق دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی کتبۂ مزار پر لکھی ہُوئی عبارت فوق کو تاریخ کی رہگزاروں پر دُور تک لے گئی ہے۔ صاحب قبر کی حیات کا سراغ لگاتے ہُوئے، تحریر کے آغاز میں اپنا ایک شعر لکھ دیا ہے۔ اس ایک شعر میں پُوری کہانی بیان کر دی گئی ہے۔ اِن شعروں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے تو ایک طویل نظم بن جاتی ہے۔ یہ تمام اشعار ایک زمین میں لکھے گئے ہیں۔ اس سے فوق کی شاعرانہ قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ نویسی کے فن میں نئے اسلوب کی طرف نشاندہی ہوتی ہے جو تاریخ کے عالموں اور محققوں کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہوگی۔ فوق کی ایک غیر مطبُوعہ کتاب "بے نشان نامور" بھی دستیاب ہُوئی ہے۔

فوق نے تین جلدوں میں تاریخ اقوام کشمیر لکھی ہے۔ انھوں نے اس طرح کشمیریوں کے نام و نسب کا دفاع کیا ہے۔ انسانوں اور ان سے متعلق دوسری چیزوں کی اصل اور ابتدا کا حال معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ تحقیق ہوتی رہی ہے۔ انسانی دُنیا ذاتوں اور نسلوں کا عجائب گھر ہے تحقیق و جستجو کے لیے یہ ایک وسیع موضوع ہے۔ صرف کشمیر میں فوق نے ایک ہزار سے زائد مختلف ذاتوں کا سُراغ لگایا ہے۔ اس طرح لوگوں کے بارے میں کئی دلچسپ واقعات سامنے آئے ہیں۔ فوق نے دو جلدوں میں "تاریخ اقوامِ پونچھ" بھی تحریر کی ہے۔ اس کے علاوہ کئی علاقوں کے حوالے سے اس طرح کا کام کرنے کا فوق کا ارادہ تھا۔ ان کے کاغذات میں اس طرح کی چیزیں ملی ہیں۔ وہ یہ منصوبے ادھورے چھوڑ کر فوت ہو گئے مگر ان خطوط پر بہت وقیع اور مفید کام کرنے کی گنجائش ہے۔

فوق نے اپنی سوانح عمریوں میں بھی تاریخ نگاری کا انداز برقرار رکھا ہے۔ اس مقالے میں فوق کی تاریخ نگاری کے ذوق و شوق کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

اس حوالے سے شبلی کے جاہ وجلال کے مقابلے میں فوق کا انداز دھیما اور شفقت سے لبریز ہے۔ ان کے ہاں اسلوب کا شکوہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ وہ عام فہم اور سادہ و سلیس انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے بلکہ دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ مؤرخانہ کمالات کی جھلک، سوانح عمریوں کے علاوہ، ان کے سفرناموں، شعری مجموعوں اور دیگر متفرق تحریروں میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

فوق، شاعری کے دوران بھی مؤرخ کو اپنے اندر زندہ و بیدار رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ہر نظم اور غزل سے پہلے ایک نوٹ لکھا ہے۔ اگر ان نثر پاروں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا جائے تو اس طرح نہ صرف فوق کی زندگی اور ان کے زمانے کی تاریخ کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے بلکہ ان میں سے چند ایک نثر پارے فوق کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ اس طرح ایک مختصر مقدمہ شعر و شاعری تیار کیا جاسکتا ہے۔ فوق کے ہاں اس طرح کے تنقیدی اشارے کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں اس لیے یہ ایک برجستہ اور مُثبت تنقیدی رویّہ ہے۔ پروفیسر علم الدین سالک نے فوق کو کشمیر کا حالی کہا ہے۔ حالی نے غالب کی صحبت میں اعلیٰ پائے کی غزلیں کہیں۔ اور پھر سرسید کی رہنمائی میں "مدوجزرِ اسلام" لکھی اور "مقدمہ شعر و شاعری" تحریر کیا۔ اپنی خفتہ نصیب قوم میں ایک نیا ولولہ پیدا کرنے اور اپنے شاعروں اور ادیبوں کو مقصدی ادب کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ فوق نے داغ کی شاگردی میں غزلیں کہیں۔ داغ نے فوق کے نام خطوط میں ان کی تعریف بھی کی۔ پھر اقبال کی رفاقت اور کشمیر کے دگرگوں حالات دیکھ کر فوق نے فلاح و اصلاح کے لیے اپنے شعر و ادب کو وقف کر دیا۔ فوق ایک مصلح کا دِل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شاعری میں کشمیر کے نظاروں کی دلآویزی ہے۔ انھوں نے کشمیر کی افلاس و ادبار کی ماری ہوئی زوال آمادہ معاشرت کی عکاسی

بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؏

مری قسمت میں نوحہ خوانی کشمیر ہی آئی

فوق کی شاعری کا زمانی ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں اسی انداز کا فکری ارتقاء دکھائی دیتا ہے جو حالی اور اقبال کے ہاں ایک اور انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ شعروادب کے حوالے سے یہ ارتقاء تحقیق و تنقید کے لیے اہم موضوع سمجھا جاتا ہے۔

فوق کا افسانوی اَدب بھی مقصدی اَدب کے ذیل میں آتا ہے۔ فوق کا افسانوی اَدب ناول، حکایات اور ایک غیر مطبوعہ ڈرامے پر مشتمل ہے۔ یہ بات تحقیقی نقطۂ نظر سے تعجب خیز ہے کہ اُردو اَدب کی تاریخوں اور ناول کے تنقیدی جائزوں میں فوق کی ناول نویسی پر کوئی مواد نہیں ملتا۔ جب کہ ان کی دیگر حیثیات کے بارے میں مشاہیر اور اہم ہم عصروں کی آرار موجود ہیں۔ اس صورتِ حال میں فوق کے ناولوں کا مطالعہ ناول کے مؤرخوں اور نقادوں کے لیے بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اب فوق کے ناولوں کو بھی ناول نگاری کے تجزیے میں شامل کیا جائے گا۔

فوق کے دو ناول ''اکبر'' اور ''انارکلی'' تاریخی ناول ہیں جب کہ گیارہ ناول معاشرتی مسائل کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ فوق ناول نگاری میں شرر کے ساتھ فنی اور فکری مطابقت رکھتے ہیں۔ شرر کے ناول ''فردوسِ بریں'' کو ان کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے جب کہ فوق کا ناول ''اکبر'' ایک مکمل تاریخی ناول ہے۔ اپنے ناول ''انارکلی'' میں بھی فوق نے اکبر کے جلال و جمال کی کہانی بیان کی ہے۔ ''انارکلی'' نام کی اور بھی کچھ تحریریں ہیں۔ امتیاز علی تاج کا ڈرامہ بہت مشہور ہے۔ اب فوق کے اس ناول کا مطالعہ کئی لحاظ سے ضروری ہو گیا ہے۔ فوق کے معاشرتی

ناولوں میں نذیر کے اسلوب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ابتدائی دور کے اُردو ناولوں کے ساتھ فوق کے تقابلی جائزے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فوق کے ناول بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، پھر نجانے کیوں اُردو ناول کے محققوں کی نظر ان پر نہیں پڑی۔ اس مقالے میں فوق کی ناول نگاری پر ایک باب مخصوص کیا گیا ہے تاکہ آئندہ اُردو ناول کی تاریخ و تحقیق میں فوق کو مناسب توجہ دی جا سکے۔ دراصل فوق کی مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، صحافی اور ریفارمر کے طور پر شہرت کی وجہ سے ان کی ناول نگاری کی حیثیت پس منظر میں چلی گئی۔ ان کے ادبی سرمائے میں ان کے ناول بھی قابلِ ذکر اہمیت کے حامل ہیں۔ اس مقالے میں فوق کی ناول نگاری کا جائزہ اوّلین تحقیقی اور تنقیدی کوشش کی حیثیت رکھتا ہے۔

فوق کی حکایت نگاری بھی ان کی ناول نگاری کی طرح تحقیقی مطالعے کی مستحق ہے۔ اُردو ادب میں اب حکایت نگاری کا رجحان نسبتاً کم ہوتا جا رہا ہے۔ فارسی زبان میں لکھی گئی حکایات کو چھوڑ کر، اُردو میں حکایات بالعموم بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ فوق نے بھی بچوں کے لیے حکایات لکھیں اور یہ مختلف مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ ان حکایات کو بچوں کے ادب کی روایت کے حوالے سے اور درسی کتب کی افادیت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان و اسلوب کی غیر معمولی سادگی اور سلاست کی خصوصیت نے حکایات کو دلچسپی عطا کر دی ہے، اور ان سے استفادہ کرنے کے امکان میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ تاریخی واقعات کو کہانی کا رنگ دے کر پُر لطف اور سبق آموز بنا دیا گیا ہے۔ حکایت نگاری کرتے ہوئے، فوق نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اور اصل واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے جس طرح وہ پیش آئے تھے۔ فوق کی کتاب "حکایاتِ کشمیر" کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ابھی پچھلے برس ۱۹۸۵ء میں سرینگر سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔

کسی کتاب کی غیر معمولی مقبولیت بھی تحقیق اور پرکھ کے نئے دروازے کھولتی ہے۔

فوق کا ایک غیر مطبوعہ ڈرامہ "زمیندار کی سرگزشت" انھی مقاصد کی تائید کرتا ہے جو ناولوں اور حکایات میں ان کے پیشِ نظر رہا ہے۔ یہ ڈرامہ کشمیر کے دیہاتی علاقوں کے مسائل کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ یہ فوق کا معروف اور محبوب موضوع ہے مگر ڈرامہ غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اب تک قارئین اور ناقدین کے سامنے نہیں آسکا۔ یہ ڈرامہ اسلوب بیان اور اپنی تکنیک کے اعتبار سے ریڈیو کے لیے لکھے گئے ڈراموں سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس طرح فوق کی ڈرامہ نگار کے طور پر ایک اضافی حیثیت کا سُراغ ملتا ہے۔

اس ڈرامے کے علاوہ فوق کی متعدد غیر مطبوعہ کتابیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں سے کچھ فوق کی وفات کے بعد مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں مگر ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔ چند ایک کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے بعض اہمیت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ انھیں جلد از جلد شائع کیا جائے۔ اس مقالے میں فوق کی تقریباً تمام کتابوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ غیر مطبوعہ کتابوں کے سلسلے میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ شائع ہونے سے کس طرح رہ گئیں اور اب ان کی اشاعت کی ضرورت کس حد تک ہے۔ فوق کی بیشتر غیر مطبوعہ کتابوں کی نقول راقم نے اپنے پاس محفوظ کر لی ہیں۔

فوق کا ادبی سرمایہ ان کی ہمہ گیر اور جامع حیثیات شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف مقتدر شخصیات کے ساتھ تقابلی مطالعے کے دوران پتہ چلتا ہے کہ فوق ایک متاثر کرنے والے انتھک، مستعد اور ناقابلِ فراموش کردار کے مالک تھے۔ وہ علم و عمل کی یکجائی کے قائل تھے۔ انھوں نے علم و ادب کو ہمیشہ مقصد کے تابع رکھا۔ وہ اس بات میں ایمان رکھتے تھے

ادب ترسیل کا فن ہے۔ فوق کا مقام تہذیبی اور تاریخی شعور کو مالدار بنانے کے عمل میں پوشیدہ ہے۔ فوق نے برطانوی ہند میں احیائے اسلام اور حُبِ وطن کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ بالخصوص کشمیر کے لیے ان کی خدمات بے مثال ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے جو کام کیا ہے، وہ کئی انجمنیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ کشمیر پر اتنا لٹریچر مہیا کیا جو بڑے سے بڑا ادارہ بھی مشکل سے دے پائے گا۔ اس کے علاوہ بھی فوق نے پوری زندگی علم و ادب کے فروغ اور ترویج میں بسر کر دی۔ ان کی متنوع حیثیتوں اور بہت پھیلے ہوئے کام کو سمیٹنا اور اس کا جائزہ پیش کرنا ایک تھکا دینے والا کام تھا۔ اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ فوق کی حیات اور علمی و ادبی خدمات کو پوری طرح سامنے لایا جا سکے۔

اس تحقیقی اور تنقیدی مسافت میں اگر کچھ کرم فرماؤں کی رہنمائی نہ ملتی تو یہ سفر اور زیادہ کٹھن ہو جاتا۔ اِن سب کا شکریہ ادا کرنا بڑا خوشگوار فرض ہے۔ اس موضوع کے انتخاب اور خاکہ و کتابیات کی تیاری کے ضمن میں مولانا عبداللہ قریشی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی رہنمائی راقم کے لیے بہت بڑی تحریک ثابت ہوئی۔ یونیورسٹی کی طرف سے اس تحقیقی مقالے کا نگران ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی بیرونِ ملک روانگی کے بعد ڈاکٹر سہیل احمد خاں کو نگران مقرر کیا گیا۔ اس مقالے کی تکمیل ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی ماہرانہ نگرانی اور دوستانہ توجہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔ ممتاز محقق اور مؤرخ مولانا عبداللہ قریشی، فوق کے عزیز دوستوں میں سے ہیں۔ ان کے پاس فوق کی کتابوں کا ایک ذخیرہ محفوظ ہے۔ فوق کے بارے میں ان کے کئی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ قریشی صاحب کی امداد اور تعاون کے ساتھ ہی اس مقالے کی تکمیل ممکن ہوئی۔ معروف اخبار نویس اور ماہر کشمیریات جناب کلیم اختر اور پروفیسر علم الدین سالک کے صاحبزادے پروفیسر احسان الٰہی سالک

نے فوق کی کئی نایاب کتابیں اور ان کے بارے میں مختلف مواد فراہم کرنے میں راقم کی مدد کی۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم، پروفیسر جیلانی کامران، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر سلیم اختر، جاوید احمد الغامدی، اکرام چغتائی، ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر حسن اختر، محترمہ ڈاکٹر عفیرہ حامد علی اور جناب جعفر بلوچ نے وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، ڈاکٹر اکبر حیدری صدر شعبۂ اُردو سری نگر یونیورسٹی، میر عبدالعزیز مدیر "انصاف" راولپنڈی، خواجہ عبدالصمد وانی مدیر "کشیر" راولپنڈی، خواجہ منظور الحق مدیر "جدید کشمیر" مظفر آباد، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، سید نور محمد قادری اور جناب مشفق خواجہ سے خط و کتابت کے ذریعے مختلف معاملات میں رہنمائی ملی اور کتابوں کی فراہمی میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ میں برادرم انور جاوید اور حسین شاد کا بھی شکر گزار ہوں۔

فوق کی صاحبزادی محترمہ ظفر سلیمہ، فوق کے صاحبزادے ظفر الحق اور پوتے ظفر عزیز نے فوق کی ذاتی لائبریری دیکھنے کا موقع عطا کیا۔ اور ان کی زندگی کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کیں۔

میرے بھائی محمد اکبر نیازی، محمد اصغر نیازی، میری اہلیہ رفعت، میرے عزیز دوست امجد طفیل اور میرے بھانجے اسد ایوب نیازی اور بلال ایوب نیازی نے مختلف مرحلوں پر میری مدد کی۔ میں ان تمام خواتین و حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ۱۹۸۸ء میں اس مقالے پر مجھے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ اب اس کی اشاعت کے موقعے پر ایک دوست پبلشر بلکہ علم دوست پبلشر محترم نیاز احمد ان کے صاحبزادوں افضال احمد اور اعجاز احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

یہ بات بے حد خوش آیند ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ کشمیریات کا اجرا ہوا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے اس طرح پاکستانیات اور کشمیریات کے امتزاج سے ایک نئے علمی منظر نامے کے طلوع ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں اس شعبے میں فوق صاحب کی تحریروں سے خصوصی استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اس شعبے کے قیام کے لیے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر یوسف بخاری کی کوششیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ تحریکِ حریتِ کشمیر کا تسلسل اب فیصلہ کُن دائرے میں پہنچتا ہوا محسوس ہو رہا ہے میرے لیے بزرگ کشمیری رہنما سردار محمد عبدالقیوم خان اور نوجوان حریت پسند لیڈر جناب شبیر شاہ کا ذکر ایک سا بھی سرخوشی کا باعث بن رہا ہے۔ سردار صاحب نے آزاد کشمیر کی آرزو میں پہلی گولی چلا کر مجاہدِ اوّل کا خطاب پایا۔ مقبوضہ کشمیر میں شاہ صاحب کے ایک خفیہ پیغام پر پوری وادی آتش فشاں بن جاتی ہے۔ آتشِ چنار سے مہکتی ہوئی زمین پر رہنے والوں نے ثابت کر دیا ہے کہ لہو کے قطرے اور آگ کے شعلے بھی پھولوں سے کم نہیں ہوتے۔ میں ان شہیدوں کو بھی سلام کرتا ہوں جن کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوتا مگر پاکستان کا جھنڈا ضرور ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ناقابلِ شکست ثبوت ہے کہ پاکستان کشمیر کے بغیر نامکمل ہے۔

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

محمد اجمل نیازی
گورنمنٹ کالج لاہور

حالاتِ زندگی اور شخصیّت

باب ۱

حالاتِ زندگی اور شخصیت

منشی محمد الدین فوق کے علمی اور ادبی کارناموں کے بیان سے پہلے ان کے حالاتِ زندگی، خاندان اور اس ماحول کا ذکر ضروری ہے جس میں ان کی زندگی بسر ہوئی۔ منشی محمد الدین فوق اپنے زمانے میں بہت معروف تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں پر انھوں نے اپنی شخصیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات پر کئی مضامین لکھے جا چکے ہیں اور بالخصوص کشمیر اور کشمیری تحریکِ آزادی پر کام کرنے والوں نے ان کا بار بار ذکر کیا ہے۔ تاہم ان کے خاندانی حالات اور ان کی اپنی شخصیت کے بارے میں ان کی زندگی میں نسبتاً کم لکھا گیا ہے مگر خوش قسمتی سے چند ایسے بنیادی اور ثانوی ماخذ موجود ہیں جن کی مدد سے فوق کے خاندان اور ان کی زندگی کے مختلف مراحل کے متعلق معلومات یکجا کی جا سکتی ہیں۔ اس باب میں ہم انہی ماخذوں کی مدد سے فوق صاحب کی شخصیت کا تذکرہ کریں گے۔

ہمارے خیال میں سب سے قابلِ ذکر ماخذ فوق کی وہ خود نوشت سوانح عمری ہے جو ان کے رفیقِ عزیز مولانا محمد عبداللہ قریشی نے وقتاً فوقتاً لکھوائی۔ اور وہ "سرگزشت فوق" کے عنوان سے غیر مطبوعہ صورت میں قریشی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ یہ دستاویز فوق پر تحقیق کرنے والوں کے لیے نعمت کا درجہ رکھتی ہے۔ قریشی صاحب نے اس سرگزشت کا خلاصہ "نقوش" لاہور کے آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء میں شائع کر دیا تھا جو صفحہ ۳۷۰ سے ۳۷۶ تک سات صفحوں پر مشتمل ہے۔ سرگزشت کا ایک بڑا حصہ ہفت روزہ "انصاف" راولپنڈی میں اٹھارہ قسطوں میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۸ء سے ۲۹ اگست ۱۹۷۸ء تک شائع ہوا۔ اس رسالے کے مدیر میر عبدالعزیز ہیں۔

اس سے پہلے فوق نے اپنے رسالے "کشمیری میگزین" لاہور کے ایڈیٹر نمبر مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں اپنے مختصر حالاتِ زندگی لکھے تھے جو بعد میں "اخبار نویسوں کے حالات" کے نام سے ۱۹۱۲ء ہی میں کتابی صورت میں لاہور کے اشاعتی ادارے رفاہِ عام سٹیم پریس کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ فوق نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اقوامِ کشمیر" کی پہلی اور دوسری جلد میں ڈار فیملی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ "تاریخ اقوامِ کشمیر" کی تیسری جلد فوق صاحب کی وفات کے بعد قریشی صاحب نے مکمل کی جس کے آخر میں فوق صاحب کے بارے میں اڑتالیس صفحے کا مضمون بھی تحریر کیا جو بعد میں ظفر برادرس لاہور نے "شاعرِ کشمیر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ قریشی صاحب کی کتاب "حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں" میں بھی قیمتی مواد موجود ہے جو بزمِ اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ سرینگر کشمیر سے "شیرازہ" جلد ۱۷۔ شمارہ ۵، ۶ کا فوق نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ جس میں فوق صاحب کے فن و شخصیت کے بارے میں انیس مضامین موجود ہیں

اس کے علاوہ "نقوش" لاہور کے کئی خاص شماروں میں فوق صاحب کے بارے میں مواد شامل ہے۔

فوق صاحب نے اپنے شعری مجموعوں "کلام فوق" اور "نغمہ وگلزار" میں نظموں غزلوں سے پہلے پس منظر کے طور پر نوٹ لکھے ہیں۔ ان میں بھی ان کی زندگی کے بارے میں جھلکیاں مل جاتی ہیں۔

ان میں تمام تحریروں کی مدد سے منشی محمد الدین فوق کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ اس باب میں درج کی جا رہی ہیں۔

منشی محمد الدین فوق کے آباؤ اجداد شمالی کشمیر کے علاقہ زنگیر کے رہنے والے تھے۔ یہ علاقہ کشمیر کے ہر دلعزیز سلطان زین العابدین نے آباد کیا تھا۔ اس کو سیراب کرنے کے لیے ایک نہر بھی بنوائی تھی۔ اس کے چالیس پینتالیس دیہات میں سے ایک بڑا گاؤں ہر دو شیوہ بھی تھا، جس میں ڈار خاندان کے بہت سے لوگ آباد تھے۔ فوق کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔

کشمیر میں افغانوں کی حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ افغان بادشاہوں نے جو گورنر بھی کشمیر میں بھیجے، وہ کشمیریوں کے ساتھ زیادتیاں کرتے رہے۔ ان میں حاجی کریم داد خاں، اس کا بیٹا آزاد خاں عرف نادر شاہ ثانی، عظیم خاں اور جبار خاں تو واقعی کشمیریوں کے لیے مصیبت بن گئے تھے۔ ۱۲۲۸ھ کا قحط اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایک تو لوگ قحط سے چیخ رہے تھے پھر اس پر جاٹوں کا ظلم وستم متزاد تھا۔ جبر وستم، ناانصافیوں اور رشوت ستانیوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کسی کو لب کشائی کی ہمت وجرأت نہ تھی۔ بہت سے ہندو اور مسلمان ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ فوق صاحب خود لکھتے ہیں:

"انہی ستم رسیدوں میں ہر دو شیوہ کا ایک سرکردہ زمیندار حسن ڈار

بھی تھا، جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں کھاتا پیتا آدمی
تھا اور غریب مظلوموں کی دادرسی کے لیے کبھی کبھی افغان حاکموں کے
پاس جانے کی جرأت کر لیتا تھا۔ یہی روشنی طبع اس کے لیے بلا بن
گئی۔ حاکموں نے اسے بات بات پر یہاں تک تنگ کیا کہ وہ چند
ستم رسیدوں کو ساتھ ملا کر ترک وطن پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت حسن ڈار
کی عمر ۲۴-۲۵ سال تھی اور وہ ایک بچے کا باپ بھی تھا۔ یہ ۱۲۳۱ھ
بمطابق ۱۸۱۶ء کی بات ہے۔ ان دنوں عظیم خاں حاکم کشمیر اور
محمود شاہ دُرانی افغانستان اور کشمیر کا بادشاہ تھا۔"[1]

حسن ڈار کے مختصر سے قافلے کے کچھ لوگ تو کالا ضلع جہلم میں رہ گئے۔ کچھ
وزیر آباد، گوجرانوالہ اور کچھ لاہور چلے گئے۔ مگر حسن ڈار اپنے اہل و عیال کو لے کر
گوجرہ تحصیل ڈسکہ میں آ کر مقیم ہو گیا۔ یہاں مزدوری نہ ملنے پر وہ اس تحصیل کے
موضع گھرٹل میں چلا آیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقرر کردہ حاکم عدالت سردار
بساکھ سنگھ کی زیر تعمیر حویلی کے مزدوروں میں شامل ہو کر اپنا اور اپنے بال بچوں
کا پیٹ پالنے لگا۔ اس زمانے میں ۲ آنے یومیہ سے زیادہ مزدوری نہ تھی۔
البتہ اناج ۲۵ یا ۳۰ سیر تک ایک روپے کا مل جاتا تھا۔ قدرت، حسن ڈار پر
مہربان ہوئی۔ سردار بساکھ سنگھ نے اس کی دیانت داری سے خوش ہو کر اسے
رہنے کو جگہ بھی دی اور ترقی دے کر اسے مزدوروں کا میٹ بنا دیا۔ وہ دو
لڑکے رجب علی اور اللہ دتہ اپنے پیچھے چھوڑ کر تقریباً چونسٹھ سال کی عمر میں
۱۸۵۵ء بمطابق ۱۹۱۲ بکرمی میں انتقال کر گیا اور گھرٹل میں دفن ہوا۔ اس
نے تین حکومتیں دیکھیں۔ کشمیر میں افغانوں کی، پنجاب میں سکھوں کی اور پھر انگریزوں
کی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے دو سال قبل وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

منشی محمد الدین فوق نے ۲ مئی ۱۹۳۷ء کو اپنے جدِ امجد کی یاد میں ایک نظم کہی تھی جس میں ان کے ترکِ وطن کے اسباب، ان کے مصائب اور پھر خوشحالی اور ان کی ذریات کا کچھ ذکر ہے۔ یہ نظم غیر مطبوعہ ہے۔ سرگزشت فوق (قلمی) سے لے کر یہاں پیش کی جاتی ہے:

اِک مدت گزری تھی دُنیا کی جنت میں آباد حسن
سرور حسن محفوظ حسن خوش باش حسن و شاد حسن

جب کابل کے افغانوں کا اس مُلک میں آ کر راج ہُوا
اس راج کے ظلم و تشدد سے کرتا ہی رہا فریاد حسن

لیکن نہ فغاں افغاں نے سُنی اور ظلم عظیم بھی کم نہ ہُوا
اس عالم جور و تعدی میں آخر کو ہُوا برباد حسن

اب گردشِ دَورِ گردوں نے وہ چشمۂ شیریں چھین لیا
جس چشمۂ خواجہ حسن کو سمجھا آبِ رکنا باد حسن

ہر رنج کی ظلمت میں لیکن اِک نور تھا پنہاں راحت کا
اور اس کو اپنی مصیبت میں رکھتا تھا ہمیشہ یاد حسن

مہجور وطن سے اہل وطن بھی چھُوٹ گئے سب آخر کار
افتاد جو تھی یہ جاں لیوا لیکن یہ بنی افتاد حسن

آ دیکھ کہ اب کس شان سے ہے وہ اوج فلک کی چوٹی پر
رکھی تھی حسن تعمیر کی تُو نے غربت میں بُنیاد حسن

کشمیر کی ارض پاک میں تیری خاک کے ذرے مہر بنے
پنجاب میں وہ اقبال بڑھا، ہیں صاحب عدل و داد حسن

اب آل کی بھی اولاد کی بھی دُنیا میں ہر سو شہرت ہے
اے نام حسن تو تھا ہی حسن تیری آل حسن اولاد حسن [۵۲]

حسن ڈار نے اپنے دونوں بیٹوں رجب علی اور اللہ دتہ [۵۳] کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے میاں امام دین اور میاں بدر الدین کی درس گاہ میں داخل کرا دیا جہاں انھوں نے گاؤں کے رئیس زادوں کے ساتھ مل کر گلستان اور بوستان وغیرہ کتابیں پڑھیں اور عربی میں واقفیت پیدا کی۔ سکھوں کے آخری زمانے میں رجب علی پہلے قادیان ضلع گورداس پور میں پولیس محرر ہوئے۔ اس کے بعد لاہور آ کر سکھ فوج میں بھرتی ہو کر چیلیاں والا (گجرات) کی جنگ میں شامل ہوئے۔ اس جنگ میں سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریز پنجاب پر قابض ہو گئے۔

امن عامہ اور معافی کا اعلان ہونے کے بعد جب انگریزوں نے راولپنڈی میں سرحدی چھاؤنی قائم کی تو رجب علیؒ نے وہاں خطوط نویسی شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۸۶۷ء تک جاری رہا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی اللہ دتہ منصرم بندوبست تھے۔ ان کے کہنے پر آپ بھی محکمہ بندوبست میں ملازم ہو گئے اور قریباً گیارہ سال موضع کوٹلی ہرنارائن ضلع سیالکوٹ میں پٹواری رہے۔ یہیں ۱۸۷۶ء میں بمرض ہیضہ انتقال کیا [۵۴]

رجب ڈار کے چھ بچے تھے۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ فرزندوں کے نام بڈھا خاں، الدھا خاں اور غلام محمد خادم تھے۔ سب سے بڑے بڈھا خاں تھے۔ یہ اعلیٰ درجے کے خوش نویس اور پنجابی کے مشہور شاعر تھے مشتاق تخلص کرتے تھے۔ بے شمار قصے ان کی یادگار ہیں۔ انھوں نے بعمر اسّی سال ۱۹۳۱ء میں بمقام لاہور انتقال کیا [۵۵]

دوسرے کا نام میاں الدھا خاں تھا۔ یہ پٹوار سے ترقی کر کے نائب صدر

قانون گو ہو گئے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور زار تخلص کرتے تھے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں کبھی پونچھ، کبھی جموں، کبھی لائل پور میں رہے۔ آخر اپنے آبائی وطن کشمیر چلے گئے۔ یہاں آپ کے چھوٹے بھائی غلام محمد خادم پہلے ہی سے آباد ہو چکے تھے۔ وہاں کچھ عرصہ رہے۔ اپنے رشتے داروں سے ملے۔ ایک مکان بھی خریدا مگر سردیوں میں پھر لاہور آ گئے اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ۶۹ سال کی عمر میں یہیں پیوند زمین ہو گئے[۸]۔ ان کے چار بیٹوں میں سے منشی محمد الدین فوق دوسرے فرزند تھے جنھوں نے ادب اور صحافت میں بڑا نام پیدا کیا۔ فوق صاحب کے رسالہ "طریقت" میں ان کے کئی صوفیانہ مضامین دیکھنے میں آتے ہیں۔

غلام محمد خادم سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ انھوں نے کشمیر میں بہت سی اراضی خریدی اور ایک بہت بڑا باغ بھی لگایا جس میں اعلیٰ درجے کے ثمردار درخت تھے۔ یہ نثر بھی لکھتے تھے اور شعر بھی بہت اچھے کہتے تھے۔ تمام عمر اسلامی، قومی اور سیاسی نظمیں لکھیں۔ کبھی عشقیہ شاعری نہیں کی۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور اور مسلم کشمیری کانفرنس کی دامے، درمے، قدمے اور قلمے بہت خدمت کی۔ شیخ عبداللہ کو شیرِ کشمیر بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ کشمیریوں کی اصلاح و فلاح میں بھی ہمیشہ سرگرم رہے۔ ان کے فرزند منظور الحق نے عملی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں اور آزاد کشمیر میں کونسل کے رکن بھی رہے۔ خادم صاحب نے خانقاہ ڈوگراں کے موضع گجیانہ میں بہت سی اراضی خرید کر آباد کی اور اس کا نام کوٹ غلام رکھا۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں بیمار ہو کر کشمیر سے لاہور آتے اور دسمبر کے تیسرے ہفتے تک یہاں علاج کراتے رہے۔ ذرا تندرست ہو کر اپنے آباد کیے ہوئے گاؤں کوٹ غلام محمد (خانقاہ ڈوگراں) چلے گئے اور وہیں انتقال فرمایا[۹]۔ اکثر شعراء نے آپ کی وفات پر اشعار لکھے۔ پنجاب، جموں و کشمیر اور پونچھ کے

اخباروں نے آپ کی وفات کو قومی ماتم قرار دیا۔ یہاں صرف چودھری خوشی محمد ناظر کی ایک طویل نظم کے مندرجہ ذیل چند شعر بھی "سرگزشت فوق" سے نے کر لکھے جاتے ہیں:

سُن کے خادم کی آج بانگ رحیل — قافلے والے زار روتے ہیں
ماتم غم محترم میں فوقؔ — بادل بے قرار روتے ہیں
عاشق قوم تھا محبِ وطن — اس کو شہر و دیار روتے ہیں
تجھ کو اے قیس وادیٔ کشمیر — دشت و در زار زار روتے ہیں
ملک و ملت کے خادم بے باک — تجھ کو مردان کار روتے ہیں
اوّلین جرعہ نوشِ آزادی — تجھ کو سب میگسار روتے ہیں

یار دیرینہ چھوٹ کر تجھ سے
ناظرؔ دلِ فگار روتے ہیں

منشی محمد الدین فوق کے تین بھائی اور بھی تھے۔ ایک ان سے بڑا تھا اور دو چھوٹے۔ رحیم بخش شیدا، چراغ دین اور فیروزالدین۔[۷]

فوق صاحب، منشی لدھا خاں کی دوسری اولاد تھے۔ وہ فروری ۱۸۷۷ء میں کوٹلی ہرنارائن میں پیدا ہوئے۔[۸] محمد دین قادری نے اپنی کتاب "مدینۃ الاولیا" میں مؤرخین لاہور میں فوق کے حالات لکھتے ہوئے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۸۷ء تحریر کی ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔[۹] ان کے والد ان دنوں معظم آباد متصل کوٹلی لوہاراں میں پٹواری تھے۔ بھائی رحیم بخش جو ان سے اڑھائی سال بڑے تھے، اپنی دادی کے پاس گھڑتل میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ فوق صاحب کو بھی گھڑتل بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ گھڑتل میں ان دنوں صرف پرائمری سکول ہوتا تھا۔ اس کے مدرس اوّل

میاں وسوندھی خاں اور مدرس دوم منشی بھاگ علی تھے۔ مولوی الٰہی بخش اور منشی جے گوپال ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس تھے، جو وقفے وقفے کے بعد سکول کا معائنہ کرنے آتے تھے۔ مولوی الٰہی بخش عربی فارسی کے عالم فاضل تھے۔ انھوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ لالہ ٹھاکر داس راولپنڈی سرکل کے انسپکٹر تھے۔ محمد الدین کو جو سند ۲۸ مارچ ۱۸۹۰ء کو ملی، اس پر انہی کے دستخط تھے۔

فوق صاحب انگریزی پڑھنا چاہتے تھے اس لیے کچھ دنوں کے لیے گوجرانوالہ کے مشن ہائی اسکول میں داخل ہو گئے جو سیالکوٹی دروازے کے اندر واقع تھا۔ لیکن پھر واپس آکر جاگکے مڈل سکول سے ۱۶۔ اپریل ۱۸۹۲ء کو سپیشل کلاس (انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت راولپنڈی سرکل کے انسپکٹر آف سکولز مسٹر ڈی۔ ایچ ٹامسن تھے۔ سند پر انہی کے دستخط تھے۔ جاگکے کا مڈل سکول اب ہائی سکول کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ فوق صاحب کو یہاں گزاری ہوئی زندگی جب بھی یاد آتی تھی، ان کا دل بھر آتا تھا۔ خود فرماتے ہیں:

پہروں رویا ہوں کلیجہ تھام کے
یاد جب آیا ہے مجھ کو جاگکے [۱]

۱۸۹۳ء میں خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ قائم ہوا۔ ہیڈ ماسٹر چوہڑ سنگھ کو طالب علموں کی ضرورت تھی۔ فوق صاحب نے انھیں لکھا کہ اگر میری فیس معاف کر دی جائے تو میں دو ایک اور دوستوں کو بھی لا سکتا ہوں۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ فوق صاحب دو طالب علموں کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ ہیڈ ماسٹر نے ان کی فیس تو معاف کر دی اور دوسرے دونوں کی نصف معاف کر دی۔ فیس معافی میں ان کی کرکٹ کے کھیل میں اہلیت کا بھی دخل ہے [۲]۔ سکول میں ابھی بورڈنگ کا انتظام نہیں ہوا تھا، اس لیے تینوں کو گرجاگھر کے دروازے کے اندر ایک چوبارہ کرائے

پرے کر رہنا پڑا۔ لیکن فوق صاحب کو یہ زندگی پسند نہ آئی اس لیے جلد ہی وہاں سے واپس آکر پھر جالکے سکول میں پڑھنا شروع کر دیا۔ گوجرانوالہ کا یہی معمولی سکول بعد میں گرونانک خالصہ کالج بنا۔

گھڑتل اور جالکے میں جس طرح انھوں نے زندگی گزاری، اس کے دو تین واقعات تو ایسے ہیں کہ وہ ان کی آئندہ زندگی کا پیش خیمہ بنے۔ فوق لکھتے ہیں:

"مَیں شاید دوسری یا تیسری جماعت میں تھا، دیہاتی لڑکے بانسری کے ساتھ اس قسم کے گیت گایا کرتے تھے:

چندا وے جے چلیوں پسرور دھیاں ڈھڈیال پینڈا دُور
اِک پل بہہ جاناں

مَیں سب پنسل سے کاغذ پر لکھ لیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پہلی کی کتاب پروفیسر آزاد کی تھی۔ اس میں جو نظمیں ہوتی تھیں وہ مَیں زبانی یاد کر لیا کرتا تھا۔ "رسوم ہند" ایک بہت اچھی کتاب تھی، جو ہمیں چوتھی جماعت میں پڑھائی جاتی تھی اور کچھ پانچویں میں۔ اس کتاب میں ہندوؤں اور مُسلمانوں کے رسم و رواج اور ان کے بزرگوں اور پیشواؤں کا ذکر ہوتا تھا۔ اس طرح نامعلوم طور پر لڑکوں کے دل و دماغ پر ابتدا ہی میں ایک دوسرے کے مذہب کے احترام اور ہندو، مُسلم اتحاد کے جذبات پیدا کیے جاتے تھے۔

مَیں پانچویں جماعت میں تھا۔ ایک مرتبہ گرمائی تعطیلات میں کثرت سے تمام طلباء کو سوالات ملے۔ وہ زمانہ آج کل کا زمانہ تو تھا نہیں کہ مُسلمان، ہندوؤں کے گھروں میں چلا جائے تو ہندو بھرشٹ ہو جائے یا کم سے کم اس کے مُسلمان ہونے کا وہم اس کے رشتے داروں کو ہو جائے یا ہندو لڑکا مُسلمان گھروں میں جائے تو مُسلمان کے کافر بن جانے یا اس کے شدھ جانے کا کِس

کو خیال آتا۔ سب لوگ اپنے اپنے عقائد پر سختی سے پابند ہوتے تھے۔ آج کل کی طرح سیاسی مذہب نہیں رکھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ایک دوسرے سے محبّت کرتے تھے اور اتفاق سے رہتے تھے۔ چنانچہ ہندو ہم جماعت مُسلمان گھروں میں اور مُسلمان طلباء ہندو طلباء کے گھروں میں جا کر مِل جُل کر کام کیا کرتے تھے۔ ہماری جماعت کے طلباء نے بھی اسی طرح باہمی اشتراکِ عمل سے رخصتوں کا کام لکھائی پڑھائی اور حساب وغیرہ ختم کیا۔

مَیں نے اپنے تمام حل کیے ہُوئے سوالات کی کاپی کو خوش خط لکھّا اور اس کا نام اپنے نام کی رعایت سے "محمد الحساب" رکھا اور اس کا سرورق بڑا خوبصُورت بنایا۔ جب مولوی دسوندھی خاں نے میرے ہم جماعتوں کی کاپیوں کے ساتھ میری کاپی دیکھی اور اس کا ٹائیٹل ملاحظہ کیا جس پر لکھا ہُوا تھا "محمد الحساب" مصنّف محمد دین طالب علم جماعت پنجم مدرسہ گھڑتل، تو حیرت سے دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔

۱۸۹۱ء میں، مَیں انگریزی تعلیم کے لیے مڈل سکول جامکے ضلع سیالکوٹ میں داخل ہُوا جو قریبًا بیس پچیس سال سے اب ہائی سکول ہے۔ مجھے بچپن ہی میں شعروشاعری کا شوق تھا۔ اس زمانے میں میرے چچا منشی غلام محمد خادم (جو اُن ایام میں سوختہ تخلص کرتے تھے) میرے نگران تھے۔ ایک دفعہ والدہ مرحوم نے پونچھ سے چچا صاحب کو خط لکھّا اور اس میں میرے متعلق یہ الفاظ لکھے:

"محمد دین کا خیال رکھنا۔ اس کو شعروشاعری کا بڑا شوق ہے۔ وقت ضائع نہ کرتا رہے۔" لیکن نوشتۂ تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے۔ یہ جنون میرے تخلص کی بدولت آخر جزوِ زندگی ثابت ہو کے رہا۔ ؏

جامکے میں شعر خوانی اور شعر گوئی کے "جنون" کو اور بھی ہَوا ملی۔ منشی رحیم بخش رمز

جو کئی سال لاہور میں "گرداور" قانونگو اور مدرسہ پٹواریاں کے استاد رہے، فوق صاحب سے ایک جماعت آگے تھے۔ لیکن شغلِ شاعری میں ان کے ہمنوا تھے۔ ان کی وجہ سے اس بے سمجھی کے زمانے میں شاعری کی خوب رونق رہی۔

ایک دفعہ امتحان میں نظیر اکبر آبادی کا یہ مسدس فارسی میں ترجمہ کرنے کو ملا:

کیا خوب سودا نقد ہے ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

نکات شعری سے بالکل ناواقف ہونے کے باوجود فوق صاحب نے اس کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا۔ آخری الفاظ کچھ اس طرح تھے:

"وزیں دست دہ زاں دست گیر"

یہ ان کی جرأت اور شوق کی دلیل ہے اور طبیعت کی موزونی کی بھی۔

اپنے چچا غلام محمد خادم کی نگرانی کے بعد فوق صاحب سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ یہ زندگی طرح طرح کی دلچسپیوں کا ایک مرقع ہوتی ہے۔ اس زندگی میں طالب علم عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔ اپنے استادوں سے بھی شرارت کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ایک رات تمام لڑکوں نے ایک تماشہ کیا۔ کوئی استاد بنا کوئی شاگرد سبق کس طرح غلط سنایا جاتا ہے۔ ایک طالب علم دوسرے کو کس طرح چھیڑتا ہے۔ کس انداز سے اس شرارت کی شکایت ماسٹر سے کی جاتی ہے۔ گھروں میں جا کر کس طرح جھوٹے بہانے بنائے جاتے ہیں اور خرچ کے لیے پیسے بٹورے جاتے ہیں۔ ماسٹر کا بینچ پر کھڑا کرنا، جرمانے کی سزا دینا، رجسٹر سے نام خارج کرنے کی دھمکی دینا، سیدھے سادھے درویش صفت ہیڈ ماسٹر کی نقلیں کر کے میز پر ٹانگیں دراز کر دینا، بورڈنگ کا سپرنٹنڈنٹ بن کر بورڈنگ کا معائنہ کرنا اور لنگر خانے کی روٹیاں دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ حافظ اللہ بخش سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ

ہاؤس اور مولوی غلام محی الدین ہیڈ پرشین ٹیچر آ گئے۔ اشادوں کی شکلیں دیکھتے ہی سب تتر بتر ہو گئے۔ فوق صاحب سکول کی چھت پر جا بیٹھے اور جو لڑکے قابو میں آ گئے، ان کو پٹتے دیکھتے رہے۔ اور بن پٹے ہی کانپتے رہے۔ دوسرے دن صبح ان کی بھی جواب طلبی ہوئی۔ مولوی غلام محی الدین چھڑی لے کر اُٹھے۔ فوق صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا گو رات کو مجھے مار نہیں پڑی لیکن خدا کی قسم جن کو مار پڑی ہے، ان سے زیادہ نادم ہوں اور ان سے زیادہ درد محسوس کر کے رو تا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا مار کے بغیر رونا کس طرح آیا۔ فوق صاحب نے کہا آپ ہی نے تو گلستان میں پڑھایا ہے:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

مولوی صاحب ہنس پڑے اور انھیں سزا سے نجات مل گئی۔[۱۳]

غیر تعلیمی سرگرمیاں

جالکے میں طالب علمی کے زمانے کے بعد فوق صاحب لاہور آ گئے۔ یہاں ان کے بڑے بھائی رحیم بخش میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے فوق صاحب کو اینچی سن مڈل سکول میں داخل کرا دیا۔ یہ سکول موری دروازہ کے باہر پیسہ اخبار بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا۔ لیکن ان کے والد انھیں پٹوار کا کام سکھانا چاہتے تھے جو ایک طرح سے ان کا خاندانی پیشہ بن گیا تھا۔ ۱۸۹۴ء کی تعطیلات گرما میں جب وہ سیالکوٹ گئے، تو اپنے چچا منشی فتح دین صدر قانونگو کے پاس پٹوار

کا کام سیکھنا شروع کیا۔ اس طرح وہ مڈل کا امتحان پاس نہ کر سکے۔ سات آٹھ ماہ تک مختلف پٹواریوں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ چونکہ ان کا خط نہایت ہی اچھا تھا، اس لیے ہر پٹواری انھیں اپنے ساتھ رکھنے پہ آمادہ رہتا تھا۔ لیکن دوسرے سب اُمیدوار تو پٹواری ہو گئے اور یہ اپنے چچا کی بے التفاتی کی بدولت مُنہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

بیکاری کا سارا وقت شعروشاعری میں بسر ہونے لگا۔ میاں نظام الدین وزیر پونچھ کے سب سے بڑے صاجزادے میاں فیروزالدین جو پونچھ میں نائب وزیر تھے، پونچھ کے دیہات کی پڑتال کے لیے ایک نائب تحصیلدار کے ساتھ یہاں آئے ہُوئے تھے۔ وہ بڑے سخن فہم اور شعر کے شائق تھے۔ انھیں جب فوق صاحب کی شاعری کا حال معلوم ہُوا تو اکثر ان کو بلا بھیجتے، کھانا بھی کھلاتے اور ایک دوسرے سے شعر بھی سُنتے رہتے۔ منشی نورالدین عنبرؔ اور منشی فقیر علی عاقلؔ کانگڑوی کی موجودگی سے بھی شعروشاعری کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ یہ دونوں بڑے خوش مذاق تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ عنبرؔ صاحب کا کلام تو لاہور کے رسالہ "مخزن" میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ وہ لنگیٹ میں نائب تحصیلداری کے عہدے تک پہنچے تھے کہ عین عالم شباب میں انتقال کر گئے۔ عاقلؔ صاحب شیعہ عقائد رکھتے تھے۔ اِن کی وجہ سے محرّم کی مجالس میں جا کر مرثیہ خوانی بھی کرنی پڑتی تھی۔ لکھنؤ سے طرحی غزلوں کا گلدستہ منگوایا جاتا تھا اور اس کی غزلوں کو سامنے رکھ کر خوب طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ غرض ہر وقت شعر کی دُھن سوار رہتی تھی اور موزونیٔ طبع ہمہ وقت آپ کا ساتھ دیتی تھی۔

جموّں کے مشہور ادیب اور شاعر حبیب کیفوی اپنی کتاب "کشمیر میں اُردو" میں اِن دنوں کی سرگرمیوں کا حال بیان کرتے ہُوئے منشی محمدالدین فوق کی خدماتِ اردو کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"منشی محمدالدین فوق مرحوم نے جو ۱۸۹۵ء سے جموّں کے محکمہ پرمٹ

میں ملازم تھے، جموں میں ادبی جلسوں کی طرح ڈالی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریاست میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد صفر کے برابر تھی۔ تاہم فوق صاحب نے، جن کی شاعری کی ابھی ابتدا تھی، جموں میں شعری مجلسوں کی ابتدا کر کے عملی طور پر اُردو کے لیے راستہ ہموار کیا۔ عاقل اس دور کے ایک اور شاعر تھے جو فوق کے ہم عصر تھے (وہ شیعہ تھے)۔ جموں میں ادبی مجلسیں انہی دو شاعروں کی وجہ سے رونق پر تھیں۔ مشاعروں کا ابھی رواج نہیں ہوا تھا شعری مجلسیں بھی گنے چنے لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ دونوں شاعروں نے محرّم کی مجلسوں کو اُردو کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ مجلسوں میں شامل ہوتے اور مرثیے سناتے۔ اس طرح ذوق کی تسکین بھی ہو جاتی اور اُردو کے فروغ کا جو مقصد پیشِ نظر تھا، وہ بھی حل ہو جاتا۔"[۱۴]

انہی دنوں آپ نے لکھنؤ کے رسالہ "پیام یار" کے لیے ایک غزل لکھی اور اشاعت کے لیے بھیج دی۔ مصرعہ اس طرح تھا۔ ع

نجد آباد ہے لیلیٰ ترے دیوانے سے

"پیام یار" میں چھپنے والی یہ آپ کی سب سے پہلی غزل تھی۔ اس وقت تک آپ شوقؔ تخلص کرتے تھے اور حضرت احسان شاہ جہانپوری سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس سے حوصلہ بڑھ گیا اور آپ نے دوسری غزل رسالہ "انتخاب" میں چھپنے کے لیے بھیج دی۔ مگر اس کے مدیر نے آپ کو لکھا کہ ہمارے دوست مولانا محمد ظہیر احسن شوقؔ نیموی عظیم آبادی کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے "شوق" کی غزل ہمارے رسالے میں جگہ نہیں پا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے آپ کے لیے فوقؔ تخلص تجویز کر دیا، جو آپ نے قبول کر لیا اور اپنا پہلا تخلص بدل دیا۔[۱۵]

اس تخلّص پر فخر کا اظہار کرتے ہُوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے فوقؔ یہ تخلّص کیا خُوب ہے ہمارا
اس سے ہے فوق ہم کو ہم آسمان پر ہیں

دوسری جگہ یُوں فرماتے ہیں:

ہم فوق ہیں اور فوق رہے گا ہمیں سب پر
کیا غم ہے جو تقدیر نے چکّر میں ہے ڈالا

قیامِ جمّوں کے دوران فوقؔ صاحب نے ریاستی سازشوں کے بڑے بڑے انداز دیکھے۔ معتمد اور معزز اہل کاروں کی درگت بنتے بھی دیکھی۔ وزیر پچھمن کا طوطی بولتے اور پھر خوار ہوتے بھی دیکھا۔ گمٹ دروازے کے نچلے میدان میں شارعِ عام پر پھانسی پانے والوں کا عبرت ناک انجام بھی مشاہدہ کیا۔ لوگ اس کثرت سے وہاں جمع ہوتے تھے جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ ہاتھی پر بیٹھ کر دریائے توی کو کئی بار پار کیا۔ ہولی کے ایّام میں لوگوں کو کیچڑ اور غلاظت اچھالتے اور لت پت ہوتے بھی دیکھا۔ چھوت چھات کی زیادتی سے انسانی اَنا پامال ہوتے بھی دیکھی۔ ہندو دکاندار کو مُسلمان گاہکوں کو دُور ہی سے اچھال کر سودا دیتے بھی دیکھا۔ تھیٹریکل کمپنیوں کی گرم بازاری بھی دیکھی۔ دسہرے کے دِنوں میں ہاتھیوں اور مینڈھوں کی لڑائی کے تماشے بھی دیکھے۔ غرض ایک سال جمّوں میں گزار کر شہر کے در و دیوار پر حسرت کی نگاہ ڈالتے، دوست احباب سے رخصت ہُوئے اور گھر تل آ گئے۔

فوقؔ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں جمّوں کی اس وقت کی تمدنی اور معاشرتی حالت کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ ڈوگرہ دیش کی وجہ تسمیہ اور جمّوں کی اسلامی اور غیر اسلامی عبادت گاہوں کی کیفیّت بھی بیان کی ہے۔ جن مسجدوں میں اذان کی بندش تھی اور جو بعد میں واگذار ہُوئیں، ان کا حال بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ان دنوں لاہور میں مشاعروں کا بڑا زور تھا ۔ ایک ہفتہ وار مشاعرہ "انجمن اتحاد" کے زیر اہتمام بھاٹی دروازہ کے اندر بار حکیماں میں ہوتا تھا ۔ حکیم شجاع الدین محمد نے ۱۸۹۰ء میں اس تنظیم کو باقاعدہ کیا ۔ حکیم صاحب شعر بھی کہتے تھے ۔ "داغ ہجراں" اور "خزینہ خزینہ" ان کی شاعری کی یادگار ہیں ۔ وہ مشہور فاضل اور ڈرامہ نویس حکیم احمد شجاع مرحوم کے والد تھے ۔ یہ مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء کے مکان پہ ہوتے تھے ، اور جو کلام ان میں پڑھا جاتا تھا وہ رسالہ "شور محشر" میں چھاپ دیا جاتا تھا ۔

خان احمد حسین خاں مدیر "شباب اُردو" اس انجمن کے سیکرٹری تھے ۔ وہ عاشقانہ اور طرزِ جدید دونوں رنگوں میں شعر کہتے تھے اور میرزا ارشد گورگانی کے شاگرد تھے ۔ انھوں نے بہت سے ناول بھی لکھے ہیں ۔ یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔[۱۶] بے شمار کتابیں تصنیف اور تالیف کیں ۔ دوسرے شاعروں کے علاوہ مرزا ارشد گورگانی دہلوی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے ۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی اور ان کے شاگرد بھی شامل ہوتے تھے ۔ بقول حکیم احمد شجاع — "دونوں کی ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے مصروف غزل خوانی ہوتی تھیں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا ۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی میر اور میرزا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے اور پنجاب کے شعراء بھی میر اور مرزا ہی کے زیر قیادت میدان سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروف پیکار تھے ۔ بہر حال اس بزم کی رونق اسی ہنگامے پر موقوف تھی ، اور جب تک یہ ہنگامہ جاری رہا "شور محشر" قیامت برپا کرتا رہا ۔"[۱۷]

ان مشاعروں کی شہرت سن کر فوق صاحب بھی وہاں پہنچے اور غزل سرائی کرنے لگے ۔

ان کی ایک غزل کے دو اشعار اس طرح ہیں۔

گیسو کو چھوڑتے نہیں رُخ پر شبِ وصال
تصویر کھینچتے ہیں وہ لیل و نہار کی

اے فوق شاعری کو ادب سے سلام کر
صورت نکال جا کے کہیں روزگار کی[۱۸]

اتفاق کی بات ہے کہ اس کے دوسرے ہی روز پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت مل گئی اور آپ مولوی محبوب عالم کی نگرانی میں اخبار نویسی کرنے لگے۔ اسی مشاعرے میں علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کے دل مل گئے اور ان میں ایسی محبت پیدا ہوگئی کہ جیتے جی کوئی اسے گزند نہ پہنچا سکا۔

ایک اور مشاعرے میں جس کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اور جس میں اقبال نے یہ غزل پڑھی تھی جس کا مقطع یہ ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا[۱۹]

فوق صاحب کی غزل کا مطلع یہ ہے۔

دیا ہر چند میں نے واسطہ گیسوئے جاناں کا
نہ چھوڑا تار کوئی دشتِ وحشت نے گریباں کا[۲۰]

۱۸۹۷ء میں فوق صاحب نے نواب میرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کر کے چند غزلیں اصلاح کے لیے حیدرآباد دکن بھیجیں۔ انھوں نے غزلیں اصلاح کے بعد واپس کرتے ہوئے لکھا:

"فوق صاحب میں تمھاری طبیعت سے بہت خوش ہوا۔ اصلاح

کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمہارا نام شاگردوں میں درج کر لیا گیا ہے۔ نیاز دلا دینا حضرت علی کرم اللہ وجہٗ، حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعدی رحمۃ اللہ، حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ، حضرت شاہ نصیر رحمۃ اللہ، حضرت استاد ذوق مرحوم کے نام کی۔[۲۱] استاد کی توجہ اور فیضان کا اعتراف فوق نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں کیا ہے ؎

داغؔ کا فیض اگر یونہی رہے گا اے فوقؔ
مان جائیں گے سخنور بھی فصاحت تیری[۲۲]

کچھ عرصے بعد معاصرانہ چشمک کی بنا پر ناظر حسین ناظمؔ نے اپنی پارٹی علیحدہ کر لی۔ اس نے بزمِ قیصری کے نام سے اپنے مشاعرے حضوری باغ میں شروع کر دیے۔ اس طرح دونوں انجمنیں اُردو کی خدمت میں ایک دوسری سے بڑھ جانے کی کوشش کرتی رہیں۔ یہ دونوں انجمنیں ختم ہوگئیں تو دہلی دروازہ میں بزمِ سخن نے اپنے مشاعرے شروع کر دیے۔ جس میں فوق صاحب کا عمل دخل سب سے زیادہ تھا۔ وہ مشاعرہ گاہ کے قریب ہی کسی گلی میں رہتے تھے چنانچہ ایک مشاعرے کی طرح یہ رکھی گئی: "فوق صاحب گلی میں رہتے ہیں"۔

فوق صاحب عربی اور فارسی تو بقدر ضرورت جانتے تھے لیکن انگریزی زبان اتنی نہ سیکھ سکے کہ اخبار نویسی میں ان کے کام آتی۔ اپنی اس محرومی کا بہت دلچسپ انداز میں اظہار کرتے ہیں ؎

انگلش زبان ہی سے جو نا آشنا تھے تم
اے فوقؔ پھر ایڈیٹر اخبار کیوں ہوئے

مگر ان کی قسمت میں اخبار نویس بننا ہی لکھا تھا، اس لیے ۱۸۹۷ء میں انھوں

نے "پیسہ اخبار" کی ملازمت اختیار کر کے مولوی محبوب عالم سے اخبار نویسی سیکھی اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ تمام بڑے بڑے صحافی ان کو مان گئے۔ اخبار نویسی کا جو سلیقہ انھوں نے اختیار کیا اسی کا اثر تھا کہ واقعات میں انتہائی دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔

"کوہِ نور" پنجاب کا سب سے پہلا ہفتہ وار اُردو اخبار تھا جو ۱۸۵۰ء میں لالہ ہرسُکھ رائے نے جاری کیا تھا۔ اس اخبار کے آخری ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء تک اس کی ادارت کی۔

۱۹۰۱ء میں "پیسہ اخبار" کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفت روزہ "پنجۂ فولاد" جاری کیا جو ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔

"کوہِ نور" اور "پنجۂ فولاد" کی ادارت کے ساتھ ساتھ فوق صاحب اخبار "بھارت سیوک جالندھر" کی نامہ نگاری بھی کرتے رہے اور "اخبار عام" لاہور کے لیے مضامین بھی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ اخبارات بھی ترتیب دیتے تھے:۔

۱۔ "آفتاب پنجاب" جو غالباً ۱۹۰۶ء میں بند ہُوا۔

۲۔ اخبار "گلزار ہند" جو ۱۹۰۱ء میں فوق صاحب ہی کے ہاتھوں جاری ہُوا۔

۳۔ "بہاول گزٹ" جو منشی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا۔

۴۔ "کشمیری گزٹ" جس کے مالک میاں جان محمد گنہے تھے اور ایڈیٹر منشی محمد الدین فوق تھے۔

۵۔ "کشمیری مخزن" جس کے ایک ایڈیٹر خواجہ کمال الدین مُسلم مشنری انگلستان تھے اور دوسرے فوق صاحب۔

۶۔ "اُردو اخبار" کے مالک لالہ منشی رام اگروال تھے اور ایڈیٹر منشی محمد دین فوق۔

اخبار "پنجۂ فولاد" کے بند ہونے کے بعد ۱۹۰۶ء میں فوق صاحب نے "کشمیری میگزین" جاری کیا۔ یہ ماہنامہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں "کشمیری میگزین" نے ہفتہ وار "اخبار کشمیری" کی شکل اختیار کی اور ۱۹۳۴ء تک کشمیری قوم کی تعلیمی، تہذیبی، اخلاقی، معاشرتی اور اصلاحی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس دوران ماہنامہ "طریقت" بھی جاری کیا جو چار سال رہا۔ اس کے بعد "نظام" جو ڈیڑھ سال رہا۔

۱۹۳۳ء میں فوق صاحب نے سری نگر کشمیر سے ہفتہ وار اخبار "کشمیر جدید" جاری کیا جو تین سال چل کر بند ہو گیا۔

فوق صاحب کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کی درس گاہ بنا رہتا تھا۔ ان کے اخباری تجربات سے فیض یاب ہونے والوں میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

۱۔ چودھری رحمت علی بی۔ اے جو بعد میں انگلستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے بیرسٹری کی اور "پاکستان" کا نام تجویز کیا۔

۲۔ نازش بدایونی۔

۳۔ ملک مقبول احمد جو بعد میں ترقی کر کے رجسٹرار کوآپریٹو سوسائیٹیز صوبہ کشمیر ہو گئے۔

۴۔ سید حبیب مالک و مدیر روزنامہ سیاست، منشور، مشرق جدید اور "غازی" وغیرہ۔

۵۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جنھوں نے اخباری تجربہ حاصل کرنے کے بعد اخبار "پولیس ریویو" جاری کیا اور کچھ عرصہ رسالہ "ادبی دنیا" کی ادارت کی۔

۶۔ میر نیاز کاشمیری۔

۷۔ محمد حنیف خمار جو بعد میں "نیرنگِ خیال"، "ادبی دنیا" اور "اخبار ریاست" دہلی

کے مدیر رہے۔

۸۔ ماسٹر محمد بخش مُسلم جو بعد میں ماہنامہ "کوآپریشن" اور دوسرے اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔

۹۔ بابو محمد دین۔

۱۰۔ رشید احمد صحرائی وغیرہ۔[۲۳]

ایک دفعہ مولانا عبدالمجید سالک مدیر روزنامہ "انقلاب" لاہور نے مسٹر مول چند کو آپ کے پاس بھیجتے ہُوئے حسبِ ذیل دستی رقعہ لکھا:

مکرمی جناب فوق صاحب قبلہ

السلام علیکم۔ میرے ایک کرم فرما مسٹر مول چند آپ کی خدمت میں حاضر ہُوئے ہیں۔ آپ پنجاب کی ورنیکلر اخبار نویسی پر (ایک تحقیقی) مضمون لکھ رہے ہیں چونکہ میرے نزدیک آپ اخبار نویسی اور ذوق تاریخ دونوں کے "مجمع البحرین" ہیں، اس لیے مَیں یقین رکھتا ہُوں کہ آپ پنجاب میں اردو اخبار نویسی کی تاریخ کے متعلق ان کو کافی مواد دے سکیں گے یا اس مواد کی طرف رہنمائی کر سکیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ان کو اپنی بزرگانہ امداد سے محروم نہ فرمائیں گے۔ والسلام

نیاز مند

عبدالمجید سالک

ایڈیٹر روزانہ اخبار "انقلاب" لاہور[۲۴]

اقبال روابطِ فوق کے حوالے سے

منشی محمد الدین فوق اور علامہ اقبال قریب ترین دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ کشمیری ہونے کے علاوہ سیالکوٹ (پنجاب) میں بھی ہم وطن تھے۔ دونوں

محبت کے ایک ہی رشتے میں بندھے ہوتے تھے۔ دونوں کو اپنے آبائی وطن کشمیر سے والہانہ عشق تھا۔ دونوں اس کی محبت میں گرفتار تھے اور وہ اس راستے پر ہم سفر بن گئے۔ بقول اقبال ؏

"ہم وطن غربت میں آکر مل گئے"

اس وابستگی نے رفاقت کی شکل اختیار کر لی۔ اس اخلاص و محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیریوں کی تنظیم و اصلاح اور بیداری کے لیے انجمن کشمیری مسلمانان اور کشمیری کانفرنس کے ذریعے دونوں نے مل کر کام کیا۔ دونوں ملی احساس کے شاعر تھے۔ اقبال اور فوق نے شاعری میں فصیح الملک میرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی اور لاہور کے مشاعروں میں بھی ایک ساتھ شرکت کی۔ وہ ایک دوسرے کے مزاج اور مذاق کو بخوبی جانتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت تشریف لے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے تو چند روز کے لیے سیالکوٹ چلے گئے۔ فوق صاحب نے مزاج پرسی کے لیے خط لکھا تو ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء کو یہ جواب ملا:

ڈیئر فوق۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مجھے کل ملا۔ میں ایک دو روز کے لیے بغرض مشورہ لاہور گیا تھا کیونکہ وہیں کام شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ "کشمیری میگزین" دیکھتا ہوں۔ اس میں جو کامیابی آپ کو ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور جو کچھ آپ گاہے گاہے میری نسبت اپنے کالموں میں تحریر فرماتے ہیں، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔[۳۵] ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"آپ جموں کے رستے (کشمیر) جائیں تو ضرور سیالکوٹ تشریف لائیں تاکہ

مجھے آپ کی دوستانہ قدر و منزلت کرنے کا موقع ملے۔ افسوس ہے کہ میں ابھی کچھ عرصہ تک آپ کے لیے کچھ نہ لکھ سکوں گا کیونکہ قانونی کتب کی طرف متوجہ ہوں چونکہ اس کام کو شروع کیا ہے اس واسطے ارادہ ہے کہ اس کو حتی الامکان پورے طور پر کروں۔ روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے، میری آرزو ہے کہ میں اس فن میں کمال پیدا کروں۔ آپ بھی دعا کریں کہ خدا تعالیٰ اس مہم میں میرا شامل حال ہو۔

انشاء اللہ نومبر میں لاہور آ کر مستقل طور پر کام شروع کروں گا۔ اس وقت آپ سے خوب ملاقاتیں ہوا کریں گی جیسے پہلے کبھی ہوا کرتی تھیں۔ اور میں "کشمیری میگزین" کی ترقی اشاعت کے لیے بھی چند باتیں آپ سے کروں گا۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام

از شہر سیالکوٹ۔ ۲۹ر اگست ۱۹۰۸ء

محمد اقبال[۲۶]

فوق صاحب کہتے ہیں کہ انگلستان سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے (اُردو بازار) میں ایک کوٹھی کرایہ پر لی۔ یہ کوٹھی گلاب سنگھ کے چھاپہ خانے کے پاس تھی۔ فوق صاحب ملنے گئے تو مروتاً پہلے اپنی اطلاع اندر بھجوائی۔ علامہ صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد بلایا۔ فوق صاحب کو بُرا لگا تو علامہ صاحب سے کہا حضرت! یہ کیا؟ فرمایا آپ خود ہی سوچیں آپ نے کیا کیا۔ کہ ایک عزیز تکلف کرے تو یہی سلوک ہونا چاہیے۔ ورنہ آپ کے لیے تو میں اس شعر کی صورت میں حاضر ہوں ؎

بصحن گلشن ما صورت بہار بیا
کشادہ دیدۂ گل بہر انتظار بیا[۲۷]

مئی ۱۹۱۰ء میں فوق صاحب اور منشی وجاہت جھنجھانوی نے ایک ساتھ غزلیں لکھیں۔ دونوں نے علامہ اقبال کو اپنا کلام سُنایا۔ اسی اثناء میں ان کے منشی

نے آکر کہا ایک مؤکل آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ فرمایا اس کو بٹھاؤ۔ یہاں سے فارغ ہو کر اس کو بلاؤں گا۔ فوق نے مؤکل سے ملنے کی تاکید کی تو علامہ نے کہا کہ مؤکل اگر میرا نام سُن کر آیا ہے تو وہ کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ چنانچہ فوق صاحب اور وجاہت صاحب کے بعد علامہ نے اپنا کلام سنایا اور پھر مجلس برخاست ہوئی۔[۲۹] محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں :

"اقبال اور فوق کا ذکر جب آئے گا، کشمیر کے توسط سے آئے گا۔ دونوں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ دونوں لاہور کی خاک میں جہان ادب کے روشن ستارے بنے۔ لیکن جہاں تک کشمیر اور کشمیریات کے مطالعے کا تعلق ہے، انھوں نے تحریری طور پر فوق کی فوقیت کو تسلیم کیا۔ فوق کو یاد کر کے ہم اقبال کی یاد کا بھی حق ادا کرتے ہیں اور اس والہانہ پن کا بھی جس نے ان دونوں رہروان محبت کو ایک دوسرے کے لیے بے قرار رکھا۔ دونوں کا دُکھ اس لحاظ سے بھی مشترک تھا کہ ان کا محبوب وطن غیروں کے قبضے میں تھا۔ ان کے ظلم و ستم کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔ اقبال پکار اُٹھے ؎

توڑ اس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے
رُوحِ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا

اور فوق نے شعر کہے :

بے یار و مددگار کی جو یار رہی ہے
اس قوم کا اب کوئی نہیں پوچھنے والا
اکسیر کو تقدیر نے گو خاک بنایا
یہ خاک بنا دے گی کبھی جسم کا پیالہ[۳۰]

مولانا محمد عبداللہ قریشی نے "اقبال اور فوق" کے تعلقات پر بڑی

تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جو اُن کی کتاب "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اقبال کی زندگی کا کوئی قابل ذکر واقعہ ایسا نہیں جس کا ذکر فوق نے اپنے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے اوراق میں نہ کیا ہو۔ اس سلسلے میں اُنھیں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ جاوید اقبال نے "زندہ رود" جلد اوّل میں اقبال کے حالات لکھتے ہوئے جگہ جگہ فوق کے حوالے دیے ہیں۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اقبال کے اپنے احباب میں سب سے پہلے ان کے حالاتِ زندگی پر مضمون فوق صاحب نے لکھا جو "حالات اقبال" کے عنوان سے "کشمیری میگزین" لاہور اپریل ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔"[۱۳]

فوق صاحب نے غزلوں کے تین چار گلدستے "بہارِ گلشن" کے نام سے شائع کیے۔ ہر ایک میں اقبال کی تین چار غزلیں ان کی اجازت سے درج کیں۔ ایک گلدستے میں اقبال کا مختصر تعارف بھی کرایا، جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"شیخ محمد اقبال (ایم اے) تخلص اقبال، وطن سیالکوٹ۔ ابھی بالکل نوجوان ہیں۔ عمر چھبیس سال کے قریب ہے۔ عربی فارسی، انگریزی میں مکمل استعداد رکھتے ہیں۔ حضور ملکہ معظمہ کے انتقال پُرملال پر آپ نے جو دل گداز نظم "اشک خونیں" لکھی، گورنمنٹ پنجاب نے اپنے صرف سے اس کی کئی ہزار کاپیاں مختلف زبانوں میں چھپوائیں۔ فصیح الملک حضرت داغ سے اصلاح لیتے ہیں۔ انگریزی خیالات کو اُردو شاعری میں بڑی خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ آج کل قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ہیں۔"[۱۴]

یہ مختصر نوٹ "گلشن نوبہار جلد دوم کے صفحہ ۳۶ پر درج ہے۔ اس کتاب پر

سال اشاعت موجود نہیں۔ مگر تحقیق کرنے پر ثابت ہُوا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہُوئی تھی۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے حصّے تو اس سے بھی پہلے شائع ہُوئے ہوں گے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ یہ کتاب مُنشی رام اگروال پریس لاہور سے شائع ہُوئی تھی فوق نے خود بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر اقبال کے مختصر حالات ان کی چند غزلوں کے ہمراہ ان کی اجازت سے سب سے پہلے مَیں نے "بہارِ گلشن" کے نام سے ایک مختصر مجموعہ اشعار میں چھاپے تھے۔ یہ ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے۔"[۳۳]

فوق نے "گلشن نوبہار" میں اقبال کے بارے میں اپنے نوٹ میں اقبال کی عمر ۲۶ سال بتائی ہے جب کہ انھوں نے اپنی کتاب "مشاہیر کشمیر" طبع اوّل ۱۹۱۱ء کے صفحہ ۱۲۷ اور طبع دوم ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۷۷ پر اقبال کا سال ولادت ۱۸۷۵ء تحریر کیا ہے۔ اس لحاظ سے "گلشن نوبہار" کا سال اشاعت ۱۹۰۱ء بنتا ہے۔ فوق نے اپنے رسالے "کشمیری میگزین" لاہور کے اپریل ۱۹۰۹ء کے پرچے میں اقبال کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ "نیرنگ خیال" لاہور کے ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء کے اقبال نمبر میں بھی فوق کا مضمون شائع ہُوا تھا۔ فوق کی تصنیف "تاریخ اقوامِ کشمیر" جلد اوّل ۱۹۳۴ء میں شائع ہُوئی تھی۔ اس میں اقبال کے آباؤ اجداد، ان کے خاندانی حالات، ذات اور گھر کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سب تحریروں میں اقبال کا سال ولادت ۱۸۷۵ء درج کیا گیا ہے۔ یہ سب رسائل اور کتابیں اقبال کی زندگی میں شائع ہُوئی تھیں۔ فوق مختلف معاملات میں اقبال سے مشورہ کرتے تھے۔ فوق کی کئی کتابوں کے بارے میں اقبال کی آراء ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ کئی امور کے سلسلے میں فوق، اقبال سے تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ یہ سب تفصیل فوق کے نام اقبال کے خطوط میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ خطوط، اقبال

کے خطوط پر مبنی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔

فوق کے نام ایک خط مرسلہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۵ء میں اقبال لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ آپ نے "کشمیری میگزین" میں میرے حالات شائع کیے تھے۔ اگر اس نمبر کی کوئی کاپی آپ کے پاس رہ گئی ہو تو ارسال فرمائیے۔ اگر پاس نہ ہو تو کہیں سے منگوا دیجیے۔" [۳۴]

یہ شمارہ یقیناً اقبال نے دیکھا ہوگا۔ "مشاہیر کشمیر" کے ملنے کی اطلاع اقبال کے اس خط میں موجود ہے جو انھوں نے فوق کو ۲۷ جولائی ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"کتاب "مشاہیر کشمیر" مل گئی ہے۔ شکریہ قبول کیجیے۔" [۳۵]

اقبال نے فوق کے تحریر کردہ سال ولادت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے اپنے بارے میں فوق کے لکھے ہوئے مضامین پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ مضامین کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔ [۳۶]

اس مقالے میں اقبال کی تاریخ ولادت پر بحث کرنا مقصود نہیں۔ اس موضوع پر بہت سے محققین نے کام کیا ہے۔ اس ضمن میں فوق کی تحریروں کو بنیادی اور اہم حیثیت حاصل ہے۔ یہاں فوق کے بیان کردہ اقبال کے سالِ ولادت کی روشنی میں ان کی کتاب "گلشن نوبہار" کا سال اشاعت معلوم کیا گیا ہے۔ "گلشن نوبہار" میں فوق کی تحریر میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات کا ذکر ملتا ہے اور اس نوٹ میں اقبال کے مرثیے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ملکہ کا انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوا تھا۔ اس دِن یوم عید الفطر بھی تھا۔ مرثیے میں بھی اس کا ذکر موجود ہے ؎

آئی اِدھر نشاط اُدھر غم بھی آگیا [۳۷]

ان شواہد کی روشنی میں یہ بات قطعی طور پر درست ہے کہ یہ بات ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے اقبال کے بارے میں یہ مختصر نوٹ پہلے سوانحی خاکے اور پہلی مطبوعہ تنقیدی رائے کا درجہ رکھتا ہے۔

اس سے پہلے "کشمیری میگزین" لاہور کے اپریل ۱۹۰۹ء کے شمارے میں فوق کے مضمون کو اقبال کے بارے میں لکھی گئی پہلی تحریر سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنے مضمون "علامہ اقبال کی سوانح عمری کا مسئلہ" میں لکھتے ہیں:

"اقبال کے حالات پر سب سے پہلا مضمون محمد الدین فوق کا ہے جو اپریل ۱۹۰۹ء کے "کشمیری میگزین" میں چھپا۔ اقبال کی ابتدائی سوانحی کتابوں میں اکثر و بیشتر فوق ہی کے بیانات کو دہرایا گیا ہے۔ البتہ ۱۹۰۹ء کے بعد کے واقعات و حالات کو دوسرے ذرائع کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے۔"[۳۸]

جسٹس جاوید اقبال نے بھی اسی بات کی تائید کی ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

جسٹس جاوید اقبال نے "زندہ رود" میں لکھا ہے کہ

"نیرنگ خیال" لاہور کے اقبال نمبر اور "تاریخ اقوام کشمیر" کی جلد دوم میں اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء قرار دیا گیا ہے جو صحیح نہیں، البتہ "تاریخ اقوام کشمیر" کی جلد دوم کے صفحہ نمبر ۲۲۵ پر فوق نے لکھا ہے کہ اقبال کی وفات کے بعد اُن کے عزیزوں کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ اقبال کا سال ولادت ۱۸۷۳ء ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن اس بیان سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ فوق نے اپنی پہلی رائے بدل لی تھی جب کہ جن کتابوں میں فوق نے سال ولادت ۱۸۷۵ء تحریر کیا ہے، ان کی اشاعت کے وقت اقبال بقید حیات تھے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور جسٹس جاوید اقبال کے بعد عتیق صدیقی نے فوق کی مبینہ اوّلیت کو باطل کر دیا۔ انھوں نے "خدنگ نظر" لکھنؤ کے مئی ۱۹۰۲ء کے شمارے میں اقبال کے بارے میں شیخ عبدالقادر کا مضمون "اقبال" ڈھونڈھ نکالا۔ عتیق صاحب لکھتے ہیں :

> "شیخ عبدالقادر کا مضمون اقبال کی شاعری اور حیات پر لکھا جانے والا پہلا اور سیر حاصل مضمون ہے جو اُردو شاعری کی بساط پر اقبال کے ورود کے ڈھائی تین سال بعد ہی لکھا گیا اور اب تک نظروں سے اوجھل تھا۔"[۳۹]

پاکستان میں عتیق کی اس تحقیق کا تذکرہ ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنے مضمون "تنقید غالب میں اقبال کا حصہ" میں کیا ہے[۴۰] اب ۱۹۰۱ء میں فوق کی تحریر کی دستیابی سے پھر ایک بار یہ اوّلیت فوق کو حاصل ہوگئی ہے۔ اگرچہ یہ تحریر مختصر ہے مگر یہ پہلا مطبوعہ تاثر ہے جو اقبال کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس مقالے میں فوق کی کتاب کا سال اشاعت معلوم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ معیاری ہے اور اس لحاظ سے بھی قابل قبول ہے کہ ایسی مثالیں پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنے مضمون "علامہ اقبال کی سوانح عمری کا مسئلہ" میں لکھتے ہیں :

> "سوانح عمریوں میں چراغ حسن حسرت کی "حیات اقبال" اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب پر سن اشاعت درج نہیں البتہ کتاب کے صفحہ ۱۴۸ کے حاشیے کی عبارت (یہ سطریں لکھتے وقت ("ارمغان حجاز" چھپ رہی ہے) سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ کتاب اقبال کی وفات (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کے چند ماہ بعد لکھی گئی۔[۴۱]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں سب سے پہلے مولوی احمد دین نے "اقبال" کے نام سے کتاب تحریر کی جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اقبال کے کلام کے علاوہ ان کی شخصیت اور فکر و فن پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر اقبال نے اس اشاعت کو پسند نہ فرمایا۔ اسی طرح ایک شخص منشی قمرالدین نے بھی اقبال کی نظمیں کتابی شکل میں شائع کیں۔ اقبال نے فوق کے نام ایک خط میں اپنے غصے کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں :

> "اس سے پیشتر میں اس شخص پر مقدمہ دائر کرنے کو تھا، مگر مولوی ظفر علی خاں کے کہنے سے باز رہا۔ اس نے میری نظموں کو میری اجازت کے بغیر شائع کر دیا ہے۔ اب یہ سب معاملہ مولوی احمد دین وکیل کے سپرد کیا ہے کہ اگر کوئی میرا کلام میری اجازت کے بغیر چھاپے تو اس پر دعویٰ کر دیا جائے۔" [۴۲]

حیرت ہے کہ پھر مولوی صاحب نے خود ہی ایک کتاب علامہ اقبال کی اجازت کے بغیر شائع کی۔ ممکن ہے اس کتاب میں اقبال کا کلام شائع نہ ہوتا تو وہ اس قدر رنجیدہ نہ ہوتے۔ چونکہ مولوی احمد دین علامہ اقبال کے گہرے دوستوں میں سے تھے، انھوں نے جب علامہ اقبال کی خفگی کا سُنا تو اپنی اس کتاب کی تمام کاپیاں اپنے سامنے جلا ڈالیں۔ اس واقعے کی علامہ اقبال کو خبر ہوئی تو انھیں بہت افسوس ہوا۔ پھر مولوی احمد دین نے "بانگِ درا" کی اشاعت کے بعد نئے سرے سے اپنی کتاب کو مرتب کیا اور دوسری بار ۱۹۲۶ء میں شائع کر دیا۔ یہ سب تفصیل مشفق خواجہ کی مرتب کردہ مولوی احمد دین کی کتاب "اقبال" میں ملتی ہے جو اُنھوں نے ایک مختصر مقدمے، مفصل دیباچے اور بہت مُفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کی ہے۔ [۴۳]

علامہ اقبال کے ضمن میں یہ تحقیقی بحث اگرچہ براہِ راست ہمارے موضوع سے متعلق نہیں لیکن اس بات کا فوق کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق دکھائی دیتا ہے۔ مولوی احمد دین، فوق کے بھی عزیز دوست تھے۔ مشفق خواجہ نے اپنے دیباچے میں مولوی احمد دین اور اقبال کے روابط کے حوالے سے فوق کا ذکر کیا ہے۔ مولوی صاحب کے ساتھ فوق کے روابط کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ مشفق خواجہ نے مولوی احمد دین کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے فوق کی تحریروں کو سامنے رکھا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فوق نے علامہ اقبال کے علاوہ دوسری مقتدر شخصیات کے بارے میں بھی لکھا ہے جو اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں :

"آج احمد دین کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ان کے مفصّل حالاتِ زندگی تو کیا مختصر حالات بھی عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخوں میں کہیں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ بعض مضامین اور ایک دو کتابوں میں ان کا ذکر اقبال کے ایک دوست کی حیثیت سے ضرور آیا ہے لیکن ان تحریروں سے احمد دین کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ محمد الدین فوق نے "تاریخ اقوامِ کشمیر" میں اِن کے بارے میں چند سطریں لکھی ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ادیب تھے بلکہ اس لیے کہ وہ کشمیری تھے۔ "نقوش" کے لاہور نمبر میں مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے فوق کے بیان کو دُہرا دیا ہے، اپنی طرف سے ایک لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔" ۴۴

احمد دین کا کشمیری ہونا فوق کے لیے کشش کا باعث ہوا ہوگا کہ ایک اہم لکھنے والا ان کا ہم خطہ ہے۔ علامہ اقبال کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ اس جستجو میں کئی اور مقتدر شخصیات کا فوق نے سراغ لگایا جن کا ذکر اگلے ابواب میں

کیا جائے گا۔ البتہ یہ بات اب بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ سوانحی حالات کے حوالے سے "حیات اقبال" ہی پہلی کتاب ہے کیونکہ مولوی احمد دین نے زیادہ تر فکری اور فنی بحث کی ہے اور علامہ کے کلام کو بنیاد بنایا ہے۔

اقبال کے بارے میں اپنی باقاعدہ تحریروں کے علاوہ فوق اپنے رسالوں میں اقبال کی مصروفیات کے بارے میں رپورٹیں شائع کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر لوگوں کو اقبال کے کارناموں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے اپنی خود نوشت "سرگزشت فوق" (غیر مطبوعہ) میں بھی جگہ جگہ اقبال کا ذکر کیا ہے۔ اس سے نہ صرف اقبال کے ساتھ فوق کے روابط کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ مطالعۂ اقبال کے ضمن میں بھی ان تحریروں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تحریریں ایک ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ اقبال کی سوانح پر لکھی جانے والی تقریباً تمام کتابوں میں فوق کا حوالہ موجود ہے جن میں سید نذیر نیازی کی "دانائے راز"، طاہر فاروقی کی "سیرت اقبال"، چراغ حسن حسرت کی "حیات اقبال"، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی "اقبال کی صحبت میں"، عبدالمجید سالک کی "ذکرِ اقبال"، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی "سرگزشتِ اقبال" کے علاوہ بھی کئی دیگر کتابوں میں فوق کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ فوق کے عزیز دوست عبداللہ قریشی نے فوق کی ان تحریروں کو بنیاد بنا کر "اقبالیات" کے حوالے سے بہت کام کیا ہے۔ اقبالیات کے مطالعے میں فوق سے استفادے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔[۴۵]

یہ تو فوق صاحب کی محبت تھی جو ان کے دل کی گہرائیوں سے نکل کر نوکِ قلم سے کاغذ کے صفحات پر پھول بکھیرتی رہتی تھی مگر یہ محبت یک طرفہ نہ تھی، اقبال بھی دل سے فوق کے قدردان تھے اور اس کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ انھوں نے فوق صاحب کے ہر اچھے کام کی تعریف کی۔ اخباروں

اور رسالوں کو مفید تر بنانے کے لیے کارآمد مشورے دیے۔ ان کی کتابوں کی تاریخیں کہیں، تقریظیں لکھیں۔ اقبال اور فوق کے روابط کے حوالے سے کلیم اختر لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال اور فوق کو اگر جنم جنم کا ساتھی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا تھا۔ دونوں نے اسلام کے آفاقی نظریۂ حیات کی تبلیغ و اشاعت کی۔ دونوں ایک دوسرے کو اوائل عمر سے جانتے تھے۔ ان کا تعلق عمر بھر قائم رہا۔"[۲۶] اقبال نے سید نذیر نیازی اور سلیمان ندوی کے بعد اگر کسی شخصیت کو بہت زیادہ خطوط لکھے تو وہ فوق ہیں۔ مولانا عبداللہ قریشی نے اپنی کتاب "روحِ مکاتیبِ اقبال" کا انتساب فوق صاحب کے نام کیا ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال انتقال فرما گئے۔ فوق کو ان کی جدائی سے بہت صدمہ پہنچا۔ وہ جب تک زندہ رہے اقبال کا ماتم کرتے رہے۔ ایک غزل میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

اجل اس مردِ حق آگاہ کو بھی لے گئی یا رب
حقیقت کا جسے بھیجا بنا کر ترجماں تو نے

ہوئے جس مے سے اسرارِ خودی و بے خودی ظاہر
نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیرِ مغاں تو نے

کیا اے فوق چاک اقبال نے اسرار کا پردہ
جو باقی رہ گئے تھے کر دیے وہ بھی عیاں تو نے

ایک اور غزل میں کہتے ہیں :

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی
فطرتِ حق کا جسے کچھ رازداں سمجھا تھا میں
یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبرِ دینِ خودی

۱۹۳۸ء

یا چراغِ محفلِ ہندوستاں سمجھا تھا میں[۴۷]

۱۹۳۸ء

اقبال اور فوق کے روابط کے ضمن میں فوق صاحب کے ایک دوست لکھتے ہیں :

"منشی محمد الدین فوق ایک پرانے انشا پرداز اور شریف النفس بزرگ تھے۔ آپ نے مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی کا زمانہ بھی دیکھا اور ان محسنینِ اردو کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ آہ، بلبلِ کشمیر بھی اپنے ہمنواؤں سے جا ملا۔ فوق صاحب نہ صرف اقبال کے ہم وطن تھے، ہم عمر بھی تھے۔ خطۂ کشمیر سے گہری وابستگی کے باعث ہر دو حضرات ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے۔ اکثر ادبی محفلیں دوش بدوش بسر کیں۔ فوق صاحب نے چونکہ ایک دو مرتبہ مجھے اقبال کا غیر مطبوعہ کلام سنایا تھا، چنانچہ انھوں نے غیر مطبوعہ چیزیں مجھے مرحمت فرمائیں جو اس کتاب میں شامل ہیں"[۴۸]

"اقبال اور کشمیر" کے نام سے تین کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر صابر آفاقی اور سلیم خان گمی نے لکھی ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئیں۔ ان تینوں کتابوں میں کشمیر کے حوالے سے اقبال اور فوق کی مشترکہ کوششوں کا تفصیل سے ذکر موجود

ہے۔

ممتاز معاصرین سے روابط

علامہ اقبال کے علاوہ اپنے زمانے کے پیشتر مشاہیر ادب سے فوق صاحب کے روابط تھے، اور سلسلہ مراسلت بھی تھا۔ وہ ایک مستعد شخصیت کے مالک تھے۔ چند ملاقاتوں کا احوال یہاں درج کیا جاتا ہے۔ انھوں نے "سرگزشت فوق" میں اپنی یادداشتوں میں مولانا آزاد سے ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے:

"مولانا محمد حسین آزاد دہلوی جو ۲۰۔ ۲۵ سال تک لاہور کے گورنمنٹ اورینٹل کالج میں عربک پروفیسر رہے ہیں، اردو اور فارسی زبان کے یگانۂ روزگار استاد تھے۔ ۱۲۴۶ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور جنوری ۱۹۱۰ء میں بمقام لاہور، بعمر ۸۲ سال، انتقال فرما گئے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد اور شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلی کے، عربک کالج میں ہم جماعت تھے۔ شاعری میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد اور نواب فصیح الملک میرزا داغ دہلوی کے استاد بھائی تھے۔ استاد داغ نے مجھ سے ایک دو بار مولانا آزاد کی خیر خیریت بھی پوچھی تھی اور لکھا تھا کہ ان کی دیوانگی یا صحت کا کچھ حال معلوم ہو، تو ضرور لکھو۔ مولانا آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے سب سے پہلے اردو اخبار، دہلی سے جاری کیا تھا۔ آزاد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کیا۔ نثر میں آپ اپنی طرزِ انشا پردازی کے موجد ہیں۔ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کوئی ایسا نہیں لکھ سکا جس میں سادگی بھی ہو، بے ساختہ پن بھی ہو، شاعری بھی ہو، اثر انگیزی اور دل نشینی بھی ہو۔ "آبِ حیات" اور "دربارِ اکبری" آپ کی لازوال تصانیف ہیں۔ مرنے سے قریباً بیس سال قبل دماغی عوارض میں مبتلا ہو کر دیوانگی کی حالت تک پہنچ

چکے تھے۔

"میں نے ان کو پہلی بار ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء میں دیکھا ہے۔ سردیوں کے دن تھے۔ گرم پگڑی سر پر رکھتے تھے جس کا شملہ بہت لمبا ہوتا تھا۔ بند گلے کا گرم کوٹ اور گرم پاجامہ پہنتے تھے۔ پاؤں میں دیسی جوتا ہوتا تھا۔ اور خود بخود کچھ باتیں کرتے رہتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۰ء کے ابتدائی ایام میں میں نے آپ کے عالمِ جنوں اور دیوانگی کے متعلق ایک مضمون (کشمیری میگزین میں) لکھا تھا جس میں یہ تین شعر بھی تھے:

وہ آزاد سرچشمہ علم و حکمت وہ آزاد سر دفترِ اہل ہمت
وہ آزاد ذی فہم اور ذی فراست وہ آزاد ہمدوشِ اہل فضیلت
تمھیں حال کچھ اس کا معلوم بھی ہے
وہ موجود بھی اور معدوم بھی ہے

لاہور سے باہر تو الگ، خود لاہور میں اکثر لوگ اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ آزاد پابندِ حیات ہے یا جہان کی دار و گیر سے مخلصی پا چکا ہے۔ تعجب ہے کہ ان کی وفات اس مضمون کے چھپنے کے چند یوم بعد ہی ہو گئی۔ ان کی ملاقات محض حسنِ اتفاق تھا۔ ان سے دو چار باتیں کر لینا نعمت غیر مترقبہ اور ان کی باتوں کا سمجھ لینا فہم و فراست کا کام نہ تھا۔

"میں مولانا آزاد سے کئی دفعہ مل چکا ہوں۔ ان کی ملاقات کی ابتدا عجیب انداز سے ہوتی تھی۔ ملاقات، بات چیت، پیام و سلام، یہ سب کچھ دو چار منٹ میں طے ہو جاتا تھا۔ میں سب سے پہلے ان کو شاہ عالمی دروازہ دلو ہاری دروازہ کے درمیانی باغ میں نہانے کے لیے جو پردہ بنا ہوا تھا، وہاں ملا۔ میرے ہاتھ میں ایک کتاب ترجمہ تاریخ الخلفا تھی۔ وہ نہر کے کنارے کنارے، سیر سے واپس،

اپنے مکان اندرونِ اکبری دروازہ کی طرف آ رہے تھے۔ میری عمر اس وقت ۱۸-۱۹ سال کی تھی۔ اس زمانے میں لاہور شہر کے گرد جو باغات ہیں، وہ گنجان درختوں سے بھرے ہُوئے تھے۔ مولانا، نہر کے کنارے کھڑے ہو کر درختوں پر جو چڑیاں چہچہا رہی تھیں، ان سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ مَیں پاس سے گزرا تو فرمایا اے میاں! کہاں جا رہے ہو؟ مَیں نے کہا "پیسہ اخبار" کے دفتر میں۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ مَیں نے کہا تاریخ الخلفاء ہے۔ فرمایا عربی میں ہے؟ مَیں نے کہا اُردو ترجمہ ہے۔ فرمایا ارے اصل چیز دیکھو۔ ہماری لائبریری میں آؤ جہاں تاریخ الخلفاء جیسی کتابوں کے ڈھیروں کے ڈھیر ہیں۔ اس کے بعد آپ روانہ ہو گئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ انہی کا نام مولانا آزاد ہے۔

"دو اور ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہُوں۔ مولانا ایک مرتبہ بکّی دروازہ کے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ مَیں ان کو دیکھ کر ان کے پیچھے ہو گیا۔ چند قدم چل کر، ڈرتے ڈرتے، "مولانا، السّلام علیکم" کہا۔ اب یاد نہیں کہ انھوں نے کیا جواب دیا، لیکن ہاتھ اُٹھا کر لب ہلاتے رہے۔ مَیں نے کہا مولانا! آپ کو معلوم ہے حضرت امیر مینائی کا عرصہ سے انتقال ہو چکا ہے۔ فرمایا کون امیر؟ مَیں نے کہا منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد، نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کے استاد۔ فرمایا اسیر کو ہم جانتے ہیں معلوم نہیں یہ امیر کون ہے۔ مَیں نے پھر عرض کیا نواب فصیح الملک کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ فرمایا وہ کون؟ مَیں نے کہا نواب میرزا خاں داغ دہلوی، آپ کے اُستاد بھائی۔ یہ نام سُن کر ایک جگہ ٹھہر گئے اور ایک منٹ کی خاموشی کے بعد فرمایا غلط، اور بالکل غلط! وہ دیکھو، داغ اور امیر دونوں پھاٹک حبش خانی (دہلی) کے مشاعرہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں۔ مَیں نے پھر عرض کیا یہ دونوں شاعر اس دُنیا سے گزر چکے ہیں۔ ذرا ترش رو ہو کر فرمایا تم بکواس کرتے ہو۔ یہ کہہ کر پھر روانہ ہو گئے۔ لیکن مَیں

ان کے ساتھ پروفیسر اقبال (ڈاکٹر سر محمد اقبال اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے) اور مولانا کی تصنیف "دربار اکبری" کی قبولیت کے متعلق باتیں کرتے اسٹیشن تک جا پہنچا کیونکہ باغ سے نکل کر چوکی چاہ میراں سے ہوتے ہوئے، اسٹیشن کی طرف اُنھوں نے اپنا رُخ کر لیا تھا۔ مگر انھوں نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا۔ آخر جب عالمِ تخیلات کے اس بادشاہ کو اپنے مشتاقِ سخن کی ہمراہی ناگوار معلوم ہوئی، غُصّہ کے لہجے میں فرمایا "میرا پیچھا بھی چھوڑو گے یا نہیں۔ تم نے میرا بہت ہرج کیا ہے۔" میں یہ سُن کر دبے پاؤں وہیں سے واپس آ گیا۔

"غالباً ۱۸۹۹ء کا ذکر ہے، مولانا مرحوم کے فرزند آغا محمد ابراہیم منصف، اکبری دروازہ کے اندر اپنا مکان نئے سرے سے تعمیر کرا رہے تھے۔ پیسہ اخبار کے دفتر کو میں اکثر اوقات اسی رستے جایا کرتا تھا۔ میں نے ان کو بارہا اینٹوں پر کوئلوں سے کچھ لکھتے اور مٹاتے دیکھا ہے۔ یہی حال، دیوانگی کی حالت میں، میاں فیروزالدین نائب وزیر پونچھ (خلف میاں نظام الدین وزیر پونچھ) کا ہو گیا تھا۔ جب اواخر ۱۸۹۹ء میں، میں نے اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا تو مولانا کی سوانح حیات لکھنے کے ارادے سے ایک دِن ان سے کہا مولانا! ایک شخص آپ کے حالاتِ زندگی لکھنا چاہتا ہے — بات کاٹ کے فرمایا میرے حالاتِ زندگی؟ بہت خُوب۔ وہ کون ایسا پاگل ہے، ذرا اُسے میں تو دیکھوں!

میں نے پھر کہا آپ کی تصویر کی بھی اسے ضرورت ہے، وہ کہاں سے ملے گی؟ فرمایا میں خود تصویرِ مجسّم ہُوں، میری تصویر لے کے وہ کیا کرے گا۔ آخر آپ کون ہیں؟ خواہ مخواہ! نہ جان نہ پہچان، بڑی بوا سلام۔ بس تشریف لے جائیے نہیں تو بلاتا ہُوں کسی کو۔ میں کان لپیٹ کے واپس آ گیا۔"

"ان کے انتقال پر لالہ دیا نرائن نگم بی۔ اے ایڈیٹر رسالہ "زمانہ" کانپور نے

مجھے مضمون کے لیے لکھا۔ مَیں نے اس مضمون میں پانچ چھ ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا۔[۴۹]
آغا محمد طاہر، آغا محمد باقر (اور آغا محمد اشرف) مولانا آزاد ہی کے پوتے اور آغا محمد ابراہیم
کے فرزند ہیں (اب یہ انتقال کر چکے ہیں)۔

"ڈاکٹر مولانا حافظ نذیر احمد ایل ایل ڈی شمس العلماء دہلوی ہر سال جلسہ
انجمن حمایت اسلام لاہور میں تشریف لایا کرتے تھے اور عموماً میرزا عبدالرحیم ڈپٹی
کلکٹر پنشنر کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ میرے چچا قبلہ خادم صاحب اور مَیں ایک مرتبہ
ان سے ملنے کے لیے ان کے ڈیرے پر گئے۔ خادم صاحب کو ان دِنوں کشمیری
مُسلمانوں کی فہرستیں مرتب کرنے کا خیال تھا۔ یہی خیال انھوں نے مولانا سے ظاہر
کیا۔ مولانا نے کہا میاں! کیا پوچھتے ہو، میرے سوا دہلی کا ہر بڑا خاندان کشمیری ہے۔
میرزا محمد سعید ایم اے نے جو ان دِنوں بالکل خورد سال تھے (بعد میں گورنمنٹ
کالج لاہور کے پروفیسر اور کسی کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے، اور آج پنشن پر ہیں)
چھُوٹتے ہی کہا مولانا! آپ کیوں نہیں۔ مولانا نے فرمایا اس لیے کہ میں دہلی کا
نہیں ہُوں بلکہ میری اصل بجنور سے ہے۔ میرزا محمد سعید نے کہا اور کیا ہم بھی؟
مولانا نے فرمایا: کیوں نہیں، میرزا محمد سعید! ہم ہوں گے تو ننھیال کی طرف سے
ہوں گے۔ مولانا! ننھیال کی طرف سے تو تم مان ہی گئے، ددھیال کی طرف سے
مَیں ثابت کر دُوں گا۔"[۵۰]

"۱۹۱۴ء کا ذکر ہے۔ آل انڈیا مُسلم کشمیری کانفرنس نے خان بہادر میاں محمد شاہ دین
(ہمایوں) بیرسٹرایٹ لاء کو اپنا صدر مقرر کیا اور قرار یہ پایا کہ کانفرنس کا سالانہ
اجلاس امسال کشمیر میں ہو۔ لیکن دربار نے اس جلسہ کی اجازت نہ دی۔ پھر یہ تجویز
ہُوئی کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بی اے بیرسٹرایٹ لاء سیکرٹری محمڈن ایجوکیشنل
کانفرنس علی گڑھ کی سرکردگی میں ایک ڈیپوٹیشن کشمیر میں مہاراجہ بہادر کی خدمت

میں پیش ہو۔ چنانچہ اس ڈیپوٹیشن میں صاحبزادہ صاحب کے علاوہ بابو عطا محمد بی اے سرکاری وکیل اور قبلہ خادم صاحب اور پنجاب کے چند اور اصحاب بھی تھے۔ کشمیر کے مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ ایک بھی مسلمان اس وفد میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ قریباً وفد کے ہر ممبر کے ڈیرے پر سی آئی ڈی کا کوئی نہ کوئی آدمی موجود رہتا تھا اس لیے فی الواقعہ کسی کو ان ممبروں سے ملنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ البتہ خادم صاحب ایک ایسے بزرگ تھے جو بے خوف ہو کر سب کے پاس آتے جاتے تھے۔

"ڈاکٹر مترا اس زمانہ میں وزیر تعلیم تھے۔ ڈیپوٹیشن نے اپنے تحریری مطالبات پیش کیے تو ڈاکٹر مترا نے ہز ہائنس کی طرف سے جو جواب دیا، وہ بڑا مایوس کن تھا۔ اس جواب میں بتایا گیا تھا کہ حیدر آباد میں، بھوپال میں اور دیگر ریاستوں میں لکھے پڑھے مسلمانوں کی کیا اوسط ہے، اس اوسط کے ساتھ یہاں کی اوسط کا مقابلہ کرو۔ اور بھی بہت سی دل شکن باتیں تھیں۔ اس موقع پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے پتھر مسجد کی واگذاری کا مطالبہ کیا تو جواب میں کہا گیا کہ عورت کی بنائی ہوئی مسجد ہے (نور جہاں بیگم کی) مسلمان یہاں مذہبی فریضہ ادا کرنا پسند نہیں کرتے۔ نیز یہاں دو زبردست فرقے دو میر واعظوں کے ہیں اور ہر ایک اس مسجد کے لینے کا مدعی ہے، ہم کس کے حوالے کریں اور کس کے نہ کریں۔

"صاحبزادہ صاحب لاہور واپس آکر مجھ سے اور سید محسن شاہ صاحب سے ملے اور تمام حالات سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ میں علی گڑھ جا کر ڈاکٹر مترا کی تحریر کا جواب الجواب، پمفلٹ کی صورت میں، لکھوں گا۔ چنانچہ وہ پمفلٹ چھپا اور ہزارہا کی تعداد میں مفت تقسیم ہوا۔

"صاحبزادہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ڈاکٹر مترا آپ کے اخبار "کشمیری" کی

شکایت کرتے تھے کہ بہت تیز لکھتے ہیں۔ مَیں نے کہا ان کے دفتر میں ان کا منہ لگا ایک کلرک مہیشر کول ہے، وہی ان کو سکھاتا پڑھاتا ہے ورنہ میری معتدل پالیسی کے سب مداح ہیں۔ پھر فرمایا تم بیگار پر سر دست لکھنا بند کر دو، ان کو اسی سے چڑ ہے۔ مَیں نے اس اخبار کا ریاست کے حکام اور عوام پر کافی اثر دیکھا ہے۔ اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ پالیسی حد سے زیادہ نرم کرنی پڑے۔

"راولپنڈی میں ایک مرتبہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا۔ مَیں نے صاحبزادہ صاحب سے پیر سید حسام الدین شاہ جاگیر دار و جنرل سیکرٹری انجمن اسلامیہ پونچھ کا تعارف کرایا اور مسلمانانِ پونچھ کی تعلیمی و سیاسی ہستیوں سے ان کو آگاہ کیا۔ اور پیر صاحب کو کانفرنس میں بولنے کے لیے وقت دلایا۔ پیر صاحب نے ایسا عظیم الشان مجمع، ایسے اکابرین قوم کا کب دیکھا تھا۔ (گھبرا گئے) جب بولنے لگے تو ان کے منہ سے پونچھ کے مردم کی بجائے پونچھ کے مُردم نکل گیا جس پر ایک قہقہہ سا مچ گیا۔ صاحبزادہ صاحب تو بڑے دُور اندیش اور زیرک تھے، انھوں نے فرمایا صاحبان! یہ ہنسنے کا نہیں بلکہ رونے کا مقام ہے۔ پونچھ کے مردم واقعی مُردم ہیں۔ وہ زندوں میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے حالات نہایت دردناک ہیں۔ وہ ریاست در ریاست اور شکنجہ در شکنجہ کی مثال ہیں۔ پھر مسلمانانِ پونچھ کے کچھ حالات بیان کیے اور جلسہ کا رُخ اصل واقعات کی طرف پلٹ دیا۔" [۵۱]

"مولانا حالی (خواجہ الطاف حسین) کو میں نے سب سے پہلے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں دیکھا۔ وہ اپنی نظم پڑھنے کو جب اُٹھے تو لاتعداد خلقت موجود تھی۔ چونکہ وہ جہیر الصوت نہ تھے اور اس زمانہ میں ابھی لاؤڈ سپیکر بھی ایجاد نہ ہوئے تھے، ان کی آواز سارے مجمع تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر محمد اقبال کو آپ کی نظم پڑھنے کے لیے دی گئی جنھوں نے نہایت خوش الحانی اور خوش اسلوبی

سے اس فرض کو ادا کیا اور نظم پڑھنے سے پہلے یہ رباعی فی البدیہہ کہی :

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
مَیں کشورِ شعر کا نبی ہُوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی [۵۲]

قبلہ خادم صاحب کی معیت میں، مَیں اِن سے علیحدہ بھی ملا۔ میرزا ارشد گورگانی جو شاہانِ مُغلیہ کی یادگار تھے اور فیروز پور میں عربی یا فارسی کے ہیڈ مدرس تھے، انجمن کے جلسہ کی رُوح رواں تھے۔ پڑھتے تھے اور عجب انداز سے پڑھتے تھے۔ بزم میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ ان کی نظم اور مولانا نذیر احمد کی تقریر کے دوران میں اکثر اہلِ علم اور اہلِ سُخن، ہندو اور سکھ آجایا کرتے تھے۔ آج (۲۱۔ جُون ۱۹۴۰ء) مسلمانوں کے مذہبی جلسوں اور ہندوؤں کے مذہبی جلسوں میں کسی مُسلمان یا ہندو کا شامل ہو جانا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ میرزا ارشد کی طبیعت میں بلا کی روانی ہوتی تھی۔ آمد کا حال ع

بادل سے چلے آتے ہیں مضمون مرے آگے

کے مطابق تھا۔ ایک مرتبہ انجمن میں سر سید احمد خاں کی برسی کا جلسہ تھا۔ میرزا ارشد کو بھی بلایا گیا تھا۔ وہ آئے اور نظم لے کر آئے، لیکن نظم گاڑی ہی میں رہ گئی۔ ان کا وقت نظم پڑھنے کا آیا تو نظم ندارد۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر میاں شاہدین (ہمایوں) نے جو بعد میں چیف کورٹ پنجاب کے چیف جج ہو گئے تھے، آپ کو اُوپر کی منزل میں علیحدہ بٹھا دیا اور آپ کا وقت کسی اور کو دے دیا گیا۔ آپ آدھ گھنٹے کے بعد تشریف لائے اور پچاس ساٹھ شعروں کی ایک نظم پڑھ گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ان دنوں

"پنجۂ فولاد" جاری تھا اور اخبار کا دفتر چنگڑ محلہ لنڈا بازار میں تھا۔ آزاد، بالکل نوعمر تھے اور اخبار "وکیل" امرتسر کے ایڈیٹر تھے اور اپنا بھی ایک ماہوار رسالہ "لسان الصدق" کے نام سے شائع کیا کرتے تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں انھوں نے اس نوعمری میں جب لیکچر دیا تو لوگ ان کی قابلیت و ذہانت اور ان کی قوتِ گویائی اور ان کی معلومات دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میرے دفتر میں مجھ سے ملنے آتے۔ "لسان الصدق" کا اشتہار بھی دیا جو مفت چھاپا گیا۔ رسالہ کو چلانے کے لیے مشورے بھی طلب کرتے رہے۔ اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ ان کی قابلیت شہرت کے پر لگا کر اُڑنے لگی۔ خلافت اور کانگریس کے اتحادی زمانہ (۱۹۱۹ء) میں اُن کی قوتِ بیانیہ اور حُریتِ صادقہ نے ایوانِ حکومت کے در و دیوار ہلا دیے۔ کئی دفعہ قید و بند کی مصیبتیں کاٹیں۔ "الہلال" کلکتہ سے جاری کیا جس نے ایک تہلکہ مچا دیا۔ قرآن شریف کا ترجمہ دو جلدوں میں کیا اور اس ڈھنگ سے تفسیر لکھی کہ نوجوان طبقہ اسے حرزِ جان بنا رہا ہے۔ کانگرسی وزارتوں کے زمانہ میں کسی کو وزیر بنانا اور خصوصاً کسی مسلمان کو کسی صوبہ کی وزارت کے لیے نامزد کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ گاندھی اور جواہر لال اور دوسرے اکابرین کانگریس پر ان کا بڑا اثر ہے۔ ۱۹۴۰ء کی نیشنل کانگریس کے صدر بھی آپ ہی منتخب کیے گئے تھے اور آپ کانگریس کی اکیاون سالہ عمر میں پہلے صدر تھے جنھوں نے اُردو میں اپنا خطبہ پڑھا تھا۔

"آغا حشر کاشمیری کا نام تو ان کے ڈراموں کی وجہ سے مدت سے گوش آشنا تھا لیکن ان سے سب سے پہلی ملاقات انجمن حمایت اسلام کے اس سالانہ جلسہ میں ہوئی جس میں انھوں نے "شکریۂ یورپ" کے عنوان سے ایک حیات افروز اور ولولہ انگیز نظم پڑھ کر اہل لاہور کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

یہ نظم جنگِ یورپ ۱۹۱۸ء کے بعد پڑھی گئی تھی۔

"آغا حشر شکل وصورت، ڈیل ڈول سے بھی کشمیری معلوم ہوتے تھے۔ ویسے بھی کشمیری الاصل تھے۔ ان کے بزرگ سری نگر سے بنارس بہ سلسلۂ تجارت آئے اور وہیں رہ گئے۔ ان کا خاندان مولوی انور شاہ شیخ الحدیث کاشمیری دیوبندی سے ملتا تھا جیسا کہ انھوں نے خود مجھے ایک ملاقات میں بتایا تھا۔ مولوی انور شاہ کا خاندان نرور محلہ سری نگر سے اطراف ملک میں پھیلا ہے۔ ایک شاخ ترگ پورہ علاقہ کمل کشمیر میں چلی گئی۔ وہاں سے پیر عبدالغفار شاہ مرحوم لاہور "تکیہ سادھواں" میں آ گئے۔ پیر محمد اشرف شاہ انہی کے فرزند ہیں جنھوں نے میانی صاحب کے قبرستان میں اپنے والد کا عالیشان مقبرہ بنوایا ہے۔ پیر عبداللہ شاہ زبدۃ الحکما، مولوی فاضل و خطیب مسجد قاضی خانہ بھی اسی خاندان سے ہیں۔ ایک شاخ لولاب کے موضع ورنو میں چلی گئی۔ مولوی انور شاہ ورنو (کشمیر) ہی کے رہنے والے تھے۔ ایک شاخ کرناہ کے علاقہ دراوہ میں آباد ہے۔ مولانا محمد سعید سیکرٹری نیشنل کانفرنس کشمیر و سابق ایڈیٹر "ہمدرد" سری نگر اور مولوی غلام مصطفےٰ مولوی فاضل ممبر پرجا سبھا کشمیر اسی شاخ سے ہیں۔

"آغا حشر نے کبھی اپنے خاندان کو سیادت سے منسوب کیا اور نہ مولانا انور شاہ نے کبھی سیادت کا دعویٰ کیا ہے، اور نہ کبھی اپنے آپ کو سید لکھا ہے۔ ایک شاخ نروری خاندان کی لوپچھ میں بھی آباد ہے۔ مولانا انور شاہ کے والد پیر عبداللہ شاہ اور ان کے بھائی پیر معظم شاہ نے میرے ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھا تھا کہ ہم سید نہیں ہیں۔ جو ہمیں سید کہتا اور لکھتا ہے، اس کا بار اسی پر ہے۔ ہمارے خاندان کا تعلق حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

"یہ تفصیل ذرا اس لیے لکھی ہے کہ مولانا انور شاہ کے حسب نسب اور ان

کے خاندان کی دیگر شاخوں کی اصلیت کے متعلق خود انہی کے خاندان میں بہت کچھ
اختلاف ہے۔ غرض، آغا حشر بڑے اخلاق و محبّت کے ساتھ مجھ سے ملے۔ وہ
بڑے لحیم و جسیم تھے اور مَیں ایک منحنی سا انسان۔ انھوں نے معانقہ میں دبا ہی لیا۔
فرمایا یو۔ پی میں بلکہ سارے ہندوستان میں، مَیں پہلا شخص ہُوں جو ایک کشمیری کی
حیثیت سے پبلک میں آیا ہُوں اور جس نے کشمیر اور کشمیریت کو عزت اور وقعت
کے ساتھ عالم آشنا کیا ہے۔ دوسرا شخص جس نے اپنے نام کے ساتھ کاشمیری کا لفظ
استعمال کیا ہے اور اس لفظ کی عزّت و عظمت کو ایک اخبار کی وساطت سے روشناس
کرایا، اور جو لوگ اپنی نافہمیوں کی وجہ سے اور اپنی اجتماعی حیثیت کی لاعلمی کے باعث
اس لفظ سے جان بچایا کرتے تھے، ان میں اس کی اہمیت کا احساس پیدا کر دیا، وہ
محمّد دین فوق کے نام سے اس وقت میرے سامنے ہے۔ تیسرا شخص جس نے آپ
کے اخبار میں اور دوسرے اخباروں میں اس لفظ کو اپنے نام کے ساتھ لکھنا شروع
کیا ہے، وہ ابوظفر کاشمیری ہے (یہ بھی فوق صاحب ہی کا قلمی نام تھا) اور اب تو
مَیں اکثر اخباروں میں فلاں کاشمیری اور فلاں کاشمیری کے نام دیکھ رہا ہُوں۔

"جب مَیں "تاریخ اقوامِ کشمیر" لکھ رہا تھا، آپ لاہور ہی میں مقیم تھے اور بیمار
رہتے تھے۔ مَیں اور مولانا محمّد علم الدین سالک پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اور مولانا
محمد عبداللہ قریشی بی اے ملازم ریلوے، آپ سے ملنے کو گئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔
یو پی اور بالخصوص بنارس، الہ آباد اور لکھنؤ اور صُوبہ بہار کے، پٹنہ اور باٹلی پور وغیرہ
کے حضرات کشامرہ کا ذکر کرتے رہے اور فرمایا ان علاقوں کا ایک دورہ کبھی میرے
ساتھ کر دتو معلوم ہو کہ یہ لوگ اپنے ملک سے بے ملک ہو کر جب غیر ملکوں میں آتے
تو کِس حیرت انگیز ترقی سے مقامی اقوام پر یہاں تک سبقت لے گئے کہ وزارتِ عظمیٰ
اور چیف کورٹوں کی ججیوں نے ان کے پاؤں چُومے۔

"افسوس! موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ ان کا مدفن لاہور ہی میں ہے۔ وہ ڈراماٹسٹ ہی نہ تھے بلکہ فنِ مناظرہ میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کا تعلق اور ان کا ذریعۂ معاش تھیٹریکل کمپنیوں اور بعد میں سینماؤں میں تھا۔ انھوں نے ایسے اچھوتے اور ایسے اچھے اور ایسے سبق آموز ڈرامے لکھے ہیں کہ ہندوستان کا شیکسپیئر ان کو کہا جاتا ہے۔ لیکن باوجود ان باتوں کے وہ نہ صرف اپنے مذہب سے بلکہ غیر مذاہب سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اکثر رسالوں نے "حشر نمبر" شائع کیے اور "حشر ڈے" پر ان کے کلام اور ان کے ڈراموں اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر تبصرے کیے گئے۔ وہ نہایت پختہ کلام شاعر تھے۔"[۵۴]

"مولوی عبدالحلیم شرر رسالہ "دلگداز" والوں سے ملا جن کے اسلامی اور تاریخی ناولوں کی سارے ہندوستان میں دھوم ہے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ میری اس التماس پر کہ باشندگانِ کشمیر کو خوابِ غفلت سے جگانے اور ان میں قومی و ملکی سپرٹ پیدا کرنے اور ان کی حمیت و شجاعت کو زندہ کرنے کے لیے بھی کوئی ناول لکھیے، آپ نے فرمایا مجھے ہر سال ایک ناول لکھنا ہوتا ہے۔ کشمیر کی تاریخ مجھے بھجوائیے اور گزشتہ زمانہ کا کوئی خاص واقعہ ہو تو اس کا بھی ذکر کیجیے گا۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے وہ میری کوتاہی و غفلت کی وجہ سے اپنے ارادے کو پورا نہ کر سکے۔

میرے اُستاد بھائی اور درس گاہ "پیسہ اخبار" کے میرے ہم مکتب سید بشارت علی جالب دہلوی ان دنوں لکھنؤ ہی میں اخبار "ہمدم" کے ایڈیٹر تھے جو تعلقہ دارانِ لکھنؤ کا ایک مشہور روزانہ اخبار تھا۔ انھوں نے رات کو دعوت کی اور لاہور کی باتوں کا دیر تک ذکر ہوتا رہا۔ میر جالب، اخباری معلومات اور ملکی حالات کا ایک خزینہ تھے اور ملک کے قابل اخبار نویسوں میں تھے۔ لاہور میں کئی اصحاب ان سے

مضامین کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ اخبار "ہمدم" سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنا ایک ذاتی اخبار "ہمت" کے نام سے بعد میں جاری کر رکھا تھا جو ان کی وفات کے بعد بھی ان کے فرزند عشرت علی شائع کرتے رہے، اور شاید اب بھی شائع ہوتا ہے۔ میر جالب کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا۔"[۵۵]

جن لوگوں کے ساتھ فوق صاحب کی خط و کتابت رہی، ان میں سے داغ، اقبال، حسن نظامی، اکبر الہ آبادی، احسن مارہروی، ظفر علی خان، نواب محسن الملک، شو نرائن شمیم، خوشی محمد ناظر، حکیم حبیب الرحمٰن خان اور کچھ دوسرے حضرات کے نام اہم ہیں۔ یہ خطوط "نقوش" کے مکاتیب نمبر میں موجود ہیں۔ فوق صاحب نے بہت سرگرم زندگی بسر کی۔ اپنی شخصیت کی ہمہ گیریت کی بدولت دوسروں کو بہت متاثر کیا، دوست داری اور وضعداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

اخباری جھمیلوں سے آزاد ہو کر فوق صاحب نے یکسوئی سے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ کئی کتابیں تکمیل کے مراحل میں تھیں، انھیں مکمل کر کے شائع کیا۔ بعض نئی کتابوں کی تحقیق و تلاش میں مصروف ہو گئے۔

وفات

۱۹۲۲ء سے فوق صاحب کو ایک عجیب مرض نے آ گھیرا۔ ان کو سردیوں میں کبھی کبھی پسینہ آنے لگتا تھا۔ یہ شکایت عام رہتی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں بھی جنوری اور فروری کے دو مہینے اسی تکلیف میں بسر ہوئے۔ یہاں تک کہ ۹ سے ۱۱ فروری تک کی تین راتیں سونا نصیب نہ ہو سکا۔ محض اس ڈر سے وہ لمحہ بھر نہ سو سکے کہ ذرا آنکھ لگ گئی تو پسینے سے بدن اور کپڑے تر بہ تر ہو جائیں گے۔ ۹ فروری رات کو بیماری نے اتنی شدت پکڑی کہ بہت ہی بے چینی رہی۔ یہ شعر انھی دنوں

میں لکھے:

تر پسینہ سے نہیں سینہ و حلقوم و جبیں!
عرق شرم گناہ نے کیا غرقاب مجھے
ابھی اے مرگِ مفاجات کسی بھیس میں آ
اب بھلا تیری جدائی کی کہاں تاب مجھے
کھینچ کے لے ہی گیا پنجۂ شاہینِ اجل
روکتے رہ گئے دنیا کے یہ اسباب مجھے
میں نے جو چشمہ کیا خشک زمیں سے جاری
آب ڈبو دینے کو ہے بن کے وہ سیلاب مجھے
بات کچھ ہو کہ نہ ہو اب وہ دبا لیتے ہیں
روز جو کہتے تھے آ کر کبھی آداب مجھے
میں بھی تو خوں کی دھاروں سے پلا ہوں آخر
کیا ڈراتا ہے تو اسے دیدۂ خوں ناب مجھے
بارہا دیکھ چکا پھر بھی تمنا ہے مجھے
ایک بار اور دکھا دے کوئی لولاب مجھے
مجھ کو اس عہد کے مسلم سے ہے یاس اے واعظ
کچھ سنا شوکت عہد بن خطاب مجھے
داغ کے یوں تو ہیں اے فوق ہزاروں شاگرد
ان میں استاد نظر آتے ہیں سیماب مجھے

۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں آپ تین ماہ کھانسی اور بخار میں مبتلا رہے۔ یوں انھیں کھانسی کی شکایت اکثر رہتی تھی۔ اس بات کا اظہار ۱۹۱۲ء میں بھی کیا تھا۔

"میں نحیف الجثہ ہوں اور کھانسی میں عموماً مبتلا رہتا ہوں"۔[56] اس عرصے میں آپ اڑھائی مہینے اپنے آبائی وطن کشمیر کی حسین وادیوں میں اپنی کھوئی ہوئی صحت دوبارہ تلاش کرتے رہے مگر ارمان پورا نہ ہوا۔ گلمرگ کے صحت افزا مقام پر پہنچ کر آپ کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی اور آپ یہ کہتے ہوئے واپس سری نگر آگئے:

صحت فزا مقام وہ گلمرگ ہے جہاں
گلبرگ بن کے خار بھی گلزار ہو گیا
بوڑھا یہاں جوان، جواں نوجوان ہے
پر میں یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیا

لاہور پہنچ کر ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جمعہ کے روز یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔[57]

مدھم سی روشنی تھی چراغ حیات میں
اے باد مرگ تو نے اسے بھی بجھا دیا

انھیں میانی کے قبرستان میں فتح شبیر روڈ پر ڈپٹی غلام حسین کی باغیچی میں دفن کیا گیا۔ کشمیر، پنجاب بلکہ سارے ہندوستان میں ان کا ماتم کیا گیا۔

"کشمیر میں تعلیمی ادارے ان کے سوگ میں بند رہے اور ہندوستان کے اہم اخبارات میں ان کی موت کی خبر سرخی بنی"۔[58]

ہفتہ وار "حمایت اسلام" لاہور نے اپنی ۲۰ ستمبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں لکھا:

"آپ برصغیر کی پرانی علمی و صحافتی محفلوں کے آخری چراغ تھے۔ آپ شاعری میں حضرت داغ دہلوی اور اخبار نویسی میں حاجی محبوب عالم مدیر "پیسہ اخبار" کے شاگرد تھے۔ آپ نے صبح طفلی سے شام پیری

تک گیسوئے اُردو کو سنوارنے میں حصّہ لیا۔ کامیاب اخبار نویسی کے علاوہ بے شمار کتابیں تصنیف کیں جو مقبول و محبوب ہیں اور آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی"۔ ۵۹

مولانا محمد علم الدین سالک پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اپنے ایک مضمون "یادگار فوق" میں فرماتے ہیں:

"کشمیر کا لکھا پڑھا طبقہ فوق صاحب کے پیغام سے روشناس ہو چکا ہے۔ وہ ان کی تصانیف سے اپنے دلوں کو گرمانے اور دماغوں کو منور کرنے کے لیے روشنی کی کرنیں پا رہا ہے، اور نہ صرف خود ان سے مستفید ہو رہا ہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو مستفیض کرنا چاہتا ہے۔ آنے والی نسلیں ان تصانیف سے فوق صاحب کی عظمت کا اندازہ لگائیں گی۔ یہ تصانیف ان کے لیے روشنی کا مینارہ ثابت ہوں گی اور بھولے بھٹکوں کو جادۂ مستقیم کی طرف آنے کی دعوت دیں گی۔ اس لیے ہر کشمیری کا فرض ہے کہ وہ ان تصانیف کو زیادہ سے زیادہ اشاعت دے تاکہ کشمیر کے اس زندہ جاوید مؤرخ کی کتابیں کشمیر کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں اور کوئی گھر ان سے خالی نہ رہے خوش قسمتی سے ان تصانیف کی اشاعت کا کام میرے محترم عزیز مولانا محمد عبداللہ صاحب قریشی نے اپنے ذمے لیا ہے۔ وہ اس کام کے لیے ہر طرح موزوں ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر فوق صاحب کا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ فوق صاحب کے جگری دوست ہونے کی وجہ سے وہ ان کے کام کو اسی طرح جاری رکھ سکیں گے جس طرح ان کی حین حیات میں تھا۔ وہ ان ادھورے مسوّدات کی تکمیل بھی کریں گے، اور چونکہ وہ

بڑے صاحب عزم و ہمت ہیں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ اس مشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔" [۶۱]

بہت سے شاعروں نے قطعات تاریخ لکھے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

مولانا سیماب اکبر آبادی:

کرد رحلت محمد الدین فوق — بُود شاگرد داغ و پاک ضمیر
شاعر نکتہ داں مدیر و ادیب — خوش بیاں، خوش مزاج، خوش تحریر
چاردہ از مہ ستمبر رفت — روز جمعہ سُوئے ملک کبیر
گفت تاریخ رحلتش سیماب
(انتزاع مؤرخ کشمیر) ۱۹۴۵ء

نوائے درد از حضرت نشتر جالندھری:

چوں رسیدش ایں خبر شد نوحہ گر — حلقہ ارباب علم و فکر و ذوق
از دلِ سوزاں بر آمد آہ گرم — رفت در جنت محمد دین فوق

۱۹۴۵ء

مفتی ضیاء الدین ضیا۔ پونچھی مقیم جامع مسجد وزیر خاں لاہور:

بہ معلومات سیرت بے بدل بُود
جناب فوق حقا بے مثل بُود
پئے افراد ملت اے دریغا
وجودش مخزن نیکو عمل بُود
ز چندیں کز نوائب ہائے دُنیا
بہ فرش ابتلا رنج و علل بُود

محمد دین بر دین محمد
بر ینش تا دمِ آخر اجل بود
ز دُنیا سُوئے عقبیٰ کرد رحلت
پئے ملت وداعش پُر زلل بُود
ضیاءؔ ملہم بگفتا سال وصلش
بگو تاریخ دانے بے بدل بُود

۱۳۶۴ھ

شہرہ غم آہ در دیہات وشہر
روئی بہ نمودہ بہر سو در دھر
کز وفات آہ محمد الدین فوقؔ
بُودہ بر چرخ درایت ہمچو مہر
سال وصلش گُفت رضواں اے ضیاءؔ
فوق کشمیری بہ شد ناگہ ز دھر

۱۳۶۴ھ

مولانا الحاج حامد حسن قادری :

تاریخ نامہ رحلت

۱۹۴۵ء

مرقد علامہ مُنشی محمد الدین صاحب فوقؔ

آہ مُنشی محمد الدین فوقؔ | بر جگر ہا نشاند داغ وفات
بُود صاحب نظر ادیب شہیر | شاعر و بذلہ سنج وخوش اوقات

درفنونِ صحافت و تاریخ — فکر او ہم کمال را مرآت
دلِ پنجاب و رُوحِ کشمیر است — مضطرب از وفات غم آیات
قادری سال رحلت مرحوم — گفتہ ام بادفیض یاب نجات

۱۳۶۴ھ

قُلت تاریخ فوتہٖ ایضاً
مطمئنُ الخلودِ فی جنات

۱۳۶۴ھ

آنکہ شد عشق محمد دین و ہم ایمان او
فوق بُود و فائقان دھر را سر آمدہ
چوں بہ جنت رفت گفتا قادری سالِ وفات
فخرِ اہلِ دانشِ پنجاب و کشمیر آمدہ

۱۹۴۵ء

حضرت انصاف قادری:

یکایک فوق کشمیری اٹھے دُنیائے فانی سے
بھلا پھر کیوں نہ ہو رنج وصال فوق کشمیری
تمھیں انصاف کیا تاریخ رحلت کی ضرورت ہے
رقم کر دو، ہوا آج انتقالِ فوقِ کشمیری

۱۳۶۴ھ

منشی محمد الدین فوق کے تین فرزند تھے۔ بڑے صاحبزادے کا نام ظفر الحق، منجھلے کا ظفر احمد اور سب سے چھوٹے کا ظفر الاحسن تھا۔ یہ تینوں ظفر برادرس کے نام سے مشہور تھے۔ فوق صاحب خود بھی ان کی مناسبت سے ابوظفر کاشمیری

کہلاتے اور اسی قلمی نام سے مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ آپ کی بیٹی کا نام بھی ظفر سلیمہ ہے۔ اب تک ان کے خاندان میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے، اس کے نام کے ساتھ ظفر ضرور ہوتا ہے۔ فوق صاحب نے اپنے اشاعتی ادارے کا نام بھی ظفر برادرس رکھا تھا۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء کے آخری دنوں میں فوق صاحب بھوپال گئے تھے۔ وہاں کئی علم دوست احباب سے ملاقات بھی ہوئی جن میں مولانا محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی، ملا رموزی (موجد گلابی اردو) جناب فہمی، جناب ہاتف، مولانا توحیدی اور منشی صدرالدین سرشار کسمنڈوی قابل ذکر ہیں۔ اور بزم قمر کے مشاعرے میں بھی شرکت کی مگر ۵ر نومبر ۱۹۲۲ء کو اطلاع ملی کہ ان کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، سخت بیمار ہے۔ اس سے غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ۸ر نومبر کی شام کو ظفر الاحسن کے وفات پا جانے کا تار ملا۔ آنسو بہاتے بذریعہ گاڑی بلب گڑھ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو کچھ اشعار کہے۔ جن میں سے کچھ یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

اس کم سنی میں سوئے عدم جانے کا یہ شوق
تنہا بھی ہو اور رواں کوئی ساجن تو نہیں ہے

دن بھر میں کتنی مرتبہ وہ روٹھنا تیرا
جاتے ہوئے بھی کیا کوئی ان بن تو نہیں ہے

کچھ لڑکے چلے آتے ہیں اسکول سے پڑھ کر
دیکھو کہیں ان میں مرا احسن تو نہیں ہے [۶۲]

علامہ اقبال نے تعزیتی خط لکھا:

ڈیئر فوق صاحب! السلام علیکم۔

"آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ کے مصائب کا حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ مولوی عبداللہ غزنوی

حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کیے جانے
کی خبر ملی۔ ایک منٹ تامّل کیا پھر طلبا کو مخاطب کر کے کہا برضائے
او راضی ہستیم۔ بیائید کہ کار خود بکنیم۔ یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف
ہو گئے۔ مخلص مُسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا
ذریعہ بنا لیتا ہے۔" [٦٣]

لاہور۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۲ء

محمد اقبال

فوق کی ایک مختصر تحریر "سفر نامہ بھوپال و دہلی" (غیر مطبوعہ) ملی ہے
جس میں یہ واقعہ بھی درج ہے۔

شخصیت

فوق صاحب مناسب قد و قامت، سُرخ و سفید رنگت، بھرے بھرے
اور پُرکشش چہرے مہرے کے مالک تھے۔ داڑھی نہ بڑی تھی نہ چھوٹی تھی۔
خوبصورت قطع و برید سے اچھی لگتی تھی جس میں سفید بال کثرت سے نکل آئے
تھے۔ لباس صاف ستھرا اور سادہ ہوتا تھا۔ قیمتی کپڑے پہننے کا شوق نہ تھا۔ ترکی
ٹوپی سر پر پہنتے تھے۔ گھر سے باہر آتے تو بند گلے کا کوٹ استعمال کرتے تھے۔
اپنے مکان کی اُوپر کی منزل پر اپنے کمرے کو لائبریری میں تبدیل کر دیا تھا۔
ان کے پاس ہر موضوع پر بے شمار کتابیں تھیں۔ مطالعے کا شوق جنون کی حد تک
تھا۔ لاہور کے صحافیوں میں سے "پیسہ اخبار" کے مالک و مدیر مولوی محبوب عالم
اور مدیر "وطن" مولوی محمد انشاء اللہ کے علاوہ آپ کی ذاتی لائبریری ایک بڑی

لائبریری تھی جہاں ہر روز کتابوں میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

فوق صاحب کا طرزِ زندگی بہت سیدھا سادہ اور بے تکلفانہ تھا۔ وہ ایک مختلف انداز سے زندگی بسر کرنے کا ذوق رکھتے تھے۔ ملنے جلنے میں بہت متواضع اور مہربان تھے۔ ان کے رہن سہن میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ ان کی زندگی میں اطمینان اور وقار کی جھلک نمایاں تھی۔ بالعموم صبح سویرے جاگ جاتے تھے اور بلاناغہ سیر کے لیے نکل جاتے تھے۔ اس معمول میں بہت کم تبدیلی آئی۔ ان کے سیر کے ساتھیوں میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی اور میر عبداللہ مالک کریمی پریس شامل تھے۔ یہ تقریباً روز کے ساتھی تھے۔ آپ کو کرکٹ کے کھیل سے بھی دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں یہ شوق ایک منفرد رنگ کی عادت شمار کیا جا سکتا ہے۔ مشعل سلطانپوری کا بیان ہے کہ:

"آپ سالن میں تیل کی بجائے گھی استعمال کرتے تھے کیونکہ تیل سے گلے میں تکلیف ہو جاتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دعوت میں یہ پہچان کروانا ہو کہ کھانے میں تیل استعمال کیا گیا ہے یا گھی تو مجھے اپنے ساتھ لے لو۔" [۶۴]

واضح رہے کہ کشمیر میں بالعموم کھانوں میں تیل ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کے لیے خاص وقت مقرر نہیں تھا۔ جب اور جہاں موقع ملتا، مطالعہ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

"آپ کا حافظہ بہت تیز تھا۔ جو شعر ایک بار سن لیتے، یاد ہو جاتا تھا۔" [۶۵]

اپنے ذاتی کمرے کے علاوہ بھی گھر میں کہیں بیٹھ جایا کرتے۔ میز کرسی، چارپائی یا فرش پر دری وغیرہ ڈال کر بھی بیٹھ جاتے۔ البتہ ایک بات اہم ہے کہ جب کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ رہے ہوتے تو اپنی دلچسپی کے مضامین و موضوعات پر نشان لگا دیتے۔

جو چیز ان کے کام کی ہوتی، اس کے لیے ان کا ذہن بہت مستعد تھا۔ انھوں نے الگ الگ لفافے بنا رکھے تھے جن میں الگ الگ موضوعات کے تراشے اور حوالے اکٹھے کرتے جاتے تھے۔ پھر جب کوئی کتاب تحریر کرتے تو ان تراشوں اور حوالوں کی وجہ سے انھیں کوئی دِقت نہیں ہوتی تھی اور جس کام کے لیے مہینوں کی ضرورت ہوتی تھی، وہ دِنوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ آپ بلاشبہ بلا کے محنتی تھے۔

گھر والوں سے ان کا رویّہ بہت شفقت والا تھا۔ جب تک پہلی بیوی زندہ رہی، انھوں نے شادی نہیں کی۔ بعد میں دوسری شادی کی۔ اس کے مرنے کے بعد تیسری شادی کی۔ تیسری بیوی سے اولاد نہیں تھی۔ سوتیلی والدہ سے بچّوں کا جھگڑا ایک فطری بات ہے لیکن فوق صاحب نے کبھی ان چھوٹے موٹے معاملوں میں مداخلت نہیں کی۔ کبھی غصّہ نہ کیا۔ ہر کسی کے ساتھ منصفانہ اور مشفقانہ برتاؤ کیا۔ آپ کے قریبی ساتھی عبداللہؐ قریشی صاحب اپنے مضمون "منشی محمدالدین فوق" میں لکھتے ہیں:

"فوق صاحب ہنگامہ خیزیوں سے الگ، گوشۂ عافیت میں رہ کر خاموشی سے کام کرنے کے علاوہ خلوص و محبت، استقلال و ہمت، شوخی و ظرافت، جذبۂ ایثار اور ذوقِ خدمت سے سرشار تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، خوش اخلاقی، خوش مزاجی اور خوش مذاقی کی وجہ سے ان کے پاس بیٹھنے اُٹھنے میں خاص لُطف حاصل ہوتا تھا"

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں اِک انجمن تھے

فوق صاحب اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ انھوں نے تخریبی کاموں میں الجھنے کو کبھی پسند نہ کیا۔ اختلاف عقائد کی بنا پر

کسی فرقے کو بُرا بھلا نہ کہا۔ تمام عمر تعمیری سکیموں کو چلانے میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو ثالث بالخیر ثابت کیا۔" [۶۶]

رسالہ "الناظر" لکھنؤ کے مدیر ظفر الملک ۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"میں آپ کی ذات کو متمنات میں سمجھتا ہوں اور متمنی ہوں کہ جلد لاہور حاضر ہونے کا موقع ملے تو خدمت والا میں حاضری کا شرف حاصل کرسکوں۔" [۶۷]

سیر و سیاحت

اِنسان کا فطری ذوقِ تجسس اسے ہمیشہ سیر و سیاحت پر مائل کرتا رہا ہے اور اس کی سماجی ضروریات بھی اسے دوسرے دیاروں کی کشش میں مبتلا رکھتی ہیں۔ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست کے مقولے اور قُل سِیْرُوْا فِی الْاَرْض کے حکم سے مُسلمانوں میں سیر و سیاحت کا ذوق پیدا ہُوا۔ انھوں نے اپنی سوچ اور قوتِ مشاہدہ کے اظہار کے لیے رودادِ سفر کے طور پر سفرنامے بھی اپنی یادگار چھوڑے جو آج ہمارے ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"مصنف کو مشاہدات کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ سفرنامے میں سیاح کا ذہن غیر متعصب اور صاف ہونا ضروری ہے۔ دراصل سفرنامہ، سفر کے سچے واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں تخیل کا عنصر صرف اس حد تک جگہ پا سکتا ہے کہ حقیقی واقعات مسخ نہ

ہوں"۔ ۶۸

فوق صاحب نے بے شمار سفر کیے اور تین سفرنامے لکھے۔ "کلام فوق" اور "نغمۂ و گلزار" کی نظموں سے پہلے بھی ان سفروں کی روداد مل جاتی ہے۔ وہ جہاں گئے، وہاں کے دلکش قدرتی مناظر کا حال بیان کیا جن شخصیات سے ملے، ان کا ذکر کیا اور جن واقعات سے سابقہ پڑا، وہ نہایت مختصر انداز میں بیان کر دیے۔ چونکہ وہ تاریخ اور ادب و صحافت کے آدمی تھے، اس لیے ان کے بیانات سے بھی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے اور ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔

ان کی سیاحت کا آغاز سرمائی مقامات اضلاع کانگڑہ، وسط ہند اور شملہ سے ہوا، جہاں دور تک لہراتے ہوئے دھان کے شاداب کھیت، گھنے درخت، قدرتی چشمے جو پتھروں پر بہتے ہوئے زمزمہ خوانی کرتے یا نالۂ فراق کی درد بھری کہانی سناتے اور میدانوں کو سیراب کرتے چلے جاتے تھے۔ دریا کے پانی کا لہراتے ہوئے بہنا اور بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرانا اور ایک خوفناک آواز پیدا کرنا، وہ حیرت انگیز منظر پیش کرتا تھا جو زخم کھائے ہوئے دل کے لیے تیر و نشتر کا کام دیتا تھا۔ فوق صاحب اپنا تاثر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ وہ مقامات ہیں جہاں معمولی گنوار بھی اپنی دیہاتی لے میں مست و مسرور نظر آتا ہے۔ پھر ایک ایسا شخص جو تک بندی کرنا بھی جانتا ہو، دل درد مند بھی رکھتا ہو، ایسے پُر فضا اور دلفریب مقامات پر جا کر کس طرح خاموش رہ سکتا ہے۔ گو "مرادوں کی راتیں" نہ تھیں، لیکن جوانی کے دن ضرور تھے اس لیے اکثر مقامات کی سیاحت پا پیادہ کی۔" ۶۹

فوق صاحب نے راجپوتانہ کا سفر صرف ایک دفعہ کیا۔ لیکن وسط ہند میں بارہا مرتبہ گئے۔ یہاں عموماً برسات کے دنوں میں جاتے تھے۔ چونکہ بندھیاچل پہاڑ کے

اکثر سلسلے وسط ہند میں واقع ہیں، اس لیے ان گرم پہاڑوں سے برسات میں قدرتی چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے جب پہلی دفعہ کشمیر گئے تو پھر ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو گئے۔ انھوں نے سیاحت کشمیر کا تاثر اس طرح بیان کیا ہے۔

"دُنیا کا سب سے اچھّا اور منتخب حصّہ ہمالیہ ہے اور ہمالیہ میں کشمیر ایک ایسی دلفریب اور سرسبز و شاداب وادی ہے۔ جو ۸۰ میل لمبی اور ۴۰ میل چوڑی ہونے کی وجہ سے دُنیا میں لاثانی سمجھی جاتی ہے ع

پہاڑوں میں یہ میدان وسیع اَللہ کی قدرت

کشمیر میں ولی، بزرگ، مہاتما، خدا پرست، مصوّر، صناع اور شاعر اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ کشمیر کی تاریخیں ان کے حالات سے بھری پڑی ہیں۔ جو یہاں آیا، وہ ع

"کرشمہ دامن دِل می کشد کہ جا اینجا ست"

ہی کہتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے ہرے بھرے کھیت آنکھوں کو تراوت بخشتے ہیں۔ قدرت کی گلکاریاں ہر پھول اور ہر کلی کے رنگ میں دماغ کو راحت پہنچاتی ہیں۔ سمندر جیسی بڑی بڑی لہروں والی جھیل وُلر عجیب ہولناک سین پیش کرتی ہے۔ دریائے جہلم، انت ناگ اور ویری ناگ کے چشموں سے نکل کر وُلر میں داخل ہوتا ہے تو یہاں سے ایک نیا جنم لے کر اور نہا دھو کر باہر نکلتا ہے اور بارہ مولا کے قریب خانپورہ کے تنگ درے کے ذریعے ڈھلواں پہاڑ کو کھودتا، کریدتا اور اسی خوشی و مسرت میں شور مچاتا پنجاب کو نکل جاتا ہے۔ جب کشمیر کے سفر اور قیام میں کسی شاعر اور مؤرخ اور مصنف

کو قدرت کاملہ کے یہ دلفریب منظر، ظہورِ شانِ ربوبیت کے یہ رُوح پرور نظارے متاثر کیے بغیر نہ رہے تو بندۂ ناچیز (فوق) جو خاک پائے اہلِ ذوق بھی ہے، خطۂ کشمیر سے نسبتِ توطن بھی رکھتا ہے، آخر پہلو میں پتھر تو نہیں رکھتا تھا۔ ع

دِل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں"[۲۵]

فوق صاحب نے ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک (یعنی اپنی وفات تک) کئی سفر کیے۔ "کلامِ فوق" اور "نغمہ و گلزار" میں بعض نظمیں ضرور مل جاتی ہیں جن سے ان مقامات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ڈھاکے کا سفر ایسا ہے جس کے حالات انھوں نے تفصیل سے لکھے اور وہ رسالہ 'طریقت' اور 'اخبارِ کشمیری' میں قسط وار شائع ہوتے۔ اِن کو جمع کیا جائے تو ایک سفر نامہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان کی ایک کتاب "سفر نامہ کشمیر" ہے جو ایک مربُوط اور مؤثر سفر نامہ ہے۔ پھر فوق صاحب نے رہنمائے کشمیر شائع کی جو ذرا مختلف کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعے کشمیر کا پُورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر فوق کے نام ایک خط میں علامہ اقبال نے لکھا ہے:

"رہنمائے کشمیر" جو حال ہی میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ طرزِ بیان بھی دلکش ہے۔ افسوس ہے کہ آج تک میں نے کشمیر کی سیر نہیں کی۔ لیکن امسال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچے"[۲۶]

ایک سال بعد ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں اقبال نے کشمیر کی سیر کی۔ کشمیر کے مناظر اور وہاں کے خستہ حال لوگوں سے متاثر ہو کر نظمیں کہیں جو "پیامِ مشرق" میں موجود ہیں۔[۲۷]

عبداللہ قریشی صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا کہ فوق صاحب جب کبھی موج میں آتے تھے یا ایسا ذکر شروع ہو جاتا تھا تو پرانے واقعات اس طرح دہراتے تھے کہ لطف آ جاتا تھا۔ "سرگزشت فوق" میں چند سیاحتوں کے مختصر حالات بھی ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں۔ ان سیاحتوں میں فوق صاحب نے بے شمار مشاہیر ادب سے ملاقاتیں کیں اور چند والیان ریاست سے بھی ملے جن میں بگھیل کھنڈ کے راجہ رگھبیر سنگھ والی میہر، مہاراجہ ریواں، مہاراجہ گڑھ، دیوان ریاست ناگور اور ولی عہد ریاست گرولی، راجگان ریاست سکیت و منڈی، پونچھ کے راجہ بلدیو سنگھ اور راجہ سکھ دیو سنگھ، میجر رام پرشاد دوبے، ریونیو منسٹر کشمیر، مہاراجہ پرتاپ سنگھ والی کشمیر، سر راجہ ہری سنگھ کمانڈر ان چیف کشمیر وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اب نہ وہ ریاستیں باقی ہیں نہ والیان ریاست مگر فوق کی وہ باتیں زندہ ہیں۔ ہفت روزہ "انصاف" پنڈی کے مدیر میر عبدالعزیز اپنے مضمون "فوق" میں لکھتے ہیں:

"Fauq Travelled in most of parts of the valley on foot and used to go to Kashmir via Kohata when the road was not motorable and one took four days to reach Srinagar by EKKA"

سے

فوق دتیا، سمتھ، ناگور، میہر اور بندھیل کھنڈ کی سب سے بڑی ریاست ریواں ہی پہنچے۔ اس سفر میں ہندوستان کے اکثر اہل علم اور شعراء حضرات سے شناسائی ہو گئی۔

فوق ریاست ستنا کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس ریاست میں، میں نے دیکھا کہ امیر سے امیر آدمی بھی کھدر پوش نظر آتا تھا۔ اور تو اور لیمپ اور مٹی کے تیل کی شکل بھی وہاں نظر نہ آئی۔

کسی بدیشی ملک اور کسی بدیشی مال کی تجارت کا میہر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ محلات میں اہل کاروں کے ہاں پرانی وضع کے چراغ جلا کرتے تھے یا کہیں کہیں موم بتیاں نظر آتی تھیں۔

ریاست کے تمام دفاتر اردو زبان میں تھے۔ راجہ صاحب خود فصیح اُردو بولتے تھے۔ اور ان کی لائبریری میں سنسکرت، ہندی، انگریزی عربی اور فارسی زبان کی ہر قسم کی کتابوں کے علاوہ اُردو زبان کی بھی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ اس زمانے میں بندھیل کھنڈ اور بگھیل کھنڈ کی جن ریاستوں میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا، سب کے دفاتر اُردو زبان میں تھے بلکہ اُردو اخبار سرکاری طور پر خریدے جایا کرتے تھے۔ دتیا، سمتھر، ناگود، میہر، بساول، کوٹھی یہاں تک کہ ریواں میں بھی، جو سب سے بڑی ریاست اس علاقے میں ہے، اردو ہی کا رواج تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد سب سے پہلے ریاست ریواں میں موجودہ مہاراجہ سر یمان صاحب بہادر کے والد کے زمانے میں ناگری اور ہندی کے حامیوں نے اُردو کے گلے پر چھری پھیری۔ اور تمام دفاتر ہندی میں کرا دیے"۔ [۴۷]

حوالہ جات (پہلا باب)

۱۔ فوق، "سرگزشت فوق" (غیر مطبوعہ)، ص۔ ۲، ۳

۲۔ "نغمہ و گلزار"، طبع اول، ص۔ ۵۰، ۹۴

۳۔ فوق، "تاریخ اقوام کشمیر" جلد دوم، لاہور: ظفر برادرز، طبع اول ۱۹۳۴ء

۴۔ ایضاً، ص۔ ۳۸۲ صفحہ ۳۸۰۔

۵۔ ایضاً، ص۔ ۳۸۶

۶۔ "تاریخ اقوام کشمیر" جلد دوم، ص۔ ۴۱۲۔

۷۔ "تاریخ اقوام کشمیر" جلد دوم، ص ۳۹۵۔ ۴۰۵

۸۔ (ا) "تاریخ اقوام کشمیر" جلد دوم، ص۔ ۳۸۹۔

(ب) "سرگزشت فوق" (قلمی) ص: ۷۔

(پ) "اردو دائرہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کراسہ ۷، جلد ۱۹ کے صفحات ۴۲۰-۴۲۱۔

لاہور : پنجاب یونیورسٹی، طبع اوّل، ۱۹۸۶ء

(ج) "اردو انسائیکلو پیڈیا" (مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید۔ سید سبط حسن، احمد ندیم قاسمی۔

لاہور : فیروز سنز لمیٹڈ، طبع اوّل ۱۹۶۲ء، ص : ۱۱۶۵۔

(د) فوق، "اخبار نویسوں کے حالات"، لاہور : رفاہ عامہ پریس، طبع اوّل ۱۹۱۲ء،

ص : ۵۳

(ز) "اسلامی انسائیکلو پیڈیا" (مرتبہ قاسم محمود) کراچی : بک فاؤنڈیشن، طبع اوّل

۱۹۸۴ء، ص : ۱۲۰۳

۹؎ محمد دین کلیم قادری : "مدینۃ الاولیا" لاہور : اسلامک بک فاؤنڈیشن طبع اوّل

۱۹۶۹ء، ص : ۶۹۔

۱۰؎ فوق "کلام فوق" لاہور : ظفر برادرس، طبع دوم ۱۹۳۳ء، ص : ۶۔

۱۱؎ "اخبار نویسوں کے حالات"، ص : ۵۳

۱۲؎ "سرگزشت فوق" (قلمی)، صفحات : ۸۔۹۔

۱۳؎ "سرگزشت فوق" (قلمی)، صفحات : ۱۰۔۱۱ "نقوش" شخصیات نمبر ۲،

لاہور : ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۶ء، ص : ۱۰۴۱۔

۱۴؎ حبیب کیفوی، "کشمیر میں اردو" لاہور : مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء، ص : ۴۱۔

۱۵؎ محمد عبداللہ قریشی، مجلہ "صحیفہ" لاہور ماہ اپریل ۱۹۸۲ء، ص : ۲۳

۱۶؎ محمد عبداللہ قریشی : "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" لاہور : بزم اقبال، طبع اوّل،

۱۹۸۲ء۔ ص : ۶۷

۱۷؎ حکیم احمد شجاع، "خوں بہا" لاہور : فیروز سنز، ۱۹۵۱ء، ص : ۱۹۷۔

۱۸؎ "کلام فوق"، طبع دوم۔ ص : ۲۲، ۲۳۔

۱۹؎ "شور محشر"، لاہور، دسمبر ۱۸۹۶ء، عبداللہ قریشی، مرتب "باقیات اقبال"

لاہور: آئینہ ادب، طبع اول، ۱۹۸۲ء - ص: ۳۸۳

۲۰۔ "کلامِ فوق" طبع دوم، ص: ۱۰۔

۲۱۔ ایضاً۔ ص: ۳

۲۲۔ "کلامِ فوق"، لاہور: ایک راجپوت پرنٹنگ ورکس، طبع اول ۱۹۰۹ء، ص: ۲۲۔

۲۳۔ "اخبار نویسوں کے حالات" (ماخوذ)

۲۴۔ عبداللہ قریشی صاحب کے پاس خط محفوظ ہے۔

۲۵، ۲۶۔ بشیر احمد ڈار، "انوارِ اقبال" لاہور: اقبال اکادمی، طبع دوم ۱۹۷۷ء، ص: ۵۳، ۵۴۔

۲۷، ۲۸۔ "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، صفحات: ۲۴۵، ۲۴۶۔

۲۹۔ "سرگزشت فوق"، قلمی، ص۔ ۱۳۰۔

۳۰۔ "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۳۲

۳۱۔ جاوید اقبال، "زندہ رود" جلد اول۔ طبع اول ۱۹۷۹ء، لاہور: غلام علی اینڈ پبلشرز۔ ص: الف۔

۳۲۔ اقبال کے بارے میں پہلی مطبوعہ مختصر تعارفی تحریر، ۱۹۰۱ء۔

۳۳۔ "سرگزشت فوق" (قلمی) صفحہ ۱۳۲۔

۳۴۔ بشیر احمد ڈار، "انوارِ اقبال" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول مارچ ۶۷ ۱۹ء، صفحہ: ۵۹۔

۳۵۔ "انوارِ اقبال"، طبع اول، صفحہ۔ ۶۲۔

۳۶۔ "تذکارِ اقبال" مرتبہ عبداللہ قریشی، لاہور: بزم اقبال، طبع اول ۱۹۸۸ء

۳۷۔ "باقیاتِ اقبال" طبع اول۔ ص: ۷۲۔

۳۸۔ سہ ماہی "اقبال" لاہور: اقبال نمبر، اپریل۔ جولائی ۷۷ ۱۹ء

۳۹۔ عتیق صدیقی: "اقبال، جادوگر ہندی نژاد" نئی دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ، طبع اول،

اگست ۱۹۸۰ء، صفحہ: ۷-

۴۰؎ سہ ماہی "اقبال ریویو" لاہور: جنوری ۱۹۸۴ء-

۴۱؎ سہ ماہی "اقبال" لاہور: اقبال نمبر، اپریل-جولائی ۱۹۷۷ء

۴۲؎ "انوار اقبال"، ص: ۶۳-

۴۳؎ مولوی احمد دین: "اقبال" (مرتبہ مشفق خواجہ) کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، سال طباعت، ۱۹۷۹ء

۴۴؎ "اقبال" از مولوی احمد دین، (مرتبہ مشفق خواجہ) ص: ۲۳

۴۵؎ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، "اقبال کی ابتدائی زندگی" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول ۱۹۸۶ء باب اول، ص: ۱۹

۴۶؎ کلیم اختر: "اقبال اور مجدد الکشاہرہ"، روزنامہ "امروز" لاہور: ۹ر نومبر ۱۹۸۵ء

۴۷؎ محمد عبداللہ قریشی: "اقبال اور فوق"، "مجلہ اقبال" لاہور: اپریل-۱۹۶۰ء

۴۸؎ عبدالرحمان طارق: "جہان اقبال" لاہور: ملک دین محمد اینڈ سنز طبع اول، اپریل ۱۹۴۷ء ص: ۵۸۹-

۴۹؎ "زمانہ" کانپور-فروری ۱۹۱۰ء- ص: ۱۱۱-

۵۰؎ "سرگزشت فوق" (قلمی) ص: ۱۳۸-

۵۱؎ "سرگزشت فوق" (قلمی) صفحات: ۱۳۸، ۱۳۹-

۵۲؎،۵۳؎ محمد عبداللہ قریشی، "معاصرین اقبال کی نظر میں" لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۷۷ء- ص: ۸۶-

۵۴؎ "سرگزشت فوق" (قلمی) صفحات: ۱۵۵-۱۵۶-

۵۵؎ "سرگزشت فوق"، صفحات: ۱۱۶-۱۱۷-

۵۶؎ "اخبار نویسوں کے حالات"، ص: ۵۵-

۵۷؎ محمد عبداللہ قریشی: "شاعر کشمیر"، لاہور: ظفر برادرز، سن ندارد، ص: ۲۶۔

۵۸؎ مشعل سلطان پوری: "محمد الدین فوق کے مختصر حالات زندگی"، "شیرازہ سری نگر فوق نمبر، ص: ۶۲۔

۵۹؎ "ہفتہ وار حمایت اسلام" لاہور۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۵ء۔

۶۰؎ روزنامہ "خدمت"۔ سری نگر کشمیر۔ ۴ نومبر ۱۹۴۵ء۔

۶۱؎ تمام قطعات تاریخ "شاعر کشمیر" سے لیے گئے ہیں۔

۶۲؎ "کلام فوق"، طبع دوم، صفحات: ۱۹۶۔ ۱۹۷۔

۶۳؎ "انوار اقبال"، طبع دوم۔ ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۷۔

۶۴؎ مشعل سلطان پوری، "شیرازہ" فوق نمبر، سری نگر: ص: ۵۸۔

۶۵؎ "اردو انسائیکلو پیڈیا"، مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید۔ احمد ندیم قاسمی، ص: ۱۱۶۵۔

۶۶؎ "نقوش شخصیات نمبر"، ص: ۱۴۹۴

۶۷؎ "نقوش مکاتیب نمبر"، ص: ۴۳۲۔

۶۸؎ شبلی نعمانی، دیباچہ "سفر نامہ روم وشام"۔ دہلی: قومی پریس، ۱۸۹۲ء۔

۶۹؎ "کلام فوق"، طبع دوم، صفحات: ۵۲۔۵۳۔

۷۰؎ "کلام فوق"، طبع دوم، صفحات: ۸۲۔ ۸۳۔

۷۱؎ "انوار اقبال"، طبع دوم، ص: ۶۵۔

۷۲؎ اس سفر کی مکمل روداد مولانا عبداللہ قریشی کے مضمون "اقبال اور فوق" مطبوعہ سہ ماہی اقبال، اکتوبر ۱۹۷۶ء میں موجود ہے۔

۷۳؎ Pakistan Times Lahore, Sep., 20 1978.

۷۴؎ سرگزشت فوق۔ صفحہ: ۴۴

فوق

مورّخ کشمیر و لاہور اور سوانح نگار

باب ۲

فوق ــــ مؤرّخِ کشمیر و لاہور اور سوانح نگار

بحیثیت مؤرخ، سوانح نگار اور تذکرہ نگار جب بھی منشی محمد دین فوق کا ذکر آئے تو ان کے مؤرخ ہونے اور بالخصوص مؤرخ کشمیر ہونے کی حیثیت نمایاں طور پر ذہن میں ابھرتی ہے۔ کشمیر ان کا وطن مالوف تھا۔ لاہور میں وہ رہتے تھے۔ مؤرخ کشمیر ہونے کے علاوہ مؤرخ لاہور کے طور پر بھی وہ معروف ہیں۔ وہ ایک بسیار نویس ادیب تھے۔ انھوں نے متنوع موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ وہ ایک ممتاز صحافی، شاعر سوانح نگار اور ناول نگار بھی تھے۔ اس کے علاوہ بھی متفرق عنوانات کے تحت ان کی کتابیں مل جاتی ہیں مگر ان تمام تحریروں میں کہیں نہ کہیں ان کا مؤرخانہ وصف اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے۔ فوق سے پہلے تاریخ ادب اُردو میں جس دوسری شخصیت کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے وہ شبلی نعمانی ہیں۔ وہ بھی ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے مگر اپنی دوسری حیثیتوں کے باوجود مؤرخ شبلی نے اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ

ان کے دُوسرے سارے کمالات اس میں اکٹھے ہوتے چلے گئے۔ شبلی کے ایک ممدوح اور مداح مہدی افادی یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ:

"شبلی سے اگر تاریخی کتب لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے"۔[۱]

شبلی کی ادبی حیثیت کے کئی پہلو فنی اعتبار سے ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ وہ سوانح نگار کے روپ میں مؤرخ ہیں۔ اور مؤرخ کے پردے میں سوانح نگار ہیں۔ محمد الدین فوق کے بارے میں بھی کسی قدر اعتذار کے ساتھ یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ یہاں مؤرخ، سوانح نگار اور تذکرہ نگار کے طور پر ایک متحد اور مشترک شخصیت کے روپ میں فوق صاحب کے فن کا ایک ساتھ جائزہ لینا بے محل نہیں ہوگا۔

یہ بات متنازعہ نہیں کہ یہ تینوں شعبہ ہائے علم و ادب ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ان کی حدود آپس میں گھل مل جاتی ہیں۔ یہ بات اب تقریباً طے شدہ ہے کہ ایک مؤرخ، سوانح نگار اور تذکرہ نگار کا طریقہ کار بعض اوقات اتنا ملتا جلتا ہوتا ہے کہ ان میں واضح تقسیم مشکل ہو جاتی ہے۔ اور اگرچہ فوق صاحب کی تصانیف کو مختلف صنفی درجہ بندی کے ذیل میں بھی لا کے دیکھا جائے گا مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں بعض اصطلاحات کی وضاحت کر دی جائے اور ان کی مطابقتوں پر نظر ڈال لی جائے تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔

تاریخ نویسی کا تاحدِ امکان کھوج لگایا جائے تو ایک ہزار سال قبل مسیح بمشکل سُراغ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان مٹے مٹے آثار پر تاریخ نام کی کسی شے کا خاکہ اتارنا بے سُود ہوگا ان زمانوں میں حالات و واقعات کے ریکارڈ کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ یادداشت، جس کا بیشتر انحصار بصارت اور سماعت پر تھا۔ لیکن وقت کے حال سے ماضی میں منتقل ہونے کے بعد کل کائنات بس سماعت ہی رہ گئی تھی۔

اس کے باوجود صرف یہی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ہی انسانی علوم میں سے سب سے پرانا علم ہے۔ اس ضمن میں ایس۔ایم۔جعفر کی یہ بات قرین قیاس نظر آتی ہے۔

Spoken history is as old as speach and written or recorded history is as old as script.

جعفر صاحب آگے چل کر کہتے ہیں:

History is every thing and everything is history 2

بیسویں صدی کے آخر میں یہ بات حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ دُنیا کے تمام علوم کا حرف اوّل ہے۔ دُنیا میں جو کچُھ ہوچکا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب تاریخ ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ بھی تاریخ ہی کے زمرے میں آئے گا۔ اس لحاظ سے کسی بھی علم کا ماہر کسی نہ کسی طرح فن تاریخ سے متعلق ہوگا۔ تاریخ وہ واحد سرچشمہ ہے جو انسانوں کی تجربہ گاہ بھی ہے جس کی مدد سے زندگی آگے بڑھ رہی ہے اور انسان ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اب نہ صرف علوم و فنون کے انبار لگتے جا رہے ہیں بلکہ ہر علم اور ہر فن کی کئی کئی شاخیں وجود میں آرہی ہیں۔ مگر جو بھی علم ہے اس کی اپنی بھی ایک تاریخ ہے۔ حتیٰ کہ فن تاریخ کی بھی ایک تاریخ ہے۔ جب کہ تاریخ کو سمجھنے اور اسے بیان کرنے کے کئی انداز ہیں۔

ایک طرح سے تاریخ سوانحی تذکروں اور لوگوں کے حالات اور کارناموں کا نام بن جاتی ہے۔ کارل لائل کا نظریہ بھی یہی ہے وہ نامور لوگوں کی زندگی کے بیان کو تاریخ سمجھتا ہے۔ اس طرح تاریخ اور سوانح ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ کارل لائل نے لکھا ہے۔

The History of world is but the Biography of great men.

شبلی نعمانی یورپی مؤرخین میں سے کارل لائل سے متاثر تھے یا انھیں ایسا سمجھا جاتا ہے۔ شبلی نامورانِ اسلام کے کارنامے مسلمانوں کے دلوں پر نقش کر دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے تاریخ نویسی سے بھی کام لیا اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ فنی اعتبار سے کس حد تک الگ الگ ہونے کے باوجود سوانح اور تاریخ نگاری ایک مشترک اسلوب بن کر شبلی کے ہاں یک جان ہو گئیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا مشکل ہے۔ اس مقام پر سوانح عمری کے بارے میں "آکسفورڈ ڈکشنری" میں درج یہ تعریف بہت برمحل معلوم ہوتی ہے۔

"سوانح عمری بطور ایک صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے"۔[۵]

یہاں تاریخ اور سوانح کی یک جہتی ثابت کرنا مقصود نہیں مگر ان دونوں اصناف کی حدود کہیں نہ کہیں دور و نزدیک ملتی ضرور ہیں۔

"تاریخ بڑی بڑی ہستیوں کی سوانح حیات کے مجموعے کا نام ہے"۔[۶]

سوانح عمری کے ماخذ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہ علی نے اپنی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" میں لکھا ہے۔

"عرب اور ایران میں سوانح عمری کا تاریخ سے ممیز اور واضح تصور نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ شبلی بھی جو اردو سوانح نگاروں میں علوم اسلامی سے زیادہ متاثر ہیں۔ اپنی تصانیف میں سوانح اور تاریخ کو خلط ملط کر دیتے ہیں"۔[۷]

منشی محمد دین فوق کی تصانیف اور سوانح عمریوں کے مطالعے سے شبلی کے نظریۂ تاریخ کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ فوق صاحب کی تمام تر شہرت مؤرخِ کشمیر

کے طور پر ہے۔ انھیں مؤرخ لاہور کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اپنے معاصرین میں سے
شبلی ہی وہ شخصیت ہیں جو فکری میدان میں ہمیں فوق کے رہبر دکھائی دیتے ہیں۔
الطاف فاطمہ اپنی کتاب "اُردو سوانح نگاری کا ارتقاء" میں لکھتی ہیں:

"فوق صاحب نے سوانح نگاری میں کارناموں کے ذکر پر زور دیا ہے
ان کا رجحان تاریخ کی طرف ہے"۔[۸]

فوق صاحب جب لکھتے ہیں تو ان کی اکثر تحریروں میں مؤرخ ان کے ساتھ
ہوتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی دوسری حیثیتوں کو کم تر کر رہے ہیں۔ مؤرخ
شبلی نعمانی کے ذکر کے بغیر سوانح نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی بلکہ اُردو سوانح
نگاری میں حالی اور شبلی کو نکال دیا جائے تو بات نہ شروع ہو سکتی ہے نہ مکمل ہو سکتی
ہے۔ فوق کا تذکرہ بھی سوانح نگاری کے نقادوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہ علی نے
مجموعی تاریخی، سیاسی اور سماجی سوانح عمریوں کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے
ان کا دائرہ سلاطین اودھ اور ہندوستان کی رانیوں سے لے کر اخبار نویسوں تک
پھیلا دیا ہے۔ انھوں نے مثال کے طور پر فوق صاحب کی کتاب "اخبار نویسوں
کے حالات" کو پیش کیا ہے[۹] حالانکہ اصل میں یہ "کشمیری میگزین" کا ایڈیٹر نمبر تھا جس
کا ذکر صحافت کے باب میں ہو چکا ہے۔ اس میں مختلف صحافیوں نے خود اپنے حالات
لکھے ہیں۔ فوق صاحب نے اپنے علاوہ بہت کم ایڈیٹروں کے حالات لکھے ہیں۔
لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ ایک منفرد تصنیف ہے پھر خود نوشت کو بھی سوانح
عمری کی ذیل میں رکھا جاتا ہے۔ فوق صاحب نے بھی "سرگزشت فوق" کے نام سے
اپنی خود نوشت لکھی ہے جس کا ذکر آگے چل کر ہو گا۔ ڈاکٹر شاہ علی نے بھی اپنی کتاب
میں خود نوشت کو سوانح عمری کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے "تذکرہ خواتین دکن" اور "تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور" کا

ذکر مختصر سوانحی خاکوں کی ذیل میں کیا ہے[۱۰] کتابیات میں فوق صاحب کی سحالات شمس تبریزؒ" اور "حیات فرشتہ" بھی شامل ہیں[۱۱]

الطاف فاطمہ نے بھی اپنی کتاب میں فوق صاحب کی سوانح عمریوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی سوانح نگاری پر تنقید بھی کی ہے[۱۲]

ذاکر حسین کالج دہلی کی شعبہ اُردو کی استاد ڈاکٹر ممتاز فاخرہ نے اپنی کتاب "اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" میں فوق صاحب کی سوانح عمریوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی مجموعی رائے بھی اہم ہے اور فوق صاحب کے اس رجحان کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ وہ مشاہیر کے کارناموں کے ذریعے ہندوستان کے لوگوں اور مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنے اس رویے میں وہ سرسید اور اس کے رفقاء کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کی کتاب کا نام بھی وہی ہے جو الطاف فاطمہ کی کتاب کا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ لکھتی ہیں۔

"مصنف (فوق) کی نظر میں ہیرو کی مکمل شخصیت کی بجائے اس کے ایسے مخصوص پہلو ہیں جو شہرت کا باعث ہوتے۔ ہیرو کے کمزور پہلوؤں کو بیان کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔"[۱۳]

ان تینوں مثالوں سے سوانح نگار کے طور پر فوق صاحب کی حیثیت اجاگر کرنے کے علاوہ یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ انھوں نے تاریخ نویسی کے لیے سوانح عمری کے فن کو بہت عمدگی سے استعمال کیا۔ ان کی دو سوانح عمریاں "سوانح عمری ملک العلما عبدالحکیم سیالکوٹی" اور "تاریخ بڈشاہی" بہت پائے کی سوانح عمریاں ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ انھوں نے اپنی ایک بہت اہم سوانح عمری کا نام "تاریخ بڈشاہی" رکھا ہے بڈشاہ کشمیر کا ہر دلعزیز حکمران تھا۔ تب وادیٔ کشمیر معاشی و معاشرتی تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے اپنے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ یہ وہ

کتاب ہے جو پہلے "سلطان زین العابدین" اور "شباب کشمیر" کے نام سے شائع ہوئی۔

"شباب کشمیر" کی اشاعت پر علامہ اقبال نے فرمایا:

"آپ کی کتاب "شباب کشمیر"، کشمیر کی تاریخ میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس سے پہلے بھی جو لٹریچر آپ نے کشمیر کے متعلق پیدا کیا ہے، میرے نزدیک مفید اور آپ کی حب الوطنی اور علمی ذوق پر شاہد عادل ہے۔"

پھر فوق صاحب نے اس پر مسلسل کام کر کے وسیع ترمیم و اضافے کے ساتھ "تاریخ بڈشاہی" کے نام سے چھپوایا۔ اس کتاب پر فوق صاحب کو اسی طرح ناز تھا جس طرح شبلی "المامون" کو اپنی پسندیدہ کتاب قرار دیتے تھے۔ "سوانح عمری ملک العلماء عبدالحکیم سیالکوٹی" بھی ایک مکمل سوانح عمری ہے۔ یہ ایک بہت بڑے عالم دین کی زندگی کا خاکہ ہے۔ اس سوانح عمری میں بھی ۳۲ صفحات پر مشتمل تاریخ سیالکوٹ شامل ہے۔ اور ۳۸ مشاہیر سیالکوٹ کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔ مولانا سیالکوٹی پر لکھے گئے تمام تذکروں کے مقابلے میں یہ کتاب فوقیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا دیباچہ علامہ اقبال نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے شبلی کی "النعمان" کی طرف دھیان جاتا ہے۔ فوق کی ان کتابوں کا شبلی کی کتابوں سے موازنہ بالواسطہ ہے ورنہ شخصیتوں کی عظمتوں کا فرق اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہاں صرف شبلی کے تاریخی مذاق سے فوق صاحب کی فطری مطابقت کا ذکر مقصود ہے ورنہ اسلوب اور انداز کے لحاظ سے فوق اور شبلی میں بہت نمایاں فرق ہے۔ شبلی ادبی جاہ و جلال کی علامت ہیں جب کہ فوق صاحب دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ اس لحاظ سے مولانا حالی کے ساتھ ان کی مشابہت کی طرف توجہ چلی جاتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

"مولانا سیالکوٹی کی سوانح عمری میں منشی صاحب مولانا حالی کے طریق

تصنیف سے متاثر ہیں" ۱۵؎

لیکن حالی کی "حیات سعدی" کے ساتھ اس کتاب کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ موضوعات کے اعتبار سے فوق شبلی کے قریب اور اسلوب بیان کے اعتبار سے حالی کے قریب ہیں۔ فوق کی دونوں کتابوں کا تفصیلی جائزہ اگلے صفحوں میں لیا جائے گا۔ فوق صاحب نے چالیس سوانح عمریاں لکھی ہیں۔

فوق صاحب نے تین جلدوں میں تاریخ کشمیر لکھی ہے اور کشمیر کے کئی ممتاز لوگوں اور عورتوں کے بارے میں سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔ "تاریخ کشمیر" کی جلد دوم میں بڈشاہ کا تذکرہ ان کی سوانح عمری سے اتنا مختلف نہیں۔ "مشاہیر کشمیر" اور "خواتین کشمیر" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب تحریروں کے ذریعے وہ کشمیر کی تاریخی عظمتوں کو سامنے لانا چاہتے تھے۔ "مآثر لاہور" کے نام سے لاہور کی تاریخ ان کی وفات کے بعد "نقوش" کے لاہور نمبر میں شائع ہوئی۔ "تاریخ شالیمار" کے علاوہ لاہور سے متعلق مشہور افراد کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں۔ فوق صاحب دو چار مثالوں کے علاوہ کہیں بھی تاریخ اور سوانح کے فنون کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ وہ ان دونوں اصناف کے درمیان تھوڑے بہت فرق کو جانتے ہوئے بھی اس کا اتنا خیال نہیں رکھتے تھے۔ یہاں مشہور مصنّف والکہ   کی یہ رائے اپنی مکمل معنویت کے ساتھ صادق آتی ہے۔

"Some people expand biography into History and some people condensed history into biography." 1

فوق صاحب نے یہ دونوں کام والکہ کی اس رائے کے مطابق کیے اور اس طرح شبلی کی تقلید کا حق ادا کر دیا جہاں تک مؤرخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے مرتبے

کا تعلق ہے تو فوق اور شبلی کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن فوق نے اس نظریۂ فن کی پاسداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جو شبلی کی تحریروں کا امتیاز خاص ہے۔

شبلی نے "سفر نامہ مصر و شام" میں ان علاقوں کا تہذیبی اور تاریخی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ تاریخ یہاں بھی شبلی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح کا منظر ہمیں فوق کے "سفر نامۂ کشمیر" میں بھی نظر آتا ہے۔ فوق صاحب نے اپنی کتاب "جغرافیہ ریاست پونچھ" لکھتے ہوئے بھی تاریخی یادگاروں کو اپنی نگاہ میں رکھا ہے اور وہ کسی مقام کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ کے ریگزاروں میں کھو جاتے ہیں۔ اور انھیں دشوار گزار راستوں پر سیاحوں کے علاوہ بادشاہوں کے قافلوں کی گرد اڑتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ انھوں نے ارادتاً تاریخی یادداشتوں کو نئے ذہن میں اجاگر کیا ہے۔ ہم ان کی کسی تحریر کو تاریخی پس منظر کے بغیر پڑھیں گے تو تحریریں دھندلانے لگیں گی تو پھر ہم ان کی سوانح عمریوں کو ان کے مؤرخانہ افتادِ طبع سے علیحدہ کرکے کس طرح پڑھ سکتے ہیں۔ وہ پہلی حیثیت میں مؤرخ ہیں اور اس کے بعد کچھ اور۔ ناول نگار، مضمون نگار، صحافی، شاعر اور بالخصوص سوانح نگار کی حیثیت میں بھی مؤرخ ہی رہتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں انگریزی ناول کی ابتدا اور ارتقا میں سوانح عمریوں کے اثرات بھی نمایاں ہیں اور تاریخی ناول کی اصطلاح تو اب ادبی دنیا میں باقاعدہ مستعمل ہے۔ اس طرح کے ناول میں تاریخ اور سوانح باہم آمیخت ہو کر ظہور کرتے ہیں۔ اردو ناول نویسی میں بھی تاریخی ناولوں کو بہت اہمیت حاصل ہے اس صنف میں ایک اہم ناول نگار شرر کا ذکر اس لیے بھی برمحل ہے کہ فوق صاحب سے ان کی ملاقات کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے۔ فوق صاحب نے سماجی موضوعات پر بھی ناول لکھے ہیں مگر ان کے نمائندہ ناول تاریخی ہیں۔ "اکبر" ایک بڑی مثال ہے۔

ان کے مضامین اپنے وقت کے معروف رسالوں میں شائع ہوئے[۱۵] جن میں زیادہ تعداد تاریخی مضامین کی ہے۔ دوسرے مضامین کی نوعیت بھی تاریخی ہے۔ فوق صاحب کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہر غزل، نظم سے پہلے اس کا پس منظر لکھا ہے جو ایک منفرد انداز رکھتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے نوٹس کو ملا کر لکھ لیا جائے تو ان کی اور ان کے زمانے کی تاریخ کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

ہم نے فوق صاحب کی ان حیثیتوں کا علیحدہ علیحدہ بھی تجزیہ کیا ہے مگر ہر دفعہ ہماری ملاقات ایک مؤرخ سے ضرور ہوتی ہے۔ انھیں علامہ اقبال کے علاوہ اپنے زمانے کے اکابرین نے ہمیشہ مؤرخ کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ اس کے لیے "نقوش" کے مکاتیب نمبر سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

موضوع اور اسلوب کے مشترک آئینے میں ہمیں فوق صاحب کی شخصیت میں شبلی اور حالی کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

"تاریخ کشمیر و لاہور کے علاوہ فوق صاحب نے "تاریخ انگورہ" لکھی ہے۔ ان کی کتاب "تاریخ ریاست ہائے پھلکھنڈ" میں تحقیقی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ "تاریخ حریت اسلام" میں تاریخ اسلام سے منتخب کر کے حریت پسند مسلمانوں کے واقعات ایک جگہ اکٹھے کر دیے گئے۔ "تاریخ کا روشن پہلو" اور "وجدانی نشتر" موضوع کے اعتبار سے مختلف لیکن اسلوب تاریخ کے اعتبار سے تاریخ حریت اسلام سے ملتی جلتی کتابیں ہیں۔ فوق صاحب کے مجموعی اسلوب تاریخ کے بارے میں اپنے مضمون بعنوان "کلہن، حسن اور فوق" میں جاوید نجیب نے بہت وقیع بات کی ہے۔

"فوق کی تصنیف، "تاریخ کشمیر" ہو یا "تاریخ حریت اسلام" "تاریخ کا روشن پہلو" ہو یا "بتان حرم" ان کا مدعا ایک ہی تھا کہ تاریخ کو اپنی دیانت اور

شرافت سے کتاب مقدس کا ہم پایہ اور بدل بنایا جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب نسل انسانی کی تاریخ کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا جاتا۔ فوق برِصغیر میں اس مکتبِ فکر کی علامت تھے جسے یورپ نے ایچ۔ بی۔ ویلز کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایچ۔ بی۔ ویلز نسل انسانی کی تاریخ کو اپنی اہمیت اور فائدے کے لحاظ سے کتاب مقدس کا ہم پایہ اور بدل قرار دیتے ہیں۔ تمدن و معاشرت اور تہذیب کے لیے ویلز تاریخ سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ اور بالکل اسی طرح فوق بھی مشاہیر کے کارناموں سے غلامی، افلاس اور بیماری کے زخموں پر پھاہا رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں تاریخ کا سوال پیدا ہوتا وہاں وہ ادب کو صداقت پر قربان کرتے ہیں۔ وہ ایک پوری قوم کی تقدیر بنانے کی خاطر قلم ہاتھ میں لیتے ہیں۔ وہ تلخ سے تلخ حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سخت سے سخت مصائب ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔ وہ تاریخ کے علمی پہلو کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ فقط واقعات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔[۱۸]

ان ابتدائی معروضات کے بعد ہم فوق صاحب کی تاریخی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

"مکمل تاریخ کشمیر، تین جلد"

علمی اور ادبی خدمات کے ضمن میں ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ فوق صاحب کی اوّلین حیثیت مؤرخ اور مؤرخ کشمیر کی ہے۔ تاریخ کشمیر کا حرف اوّل پنڈت کلہن کی "راج ترنگنی" ہے جو سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں اس کے انگریزی اور فارسی میں تراجم ہوئے۔ تاریخ کشمیر کا فارسی ذخیرہ بھی خاصا اہم ہے۔

"تاریخ اعظمی" اور "تاریخ حسن" خاص طور سے قابلِ قدر تصنیفات ہیں جو

بالترتیب ۱۱۴۸ھ اور ۱۲۰۵ھ میں خواجہ محمد اعظم اور پیر غلام حسن کھویہامی عرف حسن شاہ نے مکمل کیں۔ "تاریخ اعظمی" کا فارسی نام "واقعات کشمیر" ہے۔ "تاریخ اعظمی" کا اردو ترجمہ منشی اشرف علی نے ۱۸۴۶ء میں دہلی سے شائع کیا۔ "تاریخ حسن" جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ابھی تک مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی۔ مصنف نے ایک مکمل نسخہ خانقاہ معلی سرینگر میں بطور وقف نذر کر دیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی محمد ابراہیم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جو غلام محمد، نور محمد تاجران کتب سری نگر نے طبع کیا۔ اس کا حصہ اول (۱۹۵۷ء) حصہ سوم (۱۹۶۰ء) مولانا بہاءالحق قاسمی کے پاس محفوظ ہیں۔ راقم نے وہ دونوں کتابیں ان کے پاس دیکھی ہیں۔ حصہ اول راجاؤں اور بادشاہوں پر مشتمل ہے۔ جن کی تعداد ۲۸۸ ہے۔ آخری صفحے ۲۹۶ پر اس شعر سے تاریخ نکالی گئی ہے۔

پئے سال اتمامش اے نیک خو
خرد گفت تاریخ کامل بگو

کتاب مکمل کرنے کی تاریخ ۱۳۰۲ھ یعنی ۱۸۸۵ء بنتی ہے۔ حصہ سوم تذکرہ اولیائے کشمیر ہے جس میں ہندو مسلم اولیاء اور ریشیوں کی کل تعداد ۴۵۸ ہے۔ حکیم موسیٰ امرتسری کے مضمون "مؤرخین کشمیر" میں انیس مؤرخین میں سے ایک فوق بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون کے آغاز میں بہت دلچسپ بات لکھی ہے۔

"منشی محمد دین فوق نے مؤرخین و مصنفین کا تذکرہ مرتب کرنے کا اعلان کیا تھا۔ مگر ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔"[۱۹]

حکیم صاحب کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کشمیر کے حوالے سے کئی منصوبے فوق صاحب کے ذہن میں تھے۔ فوق صاحب کی "مکمل تاریخ کشمیر" کے تجزیے میں دوسری تواریخ کشمیر بھی خود بخود زیر بحث آتی چلی جائیں گی۔

منشی محمد الدین فوق نے تاریخ کشمیر تین جلدوں میں لکھی۔ پہلی جلد قدیم ہندو راجگان کے بارے میں ہے، جو مئی ۱۹۱۰ء میں طبع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ جون ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ "مکمل تاریخ کشمیر" کی دوسری جلد کشمیر کی اسلامی حکومت کے بارے میں ہے جو دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سلاطین کشمیر، مغل شاہان اور افغان حکمرانوں کے حالات درج ہیں۔ تیسری جلد جو سکھوں کے ستائیس سالہ عہدِ حکومت پر مشتمل ہے۔ فوق چوتھی جلد میں ڈوگرہ حکمرانوں کے حالات لکھنا چاہتے تھے ۲ مگر لکھ نہ سکے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۲ء کو مکمل ہوئی۔ یہ آخری دونوں جلدیں بھی فوق صاحب کی زندگی ہی میں ختم ہوگئی تھیں مگر یہ دوبارہ نہ چھپ سکیں۔

ابوالبرکات مولوی عبدالمالک مشیر مال ریاست بہاولپور اپنی مشہور کتاب "شاہان گوجر" میں جو ۱۳۵۳ھ-۱۹۳۴ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئی جا بجا ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ مسٹر ولسن، پنڈت گوانشہ لعل مصنف "مختصر تاریخ کشمیر" (انگریزی) اور ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مصنف "کشمیر" (انگریزی) نے آپ کی کتابوں کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔

فوق صاحب سے پیشتر اردو زبان میں کشمیر کے متعلق صرف ایک آدھ ہی کتاب موجود تھی۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ (سمت ۱۹۰۳ء-۱۹۷۵ بکرمی) نے ۱۹۳۱ بکرمی میں جغرافیہ کشمیر اور کلہن پنڈت کی "راج ترنگنی" کا ترجمہ ملا کی کتاب "گلدستۂ کشمیر" شائع کی مگر یہ کتاب تعصب سے بھری ہوئی ہے۔ فوق صاحب کی تاریخ کشمیر کی تینوں جلدوں کے بارے میں قاضی ظہور الحسن ناظم سیہوروی نے اپنی کتاب "نگارستان کشمیر" میں تین مختلف موقعوں پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

"عرض حال" کے باب میں لکھا ہے کہ "اب تک جس قدر انگریزی۔

فارسی، اُردو تاریخیں کشمیر کی لکھی گئی ہیں یہ "مکمل تاریخ کشمیر" سب میں صحیح اور بہتر ہے۔"

"کشمیر کی تاریخیں اور مؤرخ" کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ "مکمل تاریخ کشمیر"۔۔۔ کشمیر کی تاریخوں میں سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ فوق صاحب کو رتناگر کا اصل نسخہ بھوج پتر پر لکھا ہوا اور چند نایاب تحریریں دستیاب ہو گئی تھیں۔ فوق صاحب کی اس جستجو کی تعریف ٹھاکر اچھر چند مترجم "راج ترنگنی" نے بھی کی ہے۔"

"تاریخ کشمیر" کے تحت اعتراف کیا ہے کہ "منشی محمّد الدین صاحب فوق نے رتناگر اور مُلّا احمد کی تاریخ اور نیز نایاب نسخوں سے "مکمل تاریخ کشمیر" کو مرتب کیا۔ اس میں ان راجاؤں کے حالات ہیں جن کے حالات کلہن (مصنّف "راج ترنگنی") نہیں لکھ سکا ہے اس لیے کشمیر کی تاریخوں میں یہی معتبر و مستند ہے۔ ہم نے راجاؤں اور سلاطین کی ترتیب میں "مکمل تاریخ کشمیر" کو ہی ترجیح دی ہے۔"

اسی تاریخ کے آخر میں مصنّف نے مہاراجہ کشمیر کو توجہ دلاتے ہوئے مشورہ دیا ہے کہ وہ فوق صاحب جیسے قابل افراد کو تدوین تاریخ کشمیر پر مامور فرمائیں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ یہ کس پایہ کی تصنیف ہے۔[۲۱]

کشمیر کے محمّد امین رفیقی نے اپنے مضمون "فوق بحیثیت مؤرّخ" میں لکھتے ہیں: "فوق صاحب نے "راج ترنگنی رتناگر" خود نہیں دیکھی بلکہ ایک فرضی کہانی بیان کی ہے۔ اگر تاریخ مُلّا احمد یا رتناگر سے استفادہ کیا ہوتا تو اس کے متعلق مرحوم مہجور کو ضرور خبر ہوتی۔ کیونکہ مہجور صاحب اور فوق صاحب کے تعلق اس معاملے میں بہت گہرے تھے۔ ان حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے فوق صاحب کی تاریخ ویسی ہی ہے جیسی عام مؤرخین سلف کی ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی نیا یا نادر واقعہ درج نہیں ہے۔[۲۲]

جہاں تک تاریخ کی کسی کتاب میں نئے واقعہ کے بیان کا تعلق ہے تو کوئی شخص

من گھڑت واقعہ بیان کرکے اپنی تاریخ نویسی کو نادر نہیں بنا سکتا نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔ کشمیر کے مؤرخین میں فوق صاحب کو اس لحاظ سے ضرور اہمیت حاصل ہے کہ اردو میں ان کی یہ کتاب پہلی مستند اور مکمل تاریخ ہے "نگارستان کشمیر" میں قاضی ظہور الحسن کی فوق صاحب کے بارے میں آراء کی روشنی میں رفیقی صاحب کا اعتراض قابل اعتنا نہیں۔ اپنے مضمون کے آخر میں خود رفیقی صاحب لکھتے ہیں:

"تاریخ۔ سوانح۔ تذکرات۔ ناول اور شاعری پر مشتمل اپنی تصنیفات نے مرحوم فوق صاحب کو شہرت عام اور بقائے دوام کی زندگی بخشی ہے۔"[۲۳]

فوق صاحب کی تاریخ کشمیر پر کچھ اعتراضات عبدالاحد نے بھی اپنے مضمون "تواریخ کشمیر اور محمد دین فوق" میں کیے ہیں۔ انھوں نے "راج ترنگنی" کے مصنف پنڈت کلہن کو فلسفۂ تاریخ کا موجد قرار دیتے ہوئے فوق صاحب کو دورِ غلامی کا مؤرخ کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تاریخ نویسی کے دوسرے اور تیسرے مرحلے میں مؤرخین نے شاہی دربار کی لذتوں کی خواہش میں "بدشاہی" تمدن کے انصاف اور اخلاص کے قصیدے لکھنے شروع کر دیے۔ اس میں ہندو اور مسلمان مؤرخین برابر کے شریک ہیں۔"[۲۴]

"عبدالاحد" شاید بھول گئے ہیں کہ کلہن بھی "ہرش" کے زمانے کی حکومت کے ایک ممتاز رکن اور بارسوخ وزیر کے لورِ چشم تھے۔ اور وہ خود ان کے بقول شاہی دسترخوانوں کی نعمتوں سے مرعوب نہ ہوتے۔ اور غریب عوام کو حقوق سے محروم کرنے والے اجارہ داروں کی کارستانیوں کو فاش کرنے میں مصروف رہے۔ تو کوئی دوسرا مؤرخ بھی اس وصف کا مالک ہو سکتا ہے "راج ترنگنی" کا مصنف کلہن بلاشبہ

ایک عظیم مؤرخ ہے۔ اور خود فوق صاحب نے بھی "مکمل تاریخ کشمیر" کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ کشمیر کے مؤرخ اوّل کے طور پر کلہن کا ایک بلند مقام ہے تو فوق صاحب کو تاریخ کشمیر اُردو میں پیش کرنے کی اوّلیت کا اعزاز حاصل ہے۔ اپنے مضمون "کلہن، حسن اور فوق" میں جاوید نجیب لکھتے ہیں:

"کلہن، حسن اور فوق کشمیر کے مشہور ادیب، شاعر اور تاریخ نویس تھے۔ کلہن بارہویں صدی کے ایک عالم دین، حکیم، شاعر اور تاریخ دان تھے۔ اور فوق بیسویں صدی کے کشمیر کی مٹتی ہوئی شرافت کے امین، ایک اِنصاف پسند مؤرخ اور بے باک صحافی تھے۔ وہ تحریک حریت کے ایک نڈر اور جانباز سپاہی بھی تھے۔" [۲۵]

اس مضمون میں خاص طور سے کلہن اور فوق کی تاریخ نویسی کا دِلچسپ موازنہ کیا گیا ہے۔ نجیب لکھتے ہیں۔

"کلہن استعارات، تشبیہات اور محاورات کے بادشاہ بھی تھے اور ایک عظیم شاعر بھی۔ ان کے والد بادشاہ وقت کی فوج میں ملازم تھے۔ انھوں نے جتنے بھی واقعات قلم بند کیے ہیں بڑی تحقیق اور محنت سے جمع کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تاریخ پر ادب کا رنگ غالب ہے۔ لیکن ان واقعات کو مبالغہ سے پاک نہیں کیا جاسکتا۔ بقول "اناطول فرانس" وہ تاریخ کو ایک غیر ضروری اور مبالغہ آرائی سے لبریز داستان بتاتے ہیں۔ اس طرح کلہن کی تاریخ میں روانی فکر و خیال نہیں بلکہ ان کی تاریخ نویسی میں راجہ جے سنگھ کی ایما کا بھی کچھ ہاتھ ہے۔

فوق، کلہن کے برعکس ستائش کی تمنّا کے بغیر واقعات جمع کرتے ہیں۔ گھر گھر جاکر میلوں سفر طے کر کے لوگوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ واقعات کی صداقت کی گواہی میں سفر کی تکان انھیں متزلزل نہیں کرسکی۔ وہ بچھڑے ہوئے خاندانوں کو پھر سے ملانے

کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اسلاف کو موت کے دھندلکوں سے زندگی کے اجالوں
میں منتقل کرتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے تذکرے بڑی لگن سے قلم بند
کرتے ہیں۔ اگرچہ فرقہ پرستی کے بادل ان دنوں بہار سو منڈلا رہے تھے۔ مگر اس
فاضل مؤرخ کے قلم میں واقعات کی ترتیب میں سرمو فرق نہ آیا۔ فوق اس فرقے سے
تعلق رکھتے تھے جن کی محرومیوں اور رسوائیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ چاہتے تو تعصب
سے بھی کام لے سکتے تھے۔ غیر مسلموں کی آنکھ کا تنکا انہیں شہتیر نظر آتا مگر ان کے قلم سے
نکلا ہوا ہر لفظ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ وہ ایک دیانتدار مؤرخ تھے۔ تعصب سے
ان کا دامن کبھی آلودہ نہ ہوا" [۲۶]

اس جامع تجزیے کے بعد عبدالاحد کے اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں
رہتی۔ کہ فوق صاحب ایک منصف مزاج اور روادار عظیم کشمیری حکمران بڈشاہ کی مداحی
کی پاداش میں متعصب، خودغرض اور ناکام مؤرخ ہیں۔ بڈشاہ ایک فراخ دل اور رعایا
پرور بادشاہ تھا جس کی عزت ہر مذہب و ملت کے لوگ کرتے تھے۔ فوق صاحب کی
"تاریخ بڈشاہی" کو تنقید کا نشانہ بنا کر عبدالاحد نے اپنا بھانڈا خود پھوڑ دیا ہے۔
عبدالاحد ایک جگہ مزید لکھتے ہیں۔

"محمد دین فوق نے دوسرے مؤرخوں جیسے حسن کھویہامی مرجان پوری،
ڈاکٹر پارمو، پروفیسر محب حسن، ڈاکٹر زتشی، ڈاکٹر صوفی اور پریم ناتھ
بزاز کے برعکس صرف بادشاہوں کے ولی عہدوں، وزیروں اور کئی
بڑے خاندانوں کی قدامت اور قدر و منزلت کی عکاسی کی ہے" [۲۷]

ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی اور پریم ناتھ بزاز نے جس خندہ پیشانی سے فوق صاحب
کی عظمت اور خدمت کا اعتراف کیا ہے اس کا ذکر پہلے ابواب میں ہو چکا ہے۔
باقی اصحاب میں سے کچھ تو فوق صاحب سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اور ان کے

علاوہ کسی نے فوق صاحب کے خلاف رائے نہیں دی۔ احد صاحب نے فلسفۂ تاریخ کی موشگافیوں کی روشنی میں جو کچھ کہا ہے اگر وہ نیک نیتی سے "مکمل تاریخ کشمیر" کی جلد اوّل میں فوق صاحب کے پچیس صفحات پر مشتمل دیباچے کو پڑھ لیتے تو شاید ان کی رائے اتنی مخالفانہ نہ ہوتی۔ احد صاحب کے مطابق دورِ غلامی (انگریزی دور) کے اس مؤرخ (فوق) کے خیالات کی ایک تصویر یہ ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

"یہ امر مسلمہ ہے کہ جب اہلِ مشرق معراج ترقی کے زینے پر چڑھ چکے تھے تو اس وقت اہلِ مغرب ابھی پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھنے کی جدوجہد میں مبتلا تھے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ اہلِ مشرق کی نسبت اہلِ مغرب کو ہمارے زمانہ سلف کے حالات زیادہ معلوم ہوں۔"[۲۸]

"کشمیری میگزین" کے اکتوبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں فوق صاحب اپنے مضمون "ایک جدید تاریخ کشمیر کی ضرورت" میں لکھتے ہیں:

"جو قوم تاریخ ہی نہیں رکھتی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے مٹنے میں کوئی کسر نہیں۔ قومی تاریخ سے اپنے رواجوں، دستوروں اور قومی کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔ مطالعہ تاریخ ہی سرکش اور ظالم فرمانرواکا صاف گو اور آتش زبان اتالیق ہے جو اظہار حق سے ذرا نہیں چوکتا ظلم کی مذمت صاف صاف منہ پر کہہ دیتا ہے۔ تواریخ ہی کے مطالعہ سے زمانہ کے نشیب و فراز لوگوں کی ہشیاریاں، چالاکیاں، ان کے خیالات و عادات کے اثرات و تغیرات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مطالعۂ تاریخ ایک قومی ہیکل دیو کا زبردست ہاتھ ہے۔ جو ہزارہا سال کے واقعات کو کھینچ کر پیش نظر کر دیتا ہے۔ یہ ایک منتر ہے جو نوجوانوں کو صدہا سال کا تجربہ کار اور روشن ضمیر بنا دیتا ہے۔"[۲۹]

تاریخ نویسی کے ایسے کئی رموز بیان کرتے ہُوئے فوق صاحب اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ کشمیر کی تاریخیں بہت ہیں مگر مطبوعہ کم ہیں۔ ان میں سے بھی بیشتر موجودہ زمانہ میں کار آمد نہیں۔ فوق صاحب لکھتے ہیں :

"مجھے ایسی تاریخ کشمیر کی مدت سے تمنا تھی جس میں ہندو راجگان مُسلمان سلاطین اور موجودہ فرمانروائے کشمیر کے خاندان کے حالات اور ان کے عہد حکومت کے مسلسل واقعات ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی کیفیت کے ساتھ درج ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ تاریخ چھپ رہی ہے"[۲]

اس مضمون کے بعد ایک سال کے اندر ہی "مکمل تاریخ کشمیر" شائع ہو گئی۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مرحوم اپنے مضمون "مؤرخ کشمیر" میں واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں :

"مؤرخ کی حیثیت سے جو کام فوق صاحب نے سر انجام دیا وہ رہتی دُنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھے گا۔ کشمیر کی تاریخ کے متعلق انھوں نے جو بیش بہا اور نایاب لٹریچر ہزاروں کتابوں کے مطالعہ کے بعد بڑی محنت اور نہایت شوق سے فراہم کیا۔ وہ بلاشبہ انتہائی طور پر قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔ پاکستان و ہندوستان کا کوئی شخص بھی ان سے بڑھ کر کشمیر کا واقف نہیں تھا، وہ بلاشبہ کشمیر کے متعلق ایک مستند انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ مؤرخ کشمیر بجا طور پر ان کا لقب تھا۔ اور وہ اس لقب کے پُورے طور پر مستحق تھے۔ وہ صاف اور سادہ اُردو لکھنا پسند فرماتے تھے۔ اور یہی ان کا کمال تھا"[۱۳]

مشہور مؤرخ "ایکٹن" Action کے یہ خیالات ہر لحاظ سے برمحل اور دلچسپ نظر آتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :

"Requirements pressing on the historian, threatening to turn him from a man of letters into the compiler of an encyclopaedia."

فوق صاحب نے تاریخ کشمیر کے ذریعے کشمیر شناسی کو آسان بنایا۔ واقعات کو بیک وقت بہت آسان اور بہت دلچسپ انداز میں بیان کرنے کا فن انھیں آتا تھا۔ وہ ادیب اور مؤرخ کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کرنے کے حق میں نہ تھے۔ مگر یہ سمجھتے تھے کہ تاریخ لکھنے والے ادیب کا فرض ہے کہ وہ تاریخ لکھنے کے بہانے کچھ اور نہ لکھتا رہے۔ ان کے ہاں بیان سادہ مگر سلجھا ہوا ہے۔ اور واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ فطری طور پر ایک مؤرخ کا دِل و دماغ لے کر پیدا ہوتے تھے۔ شرمن کینٹ مؤرخ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"He must realize that a thought expressed must be expressed in an understandable idiom."

اب تاریخ کشمیر کے ضمن میں فوق کو ایک پیش رو کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ محققین اور مؤرخین نے اس سلسلے میں مزید قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ تاہم فوق کی تصانیف سے علمی استفادہ اب تک جاری ہے۔ اور ان کی تاریخی اہمیت کو قبول کیا جاتا ہے۔ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ نے ایک انتہائی اہم ماخذ "راج ترنگنی" کے ترجمے پر مبنی اپنی ایک ضخیم کتاب دو حصوں میں تالیف کی ہے۔ اس کے حواشی میں ٹھاکر صاحب نے بعض تاریخی امور کے لیے فوق کا حوالہ دیا ہے۔[۳۴]

"تاریخِ اقوامِ کشمیر" تین جلد

"تاریخِ اقوامِ پونچھ" دو جلد

محمد دین فوق نے "تاریخ اقوام کشمیر" لکھ کر خطہ کشمیر کی مختلف ذاتوں کی تاریخ و تعارف کے ذریعے انسانوں کی طبائع اور سیرت و کردار کی رنگا رنگیوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔ فوق صاحب نے اس طرح یہ ثابت کیا کہ وادیٔ کشمیر نام و نسب کے اعتبار سے ایک مالدار خطہ ہے مگر ذاتوں کے عجائبات کے باوجود اصل اعزاز کشمیری ہونا ہے مختلف قومیتوں کی قوت متحد ہونے میں پوشیدہ ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے۔ ع

مل کے دُنیا میں رہو مثل حروف کشمیر[۳۵]

نامور مؤرخ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ایک قبیلہ میں مختلف گھرانے اپنی جُدا جُدا عصبیت رکھتے ہیں کئی عصبیتیں اکٹھی ہو جائیں تو ان میں ایک ایسی عصبیت کا وجود ناگزیر ہے۔ جو ان سب سے قوی تر ہو۔ سب پر غالب اور سب کو اپنے میں ضم کر لینے والی ہو۔ ساری عصبیتیں اس میں جمع ہو جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک بڑی عصبیت وجود میں آجاتی ہے۔"[۳۶]

دُنیا میں ہر جگہ لوگ ذاتوں، قوموں، خاندانوں اور قبیلوں کی نسبت سے اپنے ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اہل عرب علم الانساب کے ماہر اور شیدائی تھے۔ وہ نہ صرف اپنی قوم اور قبیلوں کے حالات یاد رکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے بلکہ اپنے گھوڑوں اور اُونٹوں کے سلسلہ نسب کو بھی محفوظ رکھتے تھے۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی

دوسری ہمہ گیر قابلیتوں کے علاوہ اس فن کے بھی ماہر تھے مگران کا یہ ہنر اخوت اور اتحاد اسلامی میں رکاوٹ کبھی نہ بنا۔ اسلام نے نسب کی حفاظت کرنے کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ باہمی جان پہچان کے لیے قبیلوں اور ذاتوں کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بارے میں ہاشمی، قریشی، مکّی، مدنی اور عربی کے القابات استعمال کیے جاتے ہیں۔ حضرت حسین رضؓ نے میدانِ کربلا میں اتمام حجت کے لیے نسب کے حوالے سے بھی اپنا تعارف کرایا۔ لوگوں نے تو اپنے شجرۂ نسب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تک محفوظ رکھے ہوتے ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے:

"تم اپنے نسبوں کا علم سیکھو تاکہ اس کے ذریعے اپنے رشتے ملا سکو۔ بیشک اپنے اقربا سے سلوک رکھنا کنبے میں محبت پیدا کرتا ہے۔ اس سے مال میں زیادتی ہوتی ہے اور عمر بڑھتی ہے"۔[۳۷]

قبیلہ انسانی تمدن میں سیاسی اجتماعیت کی قدیم ترین شکل ہے۔

"انسانوں کے ہر اس گروہ کو جو ایک ہی زبان بولتے ہیں، سماجی لحاظ سے ایک ہی اصول کے پابند ہیں۔ ایک ہی مقصد کے لیے لڑتے مرتے اور ایک ہی سا پیشہ یا کاروبار کرتے ہیں، قبیلہ کہا جاتا ہے"۔

(ترجمہ) [۳۸]

"تاریخ اقوامِ کشمیر" دراصل اسی عمل کے اعادے کی سرگزشت ہے۔ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک طویل وعریض خوبصورت وادی ہے جس میں متفرق گھرانوں اور متعدد ذاتوں کے لوگ بستے ہیں۔ ان سب میں قومی اور مشترک عصبیت "کشمیر" ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ سب چھوٹی بڑی عصبیتیں مل کر اس کی سرحدوں کی حفاظت کریں، متحد ہو کر اس کی خدمت کریں اور اس کے

حُسن میں اضافہ کریں۔ منشی محمد دین فوق نے "تاریخ اقوامِ کشمیر" لکھ کر اپنی حب الوطنی کا حق ادا کیا ہے۔

جو قومیں انسانی تمدن کے عوامل کا صحیح شعور رکھتی ہیں وہ قبیلے کو معاشرتی ترقی کے لیے بنیاد قرار دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں جب انگریز آئے تو انھوں نے یہاں کی برادریوں اور قبائل کے حالات، اطوار اور روایات کا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا۔ کسی ضلعے میں جب ڈپٹی کمشنر نے انتظامی ذمہ داری سنبھالی تو اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس علاقے کے قبائلی نظام اور روایات کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ چنانچہ ان ڈپٹی کمشنروں کے مرتب کیے ہُوئے گزیٹیئرز آج بھی اس باب میں بے مثال علمی خزانہ ہیں ان گزیٹیئرز میں نہ صرف یہ کہ اقوام و قبائل کے حالات لکھے جاتے تھے بلکہ ان کی پُوری تہذیب مختصر نکات کی صُورت میں سمٹ آتی تھی۔

ان گزیٹیئرز کی ترتیب میں اور بالخصوص ان کی بنیاد پر مرتب ہونے والی بعض کتابوں میں سے A Glossory of the Tribes and Castes معروف ہے۔ جس میں پنجاب اور شمال مغربی صوبہ کی ذاتوں، قوموں کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے ۱۹۱۱ء میں شائع کی۔ چنانچہ انہی کی وجہ سے مُسلمان اور ہندو اہلِ قلم کو بھی مختلف اقوام و قبائل کے بارے میں مستقل تواریخ مرتب کرنے کا خیال ہُوا۔ فوق نے یہ خدمت اپنی قوم کی برادریوں اور قبائل کے حالات مرتب کرکے انجام دی۔ یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱)	"تاریخ اقوامِ کشمیر"	جلد اوّل -	۱۹۳۴ء	۵۸۸ صفحات
(۲)	ایضاً	جلد دوم -	۱۹۴۳ء	۳۴۵ صفحات
(۳)	ایضاً	جلد سوم -	۱۹۴۶ء	۳۴۳ صفحات

(۴) "تاریخ اقوامِ پونچھ" جلد اوّل - ۱۹۳۶ء ۷۷۸ صفحات
(۵) ایضاً جلد دوم - ۱۹۴۳ء ۲۱۴ صفحات

اس تاریخ کا خیال انھیں ۱۹۱۴ء میں آیا تھا۔ اس وقت انھوں نے ایک مختصر سا تذکرہ شائع کیا تھا جس میں صرف مسلمانوں کی سو سے کم اقوام کا ذکر تھا۔ نہ اس میں کشمیری پنڈتوں کی گوتوں کی تفصیل تھی نہ راجپوتوں، سکھوں، بوہروں اور بدھوں کا تذکرہ تھا اور نہ ہی اقوامِ پونچھ کی طرف کوئی اشارہ تھا حالانکہ وہ بھی کشمیر کا حصہ ہے۔ یہ اتنا بڑا منصوبہ تھا کہ اس کے لیے پورے ایک ادارے کی ضرورت ہے ہم جہاں تک فوق صاحب کی ہمّت اور زندگی نے ساتھ دیا انھوں نے توقع سے کہیں زیادہ کام کیا۔

"تاریخ اقوامِ کشمیر" کی پہلی جلد میں تقریباً پانچ سو مختلف المذاہب کشمیری اقوام کا ذکر ہے۔ یہ جلد پانچ سو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں کشمیری پنڈت، ان کی اصلیت، کشمیر کے قدیم باشندے، کشمیری برہمنوں کا وطن، ان کی عام اور اصلاحی ترقیاں، کشمیری پنڈتوں کی عام ذاتیں اور ان کے چند مشہور خاندانوں پر تبصرہ ہے۔

باب دوم میں کشمیر کی غیر برہمن اقوام کا ذکر ہے۔

باب سوم میں مسلمانوں کی آمد، پہلا نومسلم، مسلمانوں کی مفقود الکیفیت ذاتیں، اقوام سادات، اقوامِ افغان، مغل اقوام، قدیم مسلمان راجپوت اقوام، اقوام شیوخ اور متفرق اقوام کا بیان ہے۔

باب چہارم میں کشمیر کی ادنیٰ اقوام کی تفصیل ہے۔

باب پنجم میں نیپال، ممالک متوسط، بنگال، صوبہ سرحد، یوپی، بہار، اور پنجاب کے بعض اہم خاندانوں اور ان کے مشاہیر کا تفصیلی ذکر ہے اور تقریباً چالیس پچاس تصویریں بھی ہیں۔

"تاریخ اقوام کشمیر" کی دوسری جلد جولائی ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ تین سال کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اس میں مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا لکھا ہوا دیباچہ اور ایک سو سے کچھ اوپر خاندانوں کے حالات، ان کی ذاتوں کی وجہ تسمیہ اور مشہور ہستیوں کے کوائف درج ہونے کے علاوہ تقریباً ایک سو تصویریں بھی ہیں۔

تیسری جلد ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ فوق صاحب نے اس کی ابتدا کی ہی تھی کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ فوق صاحب کے دوست مولوی محمد عبداللہ قریشی نے ایک سال کی لگاتار محنت کے بعد مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں یہ جلد مکمل کر کے شائع کر دی۔ دیباچے میں قریشی صاحب لکھتے ہیں:

> "آخر خدا خدا کر کے ایک سال کے بعد مَیں اس قابل ہوا کہ "تاریخ اقوام کشمیر" کی تیسری جلد ملک کے سامنے پیش کر سکوں۔ اگر فوق صاحب کی تصانیف میری رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوتیں تو مَیں اس کتاب کی تکمیل میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔" [۳۹]

اس کتاب میں ۱۵ ذاتوں اور ان کے خاندانوں کے حالات و کوائف درج ہیں۔ منشی محمد الدین فوق پر ایک طویل مگر مکمل مقالہ ہے۔ کشمیری ذاتوں کے عجائبات پر بھی ایک سیر حاصل مضمون ہے جو بے حد دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ بیس کے قریب مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں۔

اس طرح "تاریخ اقوام پونچھ" کی دو جلدیں بھی ہیں جو بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہیں۔ دیباچے میں فوق صاحب نے لکھا ہے کہ "اس تالیف کا مقصد یہ نہیں کہ ایک قوم کو دوسری اقوام پر اور ایک خاندان کو دوسرے خاندان پر فوقیت دی جائے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ذاتوں اور گوتوں کی اصلیت اور بناوٹ کی تحقیق

کی جائے اور اس سلسلے میں کوئی خاندان تاریخی، علمی یا مذہبی لحاظ سے یا کسی خاص وجہ سے قابلِ ذکر نظر آئے تو اس کا تذکرہ کر دیا جائے تاکہ اس خاندان کی تاریخی یادگار قائم رہ جائے اور آنے والی نسلوں کو معلوم ہو کہ ان کے اسلاف اگر غریب اور گمنام تھے تو انھوں نے امارت و شہرت اور عزت محض وسائل سے حاصل کی اور اگر وہ امیر اور صاحبِ اقتدار تھے تو ان کا تموّل اور اقتدار کن وجوہ اور طریقوں سے جاتا رہا۔“ ۱۴۰

اس سلسلے کی کتابوں کی اہمیت کے بارے میں اسد اللہ وانی صاحب لکھتے ہیں:

”بہر کیف اقوام کے موضوع پر لکھی گئی اس تاریخ کی تاریخی اعتبار سے جو اہمیت، افادیت اور انفرادیت ہے، وہ اپنی جگہ مانی ہوئی ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ کتاب اسی موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس سے قبل اقوام کے موضوع پر ہمیں ”تاریخ حسن“ جلد اوّل میں تیرہ صفحات پر مشتمل تھوڑا سا مواد ملتا ہے۔ بعد ازاں سر والٹر لارنس نے ”ویلی آف کشمیر“ میں بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ مردم شماری کی رپورٹوں میں بھی ذاتوں اور گوتوں کا سرسری ذکر ملتا ہے۔ مگر یہ مختصر معلومات اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً اور محققین کے لیے خصوصاً ناکافی ہیں۔ اس لحاظ سے باقاعدہ اس موضوع پر سب سے پہلے کتاب لکھنے کا سہرا منشی محمد الدین فوق کے سر ہے۔ یہ موضوع جہاں کافی دلچسپی کا باعث ہے وہاں محققین کے لیے لمحۂ فکریہ بھی ہے۔

یہ کتاب اُردو ادب میں بھی لاثانی ہے کیونکہ اُردو ادب میں ہمیں زیادہ سے زیادہ کسی فرد اور اس کی گوت یا ذات کا تذکرہ ملتا ہے مگر اس موضوع پر مستقل کتاب میسر نہیں۔ منشی محمد الدین فوق نہ صرف مؤرخ تھے بلکہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے تذکرہ نویس، صحافی، شاعر اور ادیب بھی تھے۔ اس لیے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جو ادیبانہ موشگافیاں انھوں نے کی ہیں وہ صرف اور صرف ان ہی کا حصہ ہیں۔ ان کے بعد بھی اس موضوع پر تاریخ یا اُردو ادب میں کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔“ ۱۴۱

نائک یا نیاک ۔ قوم کی تحقیق کے سلسلے میں فوق صاحب نے تاریخی دُنیا میں ایک حیرت انگیز بات کا اضافہ کیا ہے ۔ یہ انکشاف اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا ۔ سلطنت خداداد (میسور) کے بانی حیدر علی اور ان کے فرزند سلطان ٹیپو دو اہم تاریخی شخصیتیں ہیں مگر ان کی اصلیت اور حسب نسب کے بارے میں تمام مغربی اور ہندوستانی مورخین متضاد روایات بیان کرتے ہیں ۔ کوئی انھیں پنجابی بتاتا ہے ۔ کوئی عربی نسل اور کوئی افغان ظاہر کرتا ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ نائک تھے ۔ پھر نائک کو بھی کوئی عرف سمجھتا تھا اور کوئی فوجی عہدہ ۔ مولانا محمود بنگلوری نے اپنی تصنیف "سلطنت خداداد" (میسور) میں لکھ دیا کہ "ہمیں آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ نائک کونسی ذات ہے ؟ کس ملک کی ذات ہے اور اس ذات کی کیا تاریخ ہے ؟" ۴۲

فوق صاحب کی تحقیق کی روشنی میں پروفیسر محمد علم الدین سالک ان تمام مورخوں کے مختلف بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون مطبوعہ "آستانہ" لاہور جولائی ۱۹۳۴ء میں رقم طراز ہیں :

"نائک فوج کا سب سے چھوٹا عُہدہ ہے ۔ کیونکہ سپاہی کے بعد نائک ، نائک کے بعد حوالدار پھر جمعدار پھر صوبیدار وغیرہ عہدے آتے ہیں ۔ حیدر علی اپنی ذاتی ، فطری بہادری اور لیاقت کی بنا پر میسور کے مختار مطلق بلکہ تاجدار بنے اور اس وقت کی تمام طاقتوں سے نبرد آزما ہوتے اتنی منازل طے کرنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فوج کا ایک پست ترین عہدہ ان کے نام کا جز و قرار پائے ۔ نائک یا نیاک کشمیر کی ایک مشہور قوم ہے ۔ اس کے معنی منطقی یا دانشمند کے ہیں ۔ یہ سنسکرت لفظ ہے ۔ (منطق کو سنسکرت میں نیا اور منطقی کو نیانک کہتے ہیں)" ۴۳

کشمیر میں آج سے سات سو سال پیشتر کے ہندو راجگان کے زمانہ اور ان کے بعد سلاطین کشمیر کے عہد میں نائک قوم تلوار کی دھنی تھی ۔ تلوار ہی ان کی دولت اور تلوار ہی ان

کی قسمت تھی۔ تلوار ہی کی وجہ سے انھوں نے کشمیر میں عزت حاصل کی اور تلوار ہی کے بل بوتے پر انھوں نے دکن میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی جس کی شان و شوکت دیکھ کر ایشیا اور یورپ کے بڑے بڑے تاجدار کانپ اٹھتے تھے۔

کشمیریوں کی آمد و رفت پنجاب و ہندوستان میں عرصہ دراز سے چلی آتی ہے لیکن مغلوں کے زمانہ میں زیادہ ہوگئی تھی۔ ان کشمیری مہاجروں میں نائک قوم کے افراد بھی تھے۔ جس طرح کشمیری مہاجر پنجاب سے دہلی، لکھنؤ، آگرہ، بنگال، دکن، نیپال پہنچے، اسی طرح حیدر علی کے آبا و اجداد بھی، جو شیخ کہلاتے تھے، دکن گئے۔ وہاں سے میسور پہنچے۔ حیدر علی نے فوج میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے بادشاہ میسور ہوگئے۔"

پروفیسر صاحب فوق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"حیدر علی کے آبا و اجداد کشمیری تھے۔ نائک قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ترکِ وطن کر کے شمالی ہند میں آئے۔ وہاں سے دکن پہنچے۔ حیدر علی اپنی قوتِ بازو سے ایک عظیم الشان سلطنت کے بانی بنے اور ان کے بیٹے ٹیپو شہید نے خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔"[۴۴]

کشمیر کی ان اقوام کا ذکر بھی فوق صاحب کی ان تصانیف میں ملتا ہے جن کے کئی افراد نے اپنے وطن کشمیر سے ہجرت کرنے کے بعد اپنی اہلیتوں، ذہانتوں اور کوششوں سے نام پیدا کیا۔ کئی نام ایسے ہیں کہ ان کا کشمیری ہونا ایک انکشاف کی طرح لگتا ہے مثلاً سر سید احمد خان کی والدہ عزیز النساء بیگم، مفتی صدر الدین خان آزردہ، سید انشاء اللہ خان انشاء، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست اور نواب سلیم اللہ جیسی ہستیوں کے آبا و اجداد کشمیری تھے۔ منشی محمد دین فوق نے بڑی محنت اور تحقیق سے کام لے کر اقوام کشمیر کا ایک بیش بہا ریکارڈ محفوظ کر دیا ہے۔

فوق صاحب کو اس سلسلہ میں بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انھوں نے حقائق بیان کرنے کی پاداش میں کئی لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا۔ کچھ لوگوں کو یہ اعتراض بھی ہے کہ فوق نے کئی قبیلوں کے حالات مبالغے سے پیش کیے ہیں۔ اس دوران ان پر روپے پیسے وصول کرنے کا الزام بھی لگایا گیا۔ مگر فوق صاحب کے اپنے بیانات کی روشنی میں یہ باتیں قرین قیاس معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ "تاریخ اقوام کشمیر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"راقم کو اکثر اقوام اور اکثر افراد کی طرف سے مصنوعی شجرے اور مبالغہ آمیز حالات ملے کہ ان پر اعتبار کر لینا بہت مشکل ہے۔ خود ان اقوام اور افراد کے ساتھ طویل عرصہ تک خط و کتابت کرنا پڑی اور بعض کتابوں سے مدد لینا پڑی۔ پونچھ کی بعض اقوام نے جو اپنی خاندانی روایتیں بیان کی ہیں حیرت انگیز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ بعض اصحاب تو ایسے ہیں کہ الم غلم، اوٹ پٹانگ جو ان کے جی میں آتا ہے لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ اپنے جہل مرکب کو زبردستی منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ (ہمارے خاندان کو داراشکوہ کی اولاد سے ظاہر کیجیے اس کے لیے اگر کچھ خرچ بھی کرنا پڑے تو بندہ حاضر ہے لیکن یہ ضرور لکھیے کہ ہمارا خاندان پونچھ میں آباد ہے اور داراشکوہ، برادر اورنگزیب کی اولاد ہے۔"

فوق صاحب نے اس طرح کے خطوط چھاپ کر ایک طرف اپنی راہ میں حائل مشکلات کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف سچی بات کی تلاش کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ فوق صاحب کی کتابوں میں اگرچہ تحقیق کا وہ طریقہ نہیں ملتا جسے فلسفہ تاریخ پر محیط اور مثالی رویہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن معلوماتی نقطۂ نظر سے بہر حال یہ ایک

قابل قدر کاوش ہے۔ مصنف نے بڑی محنت سے مختلف اقوام کے بارے میں مواد اکٹھا کیا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد، کشمیر میں ان کی آمد، مقامی باشندوں سے ان کے تعلقات، مقامی باشندوں کی اپنی روایات، تہذیبی اقدار، معروف لوگوں کے احوال، غرض جو چیزیں انھیں میسر آسکیں وہ بڑے سلیقے کے ساتھ جمع کر دیں۔

فوق کا اسلوب بیانیہ ہے، وہ حقائق کو ایک خاص ترتیب سے قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس زمانے میں چونکہ برادریاں اور قبائل حکومتی اداروں سے اپنے کسی فرد کی وابستگی کو بڑی اہمیت دیتے تھے اس لیے اس طرح کے لوگوں کے حالات بھی نمایاں طریقے پر بیان ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے کشمیر کے لوگوں کی بہت سی خصوصیات بھی سامنے آتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس علاقے کی آب و ہوا اور ماحول کے لحاظ سے جو خصائص ایسی اقوام میں ہونے چاہئیں وہ انحطاط اور ادبار کے باوجود موجود رہے۔ سیاسی احوال کی ناسازگاریوں کے ہوتے ہوئے بھی ان خصائص نے نشو و نما پائی۔

فوق اگر اپنی کتابوں کو چند اہم اقوام کے مطالعہ تک محدود کر لیتے تو غالباً ان کے لیے یہ ممکن ہوتا کہ جو مواد انھیں میسر آسکا تھا وہ اس کا فلسفیانہ تجزیہ کر سکتے۔ کشمیر کے ماحول اور سیاسی احوال سے ان کا تعلق واضح کر سکتے۔

اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتابیں بے حد اہم ہیں۔ ہمارا معاشرہ جس انتشار کا شکار ہے اس میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ موجودہ نسلوں سے ہمیں خود ان کے آبا و اجداد کے بارے میں معلومات میسر آسکیں۔ فوق صاحب کے زمانے میں لوگوں کے اندر یہ ذوق تھا اور مصنف کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ وہ یہ سب کچھ جمع کر کے اسے محفوظ صورت میں ہم تک پہنچا دیں۔ اسے اگر محض محفوظ مواد کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی خدمت نہیں:

محمد اسد اللہ وانی اپنے مضمون "تاریخ اقوام کشمیر ایک جائزہ" میں لکھتے ہیں:

"تاریخ اقوام کشمیر" گوناگوں دلچسپیوں کی حامل ہے۔ یہ محقق کے لیے بھرپور مواد، انجان کے لیے جانکاری، تفریح طبع کے متلاشی کو کیف آگیں حالات و واقعات، مؤرخ کے لیے مؤرخانہ کڑیاں، ادیب کے لیے ادیبانہ پیکر تراشیاں اور علم الانساب کے ماہر کے لیے بحرِ بیکراں اور لامحدود صحرا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک گلستان ہے جہاں رنگ برنگ کے پھول بڑی نفاست و نزاکت سے کھلے ہوئے ہیں جن کی عطر بیزی سے ہر مکتب فکر و خیال کے لوگ ہر دور میں یکساں طور پر کیف و سرور حاصل کرتے رہیں گے۔ مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ وہ شخص جس نے اُردو زبان میں تاریخ و سیاسیات کے علاوہ ناول، ڈرامہ، افسانہ، شاعری اور مشاہیر کے تذکروں وغیرہ پر ایک سو کے قریب تصنیف و تالیف کر کے اُردو زبان و ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اس کا جو ذکر ہونا چاہیے تھا وہ دبے الفاظ میں بھی موجود نہیں۔"[۴۵]

مختلف لسانی مسائل کے حوالے سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ کشمیریات کے صدر ڈاکٹر محمد یوسف بخاری نے کشمیر کے قبیلوں اور قوموں کے نسلی رجحانات کا سراغ لگاتے ہوئے فوق کی "تاریخ اقوام کشمیر" سے بہت استفادہ کیا ہے۔[۴۶] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب سے کتنے علوم کی تحصیل و تکمیل میں مدد لی جا سکتی ہے۔

"تاریخ لاہور"

لاہور کے حالات میں مفتی غلام سرور[۴۷]، رائے بہادر کنہیا لال[۴۸]، سید محمد لطیف جج[۴۹] اور مولوی نور احمد چشتی[۵۰] نے بہت کچھ لکھا ہے مگر انھوں نے اپنی تاریخیں انیسویں صدی کے آخر میں لکھیں۔ بیسویں صدی میں فوق صاحب سے زیادہ شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ ڈاکٹر محمد باقر کی کتاب "لاہور پاسٹ اینڈ پریذنٹ" (۱۹۵۲ء) سید ہاشمی فریدآبادی کی کتاب "آثار لاہور" (۱۹۵۹ء) محمد ولی اللہ خاں کی کتاب "لاہور کی عظیم یادگاریں" اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی کتاب "لاہور سکھوں کے عہد میں" (۱۹۶۴ء) "تاریخ مساجد لاہور" (۱۹۷۶ء) اور "تاریخ اماکن لاہور" (۱۹۸۱ء) منشی محمد الدین فوق کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ کرنل بھولا ناتھ کی "تاریخ لاہور" پنجابی زبان میں اور کرنل گولڈنگ اور تھارن ٹن کی انگریزی کتب ان سے کچھ پہلے کی تصانیف ہیں۔

فوق صاحب نے ہندو مسلمان صوفیاء اور بھگتوں کا تذکرہ "یادرفتگاں" (۱۹۰۴ء) "تذکرہ علمائے مشائخ لاہور" (۱۹۲۰ء) اور "تاریخ شالامار باغ" وغیرہ کتابیں لکھیں۔ "تاریخ شالامار" پہلی بار ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ تاریخ لاہور کا ابتدائیہ کہا جاسکتا ہے۔ "تذکرہ علمائے لاہور" کے دیباچے میں فوق صاحب نے تاریخ لکھنے کی اپنی خواہش کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

"۱۹۱۹ء میں قیام ڈھاکہ کے دوران تاریخ لاہور لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تاریخ لاہور خدا جانے کب شروع ہو۔ کب ختم ہو۔ لاہور کے علمائے اسلام نے کیسی کچھ جانفشانیاں کی ہیں۔ اور لاہور ازمنۂ سابقہ میں کس طرح

علم کا گہوارہ رہا ہے۔"

آگے چل کر فوق صاحب لکھتے ہیں کہ:

"لاہور کی علمی ترقی دہلی پر مقدم ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شہر کی تاریخ لکھتے ہوئے وہاں کی علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی صورتحال کا جائزہ بہت ضروری ہے۔ کتاب میں مؤرخین لاہور کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سید محمد لطیف جج، رائے بہادر لالہ کنہیا لال، مولوی نور احمد چشتی اور مولوی محمد الدین فومی کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔ فوق صاحب نے علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول قطب البلاد (لاہور) کی وہ تصویر پیش کی ہے جو اس کے زندہ مستقبل کی علامت بنے۔ فوق صاحب نے لاہور کے روحانی رہنما علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح بھی لکھی ہے۔ جو اپنی جگہ لاہور کی ایک تاریخ ہے۔ "یادِ رفتگاں" میں بھی تاریخ لاہور جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی مضامین بھی لکھے جو وقتاً فوقتاً لاہور کے مشہور رسائل "شباب اُردو"، "قوس قزح"، "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" میں شائع ہوئے۔ ان کی ایک غیر مطبوعہ کتاب "بے نشاں نامور" بھی دستیاب ہوئی ہے۔

"شباب اُردو" خان احمد حسین خاں کی ادارت میں، "نیرنگ خیال" حکیم یوسف حسین کی ادارت میں اور "عالمگیر" حافظ محمد عالم کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ "قوس قزح" کے مدیر وحید کیلانی اور مدیران اعزازی پروفیسر محمد علم الدین سالک اور مولانا محمد عبداللہ قریشی تھے۔

"تاریخ شالامار"

شالامار لاہور کا تاریخی باغ ہے۔ اس کتاب میں اس عظیم الشان باغ کی

تاریخ بیان کی گئی ہے۔ باغ کی تعمیر اور اس کے ساتھ مختلف حکمرانوں کی دلچسپی اور توجہ کے حوالے سے تاریخ لاہور کو ایک نسبتاً مختلف انداز سے تحریر کیا گیا ہے۔ انھوں نے کئی کتابوں کے مطالعے اور باغ کے گہرے مشاہدے کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۔ فروری ۱۹۰۰ء میں چھپا جس کی ضخامت بیس صفحات کے قریب تھی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۸۰ صفحات سے بھی بڑھ گئی۔ اس ایڈیشن کے بارے میں علامہ اقبال نے یہ قطعہ لکھا ہے۔

حسن سعئ فوق را صد مرحبا
ہمت ہر سطر کتابش دلربا
از سر نازش پئے تاریخ او
می سزد تصویر باغ جانفزا

نازش کے "ن" کے پچاس عدد "تصویر باغ جانفزا" کے اٹھارہ سو اکیاون (۱۸۵۱) عدد مل کر تاریخ ۱۹۰۱ء نکلتی ہے۔[۵۱]

احسان شاہجہان پوری نے ۲۲۔ فروری کو فوق صاحب کے نام ایک خط میں یہ شعر لکھے۔

فوق نے تحریر کی "تاریخ شالامار باغ
ہر ورق میں ہے شباہت صفحۂ گلزار کی
دوسری بار اس کے چھپنے کا ہوا اہتمام!
خوبیاں ظاہر ہیں سب حاجت نہیں اظہار کی
سیر اوّل کر چکے احسان لیکن بہر سال
اب بہار حال دیکھو باغ شالامار کی![۵۲]

طبع دُوم کے دیباچے میں فوق صاحب لکھتے ہیں :

"تواریخی حالات، پُرانے کھنڈرات، پُرانے مقبروں اور مکانوں کے دیکھنے کا مجھے شوق ہی نہیں خبط ہے۔ ان درد انگیز اور عبرت خیز نظاروں سے مفید سبق لیتا ہُوں"

فوق صاحب نے دوسری تصانیف کی طرح یہاں بھی جس جس ماخذ سے مدد حاصل کی ہے اس کا کشادہ دِلی سے ذکر کیا ہے۔ "مخزن پنجاب"، "گلدستۂ کشمیر"، "تاریخ کشمیر اعظمی"، "جام جہاں نما"، "تحقیقات چشتی"، "حقیقت الفقراء"، "گلشن پنجاب"، "کنہیالال اور سید محمد لطیف کی تاریخ پنجاب کے علاوہ سر سید احمد خاں کی "آثار الصنادید" سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سر سید نے آثار الصنادید لکھ کر دنیا کو چونکا دیا اور سچ تو یہ ہے کہ اہل ہندوستان کو عموماً اور اپنی بد قسمت قوم کو خصوصاً خواب غفلت سے جگا دیا۔ دہلی کے کھنڈرات اور اس بادشاہی شہر کے مقبروں کی سابقہ اور موجودہ حالت بڑے بڑے پُرانے مکانوں کی کیفیت اپنے جادو بھرے قلم سے لکھی۔ ممکن ہے یہ چھوٹا سا رسالہ بھی جو کمال دِل سوزی، عرق ریزی اور جانفشانی سے تیار کیا گیا ہے سنگ دِل اہل ملک پر اثر ڈال سکے"

شالامار کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک متاثر کرنے والی کتاب ہے۔

طبع سوم ۱۹۰۲ء کے دیباچہ میں فوق صاحب نے اپنی تمام تصانیف میں سے شالامار پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ طبع اول دہلی دروازہ گلی پھلیریاں لاہور، طبع دوم پبلک بک ایجنسی لاہور اور طبع سوم بالو ایشر داس کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

۱۹۰۳ء میں چوتھا ایڈیشن لاہور ہی سے حکیم رام کشن نے چھاپا۔ بعد میں وہ ہر دوسرے تیسرے سال یہ کتاب چھاپتے رہے۔ انجمن ترقی اُردو کراچی کی لائبریری سے

فوق صاحب کی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے اس کا نام "تحفہ چراغاں" ہے۔ کتاب پر حکیم رام کشن نے سن اشاعت ۱۹۱۵ء لکھا ہے۔ چالیس صفحات کی اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ "تاریخ شالامار" سے مختلف کتاب نہیں۔ نجانے اس کا نام کس نے بدل دیا۔ کتاب کے پہلے صفحے پر فٹ نوٹ (حاشیہ) میں لکھا ہے۔

"چونکہ میلہ چراغاں اصل میں حضرت لال حسین کے عرس کا ہی نام ہے جس کی مفصل کیفیت اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو گی حضرت مادھولال حسین کے مفصل حالات اگر دیکھنے ہوں تو کتاب "تاریخ شالامار باغ لاہور" سے ملیں گے جو اپنی مقبولیت کے باعث پانچ مرتبہ چھپ چکی ہے۔"

اس کتاب کا آغاز حضرت مادھولال حسین کے حالات سے ہوتا ہے جس میں میلہ چراغاں کی تفصیلات بھی ہیں جو شالامار باغ کے ایک حصے میں لگایا جاتا ہے جب کہ "تاریخ شالامار باغ" میں لال حسین کا تذکرہ کہیں درمیان میں ہوتا ہے۔

تاریخ شالامار باغ کی مقبولیت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ فوق صاحب کی زندگی میں کئی بار شائع ہوئی۔ افتخار ڈار اپنے مضمون "محمد دین فوق — چند اہم واقعات" میں لکھتے ہیں۔

"۱۹۰۰ء میں تاریخی کتاب شالامار تصنیف کر کے فوق صاحب نے شائع کی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ۱۹۲۷ء تک اس کے چودہ ایڈیشن شائع ہوئے۔"[۵۳]

۱۹۲۳ء میں کتاب مفصل طور پر لکھی جا چکی تھی مگر اس کے صرف چار ابواب شائع ہوئے جن میں شالامار باغ لاہور کے علاوہ دیگر مقامات کے شالامار باغ، حضرت مادھولال حسین کے حالاتِ زندگی اور باغبانپورہ کے تاریخی حالات شامل ہیں۔ اس

کتاب کو ایک بڑی کتاب کا ضمیمہ تصور کرنا چاہیے لیکن اس کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی اس کے نامکمل ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ فوق صاحب کے اسلوب کی ایک خوبی ہے۔

لاہور کے اس تاریخی باغ کے شاہی ایوانات، شاہی محل سراؤں اور سیرگاہوں کی تصویر کشی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مغلوں کے بعد نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، رنجیت سنگھ اور اس کی اولاد نے اس فقید المثال باغ کے ساتھ کس قسم کا بے دردانہ سلوک کیا۔ اس کے علاوہ کشمیر اور دہلی اور پنجاب کے دوسرے کئی باغوں کے کوائف بڑی محنت سے اکٹھے کیے گئے ہیں جو شالامار کے نام سے معروف ہیں۔

لفظ شالامار کی وجہ تسمیہ کے متعلق چونکہ زمانۂ شاہجہان کے مؤرخ مُلا عبدالحمید لاہوری نے کوئی ذکر نہیں کیا اس لیے بعد کے تمام مصنفین محض قیاس آرائیوں سے کام چلاتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اصل نام شعلۂ ماہ ہے۔ نادر شاہی مؤرخوں بالخصوص مرزا مہدی علی خان نے "تاریخ جہان کشائے جونہی" میں یہی نام لکھا ہے۔ کشمیر کے شالامار باغ کے ضمن میں لکھا ہوا ہے کہ اگنی پُوران میں ایک پھول کا نام شالی مالی ہے جو دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ پھول اس علاقہ میں کثرت سے ہوتا تھا۔ بہت مشہور ہوا، بعد میں شالامار بن گیا۔ فوق صاحب نے شالار مار باغ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یہ تفصیلات لکھی ہیں۔ انھوں نے شاہجہان کے قیام شاہدرہ کے وقت ایک خواب کا ذکر کیا ہے۔ جو بادشاہ نے دیکھا تھا ——— بادشاہ اپنے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتا تھا۔ فوق صاحب نے لکھا ہے کہ مُلا عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ کے حوالے سے، اس بے نظیر باغ کی تیاری پر چھ لاکھ روپے کے اخراجات اٹھے تھے۔ اور یہ ۱۰۴۶ھ میں مکمل ہوا۔ بادشاہ کے سامنے ایک شاعر نے یہ قطعہ سنا کر دس ہزار روپے اور ایک خلعت فاخرہ انعام میں وصول کی۔

چوں شاہجہاں بادشاہ حامیٔ دیں
آراستہ شالامار بطرز متیں
تاریخ بنائے ایں زرضواں جستم
گفتہ کہ بگو نمونۂ خلدِ بریں

سات چھوٹے چھوٹے باغوں پر مشتمل شالامار باغ کے قریب والی امارات کا ذکر بھی کتاب میں ملتا ہے۔ فوق صاحب کا طرزِ بیاں بہت خوبصورت ہے۔ ایک عظیم الشان شاہی باغ کی منظر کشی خوبصورت طریقے سے کی گئی ہے۔ کتاب میں شاہجہاں کے جشنِ نوروز کا تذکرہ بھی ہے جو ۱۰۴۱ھ میں منعقد ہُوا۔

ایک باغ کی سیر کا احوال لکھتے ہُوئے فوق نے لاہور شہر کی تاریخ لکھ دی ہے جو اس زمانے کا احوال بھی ہے۔ کسریٰ منہاس اپنے مضمون "مؤرخین لاہور" میں لکھتے ہیں کہ:

"مؤرخین لاہور کی طویل فہرست میں سے ہم نے سولہ مؤرخین کو نمائندہ قرار دیا ہے۔ ان میں کچھ مغلیہ دَورِ حکومت کے نمائندے ہیں کچھ انگریزی دَورِ حکومت کے ہیں اور کچھ پاکستانی مؤرخین کے یہ سوانحی کوائف مستند اور معتبر کتب سے اخذ وانتخاب کرکے پیش کیے گئے ہیں"۔

ان مؤرخین میں گیارہویں نمبر پر منشی محمّد دین فوق کا تذکرہ ہے باقی مؤرخین کے نام یہ ہیں۔ عبدالحمید لاہوری مصنف "بادشاہ نامہ (۱۸۶۷ء)، شہزادہ دارا شکوہ، مصنف "سفینۃ الاولیاء" (۱۸۵۳ء)، چندر بھان برہمن مصنف "چار چمن برہمن"، قلمی پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔ محمّد صالح کمبوہ مصنف "بہارِ سخن"، قلمی گولڈنگ مصنف "اولڈ لاہور" (۱۹۲۴ء) و نتھارنٹن مصنف، لاہور" (۱۸۶۰ء)۔ نور احمد چشتی مصنف "تحقیقات چشتی" (۱۸۶۴ء)۔ رائے بہادر کنہیا لال مصنف "تاریخ لاہور"

(۱۸۶۴ء)۔ مفتی غلام سرور لاہوری مصنف "تاریخ مخزن پنجاب" (۱۸۸۵ء)۔ سید محمد لطیف مصنف "لاہور" (۱۸۹۲ء)۔ کرنل بھولا ناتھ مصنف "شہر لاہور دی تاریخ" (۱۹۳۳ء) کرنل نیول مصنف "لاہور" (۱۹۵۵ء)۔ سید ہاشمی فرید آبادی مصنف "آثار لاہور" (۱۹۵۶ء)۔ ڈاکٹر محمد باقر مصنف "لاہور پاسٹ اینڈ پریزنٹ" (۱۹۵۲ء)۔ پیر غلام دستگیر نامی مصنف "تاریخ جلیلہ"، (۱۹۳۷ء)

کسری منہاس نے فوق صاحب کو پنجاب کے اوّلین اور مایہ ناز مؤرخوں اور صاحب نظر مصنفوں میں شامل کیا ہے۔

"یادِ رفتگاں"

"یادِ رفتگاں" فوق صاحب نے ۱۹۰۴ء میں لکھی جسے سٹیم پریس لاہور نے شائع کیا۔ یہ کتاب لاہور کے صوفیاء کے بارے میں ہے۔ جن کے قلبی کمالات کی مشعل فوق صاحب لوگوں کے دلوں میں جلانا چاہتے تھے۔ وہ اہلِ دل جن کی زندگیاں لاہور میں گزریں۔ فوق صاحب نے کچھ غیر مسلموں کے احوال بھی لکھے ہیں۔ یہ لوگ اپنی قوم کے لوگوں کے لیے عقیدتوں کا مرکز تھے۔ برِصغیر میں مسلم صوفیاء کی خدمت میں ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی حاضر ہوتے تھے۔ ان حالات کے بیان میں وہ ساری روحانی فضا آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ جو ان بزرگوں کی موجودگی سے لاہور میں قائم ہوتی تھی۔

ان صوفیاء میں حضرت شاہ ابو المعالی، شاہ چراغ، موج دریا، شاہ محمد غوث، شاہ جمال، درس میاں وڈا، بی بی پاکدامن، طاہر بندگی، شاہ بلاول، سید جان محمد حضوری، گھوڑے شاہ، پیر مکی، میراں شاہ، حضرت ایشاں، حضرت لال حسین، حضرت شیخ مادھو، علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میاں میر کے علاوہ دوسرے کئی مسلم صوفیاء کے

علاوہ گوروارجن، چھجو بھگت اور گورو سری چند کا احوال بھی تحریر کیا ہے۔

فوق صاحب صوفیاء کے حالات لکھتے ہوئے ان کی پیدائش، ان کا سلسلۂ تصوف، ان کے آباؤ اجداد، ان کے دوسرے مشاغل و مصروفیات ان کی کرامات، ان کے مزار پر عرس کا حال، ان کے بارے میں مشہور حکایات بیان کرتے ہوئے ہر پہلو سے بہت مؤثر طریقے سے بات کرتے ہیں۔ کسی واقعے کے ضمن میں مختلف مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتے۔ تو فوق صاحب کئی تاریخی شواہد پیش کر دیتے ہیں۔

صوفیاء کے لیے فوق صاحب کے دل میں عقیدت و محبت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ اس کتاب میں مؤدبانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ان کی عقیدت مندی قابلِ دید ہے۔ غیر مسلم صوفیاء کا تذکرہ بھی بہت عزت و احترام سے کیا ہے۔ وہ دردو محبت کی متاع کی جستجو میں کسی بھی آدمی کے پاس جانے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس معاملے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ گوروارجن کی مغل بادشاہوں سے آویزش کو اس کے بھائی چندرلال کی سازش قرار دیتے ہیں۔

اس کتاب میں ہمیں صوفیائے لاہور کی ایک واضح تصویر دکھائی دیتی ہے صوفیاء کے فیضان سے جگمگاتے ہوئے شہر میں اس کتاب کو پڑھنے والا بھی کچھ وقت گزار لیتا ہے۔ فوق صاحب اس کتاب میں لاہور کو نور و سرور کے آئینے میں دیکھ رہے تھے۔ ان کا اسلوب بیان اتنا دردمندانہ ہے کہ وہ اپنی یہ کیفیت لفظوں میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ تاریخ نویسی کے دوران بادشاہوں کے دربار عام کا نقشہ بھی کھینچتے ہیں مگر ان کا ایمان ہے کہ اصل دربار اولیاء اللہ کی محفل ہے۔ "دربار علی ہجویریؒ" کی رونق کسی زمانے میں کم نہیں ہوئی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مر کر بھی نہیں مرتے۔ اور ان کی قبریں بھی زندہ رہتی ہیں۔ ان کے حالات زندگی ہی اصل تاریخ انسانی ہے۔ لاہور چونکہ ہمیشہ اولیاء اللہ کا مرکز رہا ہے۔ اس لیے

فوق صاحب نے تاریخ لاہور میں اس موضوع کو اوّلیت اور اہمیت دی ہے۔ ان کا انداز بیان پُرتاثر ہے۔ علامہ اقبال کا فوق صاحب کے نام خط بہت اہم ہے جو اکتوبر ۱۹۱۰ء میں لکھا گیا تھا۔

"اہل اللہ کے حالات نے جو آپ نے بنام "یادِ رفتگاں" تحریر فرمائے ہیں۔ مجھ پر بڑا اثر کیا۔ اور بعض باتوں نے جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں۔ مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا ...... بھائی فوق! خود بھی اس گوہر نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے۔"[۵۵]

اس کتاب سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے اپنی یہ مشہور غزل کہی۔ جس کے دو اشعار یہ ہیں۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں[۵۶]

صوفیاء کے حوالے سے لاہور کے تاریخی منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے علاوہ فوق صاحب نے لاہور کے ماضی وحال کا سراغ لگانے کی کوشش میں شہر کے آباد ہونے کی کہانی بھی کہی ہے۔ فوق صاحب نے اس شہر کے بانی راجہ رام چندر جی کے بیٹے راجہ لَوہ کو قرار دیتے ہوئے اس بیان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض یورپین مؤرخوں کے نزدیک لاہور یونانیوں کے حملے کے بعد آباد ہوا۔ اس کے علاوہ لاہور پہ محمود غزنوی کے حملوں سے لے کر سکھ اقتدار اور پھر انگریزوں کے قبضے تک تمام حالات اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ طویل تاریخ کی تلخیص جس مہارت کے ساتھ فوق صاحب نے پیش کی ہے، بہت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ تاریخ لاہور کا یہ خلاصہ

ایک کارآمد اشاریے کا کام دے سکتا ہے۔ لاہور کے اس تذکرے کو صوفیاء کے ذکر سے مربوط کر کے فوق صاحب نے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ صاحبانِ اقتدار کے درمیان دلوں پر حکومت کرنے والے صوفیاء تاریخ کا اصل عنوان اور موضوع ہیں۔
کتاب کے مقدمے میں فوق صاحب نے مختلف فکری مسائل پر بحث کی ہے۔ اور صوفیاء کے نزدیک ان کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں محققانہ تجزیہ کیا ہے۔ خاص طور سے سماع کے بارے میں مختلف صوفیاء کے خیالات اور ان کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سماع حرام نہیں۔ مگر اس کے سننے کے لیے چند شرائط کی پابندی لازمی ہے۔ سماع کے ذریعے صوفیاء نے برصغیر میں جس طرح تبلیغ کا کام لیا۔ فوق صاحب اس فن کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔
سید سلیمان ندوی کی ایک کتاب کا نام بھی "یادِ رفتگاں" ہے۔ اس میں ندوی صاحب نے ہر شعبے کے مرحوم اہلِ کمال کا ذکر کیا ہے۔ فوق صاحب کی کتاب اس سے قدرے مختلف ہے۔ ندوی صاحب گزر چکے لوگوں کا ملال کرتے ہیں۔ فوق صاحب رفتگاں کے جلال و جمال کو اپنے زمانے میں بھی زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ع

میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

"تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور":

اس کتاب میں لاہور کے سوا سو علمائے کرام اور مشائخ عظام کا ذکر ہے۔
کسی زمانے اور کسی شہر کا مکمل تاریخی احوال بیان نہیں ہو سکتا جب تک علمی و مذہبی تناظر میں ایک بھرپور جائزہ نہ لے لیا جائے۔ فوق صاحب تاریخ نویسی میں ہر سبل فن کے سارے پہلوؤں سے واقف تھے۔ مسلم بادشاہوں کے علاوہ ایک تاریخ اسلام علماء اور اولیاء نے بھی بنائی ہے۔ اور یہ تاریخ سچی تاریخ ہے۔

علمی و روحانی اور تہذیبی و ثقافتی میدانوں میں جو کچھ ہُوا۔ وہی اپنے زمانے بلکہ ہر زمانے کے تسلسل اور ارتقاء کا ضامن بنتا رہا۔ لاہور تو علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ اور اس کی تصدیق خود فوق صاحب نے دیباچے میں کر دی ہے۔ یہ کتاب ان کی کتاب "یادِ رفتگاں" میں لاہور کے ثقافتی جائزے کا ایک تسلسل ہے۔ اُنھوں نے اولیائے کرام کے بارے میں اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ایک تو ان سوانح عمریوں میں شخصیتوں کے ذریعے پُورا عہد ہم سے کلام کرتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ عُلماء و اولیاء کو انسانیت کا اصل رہنما سمجھتے تھے اور ہر طرح کے تاریخی ارتقاء میں ان کی خدمات کو اہمیّت دیتے تھے۔

"تذکرۃ العلماء والمشائخ لاہور" میں پانچویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی کے اواخر تک لاہور کو دینی و علمی مجلسوں اور برکتوں کی وجہ سے فخر البلاد بنانے والے صوفیاء شامل ہیں۔ انھی کی وجہ سے لاہور میں ایسے لوگ پیدا ہُوئے جو علمی اور روحانی حلقوں میں اہلِ علم اور اہلِ نظر لوگوں کی طرح اشاعت دین اور ترویج علوم کے لیے مشہور ہُوئے۔ ان درس گاہوں میں مُفت تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں سے بڑے بڑے علاّمہ، فلسفی، منطقی، فقیہہ، محدّث، شاعر، حریّت پسند اہلِ علم و حق گو اہلِ قلم پیدا ہُوئے۔ کتاب کے آخر میں اپنے عہد کی ایسی ہی چند باکمال عورتوں کے حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

کتاب میں لاہور کی درس گاہوں کا حال بھی لکھا گیا ہے۔ پُرانی اسلامی درسگاہوں میں "درس گاہ ملا شاہ خواجہ شاہجہانی"، سکھوں کے عہد میں "مدرسہ خلیفہ غلام رسول" اور اپنے زمانے کی ایک علمی تحریک "انجمن حمایت اسلام" کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ فوق ان درس گاہوں کا عمومی احوال لکھنے کے علاوہ یہاں پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کا بھی مختصر تذکرہ کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مرحومین کے مزار کا حال، مزار پر تاریخ وفات کا اندراج اور صاحبِ مزار کے بارے میں بھی

اظہار خیال کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل علماء صوفیاء میں سے مولانا مسعود ابن سعد ابن سلیمان کا ذکر پہلے نمبر پر کیا گیا ہے۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے زمانے کے بارے میں فوق صاحب نے مولانا آزاد بلگرامی کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ "تاریخ فرشتہ" کے مطابق وہ سلطان ابراہیم غزنوی کے آخر زمانہ میں پیدا ہوئے۔ سلطان ابراہیم نے ۴۹۲ھ میں وفات پائی۔ مولانا عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ ان کے علاوہ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سعد اللہ لاہوری، ملّا عبد السلام لاہوری، حاجی یار محمد، مفتی شیخ مکرم، شاہ ابو المعالی قادری، قاضی صدر الدین عالم جید، مرزا نظام الدین احمد، مولوی عبد الحکیم گیلانی، خواجہ محمد سعید لاہوری، حضرت میاں نتھا لاہوری، شیخ محمد میر عرف حضرت میاں میرؒ، شیخ محمد مکی لاہوری، پیر قلندر شاہ قریشی، حضرت شاہ عنایت قادری شطاری، امام غلام محمد المشہور امام گاموں، مولوی حافظ ولی اللہ، شیخ عبد اللہ بلوچ، سائیں سید قطب شاہ، خلیفہ غلام رسول غلام اللہ مجتہد العصر، مولانا سید ابو القاسم اہم نام ہیں۔ عورتوں میں سے فوق صاحب نے کچھ عورتوں کے علاوہ زیب النساء بیگم مخفی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے بیان میں "تاریخ لاہور" کا انداز دیکھیے۔

"۸۹۵ھ میں بعہد شہنشاہ اکبر لاہور آئے۔ آپ کے علم و فضل اور تقدس و زہد کی وجہ سے ہر وقت آپ کے پاس علماء اور صوفی منش بزرگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ حضرت ملّا شاہ بدخشانی، خواجہ بہاری اور میاں نتھا لاہوری آپ کے مریدوں اور شاگردوں میں ممتاز تھے۔ ان بزرگوں کے دم قدم سے لاہور بلکہ پنجاب میں علم دین اور علم تصوف کا مینہ برس رہا تھا۔ جہانگیر اور شاہجہان نے آپ سے کئی ملاقاتیں کیں "تزک جہانگیری" اور "شاہجہان نامہ" میں کئی جگہوں پر آپ کا تذکرہ موجود ہے۔"

اس خوبصورت اور جامع اظہار خدمت کے ساتھ فوق صاحب نے یہ اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر تھوڑی سی اور محنت کی جاتی اور چند کتابیں اور بعض اصحاب سے عاریتاً مل جاتیں تو کتاب میں تھوڑا بہت اور اضافہ ہو جاتا۔ مگر نہ تو کتابیں ملیں اور نہ میری طویل علالت اور نقاہت نے اجازت دی۔"

کتاب کے بارے میں فوق صاحب کے اپنے بے لاگ بیان و تبصرے کے بعد کچھ اور گنجائش نہیں کہ کتاب پر مزید بحث کی جائے۔

چھہتر صفحے کی یہ کتاب ۱۹۲۰ء میں گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور والوں نے شائع کی تھی۔

"لاہور عہدِ مغلیہ میں"

(شباب لاہور)

"لاہور عہدِ مغلیہ میں" کے مندرجات پہلے مضامین کی صورت میں "شباب" لاہور ۲۴-۱۹۲۳ء اور "قوس و قزح" لاہور ۱۹۲۶ء میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں ان کی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں کتابی شکل دے دی گئی۔ یہ ۱۹۲۷ء میں ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ایک سو بیس صفحات ہے۔

اس کتاب کا اصل نام "شباب لاہور" تھا۔ یہ دراصل فوق کی مکمل تاریخ لاہور کا ایک حصہ ہے جو بوجوہ مکمل نہ ہو سکی۔ سب حصوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) لاہور قدیم (۲) شباب لاہور (۳) زوال لاہور
(۴) سکھی لاہور (۵) عہد جدید کا لاہور۔

فوق صاحب "لاہور عہد مغلیہ میں" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

"میرا ارادہ یہ تھا کہ ان تاریخی شکر پاروں کو اپنے اپنے موقع پر "تاریخ لاہور" کے صفحوں میں جگہ دوں گا۔ لیکن نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ لاہور جس کا بہت سا بے ترتیب حصہ منتشر طور پر لکھا ہُوا موجود ہے کب مکمل ہو۔ اس لیے اس خیال سے کہ یہ تاریخی مضامین ضائع نہ ہو جائیں مَیں نے ان مضامین کو بعنوان "لاہور عہدِ مُغلیہ میں" کتابی صورت میں چھاپ دیا۔"

کتاب کا آغاز عہد بابر سے ہوتا ہے، اور اس کا اختتام عالمگیر پر ہوتا ہے۔ اس میں لاہور کی تاریخی اہمیت، یہاں مختلف بادشاہوں کا قیام، ان کی تعمیرات اور ان کے عہد میں لاہور کے حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خاص طور سے لاہور میں تاریخی نوعیت کی عمارات کے بارے میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

لاہور کی تعلیمی درسگاہوں اور ان میں موجود اساتذہ کے بارے میں بھی مضمون موجود ہے جس میں اس وقت کے تعلیمی حالات اور نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔ مغل بادشاہوں اور ان کے مقرر کردہ گورنروں کے لاہور میں قیام کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لاہور کے مختلف علاقوں اور عمارتوں کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے مثلاً صفحہ نمبر ۱۰۴ پر چو برجی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"باغ کی چار دیواری نہایت مضبُوط اور چونا تھی۔ جب دریا کی شورش انگیز لہریں چار دیواری تک آپہنچیں تو نہ صرف چار دیواری بلکہ باغ کے اندر کی شاندار عمارتیں بھی مسمار ہوگئیں یہاں تک کہ اب صرف ڈیوڑھی کا دروازہ جس کا نام چو برجی ہے باقی رہ گیا۔"

مختلف مضامین میں اس وقت کے لاہور کے مذہبی اور سیاسی حالات بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، رسم و رواج

معاشرت کے بارے میں فوق صاحب نے کم توجہ دی ہے۔ فوق صاحب نے اس وقت کے مروّجہ معیار کے مطابق تاریخ کو بادشاہوں کی فتوحات اور ان کی تعمیر کردہ عمارات اور ان کے ساتھ متعلق حالات تک محدود رکھا ہے۔ اگر ہم اس زمانے کے حوالے سے اس کتاب کا مطالعہ کریں جب فوق صاحب یہ مضامین تحریر کر رہے تھے تو یہ ایک اہم تصنیف ہے۔

فوق صاحب کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قارئین کی دلچسپی کو مدِّنظر رکھا گیا ہے۔ لاہور کے بازاروں کی رونق اور دیگر عجائبات پر خاص توجہ صرف کی گئی ہے۔ اور کتاب کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے مقابلے میں دوسری تاریخیں واقعات کی جزئیات اور ان کی صحت پر زور دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعد کی تاریخوں میں مواد زیادہ ہے کیونکہ بعد کے مصنفین کو کچھ ایسے ماخذ مل گئے تھے جو فوق کے زمانے تک عام طور پر معلوم نہ تھے۔ ان کتابوں میں لطیف کی "تاریخ لاہور" اور کنہیا لال کی "تاریخ لاہور" قابلِ ذکر ہیں۔ لاہور کی وجہ تسمیہ اور اس کی ابتدا کا حال فوق کے یہاں کمزور ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ فوق کا طریقہ کار متفرق نگارانہ تھا۔ ایک صحیفہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کا قاری تھک نہ جائے اور اس کی دلچسپی قائم رہے۔ فوق نے سنین کا اہتمام بھی کیا ہے لیکن اس میں بھی وہ روا روی میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ فوق کی کتاب آج بھی دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہے کیونکہ لاہور کے نمایاں تاریخی مقامات کی سیر اس کتاب سے باآسانی ہو جاتی ہے اور قاری کو طویل بحثوں میں نہیں پڑنا پڑتا۔

ڈاکٹر حسن اختر نے اپنے مضمون "لاہور کی تہذیبی قدریں" میں اہل لاہور کے جلسے جلوسوں کے شوق، سیر و تفریح اور موسیقی کی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے دو جگہوں پر

"لاہور عہدِ مغلیہ میں" کے حوالے دیے ہیں[۵۸] اور کتابیات میں اس کتاب کو شامل کیا ہے۔

۱۹۲۵ء میں سید نور احمد بی اے (علیگ) نے "دی نیو اورینٹ" کے نام سے ایک ماہنامہ انگریزی میں جاری کیا۔ اس کے اپریل کے پرچے میں صفحہ ۳۶ پر فوق صاحب کا ایک مضمون اردو سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپا۔ ترجمہ کرنے والے ایم۔ آئی صدیقی بی اے (علیگ تھے اور مضمون کا عنوان تھا:

فوق صاحب کے متعلق مدیر نے لکھا تھا کہ "وہ تاریخی ریسرچ کے میدان میں ایک خاموش کام کرنے والے آدمی ہیں"۔

"مآثر لاہور"

فوق صاحب نے لاہور کے باغات اور مقبروں پر بھی ۱۹۲۲ء سے کچھ مواد جمع کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ احباب نے پھر تحریک کی کہ اسے بھی طبع کر دیا جائے۔ فوق صاحب خود لکھتے ہیں:

"خصوصاً مولانا محمد عبداللہ قریشی بی اے نے جو خود بھی اہل قلم ہیں اور جن کا ذوق تاریخ طبیعت ثانیہ بن چکا ہے، ان کی طباعت و حفاظت پر بہت زور دیا اور فرمایا کہ اگر سارا مواد طبع نہیں ہو سکتا تو لاہور کے باغات کا ذکر "باغوں کا شہر" کے نام سے ضرور چھاپ دیا جائے۔ لیکن لاہور کے قدیم شاہی باغات اور کئی دوسرے باغات مزاروں اور مقبروں کے ساتھ ملحق نظر آئے، اس لیے باغات کے ساتھ مقبروں کے ماضی و حال کی کیفیت کو نظر انداز کرنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ بلکہ ایسے مزارات کا ذکر بھی کر دیا گیا، جن کا تعلق کسی باغ سے نہ تھا۔ صرف باغ اور مزار ہی کا ذکر نہیں بلکہ

صاحبانِ قبور کے جس قدر قابلِ ذکر حالات مل سکے وہ بھی لکھ دیے گئے جن سے ان کے سوانح زندگی اور لاہور کے بعض تاریخی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے حقیقت یہ ہے کہ سوانح حیات نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"[۵۹]

لاہور کے متعلق فوق صاحب کا یہ آخری کارنامہ تھا جو ۱۹۴۴ء میں صورت پذیر ہوا۔ اس کے ایک ہی سال بعد ۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کے صاحبزادوں ظفر الحق اور ظفر احمد نے باپ کے کچھ قلمی مسودے مولانا محمد عبداللہ قریشی کے حوالے کر دیے۔ انھوں نے مسودوں کی ترتیب و تہذیب کا کام شروع کیا۔ "مآثرِ لاہور" یعنی باغات و مزارات کا کام بڑا پھیلا ہوا تھا۔ قریشی صاحب نے اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا[۶۰] بعض جگہ مفید حواشی لکھے۔ جہاں جہاں اضافے کی ضرورت تھی، وہاں اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ قدیم و جدید مساجد کے حالات خود لکھ کر شامل کیے۔ کیونکہ یہ بھی آثار ہی کا حصہ ہیں۔ اس طرح "مآثرِ لاہور" کا یہ قیمتی ذخیرہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور فروری ۱۹۶۲ء میں "نقوش" کے لاہور نمبر کی بنیاد بنا۔ صرف یہی ایک مضمون "نقوش" کے ساڑھے تین سو صفحات پر محیط ہے۔

قریشی صاحب کا کہنا ہے کہ "نقوش" کے لاہور نمبر میں شائع کرانے سے پہلے وہ "مآثرِ لاہور" کا پورا مسودہ جو چار پانچ جلدوں پر مشتمل تھا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور میں لے گئے تھے۔ مگر وہاں کوئی حوصلہ افزائی نہ کی گئی بلکہ کہا گیا کہ وہ کچھ معاوضہ لے کر یہ مسودہ ان کے حوالے کر دیں۔ ان کا اپنا آدمی اسی موضوع پر کام کر رہا ہے۔ اسے کوئی کام کی چیز نظر آئے گی تو وہ استعمال کرے گا۔ مگر قریشی صاحب چونکہ "نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن" کے مقولے پر عمل پیرا تھے، اس لیے انھوں نے واپس آکر محمد طفیل مدیر "نقوش" کو لاہور نمبر نکالنے کا مشورہ دیا۔ وہ مان گئے اور اس طرح فروری ۱۹۶۲ء میں یہ تاریخی نمبر شائع ہوا۔ اس عرصے میں سید ہاشمی فرید آبادی کی کتاب

"مآثرِ لاہور" کے نام سے بازار میں آگئی، جس میں لاہور کے آثار کا ذکر برائے نام ہے۔ قریشی صاحب مدیر "نقوش" کے شکر گزار ہیں کہ ان کے طفیل یہ تاریخی نقوش محفوظ ہو گئے ورنہ ان کو روشنی کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ اور انھوں نے خود ان کو سنوارنے میں جو محنت کی تھی وہ بھی غارت ہو جاتی۔

"مآثرِ لاہور" لکھتے وقت کسی باغ یا کسی صاحب مزار کے حالات سے متأثر ہو کر فوق صاحب کے قلم سے اتفاقیہ طور پر کوئی شعر نکل گیا۔ پھر انھوں نے اپنے اوپر پابندی عائد کر لی کہ ہر نئے عنوان کے تحت مضمون کے مطابق اسی زمین اسی قافیہ اور ردیف میں ایک آدھ شعر ضرور ہونا چاہیے۔ چونکہ وہ پیدائشی طور پر شاعر بھی تھے، اس لیے اس پابندی کو آخر تک کامیابی سے نبھا گئے اور اس طرح تاریخ نویسی کے ایک انوکھے اسلوب کی ترقی یافتہ شکل ہمارے سامنے آئی۔ اگر ان سب اشعار کو یکجا کیا جائے، تو ایک اچھی خاصی نظم پڑھنے کو مل جاتی ہے اور لاہور کے باغات اور مزارات کی ایک منظوم تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ یہاں مآثرِ لاہور کا خلاصہ پیش کرنے کی بجائے صرف اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اشعار میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

مزار شاہ حسین زنجانیؒ:

چاہ میراں میں ہے بے شک مرقدِ شاہ حسین
اے فلک لیکن کہاں اب باغِ زنجاں دیکھیے!

باغ و مقبرہ ابوالنجم ملک احمد ایاز:

کر دیا آباد جس نے از سرِ نو شہر کو
آج اس کا مقبرہ اور باغ ویراں دیکھیے

مزار گنج شہیداں:

دیکھیے قرباں گہِ تسلیم کا منظر کبھی
دیکھیے لاہور میں گنج شہیداں دیکھیے

مزار حضرت پیر مکیؒ:

پیر مکیؒ کے مزارِ پاک کے انوارِ فیض
آنکھ لائق دیکھنے کے ہو تو ہاں ہاں دیکھیے

حضرت پیر بلخی شہید:

پیر بلخی چشم ظاہر میں تھے اِک صُوفی بزرگ
چشم باطن سے انھیں غازیٔ مُسلماں دیکھیے

مزار میراں بادشاہ سیّد اسحاق گاذرونی:

عہد تغلق کے بزرگ اولیں لاہور میں
روضۂ اسحاق میں آنکھوں سے پنہاں دیکھیے

مزار حضرت سیّد بلند:

خویش و بیگانہ نے گو اکثر مٹا ڈالے مزار
ہو نہ جائے گُل یہ شمع ماہِ عرفاں دیکھیے

مزارحضرت پیر زکی شہید:

یکی دروازے کے اندر حضرت پیر زکی
کس طرح اسلام پر ہوتے ہیں قرباں دیکھیے

مزارحضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی:

گنج عرفاں ہے کہ ہے درگاہ شاہ عبدالجلیل
آیئے ایماں کی شمع فروزاں دیکھیے!

مزارحضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ:

جس خزانے سے ملی روحانیت اجمیر کو
آیئے لاہور میں وہ گنج عرفاں دیکھیے

باغ دِل افروز:

یُوں تو صحرا بھی بنے اکثر گلستاں بوستاں
بن گیا ہے جو بیاباں وہ گلستاں دیکھیے

باغ بارہ دری میرزا کامران:

دِل کا اِک اِک داغ اب اپنی جگہ ہے باغ باغ
یُوں تو دیکھے ہیں بہت یہ بھی گُلستاں دیکھیے

مزار پیر بُرہان صاحب:

جن بزرگوں کے نہیں حالات کا کوئی پتہ
ان بزرگان سلف میں پیر بُرھان دیکھیے

مزار حضرت مَوج دریا:

بحرِ عالم میں مزار مَوج دریا دیکھ کر
کشتئ عمر رواں کو فوق لرزاں دیکھیے

باغ و مزار شاہ بلاول:

رنگ لائی داغہائے اشک پُرخوں کی بہار
کھینچ گئی دامن پہ تصویرِ گلستاں دیکھیے

باغ میرزا نظام الدین احمد:

جس کے اِک اِک برگ پر تھی داستان رنگ و بُو
بے نشاں وہ آج سب حسن گلستاں دیکھیے

مزار مادھولال حسین:

زندگی میں بھی رہے من تُو شُدم تُو من شُدی
بعد مرنے کے بھی اِک قالب میں دو جاں دیکھیے

مزار شیخ حسین جامی:

جس کا اِک ادنیٰ سا خادم تھا شہ ہندوستاں
قبر اس جامی کی عبرت گاہ اِنساں دیکھیے

چار چمن و مقبرہ نور جہاں بیگم:

اَب کہاں نُور جہاں بیگم کے وہ چاروں چمن
مقبرہ بھی صُورت گورِ غریباں دیکھیے

روضہ حضرت میاں میرؒ:

شیخ نتھا بھی یہیں خواجہ بہاری بھی یہیں
باصفا یاروں کی بزم خلد ساماں دیکھیے

باغات اندرون قلعہ شاہی:

باغ دونوں خواب گاہوں کے ہُوئے مانند خواب
خواب وہ جو صُورت خواب پریشان دیکھیے

باغ و مسجد خواجہ ایاز:

باغ و مسجد کے درو دیوار سے آئی ندا
گھر خدا کا دیکھ کر سُوئے گُلستاں دیکھیے

حضرت شاہ چراغ:

نور بخشِ ہر دل و جاں روضۂ شاہ چراغ
جو نہ بجھنے پائے وہ شمع فیروزاں دیکھیے

شاہی خشت پز بدھو کا مقبرہ:

جس پژاوہ سے ہوئی قائم بنائے شہلا باغ
واں مزارات مسیحی و مسلماں دیکھیے

باغ و بارہ دری نواب وزیر خاں:

ہر طرف چھائی اداسی گر گئے دیوار و در
باغ کہتے تھے جسے اب اس کو میداں دیکھیے

مزار شیخ طاہر بندگی:

شیخ طاہر بندگی کے مرقد پُر نور کو
خطۂ میانی میں شمع بزم عرفاں دیکھیے

شالامار باغ:

یادگار شاہجہاں لاہور میں ہے شالامار
جس کا ہر تختہ گلستاں در گلستاں دیکھیے

مزارِ شیخ محمدؐ اسماعیل عرف میاں وڈا:

فیض رُوح شیخ اسمٰعیل کی برکات سے
ہو رہا ہے آج بھی واں حفظ قرآں دیکھیے

باغ و مقبرہ پیر محمد خاں عدالتی:

کر دیا تھا جس نے ویرانہ کو بھی رشک بہار
آج وہ رشک بہار خلد! ویراں دیکھیے

روضہ حضرت شاہ محمد غوثؒ:

گردش افلاک نے جس کو کیا خانہ بدوش
عزم و ہمت کی بدولت اس کو "سلطان" دیکھیے

علم دین شہید:

پہلے کچھ ذرے چمک اُٹھے جبیں حشر پر
پھر صدا آئی کہ اب خاک شہیداں دیکھیے

پیر عبدالغفار شاہ:

عمر جن کی کٹ گئی عشق رسول اللہ میں
ان کی قبروں پر فرشتے فاتحہ خواں دیکھیے

حکیم الامت سر محمد اقبال:

کر گیا مُردوں کو زندہ جس کا پیغامِ حیات
آج وہ اقبال زیرِ خاک پنہاں دیکھیے

حسن دین شہید:

زندگی کچھ قوم نے پائی ہے جن کی موت سے
خطۂ میانی میں وہ گنجِ شہیداں دیکھیے

اس کے علاوہ باغ و مقبرہ شاہ اسمٰعیل، مزار حضرت احمد توختہ ترمذی، مزار بی بی پاک دامناں، مزار قطب الدین ایبک، مزار حضرت سیّد صدف، باغ دولت خاں لودھی، باغ و مزار حضرت شاہ کاکو، مزار سیّد یعقوب زنجانی عرف شاہ صدر دیوان، باغ نولکھا، روضہ حضرت ابو اسحاق مزنگ، خان اعظم کا باغ، باغ قلیچ خاں اندجانی، راجو باغ، مقبرہ و باغ ملک علی کوتوال، باغ میرزا مومن، باغ زین خاں کوکلتانی، روضہ حضرت شاہ ابو المعالی، باغ و مقبرہ شاہ شمس الدین، باغ دلکشا و مقبرہ جہانگیر، فیض باغ، باغ نواب مرتضیٰ خاں، باغ شہزادہ پرویز، مقبرہ و باغ انارکلی، سرائے شاہجہان، باغ و مقبرہ آصف جاہ، چار چمن و مقبرہ نورجہاں، مقبرہ و بارہ دری شہزادی نادرہ بیگم، باغ و مقبرہ مخدومہ بیگم، باغ و مسجد خواجہ ایاز، مقبرہ و باغ نواب خاں دوراں نصرت جنگ بہادر، باغ و مقبرہ مُلا بدخشی، باغ چو برجی بادشاہ بیگم، باغ و مقبرہ حضرت ایشاں، باغ و مزار بدر الدین شاہ عالم بخاری، باغ و مقبرہ نواب علی مردان، گلابی باغ، بارہ دری مقبرہ دائی انگہ اندرون گلابی باغ، باغ و مزار شیخ سعدی

بلخاری، مہابت خان کا باغ، مقبرہ نواب جائی خاں، باغ امیر الامرا، بادشاہ گر، باغ بیگم پورہ اور اس کے شاہی محلات اور مقبرے، باغ و تالاب مشرف النسا بیگم عرف مقبرہ سرو والا، شمس العلما مولانا حائری، سر سکندر حیات خاں، اور شمس العلما محمد حسین آزاد کے بارے میں بھی اشعار ہیں۔

ہر آدمی کے بارے میں جو شعر لکھے گئے ہیں۔ وہ ایک طرح سے عنوان ہے۔ اس کے بعد اس آدمی کے حالات اور لاہور میں اس کی آمد اور قیام کا ذکر ہے۔ اور اس کی وجہ شہرت و ناموری اور اس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کچھ اشعار اس کتاب میں اس لیے درج کر دیے گئے ہیں کہ یہ فوق کی مؤرخانہ اور محققانہ انفرادیت کا ایک مؤثر ثبوت ہیں۔ سر سید احمد خاں کی "آثار الصنادید" کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ مگر "مآثر لاہور" اس لیے مختلف ہے کہ فوق نے اشعار کے ذریعے اپنے بیان کو پُر تاثیر بنانے کی کوشش ہے۔ فوق نے پُرانی اور بھولی بسری یادگاروں کی جستجو میں لاہور کے کونے کونے کی تلاشی لی ہے۔ اور ایسی ایسی جگہوں پر پہنچے ہیں۔ جہاں وہ لوگ بھی نہیں پہنچ پائے جو کئی پشتوں سے لاہور میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ فوق نے وہ کام کیا ہے جو محکمہ آثارِ قدیمہ والے برسوں میں نہیں کر سکتے۔

فوق نے باغوں اور مزاروں کو ایک ساتھ اپنی تاریخ و تحقیق کے لیے شاید اس لیے منتخب کیا ہے۔ کہ ہمارے اکثر مزاروں پر باغوں کا گمان گزرتا ہے۔ ظاہر ہے انھیں اُجڑے ہوئے باغ ہی کہا جا سکتا ہے۔ لاہور کا قدیم میانی قبرستان ایک غیر آباد جنگل کا منظر پیش کرتا ہے۔ فوق نے ٹوٹی ہوئی قبروں اور اُجڑے ہوئے باغوں میں زندگی کا سراغ لگایا ہے۔ انھوں نے آثار کو حقائق بنا کر پیش کیا ہے۔ کتبۂ مزار پر مٹتی ہوئی عبارت اور کھنڈر بنتی ہوئی کوئی عمارت فوق کے ذوق و شوق کے لیے تازیانے کا کام دیتی ہے۔ بعض اشعار نہ صرف متعلقہ شخصیت کا بھرپور تعارف بن گئے ہیں۔

بلکہ ان میں پوری کہانی کا تاثر بھی سما گیا ہے۔ فوق کے اشعار میں دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا مضمون بھی ملتا ہے۔ بڑی بڑی عمارتوں اور باغوں کی ویرانی قابلِ دید ہے۔ اس منظر کو مکمل پس منظر سے مربوط کر کے کسی شہر کی تاریخ بیان کرنا ایک بڑی کامیابی ہے۔

"بے نشان نامور" (غیر مطبوعہ)

یہ کتابچہ فوق صاحب نے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء کے درمیان لکھا تھا۔ یہ بھی انہی مضامین کا حصّہ ہے جو مآثر لاہور کے نام سے نقوش کے لاہور نمبر میں شائع ہو چکے ہیں مگر یہ جز کچھ اضافہ طلب تھا، اس لیے اس وقت شامل نہ کیا گیا۔ اس جزو کا نام مولانا عبداللہ قریشی نے تجویز کیا تھا اور اصل غیر مطبوعہ مسودہ بھی انہی کے پاس موجود ہے۔
اس میں ان ناموروں کے حالات ہیں جن کا انتقال لاہور میں ہوا مگر ان کی قبروں کا نشان نہیں ملتا۔ امیر مینائی نے شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے۔

امیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے
نشان ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

حضرت شاہ محمد غوث لاہوری کے دختر زادہ سیّد غلام شاہ آزاد کاشمیری نے کچھ ایسا ہی ارشاد فرمایا ہے۔

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

کتاب میں مندرجہ ذیل تینتیس ناموروں کے حالات اور واقعات درج ہیں جو بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیے گئے ہیں: چونکہ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اس

لیے اس میں شامل مشاہیر کے بارے میں مختصر تعارف لکھا جارہا ہے۔

(۱) مسعود سعد سلمان:
(۲) خضر خواجہ خاں حاکم پنجاب۔
(۳) سعید خاں چغتہ۔
(۴) میرزا سلیمان۔
(۵) خواجہ شمس الدین خوافی۔
(۶) امیرالامرا، نواب بہادر خان۔
(۷) مُلّا احمد سندھی۔
(۸) میرزا فولاد تیموری۔
(۹) مولانا کمال نیشاپوری۔
(۱۰) خواجہ نظام الدین احمد ہرویؒ۔
(۱۱) تہور خاں میرزا محمود مشہدی۔
(۱۲) شہزادہ پائندہ محمد خاں قہستانی۔
(۱۳) ظفر خاں احسن۔
(۱۴) اسد خاں معموری۔
(۱۵) ابوالبرکات منیر لاہوری۔
(۱۶) بنتی النساء۔
(۱۷) نظر بہادر خویشگی۔
(۱۸) فتح خاں حبشی۔
(۱۹) مُلّا محمد صالح کمبوہ۔
(۲۰) افضل خاں علامی:

(۲۱) خان دوراں خاں۔

(۲۲) مولوی محمد اسحاق شاہجہانی۔

(۲۳) اسماعیل خاں جانباز حسین زئی۔

(۲۴) میر سید جلال۔

(۲۵) شاہزادہ خسرو سلطان بدخشی۔

(۲۶) پانچ مُغلیہ شاہزادے۔

(۲۷) قاضی محمّد اسلم خاں ہروی۔

(۲۸) میر حسن علی خوافی۔

(۲۹) نواب میر مومن خاں۔

(۳۰) نواب میر معین الملک عرف میر منو۔

(۳۱) نواب سیّد بھکاری خاں رستم جنگ۔

(۳۲) مُلّا حافظ احسن اللہ لاہوری۔

(۳۳) مولانا خیر اللہ وفا قادری۔

یہ اس مسودے کے پہلے حِصّے کے لوگ ہیں۔ دوسرے حِصّے میں چند ہندو امراء کا ذکر ہے جن میں

(۱) راجہ ٹوڈر مل۔

(۲) راجہ بھگوان داس۔

(۳) دیوان لکھپت رائے و جسپت رائے۔

(۴) دیوان کابلی مل ناظم لاہور (جن کی حویلی کابلی مل لاہور میں ابھی تک موجود ہے) شامل ہیں۔ اس حِصّے کے شروع میں فوق صاحب نے اپنے یہ دو شعر لکھے ہیں:

تھا بوقت زندگی اُفلاک پر جن کا دماغ

آج اُن کی خاک کا نام ونشاں باقی نہیں

آگ کی مانند رہتے تھے جو ہر دم مشتعل

دیکھ لو اُن کا زمانے میں دُھواں باقی نہیں

جہاں تک راقم نے اس کتاب کا جائزہ لیا ہے اور "آثر لاہور" کے پہلے حصوں کو بنظر غائر دیکھا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ تاریخ پاک و ہند کا بالعموم اور تاریخ لاہور کا ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے؛ جو بھولی بسری یادوں اور آثار وشخصیات کے ذکر سے مالامال ہے۔ فوق صاحب تاریخ اور تذکرے کے لیے متنوع انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح ایک خوبصورت رنگارنگی پیدا ہوئی ہے کہیں مزارات کو دیکھ کر وہ صاحب مزار کے حالات بیان کرتے ہیں۔ کبھی صرف ان لوگوں کا تذکرہ لے بیٹھتے ہیں۔ جو اپنے زمانے کے نامی گرامی تھے مگر آج ان کے مزارات کے نشانات بھی نہیں ملتے۔

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا

تاریخ وسوانح نگاری کے لیے فوق صاحب کو کیسے کیسے میدان اپنی طرف بلاتے رہتے تھے۔ وہ کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے تھے کبھی باغات کی طرف۔ کبھی پہاڑوں اور دریاؤں اور جھومتی فضاؤں کی طرف۔ کبھی خالی جگہوں کی طرف۔ کبھی ان مقامات کی طرف جن کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ وہ ایک سچے مؤرخ اور محقق کی طرح کھنڈرات سے سرگوشیاں کرنے کا فن بھی جانتے تھے۔

"تاریخ لاہور" کے اپنے اس مخصوص اسلوب میں اگر فوق صاحب کو اپنا کام مکمل کرنے کی مہلت مل جاتی تو ان کے موجودہ کام کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس میدان میں ایک بڑے ماہر کے طور پر یاد کیے جاتے۔

"تاریخ ریاست ہائے بگھیل کھنڈ"
مع
"تحقیقات طلسم بکاؤلی"

یہ تاریخی اور تحقیقی نوعیت کی کتاب پنجۂ فولاد پریس لاہور سے پہلی بار ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے جو "تحقیقات طلسم بکاؤلی" کے حوالے سے مشہور ہوئی۔ قلعہ بکاؤلی چونکہ ریاست ریواں میں واقع ہے جو بگھیل کھنڈ کی ایک ریاست ہے۔ فوق وہاں خود گئے۔ چونکہ وہ مؤرخانہ ذوق وشوق کے آدمی تھے اس لیے تحقیقات طلسم بکاؤلی کے ساتھ ساتھ اس علاقے کے تاریخی حالات بھی بیان کر دیے۔ ان حالات کے بیان میں فوق نے وہی اسلوب اختیار کیا جو وہ اپنی دوسری تاریخی اور سوانحی کتابوں میں استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے ریاستوں کے اس وقت کے راجاؤں کے مختصر سوانح بھی تحریر کر دیے ہیں۔

راجاؤں کے تذکرے میں فوق نے جا بجا حواشی تحریر کیے ہیں۔ جو فوق کے محققانہ مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فوق نے ان ریاستوں میں سے ریاست ریواں کا بطور خاص تذکرہ کیا۔ ان کی تحقیقات طلسم بکاؤلی کی کاوشوں کا میدان بھی یہی ریاست تھی۔ وہاں کے راجہ نے فوق کی بہت خاطر مدارات کی اور بھرپور تعاون کیا۔

فوق نے اس تاریخی کتاب میں ایک قصے کی اصل معلوم کرنے کے لیے تحقیق

کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ اپنے اندر مؤرّخانہ شان رکھتا ہے۔ قصّہ کہانی کا تعلق تاریخ کے ساتھ بہت گہرا ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد قصّہ گل بکاؤلی پر مبنی مثنوی گلزار نسیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مثنوی حقیقت میں ایک سرگزشت یا بیان ماجرا ہے۔ جسے تاریخ کا شعبہ سمجھنا چاہیے۔ اس واسطے اس کے اصول میں لکھا ہے کہ گفتگو نہایت سلیس ہو جس طرح ہم تم باتیں کرتے ہیں۔"[61]

فوق متجسّس ذہن کے مالک تھے۔ وہ تاریخی معلومات کی فراہمی میں بھی تحقیقی طریقِ کار اختیار کرتے تھے۔ تحقیقات طلسم بکاؤلی میں تو وہ ایک ایسے محقق کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں جو حقیقت کی تلاش و جستجو میں دشوار گزار رستوں پر سفر و سیاحت اور خطرناک علاقوں میں قیام سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اُردو نثر میں سب سے پہلے گُل بکاؤلی کا قصّہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی ہدایت پر فورٹ ولیم کالج میں نہال چند لاہوری نے "مذہب عشق" کے نام سے فارسی زبان سے ترجمہ کر کے تحریر کیا۔ اس کی پہلی اشاعت مولوی سیّد محمّد کے بقول ١٨١٤ء میں ہوئی۔[62] جب کہ پروفیسر سیّد وقار عظیم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار ١٨٠٤ء میں شائع ہوئی۔[63] اس کے بعد بھی یہ قصّہ نظم و نثر کی صورت میں کئی بار شائع ہوا۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزارِ نسیم" بہت مشہور ہوئی۔ "گلزارِ نسیم" پہلی بار ١٨٣٨ء میں شائع ہوئی۔[64] فوق نے اپنی تحقیق و تفتیش میں "گلزارِ نسیم" سے کئی اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے "گلزارِ نسیم" میں بیان کی گئی داستان کا خلاصہ تحریر کر کے اس کے ساتھ امر کنٹک کے دلچسپ حالات و واقعات بیان کر دیے ہیں۔ اس ضمن میں اپنے سفر کے مشاہدات بھی شامل کیے ہیں۔ مختلف جگہوں پر یہ قصّہ مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے جو اس قصّے کے فرضی ہونے کی ایک دلیل

ہے البتہ یہ قصہ اپنی دلچسپی اور اسرار کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز رہا اور اسی وجہ سے اس میں مزید ترمیم و اضافے ہوتے رہے۔

البتہ قصہ گُل بکاؤلی کی مکمل تحقیق کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ فوق کی یہ کاوش اوّلین تحریروں میں سے سمجھی جاتی ہے۔[۶۵]

اس کتاب سے پہلے ہی "پنجۂ فولاد" کے ۱۴ اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں فوق کا ایک مضمون شائع ہُوا تھا۔ فوق اپنی کتاب کے صفحہ ۵۴ پر لکھتے ہیں۔

"سب سے پہلے ۱۴ اپریل ۱۹۰۴ء کے اخبار "پنجۂ فولاد" میں "ریاست ریواں اور گُل بکاؤلی" کے عنوان سے ایک مضمون درج ہُوا تھا جس نے مُلک کے تحقیق و جدت پسند طبقہ میں ہلچل مچا دی تھی۔ لوگ ابھی تک اسی پر بھولے بیٹھے تھے کہ کسی نامعلوم مُلک میں جہاں انسان اور پرندہ چرندہ کا گزر تک بھی نہیں۔ بکاؤلی اور تاج الملوک رہتے تھے۔ یہ حکایت و روایت برسوں سے اسی طرح مشہور چلی آتی ہے۔ نظم و نثر میں گل بکاؤلی کی کئی کتابیں اردو، فارسی اور انگریزی زبان میں لکھی گئیں مگر افسوس لکیر کے فقیر ہندوستانیوں نے جو "شاہ بہرام" "اندر سبھا" "آرائش محفل" اور "باغ و بہار" کے فسانوں پر ہی مست ہیں اور ان کو صداقت سے پُر سمجھتے ہیں اسی واقعہ کی تحقیق کی کبھی کوشش نہ کی"

اس تحقیقی معرکہ میں کچھ کتابیں بھی فوق کے پیشِ نظر ہیں جن کا تذکرہ انھوں نے خود بھی کیا ہے۔ ان میں سے مولوی رحمان علی صاحب خان بہادر کی "تحفہ خان بہادر" مطبوعہ ۱۸۸۵ء اور محمد یعقوب کی "گلدستۂ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی" مطبوعہ ۱۸۷۶ء بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب

کا نام فوق نے "تاریخ طلسم حیرت افزا" لکھا ہے۔ ان کتابوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ فوق نے خود موقع پر جاکر صورت حال کا جائزہ لیا اور بعض نتائج مرتب کیے۔ اس طرح فوق کی یہ تحریر ایک اہم اور بنیادی مآخذ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی معروف کتاب "اُردو کی نثری داستانیں" میں "قصہ گُل بکاؤلی کی اصل" کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے محمد یعقوب اور خان بہادر رحمان علی کے علاوہ فوق کا تذکرہ بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"نقوش" (جون ١٩٥٨ء) میں محمد عبداللہ قریشی کا ایک مضمون "گُل بکاؤلی" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مضمون "نقوش" کے ادب عالیہ نمبر میں بھی شامل ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ پچاس سال پہلے ایک طلسم بکاؤلی ایکسپلورنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی تھی جس نے اس قلعہ اور باغ وغیرہ کے بارے میں تفتیش کی۔ محمد دین فوق نے اخبار کشمیری لاہور میں ١٩١٠ء میں لکھا تھا کہ اس علاقے کو اب بھی بکاؤلی کا باغ کہتے ہیں۔"[٦٧]

عبداللہ قریشی، محمد دین فوق کے نہایت عزیز دوست ہیں۔ انھوں نے فوق کی تحریروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون بھی فوق کی تحقیقات سے ماخوذ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

"محمد عبداللہ قریشی نے اپنے مقالہ میں جو کچھ لکھا ہے، منشی محمد دین فوق اور ان کے "رسالہ کشمیری میگزین" بابت جنوری ١٩١٠ء کے حوالہ سے لکھا ہے۔ مضمون میں "تحفہ خان بہادر" مؤلفہ رحمان علی خان کا بھی ذکر آیا ہے۔ فوق کے حوالے سے "تاریخ طلسم بکاؤلی" نام کی ایک کتاب کا حوالہ بھی قریشی صاحب کے مضمون میں آیا ہے لیکن اس

کے مؤلف اور کتاب کی موجودگی یا ذاتی مطالعے کا کوئی سراغ نہیں دیا گیا۔"[۶۸]

ڈاکٹر فرمان صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

"محمد عبداللہ قریشی صاحب نے اپنے مضمون "گل بکاؤلی" مطبوعہ "نقوش" لاہور بابت جون ۱۹۵۸ء کے آخری صفحات میں قصہ بکاؤلی کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بلفظ محمد دین فوق کے بیان سے ماخوذ ہے۔ قریشی صاحب نے اپنے مضمون میں محمد دین فوق کی کتاب کی بجائے ایک جگہ "کشمیری میگزین" جنوری ۱۹۱۰ء کا حوالہ دیا ہے۔ یہ "کشمیری میگزین" میری نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہے فوق نے اپنی کتاب "تاریخ ریاست ہائے پھلیل کھنڈ مع تحقیقات بکاؤلی" میں جو کچھ لکھا تھا اسے پورے کا پورا یا اس کا کوئی حصہ بعد کو "کشمیری میگزین" میں شائع کیا ہو اور عبداللہ قریشی صاحب نے اسی سے فائدہ اٹھایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قریشی صاحب سے سہواً ہُوا ہو اور انھوں نے فوق کی کتاب کی جگہ "کشمیری میگزین" کا حوالہ دے دیا ہو۔"[۶۹]

اصل میں یہ فوق کا ایک ہی مضمون ہے جو "پنجۂ فولاد"، "کشمیری میگزین" اور "تحقیقات طلسم بکاؤلی" میں شامل ہُوا۔ کتاب میں اسے ذرا تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔ عبداللہ قریشی نے اپنے مضمون "گل بکاؤلی" میں بتایا ہے کہ فوق کی تحقیق اوریجنل تھی۔ انھوں نے مطالعے کے علاوہ مشاہدے پر زیادہ انحصار کیا۔ قریشی صاحب لکھتے ہیں۔

"کتاب "تحفہ خان بہادر" میں لکھا ہے اور منشی محمد دین فوق نے آج

سے پچاس برس پہلے اپنے سفر بگھیل کھنڈ میں لوگوں کی زبانی سُنا تھا کہ مولوی سیّد بدر علی تحصیلدار رام نگر (علاقہ ریواں) جہاں تک پہنچ سکے انھوں نے اس مقام کی سیر و پیمائش کی مگر دلدل اور خار دار جھاڑیوں کی وجہ سے وہ جنگل میں دُور تک نہ جا سکے۔ اگرچہ امر کنٹک ان کی تحصیل میں تھا۔ ان کو آرام و آسائش، راہداری اور واقفیت کے تمام ذرائع حاصل تھے اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ پیپر منٹ اور بکاؤلی کے کچھ پودے وہاں سے لے آئے۔ بکاؤلی کے چند درخت ۱۹۰۵ء تک رام نگر میں موجود تھے۔"[۱۸]

گُل بکاؤلی کی حقیقت معلوم کرنے والوں کی جملہ کوششوں کے حوالہ سے ڈاکٹر فرمان فتح پُوری کا مضمون "قصّہ گُل بکاؤلی کے تاریخی مباحث اور ماخذ پر ایک نظر" نہایت اہم اور مفصّل ہے۔ اُنھوں نے "گلدستۂ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی"، "تاریخ بگھیل کھنڈ" یا "تحفہ خان بہادر"، "تاریخ طلسم بکاؤلی"، "فرہنگ آصفیہ" اور "تاریخ ریاست ہائے بگھیل کھنڈ مع تحقیقات طلسم بکاؤلی" کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا ہے۔ فوق کی کتاب پر ان کی بحث چار پانچ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے فوق کی کتاب کو ایک اہم ماخذ قرار دیا ہے۔ وہ اپنے گرانقدر تحقیقی مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"اس سلسلے میں جن ادیبوں کی تحریریں میری نظروں سے گزری ہیں اور جنھوں نے اس واقعہ کی بعض گتھیاں سُلجھاتی ہیں ان میں سیّد احمد دہلوی، محمّد دین فوق، واقف لکھنوی، محمّد عبد اللہ قریشی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند، خلیل الرحمٰن داؤدی اور معراج دھول پُوری قابلِ ذکر ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اس

موضوع پر بحث کی ہے"۔ [۲۵]

ڈاکٹر صاحب کے اس اقتباس کے حوالے سے فوق کو کیسی حد تک اوّلیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس فہرست میں دیے گئے تمام لوگوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ فوق سے استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں عبداللہ قریشی صاحب کے بارے میں بحث کی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے عبداللہ قریشی صاحب کے مضمون کو سامنے رکھا ہے۔ اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر نارنگ نے اپنی کتاب میں "فرہنگ آصفیہ" اور عبداللہ قریشی کے مضمون مطبوعہ "نقوش" سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ ڈاکٹر گیان چند کے ماخذوں میں "تواریخ بکھیل کھنڈ" مولفہ رحمان علی خان اور "تاریخ طلسم بکاؤلی" مؤلفہ سید محمد اسماعیل شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر نارنگ اور عبداللہ قریشی کی تحریروں کو سامنے رکھا ہے"۔ [۲۶]

جہاں تک "فرہنگِ آصفیہ" کا تعلق ہے تو اس میں سید احمد دہلوی نے قصۂ گُل بکاؤلی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک محقق یگانہ کی وساطت سے اپنی بات کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اس کا بیان ہو بہو نقل کر دیا ہے مگر محقق کا نام نہیں لکھا [۲۷]۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق یہ محقق "تحفہ خان بہادر" کے مصنف رحمان علی خان یا گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی" کے مؤلف محمد یعقوب ہیں۔ دہلوی صاحب کی تحقیق ان دونوں سے ماخوذ لگتی ہے [۲۸]۔

اس صفحہ پر ڈاکٹر فرمان نے "فرہنگ آصفیہ" کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ وہ پہلی بار ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ فوق نے بھی رحمان علی اور محمد یعقوب سے

استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ ریاست ریواں کے سفر کے دوران فوق رحمٰن علی خاں کے مہمان رہے اور ان سے تبادلہ خیالات کیا۔ اس کا ذکر فوق کی کتاب کے علاوہ عبداللہ قریشی اور ڈاکٹر فرمان کے مضمون میں بھی ملتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فوق نے اس ضمن میں تازہ ترین معلومات کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔ "فرہنگ آصفیہ" کے اس نسخے میں جو (پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں محفوظ ہے) گل بکاولی کے تذکرے کے آخر میں لکھا ہے۔

"یہ کہنا کہ قلعہ کے اندر کوئی نہیں جا سکتا درست نہیں۔ صرف دلدل مانع ہے غبارے یا ہوائی جہاز کے ذریعے اور مختلف ترکیبوں سے بہ صرفِ کثیر جانا ممکن ہے۔ محقق موصوف نے دعویٰ کیا ہے کہ مجھ کو ایسے بہت سے طریقے معلوم ہیں کہ میں وہاں جا سکتا ہوں اور اس طلسم کا راز کھول سکتا ہوں صرف دس بارہ ہزار روپے کا خرچ ہے۔ کوئی رئیس ہمت کرے تو یہ بات بھی یادگار زمانہ رہ جائے ہمارے نزدیک گورنمنٹ یا رؤسائے ہند اس راز سربستہ کو اب بذریعہ ہوائی جہاز بآسانی کھول سکتے ہیں۔"[۴۵]

اپنی کتاب کے آخر میں فوق نے "یہ طلسم بھی کھل سکتا ہے" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے تقریباً وہی ہے جو "فرہنگِ آصفیہ" میں درج ہے۔ یہ اقتباس فوق کی ادیبانہ چاشنی اور وسعت نظر کا ترجمان ہے ورنہ اصل بات کسی طور سے مختلف نہیں۔ فوق لکھتے ہیں :

"تجربے اور تواریخیں اور مختلف روایتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ قلعہ اور گڑھی حمالہ کے عجائبات ہزارہا سال سے انسانی علم و طاقت سے پوشیدہ چلے آتے ہیں۔ اس تہذیب و روشنی کے زمانے میں جب کہ یورپین اقوام

اپنی نت نئی ایجادوں سے آسمان وزمین کے اندرونی پردوں کی تلاشی لے رہی ہیں۔ اس طلسم کا بند رہنا واقعی افسوسناک اور تعجب انگیز امر ہوگا۔ اس کی ایک وجہ تو بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ہندوستانیوں کو بھی طلسم بکاؤلی کی اصل حقیقت کی خبر نہیں تو سات سمندر پار کس طرح ہوگی۔ مگر کیا چیف کمشنر ناگپور اور ان کی جماعت کے ذریعہ یہ خبر اہالیان یورپ تک نہیں پہنچی — بہرحال اب ایک پنجابی جوان مرد منشی غلام نبی نے جنھیں علم سنسکرت و ہیئت اور عجائبات سے بہت دلچسپی ہے۔ اس طلسم کشائی کا ارادہ کیا ہے۔ ان کے خیال میں جس طرح بکاؤلی اور اس کا خاندان اور سہیلیاں وغیرہ اس دلدل کو عبور کر کے قلعہ میں بودوباش رکھتے تھے اس طرح اب بھی ممکن ہے اور اگر ان کے مجوزہ طریق کی آزمائش کی جائے تو یہ طلسم ہمیشہ کے لیے کھل سکتا ہے مگر اس میں دس بارہ ہزار روپیہ کا خرچ ہے۔ یہ طریق بذریعہ ایک غبارہ کے پورا ہوگا جو موجد صاحب اپنی مرضی کے مطابق بنوانا چاہتے ہیں تاکہ غبارہ کو جہاں چاہیں روک لیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی راجہ، مہاراجہ یا شوقین امیر کبیر اس طلسم کی سیر کرنا چاہے اور روپیہ خرچ کرنے پر آمادہ ہو تو میں طلسم کشائی کے لیے حاضر ہوں"

سید احمد دہلوی نے اپنے بیان میں پہلے بھی محقق موصوف کا نام ظاہر نہیں کیا اور آخر میں بھی اسے صیغۂ راز میں رکھا ہے جب کہ فوق نے طلسم کھولنے کا دعویٰ کرنے والے کا نام بھی تحریر کر دیا ہے۔ فوق نے اپنی کتاب کے صفحہ ساٹھ (۶۰) پر گل بکاؤلی کے متعلق تنقیدی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"منشی غلام نبی صاحب مصنف کتب متعددہ کی تحقیق کے بموجب

گُل بکاؤلی کا اصل نام تو ہلدو ہے۔ بکاؤلی کی نسبت سے اس کا نام گل بکاؤلی مشہور ہوگیا۔ دراصل یہ ایک قسم کی ہلدی کا پودا ہے جو برفانی پہاڑوں میں پایا جاتا ہے جس کے پتے کسی قدر ہلدی سے ملتے ہیں اور کچھ عقیق البحر سے — پھول زرد اور خوشبودار ہوتا ہے۔ اس طرح کا پھول آنکھوں کے بہت سے امراض کو مفید ہے چنانچہ ڈھلکا، درد، سرخی، جلن، دھند، غبار، ناخونہ وغیرہ کو بہت فائدہ بخشتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ ایک ہی درخت ہے، بالکل غلط ہے۔ وہاں اس کے بہت سے درخت موجود ہیں اور دن بدن پھیلتے جاتے ہیں — یہ غیر ملکوں میں بھی جا سکتے ہیں اور اگر آب و ہوا موافق ہو تو لگ بھی سکتے ہیں۔''

''فرہنگ آصفیہ'' میں صفحہ ۲۰۴ پر حرف بہ حرف یہی عبارت درج ہے۔ اس سے آگے بھی تمام بیان فوق کے تحریر کردہ مباحث سے ملتا جلتا ہے۔ جو منشی غلام نبی کے نام کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ جب کہ فوق نے ''فرہنگِ آصفیہ'' سے استفادہ کیا ہوتا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے کیونکہ انھوں نے اس طرح کے اعتراف سے کبھی گریز نہیں کیا۔

''فرہنگِ آصفیہ'' اور فوق کی کتاب میں بھی اس طلسم کشائی کے لیے خرچ آنے والی رقم دس بارہ ہزار بتائی گئی ہے۔ دونوں تحریروں میں غبارے کا تذکرہ بھی ہے۔ سید احمد دہلوی نے اس سے پہلے ایک محقق کا نام لیے بغیر اس کی تحقیق کو نقل کیا ہے پھر اس کا دعویٰ اس طلسم کشائی کے لیے پیش کیا ہے۔ جب کہ فوق نے تحقیق کرنے والے اور اس کی طلسم کشائی کا دعویٰ کرنے والے شخص کا نام بتایا ہے۔ عین ممکن ہے کہ سید احمد دہلوی نے غلام نبی کی کسی کتاب سے

استفادہ کیا ہو کیونکہ اس ضمن میں صرف منشی غلام نبی ہی سب سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر گیان چند اور بالخصوص ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے منشی غلام نبی کا ذکر نہیں کیا شاید اس لیے کہ منشی غلام نبی کی کوئی کتاب فی الحال دستیاب نہیں مگر یہ تذکرہ فوق کے حوالے سے تو ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید احمد دہلوی کی نظر سے فوق کی کتاب گزری ہو اور اس پر انھوں نے اپنے بیان کی بنیاد رکھی ہو کیونکہ "فرہنگ آصفیہ" ۱۸۶۸ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیانی عرصہ میں مکمل ہوئی۔[۷۶]

"فرہنگِ آصفیہ" کے مرتب خورشید احمد "منظور ہے گزارش احوالِ واقعی" کے عنوان کے تحت کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"یہ لغت ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان آخری مرتبہ لاہور میں چھپ رہی تھی۔ ان دنوں سید احمد دہلوی بسترِ مرگ پر صاحب فراش تھے لیکن اس وقت بھی ان کا دل اپنی لغت میں پڑا ہوا تھا۔ اس عالم بیماری میں بھی وہ دوسرے تیسرے دن تار بھیج کر لغت کی جلدیں طلب کرتے رہتے تھے۔ یہ نامہ و پیام ان کے تجربہ کار اور معتمد کارکن مولوی منظور احسن صاحب عباسی کے نام جاتے تھے جو ان کی عدم موجودگی میں اپنی نگرانی میں لغت چھپوا رہے تھے۔ منظور عباسی، مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی کی وساطت سے مؤلفہ "فرہنگِ آصفیہ" کے پاس ملازم ہوئے تھے۔ عباسی صاحب ایک پختہ کار معلم، شاعر و ادیب اور اعلیٰ درجہ کے مترجم تھے۔"[۷۷]

اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فرہنگِ آصفیہ مطبوعہ ۱۹۱۸ء میں بھی

سید احمد دہلوی نے ترمیم واضافہ کیا ہوگا۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ فوق ان لوگوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے طلسم بکاؤلی کی عقدہ کشائی میں ابتدائی کوششیں کیں۔ فوق نے اس قصّے کی حقیقت معلوم کرنے کے سلسلے میں تمام مستند اور ممکنہ ذرائع اختیار کیے۔ اس وقت کے حساب سے جدید ترین اور تازہ ترین شواہد سے فائدہ اُٹھایا۔ اس طرح ان کے تحریر کردہ حقائق ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف کتابوں میں موجود تحقیقی نتائج کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور تمام حالات کا ذاتی طور پر جائزہ لیا۔ اس ضمن میں معروف معاملات میں بھی ان کی ذاتی رائے موجود ہے۔ فوق صفحہ چوّن ۵۴ پر لکھتے ہیں:

"امر کنٹک ایک جنگل کا نام ہے جو ایسا وسیع، پُرخار وحشت ناک اور اتنی دُور ہے کہ وہاں کوئی بھی جانے کی جرأت نہیں کرسکتا (امر کنٹک لیواں سے بارہ منزل بیان کیا جاتا ہے) لیکن اس جنگل کی آج تک پیمائش نہیں ہوئی۔ اس کی حدود اضلاع ستھیلی پور، بلاس پور اور منڈلہ سے ملتی ہیں۔ یہ اضلاع مذکور سے بارہ بارہ اور تیرہ تیرہ منزل کے فاصلہ پر ہیں۔ ایک گوشہ اس جنگل کا ہزاری باغ سے ملا ہُوا ہے جو بنگال کا ایک ضلع ہے۔ اس جنگل میں بے شمار چشمے ہیں۔ اس کے علاوہ شیر، چیتے، ریچھ، بندر کئی قسم کے درندے اور ہزاروں قسم کی آفات ہیں۔"

آگے چل کر فوق لکھتے ہیں:

"ایک اور باغ ماتی کا باغ ہے جس میں نارنگی، پیپر منٹ، لیموں، پودینہ اور انگور کے درخت بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ حوض بکاؤلی کے پاس ہی تھوڑے سے فاصلے پر ایک تالاب خام ہے جس کے متصل آم کے درختوں کا ایک جنگل کوسوں تک چلا گیا ہے۔ اس

آم کا رس ایسا لذیذ ہوتا ہے کہ زبان پہروں چٹخارے لیا کرتی ہے۔ بیج اس کا ایک چھٹانک کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔ یہ شیریں پھل جانوروں اور جنگلی قوموں کا من بھاتا کھاجا ہے۔"

ان اقتباسات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ فوق تاریخ نگاری میں محققانہ انداز اختیار کرتے ہیں مگر یہاں ایک افسانوی تحریر کو تاریخی اور تجرباتی حقائق کی روشنی میں لاکر اپنے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ فوق کی یہ کتاب ایک اہم ماخذ کے طور پر انھیں ایک یادگار مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔ اس کتاب کا ذکر شمیم احمد کے نام محمد حسن عسکری کے ایک خط میں بھی ملتا ہے۔ جو انھوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۷ء کو لکھا تھا) - یہ خط سہ ماہی "نیا دور" کراچی کے مارچ ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

"تاریخ سیالکوٹ"

فوق صاحب نے ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اس کے آخر میں ۴۳ صفحات پر مشتمل سیالکوٹ شہر کی ایک مختصر تاریخ بھی شامل کر دی ہے۔ اس اضافے سے یہ کتاب اور بھی اہم ہوگئی ہے۔ علامہ صاحب کی سوانح کا مفصل جائزہ آگے چل کر آئے گا۔ "تاریخ سیالکوٹ" جہاں ایک شہر کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے وہاں علامہ سیالکوٹی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے معاونت کرتی ہے۔ کیونکہ شخصیت اور ماحول آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔

سیالکوٹ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ اس سرزمین سے علم و ادب کے حوالے سے بڑے بڑے آدمیوں نے جنم لیا۔ علامہ سیالکوٹی کے علاوہ بھی کچھ مشاہیر سیالکوٹ

کا ذکر کتاب میں ملتا ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال سیالکوٹی کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے فوق صاحب نے تحریر کی۔ فوق صاحب کشمیر سے ہجرت کے بعد اسی علاقے میں مقیم ہوئے تھے۔

مختصر تاریخ سیالکوٹ بظاہر اس کتاب سے بالکل ایک الگ حصہ ہے مختلف ادوار میں اس شہر کا تاریخی اور تہذیبی نقشہ ان چند صفحات میں دکھائی دیتا ہے۔

کتاب کا اختتام ۱۸۵۷ء کے واقعات پر ہوتا ہے۔ یہ تاریخی جائزہ مسلمان بادشاہوں اور مغل حکمرانوں کی شان وشوکت ان کی علم دوستی اور ادب پروری کو اجاگر کرتا ہے۔ نیز اس میں مختلف اولیاء اور علماء کی زندگیوں کے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں "قلعہ سیالکوٹ کی دیواروں پر ایک مسلمان کے خون کا چھڑکاؤ" کے عنوان سے جو ولولہ انگیز واقعہ لکھا گیا ہے۔ بہت مؤثر اور ایمان افروز ہے۔ ۵۷ھ میں تغلق عہد کے ایک باج گزار حکمران راجہ سہنپال نے خودسری اختیار کی۔ نجومیوں اور جوتشیوں نے بیوقوف راجہ سے کہا کہ اگر قلعہ کی دیواروں اور چاروں گوشوں پر انسانی خون چھڑکا جائے تو دشمن کبھی ہم پر غالب نہ آسکے گا۔ فوق صاحب لکھتے ہیں:

"اسلامی خون کے سوا اور کونسا انسانی خون بہ آسانی دستیاب ہوسکتا ہے۔ راجہ کے آدمیوں نے ایک غریب بڑھیا مسلمان عورت کے جوان فرزند کو پکڑا اور بے قصور بے جرم اس کو بے دردانہ طور پر قتل کر کے اس کا خون قلعہ کی دیواروں پر چھڑکا۔

میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی

خوں کے چھاپے لگ گئے دیوار میں

بڑھیا ماں ممتا کی ماری روتی پیٹتی سیالکوٹ سے باہر نکل آئی۔ بیٹے کے فراق و ماتم میں شہر بہ شہر پھرتی رہی۔ سید امام علی لاحق بن سید حسن مکی کی خدمت میں آئی جو عہدہ و منصب شاہی ترک کر کے کوہستان کانگڑہ کے نواح میں گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھے۔

آپ نے راجہ سہنپال کے اس ظلم وستم کی دردناک کہانی سُن کر بڑھیا سے امداد کا وعدہ کیا اور دلجوئی کے کلمات زبان سے فرماتے چند روز بعد حُسنِ اتفاق سے سُلطان فیروز شاہ تغلق کوہستان سرمور کی طرف جاتا ہُوا ادھر آنکلا۔ حضرت امام صاحب نے بادشاہ سے اس غریب بڑھیا کی المناک داستان کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے امام صاحب کے سپرد ایک عظیم لشکر کر دیا۔ اور کہا کہ خلق خدا کو راجہ کی حماقتوں سے نجات دلائیں "[۷۸]

فوق صاحب کے مطابق امام صاحب نے راجہ سے جنگ کی۔ راجہ کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اسے شکست فاش ہُوئی مگر دوسرے جانبازوں کے ساتھ زخمی ہو کر امام صاحب خود بھی شہید ہُوئے۔ فوق صاحب لکھتے ہیں:

"امام اور ان کے دیگر شہدا کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جہاں اور جس حالت میں کسی کا انتقال ہُوا۔ اسی جگہ اور اسی حالت میں اسے دفن کر دیا گیا۔ لیکن جہاں امام صاحب کا عالی شان پختہ چونہ گچ روضہ ہے۔ وہاں صدہا مزارات ایک دوسرے کے پہلو میں موجود ہیں۔ اور ہر شہید دوسرے شہید کے متعلق زبانِ حال سے کہتا ہے۔

یُوں دفن میرے ساتھ دلِ بے قرار ہے
چھوٹا سا اِک مزار کے اندر مزار ہے

اس کثرتِ مزارات سے ان جانبازانِ اسلام کی غیرت و حمیت عجب عبرت و حیرت کا نقشہ دکھاتی ہے۔ مزار مبارک پر ہر جمعرات کو مُسلمان اس کثرت سے آتے ہیں کہ خاصا میلہ ہو جاتا ہے۔ عیدین کے میلوں کے علاوہ ایام محرم میں اس روضہ مبارکہ پر عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ جس میں تمام ضلع کے لوگ آتے ہیں "[۷۹]

فوق صاحب کی تاریخ نویسی کے سلسلے میں جو مباحث سامنے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ دائرہ کتنا وسیع ہے۔ فوق بیسویں صدی کے ان مصنفوں

میں سے ہیں جنھوں نے تمدنی آثار اور تاریخی ادوار کا بیان کرتے ہیں۔ اور تحقیق و جستجو کے ذریعے معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ نویسی شبلی و حالی کے بعد کے دور میں تاریخ نویسی کی شمع کو روشن رکھنے کی مخلصانہ کوشش ہے۔ فوق صاحب کی تاریخ نویسی ایک خطے سے ان کی گہری وابستگی کی ترجمان ہے، یہ ان کی ملی امنگوں کا نشان بھی ہے۔ اور اس میں ان کے اصلاحی جذبوں کا زوردار اعلان بھی ہے۔

"تاریخ انگورہ"

کتاب پر سن اشاعت درج نہیں۔ مگر یقیناً یہ زمانہ ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے بعد کا ہے۔ عالمِ اسلام میں صرف ترکی تھا کہ جسے آخری اور سخت مرد بیمار کہا گیا۔ دُنیا بھر کے مُسلمانوں کی نظریں سلطنت عثمانیہ پر لگی ہوئی تھیں۔ شوکت علی اور محمد علی جوہر ہندوستان میں مُسلم قیادت کے کمال پر تھے۔ اور ان کی بوڑھی ماں بھی ان کے ساتھ تھی۔ ام الاحرار آبادی بانو بیگم کے بارے میں فوق صاحب نے اپنی کتاب "محبِ وطن خواتین ہند" میں ایک مفصل سوانحی خاکہ لکھا ہے۔ کتاب کے چوتھے باب میں فوق صاحب نے ہندوستان کے مُسلمانوں اور انگورہ کے باہمی تعلقات اور ربط و ضبط کا حال لکھا ہے۔ فوق صاحب نے خلافت کے بارے میں مُسلمانانِ ہند کے جذبات و احساسات کی عکاسی بھی کی ہے اور تحریک خلافت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ترکمان احرار کی طرف سے اس کے اعتراف کا تذکرہ بھی ہے۔ البتہ ان مصائب کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا جو خلافت کو ختم کرنے کے لیے مختلف ملکوں کی طرف سے کیے گئے۔ ترکوں کی جانفشانیوں اور قربانیوں کا سلسلہ دُنیا بھر کے مُسلمانوں کے لیے حوصلے کا باعث تھا۔ علامہ اقبال کی نظم طلوعِ اسلام اس سلسلے

کی گئی ہے کہ ترکمان احرار کی جدوجہد کے ذکر سے وہ مسلمانوں میں اُمید اور حوصلے کی کرن بجھنے نہیں دینا چاہتے تھے۔

ہُوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی [۸۰]

ہندوستان میں تاریخ سیاست کے اس موڑ پر فوق صاحب کی یہ کتاب ان کے قومی شعور کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے میں ایک زندہ و بیدار شخص تھے بلکہ آنے والی گھڑیوں میں ایک بہتر مستقبل کے خواہاں بھی تھے۔ وہ مُسلمانانِ ہند کے مقدر کو عالمِ اسلام کے ساتھ ایک مربوط قومی اتحاد کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ فوق صاحب "تاریخ انگورہ" لکھتے ہُوئے ایک تفصیلی تجزیے کا اسلوب اپناتے ہیں۔ ۲۶۴ صفحات کی یہ کتاب ہندوستانیوں کو ترکی کے مکمل حالات سے آگاہ کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ ان کے پیشِ نظر ہندوستان اور مُسلم ہندوستان کا تاریخی اور سیاسی منظر ہے۔ وہ اس منظر کو دوسرے منظروں کے ساتھ ملا کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت ترکی کا مستقبل اسلامیانِ ہند کے قومی وقار کے ساتھ مشروط ہو گیا تھا۔ ایک دردمند مؤرخ کی سوچ کا دائرہ وسعتوں کی طرف سفر کرنے لگا۔ "تاریخ انگورہ" میں خاندان سلجوقی سے لے کر مُصطفےٰ کمال پاشا تک

کے مفصل حالات اناطولیہ (انگورہ) درج ہے۔ اس میں سلطنت اناطولیہ کے عام حالات کے علاوہ انگورہ، طرابزون، سنیوب، قفقار، برونیہ، اطنہ، سمسون، سمرنا، تمریس، ایڈریانوپل، سالونیکا وغیرہ مشہور شہروں ملکوں اور بندرگاہوں کے تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی حالات درج ہیں۔ اس کے علاوہ انگورہ کے مختلف ممالک کے ساتھ تعلقات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ بیس مجاہدین انگورہ و ترکمان احرار کے جذبات، سوانحات عمر اور فدایان سلف کے سربکف افراد کے کارناموں کا تذکرہ بھی ہے۔

آج بھی ترکی کے ساتھ پاکستان کے مضبوط اسلامی اور تہذیبی روابط کو دیکھیں تو اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا ایک اور رُخ ہمارے سامنے آتا ہے۔ فوق صاحب تاریخ کے آگے بڑھتے ہوئے دھارے کی پہچان رکھتے تھے۔ یہ کتاب ان کی ہمہ گیر تاریخی اور تہذیبی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فوق صاحب کس قدر شعور اور درد والے آدمی تھے۔ اور اپنے کام سے انہیں کتنی لگن تھی اور وہ اس کے لیے کس حد تک محنت بھی کر سکتے تھے۔ یہ مفصل کتاب ان کی بھرپور صلاحیتوں کی گواہ ہے۔

"مرتّب کردہ تاریخیں"

منشی محمد الدین فوق کی تاریخ نویسی کا ایک طریقہ یہ بھی تھا۔ کہ وہ زیرِ مطالعہ کتابوں میں سے مختلف موضوعات پر واقعات جمع کرتے رہتے تھے۔ اور پھر انھیں مرتب کر کے یکجا کر دیتے۔ ان واقعات کو وہ اپنے اسلوب میں لکھتے تھے کہ ان میں موقعے کے مطابق ایک خاص تاثیر گھل جاتی تھی۔ ایک موضوع یا عنوان کے تحت جتنی چیزیں ان کو ملتی تھیں وہ انھیں ایک جگہ اکٹھا کر دیتے تھے۔

اس طرح ان کے قارئین کو اپنی پسند کے واقعات آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس پر فوق صاحب کا سادہ انداز ایک اور آسانی کا سامان پیدا کر دیتا ہے اور ان کی تحریر میں دوہری سہولت کی خصوصیت ایک منفرد رنگ اختیار کرتی چلی جاتی ہے اس وقت ان کی تین کتابیں زیرِ بحث ہیں۔ تینوں کا موضوع مختلف مگر انتہائی اہم ہے۔ "تاریخ حریت اسلام" (۱۹۲۱ء) مسلمانوں کی حریت پسندی کی ایک مربوط داستان ہے۔ حکمرانوں کے سامنے جرأت اظہار پر مبنی واقعات بے حد مؤثر ہیں۔ "تاریخ کا روشن پہلو" (۱۹۲۹ء) انسان کے اندر مثبت سوچ اور رواداری کا بیان ہے۔ حکمرانوں کا دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک ہماری شاندار روایات میں سے ایک ہے۔

"وجدانی نشتر" (۱۹۱۵ء) میں مختلف موقعوں پر لوگوں کے دلوں پر مرتب ہونے والی کیفیات کا ایک تذکرہ ہے۔ قرآنی آیات و احادیث کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو اشعار سننے کے بعد جو دل پہ گزرتی ہے، سچے واقعات کی روشنی میں اس کا احوال لکھا ہے۔

یہ کتابیں فوق صاحب کے ایک منفرد اسلوب تاریخ کو ہمارے سامنے لاتی ہیں ماضی کے مختلف زمانوں میں بکھرے ہوئے واقعات کو اکٹھا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ واقعات ہمیں دوسری تاریخوں میں بھی مل سکتے ہیں۔ مگر اس طرح یکجا اور مربوط شکل میں نہیں ملیں گے۔ یہ کام فوق جیسا کوئی مسلسل کام کرنے والا اپنی دھن کا پکا شخص ہی کر سکتا تھا۔ یہ تینوں کتابیں اس لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ کہ اپنے زمانے میں یہ بہت بروقت علمی سرگرمی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں دنیا بھر میں اور بالخصوص عالمِ اسلام میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ اور لوگ جبر و استبداد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ برِ صغیر میں مذہبی فرقہ واریت کی فضا عام ہو رہی تھی اور ضرورت اس امر کی تھی کہ لوگ اس وبا سے بچیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ

مسلمانوں کے دلوں میں سوز و گداز کی کیفیت کم ہو رہی تھی۔ ان تینوں صورتوں کی روشنی میں "تاریخ حریتِ اسلام"، "تاریخ کا روشن پہلو" اور "وجدانی نشتر" کی ضرورت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہر زمانے کی فلاح و بقاء کے لیے یہ ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی۔ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی یہ کیفیتیں ایک اور ارفع انداز میں ملتی ہیں۔

"تاریخ حریتِ اسلام"

تاریخ حریتِ اسلام کا پہلا ایڈیشن ۷ مارچ ۱۹۲۱ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن تین سو صفحات اور دوسرا ایڈیشن چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ طبع سوم جولائی ۱۹۳۱ء میں فوق صاحب کے اشاعتی ادارے ظفر برادرس لاہور کی اجازت سے شیخ جان محمد اللہ بخش تاجران کتب علوم شرقی لاہور نے شائع کی۔ اس کی ضخامت چار سو پینسٹھ صفحات ہے۔ چار سو پینسٹھ صفحات کی یہ کتاب شیخ جان محمد اللہ بخش کی فرمائش پر ملک دین محمد اینڈ سنز ناشران کتب لاہور نے بھی شائع کی۔ اس کتاب پر سن اشاعت درج نہیں۔ کتاب میں فوق صاحب کا دیباچہ بھی شامل نہیں۔ جب کہ پہلی کتاب (طبع سوم) میں دیباچہ موجود ہے۔ دیباچے میں فوق صاحب نے لکھا ہے:

> "اسلامی مدارس، قومی سکولوں اور لائبریریوں کے علاوہ ریاست ہائے بھوپال و بہاول پور اور پنجاب کے محکمہ تعلیم نے بھی "تاریخ حریتِ اسلام" کو منظور فرما کر حوصلہ افزائی کی ہے۔

"تاریخ حریتِ اسلام" میں زمانہ رسالت، عہد خلافت راشدہ، دورِ خلفائے بنی اُمیہ و عباسیہ، عہد بنی بویہ و سلجوقیہ، دولت ہسپانیہ و غزنویہ کے علاوہ ترکی و مصر،

الجزائر و مراکش، فرماں روایان ہند (خاندان افاغنہ و غلامان و عہد مغلیہ) اور مسلمان بادشاہان دکن، سندھ و کشمیر کے عہد گزشتہ کے راست باز اور حق پرست بزرگوں کے حیرت انگیز جرأت آفریں اور ولولہ انگیز، استقلال اور جوش و ایثار کے حریت آموز حالات اور عدل و انصاف، آزادی و مساوات، خدا ترسی و پاکیزہ نفسی کے حامی بادشاہوں کے سبق آموز واقعات کے علاوہ پرستاران حق و صداقت اور فدائے مذہب و ملت عورتوں کے سوانحات درج ہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباس فوق صاحب کی کئی دُوسری کتابوں کے آخری صفحے پر بہت واضح انداز میں لکھا ہُوا ملتا ہے۔ یہ تحریر "تاریخ حریت اسلام" کے پہلے صفحے پر بھی لکھی ہُوئی ہے۔ جو اصل میں اس کتاب کے موضوع کا جوہر ہے۔

فوق صاحب نے کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ ہر فصل کسی نہ کسی شخصیت کے حوالے سے مخصوص کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی فوق صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح اپنے اندر ایک مقصدی جذبہ رکھتی ہے۔ فوق صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اپنے تابناک ماضی کی رنگارنگ تصویریں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان کے حال میں ان کا شاندار ماضی زندہ کرنا چاہتے تھے۔ فوق نے تاریخ میں جرأتوں اور حوصلوں کا خزانہ تلاش کر لیا تھا۔ اس کے ذریعے وہ اس خزانے کو حاصل کرنا چاہتے تھے جو مُسلمانانِ ہند کے دِلوں میں کہیں چھُپ گیا ہے۔ ولولہ انگیز واقعات پر مبنی اس کتاب میں فوق صاحب یہ بھی بتانا چاہتے تھے کہ ہماری تاریخ بہت عظیم ہے۔ اس میں بڑی شخصیات بھی بے شمار ہیں۔ اور ان سے متعلق واقعات بھی اَن گنت ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ واقعات اس کتاب میں بیان کر دیے جائیں۔ یہ حقیقت ہے مُسلمانوں

کی تاریخ کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اُنھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ کوئی اہم واقعہ رہنے نہ پائے۔ اس طرح اختصار نے جامعیت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ متنازع حیثیت کے واقعات کے لیے ممکن حد تک تحقیق کی ہے کسی مقام پر ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر تیرہ سو سال پر پھیلی ہوئی تاریخ کو ایک خاص مقصد سے واقعات کی صُورت میں جمع کرنا ایک بہت بڑی خدمت ہے اور ایک کارنامہ بھی ہے فوق ہر عہد کے صرف بادشاہوں کا ذکر ہی نہیں کرتے، ممتاز عُلماء، صُوفیاء اور دوسرے اہم متعلقہ اشخاص کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔

ابھی یہ کتاب شائع نہیں ہُوئی تھی کہ اس کتاب کا چرچا ہونے لگا تھا۔ ۲۷ / اکتوبر ۱۹۲۰ء کو فوق صاحب کے نام علّامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا:

> "مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہُوئی کہ آپ نے "تاریخ حریت اسلام" لکھی ہے۔ یہ کتاب لاجواب ہو گی۔ اور مُسلمانوں کے لیے تازیانے کا کام دے گی۔ آپ بڑا کام کر رہے ہیں۔ اس کا اجر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے ملے گا۔" [۸۱]

کتاب کے شائع ہونے کے بعد اقبال نے ان تأثرات کا اظہار کیا۔

> "فوق صاحب کو اسلامیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ اس سے پہلے آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ "حریتِ اسلام" آپ کی بہترین تصنیف ہے۔ دلیری اور بے باکی سے اعلانِ حق کرنا گزشتہ مُسلمانوں کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو تھا مگر افسوس کہ عصرِ حاضر کے عام مُسلمان تاریخ اسلام سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ بھی موٹے موٹے واقعات سے بے خبر ہیں۔ ان حالات

میں فوق کی تصنیف پنجاب کے اسلامی لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان خاندان اس بیش بہا کتاب کے مطالعے سے محروم نہ رہے گا۔" [۸۲]

علامہ اقبال نے تاریخ حریت کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کو ایک شعر میں سمو دیا ہے لگتا ہے جیسے فوق صاحب کی کتاب اس شعر کی تشریح ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں فوق صاحب کا اسلوب قدیم تذکرہ نگاروں جیسا ہے۔ جہاں وہ اپنی انشاپردازی کے جوہر دکھانا چاہتے ہیں۔ وہاں ان کی نثر میں رنگینی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کا قلم موتی بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ صفحہ ۳۹ پر ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"یہ تھے شمع نبوت کے پروانے اور یہ تھی ان کی سوزشِ قلبی۔ ان کی استقامت، استقلال، ان کی قربانیاں، ان کی جاں نثاریاں۔ لیکن کیا اس داستان رنگین میں ہمارے لیے کچھ بصیرت نہیں۔ برادرانِ ملت اپنے قلوب کا جائزہ لیں تو وہاں اس آگ کی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں بھی ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کی بجاآوری کے لیے اشاعت توحید کے لیے کلمہ حق و حریت کے لیے جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کی برداشت کے لیے کس حد تک ایثار کر سکتے ہیں۔"

اس کتاب کے مطالعے کے دوران یہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بار بار یاد آتی ہے۔

"جابر سلطان کے آگے کلمۂ حق بلند کرنا سب سے بڑا جہاد ہے"۔ [۸۳]

"تاریخ کا روشن پہلو"

۱۱۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب پر تاریخ اشاعت درج نہیں۔ عرض حال کے تحت دیباچے میں فوق صاحب نے جو تاریخ لکھی ہے وہ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۲۹ء ہے۔ کتاب ظفر برادرس لاہور نے شائع کی ہے۔

محمد دین فوق تاریخ اور زندگی کا روشن پہلو دیکھنے کا مزاج رکھتے تھے۔ ہماری تاریخ کی رہگذر پر تاریک گوشے بھی ہیں۔ المناک واقعات کی بھی کمی نہیں۔ لیکن تاریخ نویسی کے حوالے سے فوق صاحب کوشش کرتے ہیں کہ حیات آفریں حالات سے لوگوں کو باخبر کیا جائے۔ وہ تاریخ میں انسانی عظمتوں اور خوبیوں کی تلاش کو مقصدِ وحید قرار دیتے ہیں۔ خاص طور پر واقعات سے مرتب کی ہوئی اپنی تاریخوں میں وہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ قارئین میں ہمت اور شرافت کے جذبات کو جِلا ملے۔ اچھے مؤرخ کے لیے مثبت فکر کا حامل ہونا بہت ضروری ہے۔ "تاریخ کے روشن پہلو" میں فوق صاحب کے عمومی اور مجموعی رجحان فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں برصغیر کی تاریخ میں سے ایسے واقعات منتخب کر کے جمع کر دیے گئے ہیں۔ جن میں مُسلمان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں کی رواداری، کشادہ دلی، وسعت نظری، بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے بلکہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ حکمران بلا تفریق مذہب و ملت تمام رعایا سے یکساں طور پر اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ کتاب میں فوق صاحب نے بھی کوئی تفریق نہیں رکھی۔ اور تمام مذاہب کے حکمرانوں کی زندگیوں میں سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں۔ جن کے مطالعے سے ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک ہمہ گیر محبت اور دوستی کے خیالات آدمی کے دل میں ابھرتے ہیں۔

اس کتاب میں جمع واقعات کا اسلوب "تاریخ حریت اسلام" والا ہے۔ ان واقعات میں کہانی کا انداز بھی ہے۔ تاریخی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے انھیں قصّے کا رنگ دینا مؤرخوں کا پُرانا اسلوب ہے۔ یوُں لگتا ہے جیسے چھوٹی چھوٹی حکایات بیان کر دی گئی ہوں۔ ان میں سبق آموز کہانیوں والی تاثیر موجود ہے۔ لیکن کہیں بھی حقائق کو مسخ نہیں کیا گیا۔ تاریخی صداقت کی تحقیق کے لیے فوق صاحب بہت محنت کرتے ہیں اور کئی کتابوں اور لوگوں سے مدد لیتے ہیں۔ وہ بات کو جذباتی بنا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کے حق میں نہیں۔ فوق صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تاریخ بنانے کے لیے آدمی کو ہمیشہ روشن پہلو پر نظر رکھنی چاہیے۔ فوق صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اہل ہند کو اپنی تاریخ کا روشن پہلو دکھایا جائے۔ اس ملک میں جہاں آج بات بات پر بے اعتمادی اور لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے، ان میں کبھی اعتماد اور محبت و اخوت کے خوشگوار تعلقات بھی تھے۔ جو لڑائیاں مُسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں ہوتی رہی ہیں۔ ان کی بنا مذہبی تعصبات پر نہ تھی۔ بلکہ سیاسی اغراض ان کو خون خرابہ پر آمادہ کرتی تھیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہندو مُسلم کے اتحاد ثلاثہ کے لیے میری یہ ناچیز مگر پُر از خلوص کوشش پبلک میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گی۔"

اپنے زمانے میں تو یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت تھی ہی کسی بھی زمانے میں اس کی اہمیت میں کمی واقع نہ ہوگی۔ اہلِ ہند، عالم اسلام اور پوری دُنیا کو ہمیشہ تعصب اور تنگ نظری سے پاک معاشرے کی تلاش میں اس کتاب کی مدد حاصل رہے گی۔ جاوید نجیب لکھتے ہیں۔

"تاریخ کا روشن پہلو" لکھ کر فوق نے غیر مُسلموں کی رواداری اور حسن سلوک کی

منادی کرائی۔ اس بصیرت افروز کتاب سے متأثر ہوکر خواجہ حسن نظامی نے روزنامچے مورخہ ۲۴؍اپریل ۱۹۳۲ء میں لکھا:

"تاریخ کا روشن پہلو" ایک ایسی عمدہ کتاب ہے جو ہندوستان کی سب قوموں کو آپس میں آسانی کے ساتھ متحد کرسکتی ہے۔ اور سب قوموں کے دل میں ایک دوسرے کی نسبت رواداری کے خیالات پیدا ہوسکتے ہیں۔۔۔۔۔ بیماری کے زمانہ میں "تاریخ کا روشن پہلو" ہمیشہ میرے سرہانے رہی اور میں نے بار بار اس کو پڑھا اور اس کتاب کے مضامین کا اتنا اثر مجھ پر ہوا کہ جب سنیاسیوں کی زہریلی دوا کے خلاف میرے احباب نے پولیس کی کارروائی کرنے پر زور دیا تو میں نے سنیاسیوں کی ہر شورش کو دبا دیا۔"[۵۴]

"وجدانی نشتر"

۴۸ صفحات کی یہ کتاب "وجدانی نشتر" کا پہلا حصہ ہے جو عبداللہ قریشی سیکرٹری انجمن معین الاسلام لاہور کی فرمائش پر اتحاد پریس لاہور سے چھاپی گئی ہے۔ کتاب پر سن اشاعت درج نہیں۔ قریشی صاحب نے بتایا کہ یہ اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ پیش لفظ کے طور پر قریشی صاحب نے ۱۲ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے۔ قریشی صاحب صفحہ نمبر ۱۶ پر لکھتے ہیں۔

"اگر اس کتاب کو پسند کیا گیا تو انشاء اللہ اس کے باقی حصے بھی جلد شائع کیے جائیں گے۔ جو "برق طور"، "پیام وصال"، "تیر و نشتر"، "درد و دل" اور "حال و قال" کے ناموں سے موسوم ہیں۔"

یہ پانچوں حصے تا حال غیر مطبوعہ ہیں اور قریشی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔

"وجدانی نشتر عرف سوز و ساز" مکمل شکل میں پہلی بار دسمبر ۱۹۱۵ء میں

گلزار سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی ضخامت ۱۲۸ صفحات ہے۔ یہ چھ حصّوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے کچھ بہت مختصر ہیں۔ قرآنی آیات سے مختلف بزرگوں کے دِلوں پر مرتب ہونے والے اثرات پر مشتمل واقعات کتاب کے پہلے حصّے میں شامل ہیں۔ یہ حصّہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ جب کہ علیحدہ کتابچے میں شامل ہونے والے حِصّے کی ضخامت ۴۸ صفحات ہے۔ جس میں ۱۲ صفحات پر مشتمل عبداللہ قریشی صاحب کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود ان واقعات پر مشتمل صفحات کی تعداد دو اڑھائی گنا بنتی ہے۔ یہ کتابچہ فوق کی زندگی میں شائع ہوا تھا انھوں نے اس کے علاوہ دوسرے حِصّوں میں بھی خود ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ اس لیے یہاں ان ترمیم شدہ حِصّوں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ فوق نے اس کتاب کے موضوع کی اہمیت اور تاثیر کو محسوس کرتے ہوئے اس کتاب کو دو جلدوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر ان کی زندگی میں یہ نہ ہو سکا۔ راقم نے مطبوعہ کتاب کو بھی اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کِتاب میں فوق نے دیباچہ تحریر نہیں کیا تھا۔ جب کہ ان کے غیر مطبوعہ مسودے میں ان کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ آگے چل کر اس دیباچے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فوق کی مطبوعہ کتاب (طبع اوّل ۱۹۱۵ء) کے حوالے سے علامہ اقبال کی رائے بہت اہم ہے۔ جو موضوع کی افادیت اور تاثیر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ علامہ صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی محمد الدین فوق ایک صاحبِ ذوق آدمی ہیں۔ ان کی جِدّت پسند طبیعت ہمیشہ انوکھی باتوں کی تلاش میں رہتی ہے انھوں نے ایک کِتاب موسوم بہ وجدانی نشتر لکھی ہے جس میں عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی اشعار جمع کر دیے ہیں۔ جو تاریخی اعتبار سے ایک خاص اثر اور سوز و گداز کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کِتاب کی تالیف میں ان کو بہت محنت کرنا پڑی ہو گی۔ مگر مولوی محمد الدین فوق محنت سے گھبرانے

والے نہیں۔ کتاب نہایت اچھی اور دلچسپ ہے۔ اور انسانی قلب کی گوناگوں کیفیات پر روشنی ڈالتی ہے۔ فوق صاحب کی تلاش قابلِ داد ہے۔"[۸۵]

اس تبصرے سے ڈیڑھ سال قبل اقبال نے ایک خط میں بھی اس کتاب کی تعریف کی تھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال، فوق کی تحریروں کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ اس سے اقبال کے خیالات ور جحانات کو جاننے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ ۲۳ ردسمبر ۱۹۱۵ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"وجدانی نشتر" خوب ہے مگر تعجب ہے کہ شیخ مُلاّ (مُلاّ شاہ بدخشی) کے ملحدانہ اور زندیقانہ شعر

"من چہ پروائے مصطفےٰ دارم"

کو آپ اس کتاب میں جگہ دیتے ہیں، اور پھر مُلاّ کی تشریح کس قدر بے ہودہ ہے۔ یہی وہ وحدت الوجود ہے جس پر خواجہ حسن نظامی اور اہلِ طریقت کو ناز ہے۔؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے اور ہم غریب مُسلمانوں کو ان کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔"[۸۶]

یہ واقعہ "وجدانی نشتر" کے حصّہ چہارم موسوم بہ "تیر و نشتر" کے صفحہ ۱۰۷ پر درج ہے۔ اس حصّے میں فارسی اشعار کے اثرات کے حوالے سے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں یہ حصّہ سب سے طویل ہے جو تقریباً ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ترمیم شدہ غیر مطبوعہ مسوّدے میں اس کی ضخامت اور بھی بڑھادی گئی ہے۔ فوق نے ترمیم شدہ مسودے میں اقبال کی ہدایت کے مطابق یہ واقعہ حذف کر دیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ خواجہ حسن نظامی بھی فوق کے دوستوں میں سے تھے۔ اور اس کتاب کے حوالے سے فوق نے اپنے غیر مطبوعہ دیباچے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ علاّمہ اقبال کے خیالات کی موجودگی میں یہاں اس واقعے کو نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فوق لکھتے ہیں۔

"حضرت مُلّا شاہ، حضرت میاں میر لاہور کے مرید خالص اور شہزادہ دارا شکوہ کے مُرشد گرامی تھے۔ حضرت میاں میر کی وفات کے بعد حضرت ملّا شاہ کشمیر ہیں گئے۔ وہاں ان کی عمارات کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ مُلّا شاہ نے انہی دنوں میں ایک شعر کہا تھا۔

پنجہ در پنجۂ خدا دارم

مَن چہ پروائے مصطفےٰ دارم

شاہجہان بادشاہ نے علمائے دہلی سے فتویٰ طلب کیا کہ ملّا شاہ اس شعر کے کہنے سے واجب القتل ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اہانت ہوتی ہے۔ شاہجہان نے مُلّا شاہ کو بھی بلوایا۔ تو مُلّا شاہ نے کہا کہ توہین مصطفےٰ تو لوگ کرتے ہیں جو اپنے اور مصطفےٰ اور خدا میں تفریق کرتے ہیں۔ خدا کے پنجہ میں آپ بھی ہیں میں بھی ہوں اور مصطفےٰ بھی ہے۔ پھر پرواہ کس کی اور خوف کس کا۔ بادشاہ خاموش ہوگیا۔ اہلِ کشمیر نے جمع ہو کر کہا کہ مُلّا شاہ نے بادشاہ پر جادو کر دیا ہے۔ جب وہ دعویٰ الوہیئت کرتا ہے تو قتل اس کا کیوں لازم نہیں۔ اس ارادے سے سب لوگ مُلّا شاہ کے پاس گئے لیکن جب اس کے پاس پہنچے تو بہت سے تو بھاگ گئے اور اکثر ان کے مطیع و معتقد ہو گئے۔"

"وجدانی نشتر" مطبوعہ (۱۹۱۵ء) کے اس مختصر تعارف کے بعد اب ہم "وجدانی نشتر" کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس کا ذکر پہلے صفحات میں کیا گیا ہے۔ "وجدانی نشتر" (مطبوعہ ۱۹۱۵ء) کا سارا مواد اس مسودے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پہلے حصے پر مشتمل "وجدانی نشتر" (۱۹۳۹ء) کے نام سے مطبوعہ اس کتابچے میں ۲۳ واقعات ہیں۔ جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی آخری کتاب قرآن کریم کی تلاوت سن کر مختلف لوگوں کے ذہن و قلب پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اور ان کی شخصیت

اور زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ کتاب کا آغاز ان واقعات سے ہوتا ہے جب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی الٰہی کے نزول کے وقت رقت اور وجد کی حالت طاری ہوتی۔ اور پھر عہد نبوی میں اس کلام معجز نما سے کئی انقلابات دیکھنے میں آئے۔ کتاب میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین، علماء و اولیاء کے دلوں پر طاری ہونے والی کیفیات کا تذکرہ ہے۔ یہ واقعات پڑھ کر دل میں جوش وجذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب فوق صاحب کسی شخص کے واقعے میں قرآن کی اثر آفریں لمحوں کا بیان پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والے بھی اس تاثیر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کے علاوہ اس کی قرأت گداز پیدا کرتی ہے جس سے شخصیت نکھرتی ہے۔ اس لیے مسلسل قرآن کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے۔ دنیا میں جتنے لوگ قرآن کریم کے حافظ ہیں اور کسی کتاب کے نہیں۔ بعض اوقات قرآن کریم کی صرف ایک ہی آیت سن کر لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ فوق صاحب نے اسی بات کے ثبوت کے لیے پیش کیا ہے۔ "وجدانی نشتر" میں جو واقعات درج ہیں ان کے عنوانات سے ہی پورا واقعہ آدمی کی آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

فوق صاحب کی یہ کتاب گہرے غور وفکر کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ رقت اور وجد کے ساتھ ساتھ عمل کی طرف بھی اکساتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ" [۸۸]

(اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو اللہ کے خوف سے گرا ہوا پھٹا ہوا پاتے۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ

وہ غور کریں)۔

فوق صاحب نے کتاب کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی ہے۔ ان کے نام ہیں، "قرآن حکیم" "سیرت النبی" "الفاروق" "تاریخ ابن خلدون" "تذکرہ السالکین" "شمس التواریخ" "تذکرہ اولیائے دکن" اور "خزینۃ الاصفیاء"۔

کتاب کے آخر میں فوق صاحب کی دوسری کتابوں کے ساتھ "وجدانی نشتر" کا نام بھی ہے۔ جس کے ساتھ عرف (سوز و گداز) لکھا ہوا ہے۔ غیر مطبوعہ مسودے میں فوق صاحب کا دیباچہ بھی ہے جو اس کتاب میں نہیں چھپ سکا۔ ان کا خیال تھا کہ جب کتاب مکمل شکل میں شائع ہوگی۔ تو اسے شامل کر لیا جائے گا۔ فوق صاحب غیر مطبوعہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"جس زمانے میں رسالہ "طریقت" جاری تھا تو ان واقعات کو جمع کرتا رہا۔ ڈاکٹر اقبال نے ان چیزوں کا نام "سوز و گداز" رکھا تھا اور خواجہ حسن نظامی نے "وجدانی نشتر" تجویز کیا تھا۔ اس کے ساتھ عظیم مرنے والوں کے آخری کلمات بھی اکٹھے کیے جو "طریقت" میں چھپے۔ ان تحریروں کا ایک حصّہ "وجدانی نشتر" کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ "طریقت" کی زندگی یعنی ۱۹۱۸ء میں یہ سلسلہ ختم کرایا گیا۔ اس کے بعد ابوالکلام آزاد نے اپنے مشہور رسالے "الہلال" کے ۱۹۲۷ء کے شماروں میں اپنا مضمون "انسانیت موت کے دروازے پر" لکھا۔ مولانا کی علمی، مذہبی، تاریخی قابلیت اور ان کا زورِ قلم مسلّم ہے۔ انھوں نے خوب لکھا ہے۔ دوسرے کئی رسائل میں بھی مشاہیر کے آخری کلمات طبع ہوئے۔ میں بھی ساتھ ساتھ یہ واقعات جمع کرتا رہا۔ اب ان کی ضخامت ۱۲۸ صفحات تک پہنچ گئی ہے"۔

دیباچے کے نیچے ۱۹۴۳ء یکم جون کی تاریخ تحریر ہے۔ مگر ابھی تک آخری کلمات پر مشتمل یہ واقعات شائع نہیں ہوئے۔ ان کی اشاعت سے یقیناً فائدہ

ہو گا۔ آخری کلمات میں بعض اوقات انسان کی پوری شخصیت اور تجربات کا نچوڑ سمٹ آتا ہے۔ آخری لمحوں میں انسان اپنی پوری زندگی کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے آخری لمحات زندگی میں گھر کے سامان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

"دیکھو میرے گھر میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ مَیں خدا کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔"

دیکھا گیا تو گھر میں صرف ایک تلوار ایک طشت اور ایک پیالہ تھا"

تیسرے غیر مطبوعہ حصّے کا نام "برق طور" ہے۔ اس میں چالیس واقعات ہیں۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جب کسی شخص نے اشعار (عربی) سُنے تو اس پر کیا اثر ہوا۔ اشعار کا ترجمہ بھی ساتھ دیا گیا ہے تاکہ جن لوگوں کو عربی نہیں آتی۔ وہ بھی مُستفید ہو سکیں۔

چوتھے حصّے کا نام "حال و قال" ہے۔ اس میں سو کے قریب واقعات ہیں۔ ان واقعات میں فارسی اشعار سے متاثر ہونے والوں کے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ فارسی زبان میں صوفیاء کے تجربات کا ایک خزانہ موجود ہے۔ اولیائے کرام کی محفلوں میں سماع اسی زبان میں ہوتی تھی۔ سماع کے دوران مختلف وجد آفریں کیفیات کا ذکر زیادہ ہے۔ اس کتاب کی مدد سے آج بھی سماع کو قابلِ سماعت بنایا جا سکتا ہے۔ کتاب میں مولانا روم۔ شیخ سعدی۔ حافظ شیرازی کے اشعار کثرت سے ہیں۔ کتاب میں موجود مولانا روم کا ایک شعر فوق صاحب کے اس اندازِ تحریر کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ ؎

اگر تو یار نداری چرا طلب نہ کنی
اگر بہ یار رسیدی چرا طرب نہ کنی

ایسے اشعار بھی ہیں کہ ایک شعر پڑھنے سے لوگوں نے بادشاہوں کو غلط فیصلے سے بچالیا۔

پانچویں حصے میں وہ واقعات درج کیے گئے ہیں جو اُردو اشعار سننے کے بعد لوگوں کی کیفیت بدلنے کا موجب بنے۔ اُردو زبان میں نازک خیالی اور اثر آفرینی کو ثابت کرنے کا یہ ایک انوکھا انداز ہے۔ اس حصے میں اقبال کے واقعات اور اشعار زیادہ ہیں۔ اس حصے میں اُردو کے علاوہ پنجابی اشعار بھی ہیں۔ مگر یہ حصہ نامکمل لگتا ہے۔ کل بیس واقعات ہیں۔ اور اگلے کئی صفحات خالی ہیں۔ فوق صاحب اسے مکمل کرنا چاہتے ہوں گے مگر اس کی فرصت نہ ملی۔ ۱۹۴۳ء کا زمانہ ان کی پیرانہ سالی اور بیماری کا زمانہ ہے۔

ان واقعات کی فراہمی میں فوق صاحب نے بہت محنت سے کام لیا ہے۔ یہ ایک انمول انتخاب ہے۔ تاریخ کی شاہراہ پر ٹھہرے ہوئے واقعات کو ایک خاص ترتیب سے موضوع کی مشابہت کے ساتھ تحریر کرنا آسان بات نہ تھی۔ ان تحریروں کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ فوق صاحب کی وفات کے آدھی صدی بعد اب اس کی اہمیت اور افادیت اور بھی مسلم ہوگئی ہے۔ فوق کی تاریخ نویسی کا ایک انداز سوانح نگاری میں بھی ظاہر ہوا۔ اس باب کے دوسرے حصے میں ان کی سوانح نگاری کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

"فوق کی سوانح نگاری"

فوق کی سوانح عمریوں کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ جن میں مختصر سوانح عمریاں بھی ہیں۔ اور ذرا تفصیلی بھی۔ ان کی زیادہ تر سوانحی تصانیف میں برِصغیر کے

مشاہیر ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے ممدوح اور موضوع زیادہ تر مسلمان شخصیات ہیں مگر وہ اپنی تحریروں میں مذہب و نسل کے امتیاز کو خاص طور سے ملحوظ نہیں رکھتے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے وہ تاریخ اور سوانح کو آمیخت کر کے اپنا اسلوب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن دنوں (۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۲ء) وہ تاریخ کشمیر لکھ رہے تھے تو انھیں سلاطین کشمیر کے ضمن میں سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کا کردار بہت پسند آیا۔ انھوں نے تاریخ کشمیر میں سے بڈشاہ والے حصے کو علیحدہ شائع کر کے اس کا نام "سلطان زین العابدین" رکھ دیا اور یوں تاریخ نویسی نے کسی حد تک سوانح نگاری کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد مزید جستجو اور تحقیق کے بعد خاصے اضافے کے ساتھ یہی کتاب "شباب کشمیر" کے نام سے شائع کی۔ فوق کے نزدیک تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے سلطان زین العابدین کا زمانہ کشمیر کے عروج کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۹ء میں "شباب کشمیر" شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی فوق نے اس موضوع پر کام جاری رکھا۔ بالآخر ان کی وفات سے ایک برس پہلے ۱۹۴۴ء میں یہی کتاب دوگنا اضافے کے ساتھ شائع ہوئی جس کا نام "تاریخ بڈشاہی" رکھا گیا۔ کشمیر میں عظمتوں کی تلاش کے ذوق و شوق نے سوانح عمری کے فن کی طرف فوق کی توجہ مبذول کرائی اور انھوں نے کشمیر کے علاوہ ہندوستان اور عالم اسلام تک اس دائرے کو وسیع کر دیا اور ہر شعبۂ زندگی سے اہم لوگ فوق کا موضوع بنے جن میں ایک خاصی تعداد خواتین کی بھی ہے۔ علماء، اولیاء، بادشاہ اور راہنمایان وطن کے علاوہ ملّا دوپیازہ، بیربر اور ٹوڈرمل جیسے لوگوں پر بھی فوق نے توجہ دی۔ وہ اپنے قارئین کو کسی موڑ پر بھی مایوس نہیں کرتے۔ ان کے پاس بالعموم ہر آدمی کی پسند کی کوئی نہ کوئی شخصیت موجود ہے۔ فوق سمجھتے تھے کہ بڑا آدمی صرف وہی نہیں جو تخت پر بیٹھا ہے، گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہے مسجد

کے صحن میں امامت کے مصلّے پر بیٹھا ہے بلکہ وہ آدمی بھی زندگی کو پیارا ہو سکتا ہے۔ جو گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلتا ہے یا حاضرین کو ہنسانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ فوق زندگی کی بوقلمونیوں اور شخصیّت میں چھُپی بوالعجبیوں کو تلاش کرنے اور پہچان لینے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ "خواتینِ کشمیر" میں کچھ ایسی خواتین کا تذکرہ بھی ہے جن سے ہر پڑھنے والا پہلی بار متعارف ہوتا ہے۔ "خواتینِ کشمیر" کی طرح ان کی کچھ اور کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں بہت سے لوگوں کے بارے میں سوانحی مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ شخصیات ایک ہی شخص کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔ ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی تحریروں سے جھانکتی ہوئی شخصیّتیں ایک قطار میں کھڑی دکھائی دیتی ہیں "محبِّ وطن خواتینِ ہند" ان عورتوں کا تذکرہ ہے جو برِّصغیر کی تحریکِ آزادی میں نہ صرف مردوں کے شانہ بشانہ شریک تھیں بلکہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھیں۔ اس میں ہندو، مُسلم، عیسائی، پارسی اور سکھ عورتیں شامل ہیں۔ یہ فوق صاحب کا مخصوص انداز ہے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے سے ملتے جُلتے لوگوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ یہ مختصر تحریریں اکٹھی ہو کر بھرپور تأثر بناتی ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح کسی شخصیّت سے مکمّل واقفیّت تو نہیں ہوتی مگر اس کے ساتھ ایک تعلّق ضرور بن جاتا ہے۔ اور یہ کشش اس کے مزید مطالعہ کے لیے اکساتی ہے۔ فوق صاحب ان لوگوں کے سامنے سیرت و کردار کی مثالیں پیش کرنا چاہتے تھے۔ بڑی بڑی قوموں نے سوانح نگاری کو حصولِ تعلیم کے لیے ایک ضروری عنصر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ فوق صاحب کی کئی ایسی کتابیں کشمیر کے مدرسوں میں شامل نصاب رہی ہیں۔ ان کی مکمّل سوانح عمریوں میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو نیکی، بھلائی اور علم و عمل کی علامت ہیں۔ تہذیبی اور روحانی طور پر صاحبِ

دل اور صاحبِ نظر شخصیات فوق صاحب کا محبوب موضوع ہیں۔ "سوانح عمری حضرت علی ہجویری"، "ملک العلماء مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی"، "مہاتما بدھ" اور "حیاتِ فرشتہ" وغیرہ کے علاوہ جس خاتون کی سوانح انھوں نے بہت عقیدت سے لکھی ہے وہ کشمیر کی للہ عارفہ ہے جسے مسلمان اور ہندو دونوں پیار کرتے تھے۔ اس طرح ہر طرح کے صاحبِ کمال لوگ ان کی سوانح عمریوں میں شامل ہیں۔ "تان سین"، "راجہ ٹوڈر مل"، "مُلّا دو پیازہ" وغیرہ دلچسپ کتابیں ہیں۔ فوق صاحب نے جن دو چار بادشاہوں پر قلم اُٹھایا ہے وہ اعلیٰ اوصاف کی بنیاد پر تاریخ کا افتخار ہیں۔ سب سے بڑی مثال "تاریخ بڈشاہی" ہے۔ ایک مختصر کتاب خاتون حکمران "اہلیا بائی" کے بارے میں ہے جو عورتوں میں چھپی ہوئی ہمتوں کا آئینہ ہے۔ ان کی کچھ غیر مطبوعہ سوانح عمریاں بھی ملی ہیں جن میں کشمیر کا "مہاراجہ گلاب سنگھ" اور کشمیر کا "نادر شاہ" اس لحاظ سے اہم ہیں کہ مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ خاندان کا سپوت تھا اور ڈوگرہ راج کے خلاف جدّوجہد کے باوجود فوق صاحب نے اس کے اچھے پہلوؤں کی نشاندہی میں تعصب نہیں برتا اور دوسری غیر مطبوعہ سوانح عمری میں ایک مسلمان افغان گورنر آزاد خان کے ظلم وستم اور بدعنوانیوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ یہ واحد کتاب ہے (غیر مطبوعہ ہونے کی صورت میں قارئین کی نظر سے نہیں گزری) جس میں فوق صاحب نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے البتہ "نور جہاں اور جہانگیر" کی زندگی پر مشتمل سوانح عمری میں فوق صاحب نے مؤرخ کے ساتھ ساتھ ایک ناقد کا انداز بھی اختیار کر لیا ہے۔ فوق صاحب کا لہجہ ذرا تلخ ہے اور ان کا انداز مناظرانہ ہو گیا ہے۔ وہ اصل میں ایک مؤرخ مرزا حیرت پر ناراض معلوم ہوتے ہیں اور جہانگیر ان کی اسی خفگی کی زد میں آگیا ہے ورنہ باقی تمام شخصیات کی طرف ان کا رویّہ ہمدرد ہے بلکہ عقیدتمندانہ ہے۔ وہ اپنی سوانح عمریوں میں اپنی متعلقہ شخصیات سے بے حد متاثر دکھائی

دیتے ہیں۔ وہ مثبت رجحان کے ادیب تھے۔ ان کی نظر ہمیشہ روشن پہلوؤں پر رہی۔
سوانح نگاری بحیثیت صنف سخن جو مقاصد اور اثرات اپنے اندر رکھتی ہے ان سے فوق صاحب بخوبی آگاہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ عظیم انسانوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ مستحسن جذبات پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ علی لکھتے ہیں:

"انسان اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اس سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس طرح خود اعتمادی حاصل کر سکتا ہے۔ اوروں کے نیک ارادوں اور عمل کے صحت مند اثرات کے مدنظر خود بھی اپنی زندگی کو اعلیٰ تر مقاصد، خدمت و اصلاح کے لیے وقف کر سکتا ہے۔" [89]

سوانح نگاری ایک نہایت مفید اور مؤثر صنف کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات سے سوانح نگاری کا کوئی محقق انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح آپ کسی پابندی کے بغیر عظیم لوگوں کی صحبت اختیار کر سکتے ہیں۔ آسمانی کتابوں میں بھی ان لوگوں کے حالات کثرت سے بیان ہوئے ہیں جو انسانوں کی زندگیوں میں اصلاح و انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے۔ فوق صاحب کے دل میں یہ تڑپ موجزن تھی کہ وہ اہلِ کشمیر کی تقدیر بدل دیں۔ اہلِ پنجاب اور اہلِ ہند کو ان کی اپنی تاریخی عظمتوں سے روشناس کرائیں۔ انھوں نے زیادہ تر اپنے ملک میں ہی یہ عظمتیں تلاش کیں اور انھیں بہت سادہ اور سچے انداز میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ وہ سرسید اور حالی کے نظریۂ فن پر عمل کرتے ہوئے عظیم ادیب بننے کے خواہش مند نہیں تھے، اپنی صلاحیت کے ذریعے کوئی خدمت بجا لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے فن کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا لیکن اس کی باریکیوں میں بھی نہیں الجھے۔ ایک صاف، سیدھے بیانیہ اسلوب میں بڑی بڑی شخصیات کے حالات و واقعات لکھ دیے ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے سہولت اور آسانی

محسوس ہوتی ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اپنے پڑھنے والوں کو بڑے لوگوں سے متعارف کراتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ ہیں کہ جو بظاہر بڑے محسوس نہیں ہوتے مگر فوق صاحب ان میں اس طرح بڑائیاں تلاش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بھی اپنے بڑے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ماضی بالخصوص کشمیر کے ماضی کے مشاہیر جو فوکس میں نہیں تھے ان کا ذکر بھی عام کیا۔ برصغیر کی بھولی ہوئی کہانیوں کو تاریخ حقیقتوں کی روشنی میں سب کے سامنے لاکر پیش کیا۔

تاریخ و سوانح کا فن انشاء پردازی کو قبول نہیں کر سکتا۔ مؤرخ کا فرض ہے کہ وہ ماضی کی صحیح تصویر دکھائے۔ وہ اگر زبان و بیان کے دھندلکوں میں بھٹک جائے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ شرمن کینٹ نے اسی اندیشے کے پیش نظر کہا تھا۔

"مؤرخ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وہ جو کچھ کہے بڑی صاف اور سمجھ میں آنے والی زبان میں کہے۔"[۹] (ترجمہ)

فوق صاحب اپنے لوگوں کو باخبر بنانا چاہتے تھے۔ وہ تلخ حقائق کے گرد تاریخی حقائق کا پردہ ڈال کر لوگوں کے اندر حوصلے زندہ رکھنے کے حق میں تھے۔ وہ بات کو رنگین بنا کر دھوکہ دینے کے حق میں نہیں تھے۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ سادگی بیان کے لحاظ سے فوق صاحب حالی کے مسلک کے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ نے حالی کی سوانح نگاری کے اسلوب بیان کے بارے میں جو بات کی ہے وہ فوق صاحب پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ فوق صاحب ایک سرگرم آدمی تھے، کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان کے دل میں ہر وقت کروٹیں لیتا رہتا تھا وہ تمام عمر چین سے نہیں بیٹھے مگر ان کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ تھا اور وہ ذاتی طور پر حالی کی شخصیت کے قریب تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے۔

"حالی کی تحریریں ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ سادگی، سلامت روی اور خلوص یہ سب رنگ ان کی تحریروں میں جھلک رہے ہیں"۔ ۹۱

فوق صاحب اپنے زمانے کے ایک معروف اور مصروف آدمی تھے۔ انھوں نے کئی اصناف کو اپنی تحریروں کے لیے استعمال کیا۔ وہ ایک ممتاز صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ادب و صحافت کو یک جان کر کے ایک مؤثر اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے واقفانِ فن کے ساتھ ساتھ کم پڑھے لکھے لوگوں کو بھی خود سے کبھی جدا نہ سمجھا۔ وہ اپنے عہد میں ایک مقبول لکھنے والے تھے۔ ان کی کتابیں بہت پڑھی جاتی تھیں۔

ان کی کتابوں بالخصوص تاریخی اور سوانحی کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ سوانح نگاری کے میدان میں اردو زبان کے پاس دوسری اصناف کے مقابلے میں اتنا بڑا ذخیرہ نہیں لیکن اس صنف کا مستقبل روشن ہے۔ فوق صاحب کی سوانح عمریاں تعداد اور معیار کے لحاظ سے ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس عمومی تجزیے کے بعد فوق صاحب کی سوانح عمریوں کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کتب کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا ایک خاص ترتیب کے ساتھ فہرست بنائی گئی ہے۔ اور موضوع کی کسی حد تک یگانگت کے حوالے سے ایک انداز کی سوانح عمریوں کو ایک ساتھ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اولیائے کرام، علمائے عظام، سلاطین، خواتین اور متفرق شعبہ ہائے زندگی سے متعلق سوانح عمریو ں کو ایک جگہ کر کے دیکھا گیا ہے جن میں سے چار غیر مطبوعہ کتابوں "مہاراجہ گلاب سنگھ"، "کشمیر کا نادر شاہ"، "شیخ نور الدین ولی" اور "راجہ سکھ جیون مل" میں سے پہلی دو کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ "مہاراجہ گلاب سنگھ" کا مسودہ فوق صاحب کے بیٹے ظفر احمد مرحوم کے گھر سے اور "کشمیر کا نادر شاہ" عبداللہ قریشی کے پاس محفوظ ہے۔

عبداللہ قریشی صاحب نے "نقوش" لاہور کے لاہور نمبر میں فوق کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی جو فہرست دی ہے۔ ان میں سے "ایڈورڈ ہشتم" "تان سین" اور "سر گنگا چندر بوس" ہر ممکن کوشش کے باوجود دستیاب نہیں ہوسکیں۔ جب کہ اس فہرست کے علاوہ فوق کی دو کتابیں "حسن بصری" اور "مجدد الف ثانی" انجمن ترقیٔ اردو، کراچی کی لائبریری سے مل گئیں۔ یہ دو کتابیں سوانحی مضامین کے اس سلسلے سے تعلق رکھتی ہیں جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۷ء تک فوق صاحب نے پنڈی بہاؤ الدین (منڈی بہاؤ الدین) سے نکلنے والے اپنے وقت کے مشہور رسالے "صوفی" میں لکھے تھے۔ جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ مختصر سوانحی مضامین کو ایک کتاب میں اکٹھا کر دیا گیا۔ "تذکرۃ الصالحین" اس کی نمایاں مثال ہے۔ نسبتاً طویل سوانحی مضامین کو الگ الگ شائع کر دیا گیا ہے۔ "حسن بصری" "مجدد الف ثانی" کے علاوہ "شمس تبریز" "سعد زاغلول پاشا" "حیات فرشتہ" "مہاتما بدھ" اور "مہاراجہ گلاب سنگھ" معروف ہیں۔ "صوفی" اپنے زمانے کا ممتاز اور مقبول رسالہ تھا۔ اس کے مدیر ملک محمد الدین اعوان تھے۔ انھوں نے ایک دور افتادہ مقام سے ایک ایسا رسالہ باقاعدگی سے نکالا۔ جس کے اثرات بڑے شہروں میں بھی محسوس کیے گئے۔ ملک صاحب مذکور کے مختصر حالات فوق کی کتاب "اخبار نویسوں کے حالات" میں صفحہ ۶۲ پر موجود ہیں۔ اپنے وقت کے تقریباً تمام نامور لکھنے والے یہاں شائع ہوتے تھے۔ بہت سے لوگوں میں علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، راشد الخیری، سیماب اکبر آبادی، نیاز فتح پوری اور محمد الدین فوق بھی شامل تھے۔ اس رسالے میں اپنے نام کی رعایت سے صوفیائے کرام کے بارے میں خاص طور سے مضامین چھپتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی علمائے کرام سلاطین اور صلحائے قوم کے بارے میں تحریریں

شائع ہوتی تھیں۔ فوق صاحب اس رسالے میں اکثر و بیشتر لکھتے رہتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں مطبوعات صوفی کے اشاعتی ادارے سے شائع ہوئیں۔ جنھیں بعد میں فوق صاحب نے "ظفر برادرس" کے زیرِ اہتمام خود بھی چھاپا۔ اس رسالے میں فوق صاحب کی دوسری کتابوں کے اشتہار بھی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۴ء تک کے صوفی کے رسالوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ فوق صاحب کی سوانحی کتاب "بتانِ حرم" پر ایک مختصر تبصرہ "ادبیات" کے عنوان کے تحت ہوا ہے۔

"مصنّف کا مقصد تاریخی شخصیتوں سے تعارف کرانا ہے۔ انھوں نے جس کا بھی حال لکھا ہے۔ اس کی سیرت کا مرقع کھینچ دیا ہے۔"[۹۲]

فوق صاحب کے کچھ ایسے مضامین "قوس قزح" لاہور اور "نیرنگ خیال" لاہور میں شائع ہوئے۔ "فروری ۱۹۲۷ء" میں مراد بیگم بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ سوانح نگاری کی صورت میں فوق صاحب اصل میں تاریخ نگاری کے مختلف تجربات کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی تاریخی کُتب خاص طور سے "مآثر لاہور" اس کے غیر مطبوعہ حصّے "بے نشان نامور" اور "تاریخ شالامار" کا انداز سوانحی ہے۔ "تاریخ شالامار" بھی مشہور پنجابی صوفی شاعر شاہ حسین کی سوانح عمری بھی شامل ہے۔ فوق صاحب کی خودنوشت "سرگزشت فوق" اور تذکرہ مزار الشعرائے کشمیر" کو بھی اسی باب میں شامل کیا گیا ہے۔ تذکرہ اور خودنوشت کو بھی سوانح کے اکثر علما، سوانح عمری ہی میں شامل سمجھتے ہیں۔

فوق کی سوانح عمریاں تحقیق و جستجو کے ایک ذریعہ کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ ڈاکٹر یوسف بخاری نے اپنی کتاب "کاشر شاعری" میں کشمیر کی ایک قدیم اور مشہور شاعرہ للہ عارفہ کے بارے میں لکھے گئے پورے باب میں "خواتین کشمیر" میں شامل فوق کے سوانحی مضمون کو بنیاد بنایا ہے۔ کئی واقعات کی تائید کے لیے

فوق کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:
"سید علی ہمدانی اور للہ عارفہ کی پہلی ملاقات کا واقعہ بہت دلچسپ اور مشہور ہے۔ اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں۔ ہم یہ دونوں "خواتین کشمیر" مصنفہ محمد الدین فوق سے حرف بحرف نقل کرتے ہیں۔" [۹۳]

اس واقعے کے علاوہ اور بھی کئی واقعات اسی طرح پورے کے پورے درج کر دیے گئے ہیں۔

فوق کی سوانح عمریوں کی فہرست اس طرح درج کی جاتی ہے کہ ان کی امتیازی خصوصیت کا پتہ چل سکے۔

علماء و اولیاء:

تذکرۃ الصالحین۔
شمس تبریز۔
حضرت ابراہیم ادھم۔
حیات مولانا روم۔
حضرت علی ہجویری۔
مجدد الف ثانی۔
شیخ نور الدین ولی۔
خواجہ حسن بصری۔
مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی۔

سلاطین:

سلطان زین العابدین۔

شباب کشمیر۔

تاریخ بڈشاہی۔

حیات نور جہاں وجہانگیر۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ۔

ایڈورڈ ہشتم۔

کشمیر کا نادر شاد (غیر مطبوعہ)

راجہ سکھ جیون مل ،،

مہاراجہ گلاب سنگھ ،،

خواتین :

محب وطن خواتین ہند۔

بتان حرم :

خاتون جنت۔

للہ عارفہ۔

تذکرہ خواتین دکن۔

خواتین کشمیر۔

اھلیا بائی۔

متفرق :

مُلّا دو پیازہ۔

حالات نواب دبیر الدولہ۔

راجہ ٹوڈر مل۔

مہاتما بدھ۔

حیات فرشتہ۔

سعد زاغلول پاشا۔

تذکرہ رہنمائے ہند۔

فاتح ملتان۔

سر جگدیش چندر بوس۔

راجہ بیربر۔

مشاہیر کشمیر۔

تان سین۔

ہندوستانی وی سی۔

موجد اور ایجادیں (غیر مطبوعہ)

خودنوشت :

سرگزشت فوق۔

تذکرہ :

مزار الشعرائے کشمیر

"علماء و اولیاء کے بارے میں سوانح عمریاں"

محمد الدین فوق کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری واضح طور پر مقصدیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی سوانح نگاری کے ذریعے سے انسانی عظمت کی بعض روشن مثالوں کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اولیائے کرام اور علماء کی سوانح عمریاں بھی لکھیں۔ برِ صغیر میں صوفیاء نے انسانی اور اسلامی فلاح و بہبود اور اتحاد و اتفاق کا جو معاشرہ تخلیق کیا۔ وہ فوق صاحب کے لیے بہت بڑا محرک تھا۔ ایک آفاقی اور بے لوث محبت سے مرتب شدہ معاشرہ جو صُوفیا کی صحبت میں لوگوں کو میسر آیا۔ ان کے عقیدت مندوں نے ان کی تحریروں اور اقوال کے حوالے سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ پُورے عالمِ اسلام میں اور بالخصوص برِ صغیر ہند میں اولیائے کرام کی سرگرمیاں ایک پوری تاریخ رکھتی ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اہلِ علم تھے۔ اہلِ خبر تھے، اہلِ دل بھی تھے۔ ذہنی، قلبی اور روحانی طور پر لوگوں میں انھوں نے ایک سچی زندگی کا سلیقہ پیدا کر دیا۔ جو عقیدت ان حضرات کو لوگوں کی طرف سے حاصل ہُوئی۔ وہ بادشاہوں کے درباروں میں دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی موت کے بعد بھی ان کا فیضان جاری رہا۔ ان کی قبروں پر لوگوں کا ہجوم اس بات کی سب سے بڑی گواہی ہے۔ اولیائے کرام کے عرس اب میلے کا انداز اختیار کر چکے ہیں۔ اور ثقافتی زندگی کی ایک لازمی سرگرمی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی تعلیمات اور ان کی زندگی کی مختلف جھلکیاں ایک بہتر زندگی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے فقیری میں بادشاہی کی۔ فوق صاحب تو بادشاہوں کے ضمن میں بھی اپنی پسندیدگی کے لیے فقیرانہ مزاجی کو ترجیح دیتے ہیں۔ فوق صاحب نے اپنی سوانح

عمریوں کے لیے ان حضرات کو منتخب کیا ہے۔ جو علوم ظاہری اور علوم باطنی میں
میں کمال رکھتے تھے۔ ان کی سیرت وسوانح کے ذریعے وہ لوگوں کو اندر سے زندہ
کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ یہ سوانح عمریاں اپنی سادگی بیان اور تاثیر کے
اعتبار سے ایک عمدہ نمونہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ ہم نے اسی لیے سب سے پہلے
فوق صاحب کی ان سوانح عمریوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں چھ مکمل سوانح عمریاں ہیں۔
"تذکرۃ الصالحین" میں مختلف اولیائے کرام کے بارے میں سوانحی مضامین ہیں۔
جس میں سے "صوفی" (منڈی بہاؤالدین) کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے
جن کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔

"تذکرۃ الصالحین"

۱۹۱۲ء میں ہندوستان سٹیم پریس لاہور کی طرف سے شائع ہونے والی ۱۲۰
صفحات کی اس کتاب میں تیرہ ایسے اولیائے کرام کے بارے میں مختصر سوانحی
مضامین ہیں جنھیں سوانحی خاکے کہا جاسکتا ہے۔ نہایت اختصار اور جامعیت
کے ساتھ ان زندۂ جاوید لوگوں کی زندگیوں کی مکمل جھلک دکھانے کی کوشش
کی ہے۔ ایک واضح اندازِ بیان سے جو بھرپور اور پُرتاثیر بھی ہے۔ کہیں کہیں
تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر ایک مربوط سلسلۂ تحریر میں اس کا اتنا احساس بھی نہیں
ہوتا۔ ایک تذکرہ کے ختم ہوتے ہی دوسرا تذکرہ تاثر کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ واقعات کی
یک رنگی بھی آدمی کی توجہ کو قائم رکھتی ہے۔ اولیائے کرام کی زندگیوں میں ایک مخصوص
انداز کی مشابہت اور مطابقت نے فوق صاحب کی بڑی مدد کی ہے۔ مختلف اولیائے
کرام کے واقعاتِ زندگی کے انتخاب میں فوق صاحب نے بہت محنت کی
ہے۔

"تذکرۃ الصالحین" میں جن تیرہ بلند مرتبت شخصیات کا تذکرہ ہے۔ ان میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی، حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی، شیخ شرف الدین، بو علی قلندر، حضرت ابوالحسن، امیر خسرو، حضرت شاہ دولہ، حضرت سُلطان سخی سرور، حضرت خواجہ حسن نظامی، حضرت خواجہ حبیب عمی، حضرت داؤد طائی، حضرت خواجہ معروف کرخی، حضرت شیخ نورالدین ولی اور حضرت شیخ حمزہ کشمیری شامل ہیں۔

راقم نے "صوفی" منڈی بہاؤالدین کے جنوری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں حضرت شاہ دولہ یا ور جنوری ۱۹۱۲ء کے شمارے میں حضرت خواجہ معروف کرخی کے بارے میں فوق صاحب کے مضامین دیکھے ہیں جو بعد میں اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ممکن ہے اس کتاب میں شامل ان کے دوسرے مضامین بھی صوفی کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے ہوں۔

فوق صاحب ہر صُوفی کے ابتدائی حالات ان کے معاملات و مشاغل ان کے سلسلۂ تصوف ان کے مرتبہ و مقامِ سلوک کے علاوہ ان کی تعلیمات اور مجالس اور عام لوگوں کے ساتھ ان کے روابط کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ وہ ہر مسلک کے صوفی کے لیے شریعت کی پابندی کا ذکر بھی خاص طور پر کرتے ہیں۔

صُوفیاء کے حالات کے بیان میں اس وقت کے سیاسی حالات کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں۔ صفحہ ۴۴ پر امیر خسرو کے تذکرے میں انھوں نے شہزادہ محمد سُلطان کے ہمراہ لاہور میں مغلوں سے لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ شہزادے کے قتل اور امیر خسرو کے قیدی بن کر بلخ جانے کے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ اور صوفیا کے کشف و کرامات کی باتیں بھی لکھی ہیں۔ البتہ اس ضمن میں صرف عام لوگوں کی سنی سنائی باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت تحقیق و جستجو کے بعد

ن کی تصدیق کی ہے۔ حضرت شاہ دولہ گجراتی کا تذکرہ صوفیاء کے سلسلے کی عام کتابوں
یں کم ملتا ہے۔ فوق صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں شاہ دولہ کے چوہوں
کا تذکرہ کیا ہے۔ روایت ہے کہ جو بے اولاد لوگ مزار شریف پر منت مانتے کہ
وہ اپنا پہلا بچہ شاہ دولہ کی نذر کر دیں گے تو ان کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے۔ مزار
پر ایسے مردوں، عورتوں کی خاصی تعداد ہوتی ہے جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔
ان کو شاہ صاحب کی کرامت کی گواہی قرار دیا جاتا ہے۔ فوق صاحب نے اس
روایت کی تردید نہیں کی مگر اتنا ضرور بتایا ہے۔ کہ مزار پر نذر کیے ہوئے ان بچوں کو
خاص ٹوپیاں پہنادی جاتی ہیں جن سے ان کے سر چھوٹے رہ جاتے ہیں اور جسم
کے ساتھ ان کے دماغ کی صحیح افزائش نہیں ہوسکتی۔ وہ نہ صرف بدہیئت ہو جاتے
ہیں بلکہ عقل و شعور سے عاری بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔
اس بات پر فوق صاحب نے تنقید کی ہے کہ ان معصوم بچوں پر دُہرا ظلم یہ کیا
جاتا ہے کہ ان کے ذریعے بھیک مانگنے کا کاروبار چمکایا جاتا ہے۔ اور اُنھیں اپنے
روزگار کا وسیلہ بنالیا جاتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فوق کی نظر بعض بدعتوں پر
بھی پڑتی ہے۔ اس اندازِ بیان سے فوق صاحب کی یہ کتاب اور بھی اہمیت اختیار
کر جاتی ہے۔

کتاب میں دو کشمیری صوفیوں شیخ نور الدین ولی کشمیری اور محبوب العالم
سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ کشمیری کے احوال بھی لکھے گئے ہیں۔ جو فوق
صاحب کی کشمیر سے فطری مناسبتوں کے عین مطابق ہے۔ شیخ نور الدین ولی کے
بارے میں ایک کتاب بھی فوق صاحب نے لکھی تھی جو شائع نہ ہو سکی۔ اور اب اس کا
غیر مطبوعہ مسودہ بھی نایاب ہے۔

"حالات حضرت شمس تبریزؒ"

۱۹۱۴ء ہی میں بلالی سٹیم پریس منڈی بہاؤالدین میں مطبوعات "صوفی" کے تحت "حالات حضرت شمس تبریز" شائع ہوئی۔ اس مختصر کتاب کی ضخامت ۵۹ صفحات ہے۔ اس کتاب میں حضرت شیخ شمس الدین تبریزی کے حالات واقعات اور کرامات کا تذکرہ ہے۔ شمس الدین تبریز مولانا روم کے مرشد ہونے کے حوالے سے ساری مشرقی دُنیا میں جانے جاتے ہیں۔ ان کے مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا روم جیسے صاحب بصیرت اور رمز آشنا شاعر اور ولی نے ان کے مرید ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے سب سے بڑے ماخذ کے طور پر شمس تبریز کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ اور اپنی غزلیات کے مجموعے کا نام بھی "دیوان شمس تبریز" رکھا ہے۔ فوق صاحب نے اس پر شک کا اظہار کیا ہے۔ کہ یہ مولانا روم کا کلام ہے۔ جب کہ مولانا روم نے اپنی عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے شمس تبریز کے نام سے اپنا مجموعہ کلام شائع کرایا تھا۔

شمس تبریز کے قتل کے بارے میں بھی فوق صاحب نے متنازعہ باتیں کی ہیں۔ اس کتاب میں فوق صاحب نے تحقیقی انداز اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ انھوں نے جن کتابوں سے مدد لے کر یہ کتاب لکھی ہے۔ ان کے نام بھی لکھ دیے ہیں جن میں "مناقب العارفین"، "دیوان شمس تبریز"، "سوانح مولانا روم" اور "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" قابل ذکر ہیں۔ شمس تبریز کی سوانح اس لحاظ سے اہم ہے کہ علوم ظاہری کے ساتھ جب تک علوم باطنی کی روشنی شامل نہ ہو، گہرائی اور تاثیر کا امتزاج کسی کلام میں پیدا ہونا مشکل ہے۔

"حضرت ابراہیم ادھمؒ"

۱۹۱۴ء ہی میں راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور ۸۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت ابراہیم ادھم کی زندگی سے واقفیت مہیا کرتی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے بادشاہی کو ٹھکرا کر فقیری اختیار کی۔ اور اہلِ دُنیا کو بتایا کہ اصل بادشاہی فقیری میں ہے۔ ہماری تاریخ بادشاہی میں فقیری کرنے والوں سے بھری پڑی ہے۔ فقیری میں بادشاہی کا راز پاجانے والوں کی کمی بھی نہیں۔ ابراہیم ادھم ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ان دونوں مقامات کو فتح کیا تھا۔ اور بالآخر فقیری اختیار کرکے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان "الفقر فخری" کو اپنا مقدر بنالیا۔ اتنے بڑے ولی اللہ کے حالات تحریر کرکے فوق صاحب نے اُمّتِ مُسلمہ کا درد رکھنے والے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ وہ تاریخ اِسلام کے تابدار گوشوں کو تلاش کرکے لوگوں کے سامنے لانے کا عزم رکھتے تھے۔ اور اسے دِلچسپ انداز میں بیان کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ اس سوانح حیات میں بھی چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے بات کو دلنشین پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔ کہیں کہیں مکالمے کا انداز بھی مِلتا ہے۔ ابراہیم ادھم کی بات ان کے قلم سے زیادہ مؤثر صُورت میں بیان ہُوئی ہے۔ وہ علوم و رموز جو آسانی سے سمجھ میں آنے والے نہیں، اُنھیں بات چیت کے اسلوب میں پیش کرکے قارئین کے لیے سہولت پیدا کر دی ہے۔ فوق صاحب نے آپ کے چند کلمات طیبات نقل کیے ہیں۔ حضرت ابراہیم ادھم فرماتے ہیں۔

۱۔ جو شخص شہوت کا غلام ہے، اس کے دِل میں صدق اور خلوص کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔

۲۔ کتاب کی جدائی سے کوئی چیز مجھ پر زیادہ سخت نہیں۔

۳۔ حریص نہ بن۔ کیونکہ حریص آدمی محروم رہتا ہے۔

فوق صاحب نے حضرت ابراہیم ادھم کے ہم نام بزرگان دین کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔ ان کی تعداد اکیس ہے۔ جن میں ابراہیم بن سعد العلوی الچشتی، ابراہیم رباطی، ابراہیم شماس سمرقندی، ابراہیم بن عیسیٰ، ابراہیم بن ثابت۔ ابراہیم دہقانی، ابراہیم المتوکل اور ابراہیم مجذوب کے علاوہ بھی کئی معروف لوگ شامل ہیں۔ بعض اوقات ناموں کی یکسانیت سے مختلف الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ بات قاری کے لیے آسانی کا باعث بنتی ہے۔ اس انوکھے اسلوب سوانح نگاری سے کتاب میں دلچسپی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

حضرت ابراہیم کے پیر طریقت حضرت فضیل بن عیاض کے مختصر حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ آپ ڈاکو تھے بلکہ قزاقوں، لٹیروں، رہزنوں کے سردار تھے۔ پھر اچانک ایک واقعے نے ان کی قلبی حالت تبدیل کر دی۔ اور آپ بہت بڑے ولی ہوئے۔ بادشاہی چھوڑ کر فقیری اپنانے والے ابراہیم ادھم کا پیر ایسا ہی آدمی ہونا چاہیے تھا۔

حسب معمول فوق صاحب نے ان کتابوں کے نام لکھ دیے ہیں۔ جن کی مدد سے یہ کتاب تیار کی گئی۔ آخر میں اپنی کتاب "تذکرۃ الصالحین" کا نام بھی ہے۔ جس کا جائزہ پہلے صفحات میں موجود ہے۔

"مجدد الف ثانیؒ"

منڈی بہاؤالدین کے رسالہ "صوفی" کی طرف سے سلسلۂ مشاہیر اسلام و صوفیائے کرام کے تحت یہ دونوں کتابیں "مجدد الف ثانی" اور "حسن بصری" شائع

ہوئیں۔ ان کے علاوہ مختلف لوگوں کی لکھی ہوئی کئی اولیائے کرام کے بارے میں کتابیں بھی شائع کی گئیں۔ یہ دونوں بزرگوں کے حالات سیدھے سادھے انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ جن کی مدد سے ان کے عمومی حالات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ پیدائش۔ بچپن۔ تعلیم، درس وتدریس اور رشد وہدایت کا احوال مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مجدد صاحب کے ضمن میں آپ کی ابوالفضل اور فیضی سے ملاقاتوں کا حال بھی لکھا گیا ہے۔ ایک سفر کے دوران تھانیسر کے مقام پر رئیس شیخ سلطان نے اپنے خواب کی روشنی میں آپ کے والد کو اپنی بیٹی کی شادی کی درخواست کی جو انھوں نے منظور کرلی۔ اس طرح حضرت مجدد دنیاوی لحاظ سے اس قدر مالا مال ہوئے کہ ان کو کسی طرح کی حاجت نہ رہی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ سے آپ کی ملاقات فوق صاحب کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ حسن کشمیری کی وساطت سے ہوئی۔ حضرت کشمیری کے لیے حضرت مجدد صاحب کے احسان مند ہونے کا تذکرہ بھی کتاب میں موجود ہے۔ دہلی اور لاہور کے سفر کے احوال میں عقیدت کے مظاہرے کی تفصیل بھی موجود ہے۔ فوق صاحب لکھتے ہیں:

"جب آپ دہلی کے قریب پہنچے تو حضرت خواجہ باقی باللہ اپنی جماعت کے ساتھ پیادہ پا آپ کے استقبال کو روانہ ہو گئے۔ اور آپ کو بااعزاز اپنے ہمراہ لائے۔ ایک دن فرمایا۔ ہم ضعیف ہیں۔ ہمارے لڑکے خورد سال ہیں۔ ان کی خبرگیری رکھنا یہ کہہ کر لڑکوں کو بلوایا اور حضرت مجدد کی گود میں دے دیا۔ یہ دونوں بزرگوں کی آخری ملاقات تھی۔"

(صفحہ ۱۳۔)

فوق صاحب نے جہانگیر کے دربار میں آپ کی طلبی اور گرفتاری کے بعد جہانگیر کی پشیمانی کا ذکر مؤثر انداز میں کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لیے

علامہ اقبال نے یہ زندہ جاوید مصرعہ کہا ہے۔

گردن نہ جُھکی جس کی جہانگیر کے آگے

جُرأت و حق گوئی آپ کی سب سے بڑی کرامت تھی۔ اس کے علاوہ بھی مختلف کرامتوں کا بیان فوق صاحب نے کیا ہے۔ اس کے ساتھ فوق صاحب کی یہ بات بہت فکر انگیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کوئی بات بھی ان کو پسند نہیں جو شرع شریف اور سُنّتِ نبوی کے خلاف پائی جاتی ہو۔" (صفحہ ۱۸۔)

مجدّد صاحب کے حالات لکھ کر فوق صاحب نے صُوفیاء کے بارے میں اپنے نظریات کی از خود وضاحت کر دی ہے کہ وہ شخص بڑا ہے جو بادشاہوں پر تنقید کرنے سے نہیں ہچکچاتا۔ حضرت مجدّد کا تذکرہ ان کی کتاب "تاریخ حُریت اسلام" میں بھی موجود ہے۔ کتاب پر سن اشاعت لکھا ہُوا نہیں۔

"حضرت خواجہ حسن بصریؒ"

تاریخ تصوّف اِسلام میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے بارے میں فوق صاحب نے بنیادی اور عمومی نوعیت کی معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔ پیدائش سے لے کر وفات تک ان کی زندگی کا ایک واضح تسلسل اس کتابچے میں نظر آتا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت مختصر واقعات کے ذریعے وہ اپنی بات پڑھنے والوں تک پہنچانا چاہتے ہیں "دُنیا داری کے جھمیلوں میں مخلصی"۔ "وعظ میں محویت"۔ "آپ کا درد اور ذوق"، "ایک جنازہ میں شمولیت"، "نماز استسقاء میں وعظ"، "پانچ قسم کے لوگوں کی تعریف"۔ "آپ کی وفات" چند ایک ایسے عنوانات ہیں جو پورے واقعے کی خبر فراہم کر دیتے ہیں لیکن مختلف

نوعیت کے واقعات کے ذریعے فوق صاحب کسی شخصیت کے لیے دلچسپی تو پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر اس طرح مکمل زندگی کا بھرپور تجزیہ ممکن نہیں ہوتا۔ ان واقعات کے درمیان کوئی تاریخی ترتیب نظر نہیں آتی۔ نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ فوق صاحب ان واقعات کو حکایات کا رنگ دے کر کوئی نہ کوئی سبق آموز حقیقت برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جنازہ میں شمولیت اور مُردہ کو کندھا دینا آپ فرض اولیٰ سمجھتے تھے۔ اور حتی الامکان یہ ثواب ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ایک جنازے میں شامل ہوئے۔ جب لوگ مُردے کو دفن کر چکے اور الگ بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا۔ اے دُنیا پرستو! یہ قبر دُنیا کا آخر ہے اور آخرت کی پہلی منزل ہے۔ پھر کیا ناز اور غرور ایسے عالم پر جس کا آخر یہ ہے۔ اے دُنیا کے کیڑو! کیوں نہیں ڈرتے اس عالم سے جس کا اوّل یہ ہے۔ جب اوّل و آخر ایک ہی ہے تو اے غافلو ڈرو اس وقت سے جب تمھیں سر پیر کا ہوش نہیں رہے گا۔ یہ بیان اس دردناک پیرایہ میں حضرت خواجہ نے فرمایا کہ لوگ روتے روتے بے خود ہو گئے" (ص: ۱۱۔)

یہ واقعہ ایک عبرتناک سچائی کا عکاس ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کہاں اور کن لوگوں سے حضرت نے خطاب کیا تھا۔ شاید وہ اس طرح حضرت کی زندگی کے جستہ جستہ پہلوؤں کو سامنے لا کر لوگوں میں پُرخلوص جذبوں کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ کسی شخصیت کا مربُوط تعارف نہیں ہوتا۔ مگر اس شخصیت کے جس رُخ پر فوق صاحب زور دینا چاہتے ہیں۔ اس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

اس کتاب کا سوانحی اسلوب مجدد صاحب کے بارے میں سوانح عمری سے

مختلف نہیں ہے۔ سوانح عمریوں کا یہ انداز لوگوں میں زندگی گزارنے کا ایک ایسا سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کی ذیل میں آتا ہے۔ کہ ان میں ذوق وشوق اور سوز وگداز اور خیر وبرکت کے جذبات پیدا ہوں۔ اس لیے فوق صاحب نے فنی باریکیوں اور تحقیقی موشگافیوں میں الجھے بغیر بیانِ واقعات کا ایک براہِ راست اور سیدھا سادہ انداز اختیار کیا ہے۔

کتاب میں حضرت رابعہ بصری کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔ جو خواتین کے لیے فوق صاحب کے اس نقطہ نظر کے مطابق ہے۔ جس کے تحت ... وہ سمجھتے ہیں کہ عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں برابر کا مقام رکھتی ہیں۔ حضرت رابعہ بصری کے لیے حضرت حسن بصری کے عزت واحترام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا اختتام حضرت بصری کے بصیرت افروز اقوال پر کیا گیا ہے۔

۱۔ جس دِل میں دُنیا کی محبت ہے وہ دِل زندہ نہیں مُردہ ہے۔

۲۔ جو شیخ شیخی میں آگیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں۔

"حضرت علی ہجویریؒ" (مکمل سوانح عمری)

یہ سوانح عمری بھی فوق صاحب نے ۱۹۱۴ء میں اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے چھپوائی۔ یُوں لگتا ہے کہ یہ ساری سوانح عمریاں ایک کیفیت میں لکھی گئی ہیں۔ علی ہجویریؒ پہلی سوانح عمریوں سے قدرے مختلف ہے۔ یہ ایک مکمل اور مفصل سوانح حیات ہے۔ ۱۶۲ صفحات پر مشتمل علی ہجویریؒ کی پُوری زندگی کا نچوڑ اس کتاب میں موجود ہے۔ اپنے روایتی اسلوب کے مطابق پیدائش سے لے کر وفات تک کا احوال لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی صوفیانہ سرگرمیوں اور سیر وسیاحت اور ان کی تصانیف کا جائزہ بھی لیا ہے۔ علی ہجویریؒ کی لاہور میں

آمد اور اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ علی ہجویریؒ کی لاہور میں آمد کے بارے میں مختلف روایات کا حقیقی اور تاریخی انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ حضرت کے لباس، خوراک، نشست و برخواست، ان کی درسگاہ، طریقۂ درس اور تعمیر مسجد کے واقعے کے بیان کے علاوہ لاہور میں ان کی پذیرائی اور مشکلات کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور صوفیانہ معاملات میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ علی ہجویریؒ کے لقب کی وجہ تسمیہ بھی فوق صاحب نے بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کی ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" اور "کشف الاسرار" پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ علی ہجویریؒ کو حضرت رسولِ کریمؐ کی زیارت ہوئی تھی، یہ واقعہ بھی فوق صاحب نے بیان کیا ہے "مخزن" لاہور کے اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں علی ہجویریؒ کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس ضمن میں فوق صاحب نے خاصی بحث کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس تصویر کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس نے بنائی اور کب بنائی۔ اور کیا یہ علی ہجویریؒ کی اصل تصویر ہے؟ علی ہجویریؒ جیسے آدمی کے بارے یہ کہنا کہ انھوں نے ارادتاً یہ تصویر اتروائی ہو گی۔ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

حضرت علی ہجویریؒ کی وفات کے بعد کہے جانے والے قطعات جو مزار کی اندرونی ڈیوڑھی کی دیوار پر اور صحن مسجد کے دروازے پر کندہ ہیں، فوق صاحب کے شوق تجسس کو بڑھاتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا ہوا۔ بعض روایات کے مطابق ان میں سے کچھ مولانا جامی سے منسوب کیے جاتے ہیں مگر مولانا کی اپنی کتاب "نفحات الانس" میں اس طرح کا کوئی قطعہ موجود نہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں حضرت کے مزار کی تعمیر، اس کی مرمت، دوسری قبروں کا احوال اور حضرت کے روضے سے فیض یاب ہونے والوں کا تذکرہ ہے

جن میں حضرت معین الدین چشتی، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت لال حسین اور شہزادہ داراشکوہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس سوانح عمری کی غرض و غایت کے حوالے سے خود فوق صاحب کا دیباچہ ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"کتاب اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ حضرت کے کمالات ظاہری و باطنی سے اُردو دان طبقہ پُورے طور پر واقف ہو جائے۔ وہ حضرت کے حالات و خیالات سے آگہی کے بعد فائدہ اٹھائے اور شریعت و طریقت میں جو مسائل آپ نے بیان کیے ہیں، ان پر عمل پیرا ہو کر اپنے آپ کو ایک سچا مُسلمان بنائے۔"
(صفحہ : ۳)

یہ کتاب بتاتی ہے کہ پیر میں کیا اوصاف ہونے چاہئیں اور مرید کو کس طرح ارادت مندی کرنی چاہیے۔

کتاب کا مجموعی اسلوب رواں اور صاف سُتھرا ہے۔ حضرت کی غزنی سے لاہور آمد کا حال اس طرح لکھا ہے۔

"غزنی سے لاہور کا سفر جس قدر دشوار گزار ہے اور جس قدر دُور دراز فاصلے پر ہے۔ اس کو کون نہیں جانتا۔ ملک الگ، زبان الگ، معاشرت الگ، آب و ہوا میں نمایاں اختلاف۔ ایسے کٹھن سفر کی تیاریوں کے لیے جس قسم کے سازوسامان کی ضرورت ہے۔ وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مگر حضرت علی ہجویریؒ پا پیادہ بغیر کسی سازوسامان کے اور بغیر کسی اہتمام و انصرام کے روانہ ہُوئے۔" (صفحہ ۱۰۴)

حضرت علی ہجویریؒ کی کتاب "کشف المحجوب" کے مطالعے کے دوران فوق صاحب کی یہ کتاب بھی پڑھی جائے تو معرفت و آگہی کے حصول میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے نیز یہ کتاب علی ہجویریؒ کے رموزات جلالی و جمالی اور اسرار و معارف کے

خزانے کی دریافت کی ایک کوشش تصور کی جاسکتی ہے۔

"ملک العلماء مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ"

علماء و صوفیاء کی سوانح عمریوں میں فوق صاحب کی یہ کتاب ایک ایسے صاحبِ علم کا تذکرہ ہے جو اپنے زمانے ہی میں نہیں، بلکہ مسلمانوں کی تاریخ کے آخری دور میں درسیات کے چند بڑے لوگوں میں سے ایک تھے۔ اس خاص فن میں جو مقام میر سید شریف جرجانی۔ تفتازانی۔ بحرالعلوم عبدالعلی لکھنوی۔ مولانا جامی اور مولانا عبدالحکیم لکھنوی کو حاصل ہے، مولانا سیالکوٹیؒ بھی (جنھیں فاضل سیالکوٹیؒ اور فاضل لاہوری کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) کسی طرح اس سے کم مرتبہ عالم اور استاد نہ تھے۔

یہ ۱۲۶ صفحات کی کتاب ہے جس میں ۶۷ صفحات مولانا کے بارے میں ہیں۔ ۱۶ صفحات پر مشاہیر سیالکوٹ کا مختصر احوال ہے اور باقی صفحات پر سیالکوٹ کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب اور بھی مفید اور وقیع ہوگئی ہے۔ جس زمانے میں مولانا سیالکوٹیؒ علوم دین کی روشنی دلوں میں اجاگر کر رہے تھے، اس کتاب کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کون کون لوگ سیالکوٹ میں یہ خدمت کر رہے تھے اور اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کیا تھے۔ تاریخ سیالکوٹ کا جائزہ پہلے صفحات میں موجود ہے۔ مشاہیر سیالکوٹ کی تعداد کتاب میں ۳۸ ہے۔ ان سب بزرگان کا تعلق مسجد و مدرسہ سے اور مولانا سیالکوٹیؒ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح قائم ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر آخوند ملّا کمال، مولانا صاحب اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے استاد تھے۔ شیخ محمد اخلاص خان وامق ڈوہرہ قوم کے کھتری تھے۔ انھوں نے مولانا کے صاحبزادے مولوی عبداللہ کے دستِ حق

پرست پر بیعت کی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اپنی قابلیت اور علمیت کی وجہ سے سربلند ہو کر امیر الامراء کے منصب تک پہنچے۔ مولانا جان محمدؒ، مولانا عبدالحکیم کے خاندان سے تھے۔ فوق صاحب نے اپنی اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں انھوں نے علامہ کے خاندان، وطن، اساتذہ اور ہم مکتبوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ مولانا نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ دیکھا تھا۔ مغل بادشاہوں نے جس جس طرح ان کی پذیرائی کی، اس کا حال بھی ملتا ہے۔ حضرت مجدّد الف ثانی کے ساتھ مولانا کے روابط کا ذکر بھی بہت دلچسپی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ فوق صاحب نے مولانا کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے کے لیے بھی مجدّد صاحبؒ کے حالاتِ زندگی سے مدد لی ہے۔ مجدّد صاحب کا سنِ پیدائش فوق صاحب نے ۹۷۱ھ لکھا ہے۔ یہ اکبرِ اعظم کا زمانہ ہے۔ ان کے بقول مولانا سیالکوٹی، مجدّد صاحبؒ سے تقریباً چار سال بڑے تھے۔ اس طرح ان کا سال پیدائش ۹۶۸ھ بنتا ہے۔ مولانا سیالکوٹی کے حالات لکھتے ہوئے فوق صاحب نے آپ کے تلامذہ کا تعارف کرایا ہے، ان کے کتب خانے کی سیر بھی کرائی ہے اور ان کے علمی کارناموں کا بھی پورا پورا احاطہ کیا ہے۔

یہ سوانح عمری فنِ سوانح نگاری کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس طرح کی دوسری سوانح عمریوں میں فوق صاحب بالعموم بیانِ واقعات کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہاں ان کے اسلوب میں تحقیقی انداز بھی شامل ہو گیا ہے۔ آپ نے متناقض واقعات کی تطبیق بھی کی ہے۔ بعض واقعات پر جرح کر کے تاریخی تنقید کا حق ادا کیا ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں مولانا سیالکوٹی اور مجدّد الف ثانیؒ کے تذکرے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ فوق صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت مجددؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے مصنف تھے۔ وہ اپنے قابل ہم مکتب سے بڑے اخلاص سے ملے۔ مولانا بہت دنوں تک سرہند میں رہے۔ جب تک رہے، ظاہری اور باطنی علوم کی صحبتیں گرم رہیں۔" (صفحہ ۲۰)

فوق صاحب نے مولانا کے ضمن میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا ہے۔ واقعات کے اخذ وانتخاب میں رطب و یابس کے اختلاط سے گریز کیا ہے۔ اختصار کا وہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے جو ادائے مدعا میں مانع نہیں، اور تفصیل کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو حشو وزوائد سے پاک ہے۔

مولانا سیالکوٹی کے علمی معاملات، بالخصوص کتابوں کے موضوعات فوق صاحب کے فہم سے بالاتر تھے اس لیے انھوں نے ایک دیانتدار اہل قلم کی حیثیت سے ان پر تبصرہ کرنے کی بجائے اپنے وقت کے جلیل القدر فاضل مولانا محمود علی کو تبصرہ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس کا اعتراف اور تشکر کتاب کے دیباچے میں موجود ہے:

"سب سے زیادہ مشکل کام مولانا کی تصنیفات پر، جو سب عربی زبان میں ہیں، تبصرہ اور تنقید کا تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی تحریک سے مولانا محمود علی صاحب ایم اے پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے لی تو مجھے بہت بڑا سہارا مل گیا۔" ۹۳؎

فوق صاحب نے یہ فاضلانہ تبصرہ، جُوں کا تُوں، کتاب کا حصہ بنالیا۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو مولانا شبلی نعمانی نے "سیرت النبیؐ" کی تصنیف کے دوران اختیار کیا، جس کی پیروی ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی بہت عمدگی سے کی۔ اہل علم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ "سیرت النبیؐ" کے سلسلے میں

بہت سی فنی بحثیں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا عبدالباری ندوی کے رشحاتِ فکر ہیں[۹۴] محمد الدین فوق نے اپنی ایسی ضرورت کے لیے بجا طور پر مولانا محمود علی کا انتخاب کیا اور ان کا تبصرہ انہی کے نام سے کتاب میں درج کیا۔

اس کتاب میں مصنف نے جو مضامین کی ترتیب قائم کی ہے، وہ بھی نہایت سائنٹیفک اور ہر لحاظ سے ان اصولوں پر پوری اترتی ہے جو تاریخ و سوانح نگاری کے جدید مکاتیبِ فکر کے ہاں مُسلّم سمجھے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالحکیم کے بارے میں ان کے معاصر مولوی عبدالغفور اور اس دَور کے مصنف عبداللطیف نے بھی لکھا ہے۔ لیکن فوق صاحب کی یہ کتاب ان تذکروں پر بہر طور فائق ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پیش لفظ علامہ اقبال نے لکھا ہے:

"مولوی عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے جو شاہان مغلیہ کے زمانہ میں اسلامی علوم کی ایک مشہور درس گاہ تھی۔ ان کی عالمگیر شہرت آخر شاہجہان تک پہنچی جس نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ دربار دہلی میں بڑے بڑے معرکۃ الآراء مذہبی و فلسفیانہ مباحث ہوا کرتے تھے جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں وسط ایشیا اور ایران کے حکماء کو محوِ حیرت کیا کرتی تھیں۔

منشی محمد الدین فوق صاحب نے جن کی تاریخی کدو کاوش مشہور ہے، مولانا کے حالاتِ زندگی لکھ کر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کی یہ تصنیف دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔"

محترمہ پروفیسر الطاف فاطمہ اس سوانح عمری کے بارے میں لکھتی ہیں:

"فوق صاحب کی یہ تصنیف ہر لحاظ سے اہم ہے۔ عہد جہانگیری اور شاہجہان

کے ایک زبردست عالم کی مستقل سوانح عمری کافی دلچسپی سے لکھی گئی ہے۔"[95]

مولانا سیالکوٹی کی قبر مبارک کی خستہ حالی کا حال فوق صاحب نے اس طرح لکھا ہے:

"قبر بالکل بے سایہ ہے۔ سوائے چار دیواری کے کسی مکان یا عمارت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے سکھا شاہی دور میں جس طرح لاہور کی اسلامی عمارات پر زوال آیا، اسی طرح سیالکوٹ کی شاہجہانی طرز کی یہ عمارت بھی مسلم جاہ و جلال کا آثار سمجھ کر یا سنگ مرمر کی طمع کے لیے مٹا دی گئی۔ لیکن جو لوگ اپنے نہ مٹنے والے کارناموں کی وجہ سے ثبت است بر جریدۂ عالم کے مصداق ہوں، وہ جسمانی طور پر نابود ہو جائیں، ان کی قبریں مٹا دی جائیں، لیکن ان کے نام کبھی مٹ سکتے ہیں؟"

"سلاطین کی سوانح عمریاں"

"تاریخ بالعموم حکمرانوں کے تذکرے کا نام سمجھی جاتی ہے جب کہ تاریخ میں انسانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی بھی کی جاتی رہی ہے۔ مگر مرکزی حیثیت حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستان کی رہی ہے۔ پچھلے صفحات میں محمد الدین فوق کا مؤرخِ کشمیر کی حیثیت سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ سوانح عمری کے حوالے سے بھی انھوں نے خواتین حکمرانوں کو چھوڑ کر بادشاہوں کے سلسلے میں زیادہ تر کشمیر ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تین کتابیں کشمیر کے محبوب بادشاہ سلطان زین العابدین کے بارے میں ہیں جو خاص تسلسل میں لکھی گئی تھیں "تذکرہ خواتین دکن" اور "کشمیر کی رانیاں" میں مختلف حکمران عورتوں کے سوانحی خاکے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ "اہلیا بائی"

کے بارے میں پوری کتاب ہے۔ ان خواتین کا تذکرہ خواتین کی سوانح عمریوں کے ذیل میں کیا جارہا ہے۔

بادشاہوں کے بارے میں بہت کم سوانح عمریاں فوق صاحب نے تحریر کی ہیں۔ ان میں سے سوائے جہانگیر کے تمام کا تعلق کشمیر سے ہے۔ "نورجہاں و جہانگیر" ایک کتاب ہے جس میں نورجہاں اور جہانگیر کا الگ الگ تذکرہ ہے۔ ہم یہاں صرف جہانگیر کے بارے میں فوق صاحب کی تحریر کا جائزہ لیں گے، اور سوانح عمریاں "کشمیر کا نادر شاہ" اور "مہاراجہ گلاب سنگھ" غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ دونوں سوانح عمریاں اپنی اہمیت کے اعتبار سے شائع ہونا چاہئیں۔ فوق صاحب کی سب سے اہم اور بہترین سوانح عمری "تاریخ بڈشاہی" ہے۔ اس کتاب میں فوق صاحب کی دو سوانح عمریاں "سلطان زین العابدین" اور "شاب کشمیر" بھی موجود ہیں۔ ان کا ذکر "تاریخ بڈشاہی" میں بھی آئے گا۔ مگر ان کی الگ حیثیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

"سلطان زین العابدین"

۱۹۰۸ء میں فوق صاحب نے "تاریخ کشمیر" کی دوسری جلد لکھی۔ اس میں سب سے طویل باب سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے بارے میں تھا۔ یہ بادشاہ وادیٔ کشمیر کی تاریخ میں اپنی مقبولیت اور ہردلعزیزی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فوق صاحب کی وابستگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے بہت اضافے کے ساتھ فوق صاحب نے "تاریخ کشمیر" کے اس حصے کو الگ شائع کروادیا۔ یہ کتاب ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو پہلی بار رفاہ عامہ سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ کُل ۵۲ صفحات کی کتاب ہے۔

فوق صاحب کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں نے تختِ کشمیر پر پانچ سو سال تک دادِ حکومت و شجاعت دی۔
ان میں سلطان زین العابدین ایک لاثانی بادشاہ تھا۔ اس نے تمام رعایائے کشمیر کو
بلا تفریق مذہب و ملت اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ بات ظلم و ناانصافی ہو گی اگر ایسے
نیک نام بادشاہ کے حالات اس روشنی کے زمانے میں جب کہ کتابوں اور
پریسوں نے علم کے دریا بہا دیے ہیں، تاریکی میں رہتے اور ان سے کوئی استفادہ
نہ کر سکتا۔"

سلطان زین العابدین نے کشمیر پر ۱۴۲۳ء سے ۱۴۷۴ء تک حکومت کی۔
یہ اکبرِ اعظم سے اناسی برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ بڈشاہ نے بھی اٹھارہ برس کی عمر میں
تاج پہن کر پچاس برس سے زیادہ مدت تک حکومت کی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک
عظیم بادشاہ تھا۔ مہربان، روادار، رعایا پرور، علوم و فنون کی قدر اور سرپرستی کرنے
والا۔ ہندو اسے بٹ شاہ (ہندوؤں کا بادشاہ) اور مسلمان بڈشاہ (بڑا بادشاہ) کہتے
تھے۔ اس کے عہدِ حکومت میں علوم و فنون کی بڑی قدردانی ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ
"تاریخ بڈشاہی" میں کیا جائے گا۔ اس کتاب کو "شباب کشمیر" کا خلاصہ کہا جا سکتا
ہے۔ اور "شباب کشمیر"، "تاریخ بڈشاہی" کی ابتدائی صورت سمجھی جا سکتی ہے۔ "تذکرہ
سلطان زین العابدین" میں اسلام کی اشاعت کے لیے جو بات کی گئی ہے، وہ
دوسری دونوں کتابوں میں نہیں ہے۔ فوق صاحب لکھتے ہیں:

"اگر اشاعت اسلام کا دارومدار صرف تلوار، جبر اور قوت ہی پر ہوتا تو اس کو کبھی
حقیقی کامیابی نصیب نہ ہو سکتی، اور آج کشمیر میں سو میں سے پچانوے مسلمان
کہیں نظر نہ آتے۔

جو بڑی کامیابی اسلام کو ہوئی، وہ سلطان زین العابدین کا حسن سلوک تھا۔ ہندو
اس کے احسانات اور مہربانیوں کے اس قدر گرویدہ تھے کہ اس کے مذہب

میں خوشی سے داخل ہونا باعثِ عزت سمجھتے تھے۔" (صفحہ : ۱۰،۹)

فوق صاحب مُسلم کشمیر کی مظلومیت کا موازنہ سُلطان زین العابدین کے کشمیر کے ساتھ کرتے ہیں اور بار بار اس تذکرے سے پُرانے زمانے کی یاد مُسلمانوں کے دِلوں میں بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ایک نظم اس کتاب کے آخر میں بھی موجود ہے جس کے ہر شعر میں درد و گداز کی کیفیت نمایاں ہے۔ نظم کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

اب نہ وہ گلچیں نہ وہ گلبن نہ وہ باغ و بہار
اب نہ وہ محفل نہ وہ ساقی نہ وہ پیرِ مغاں
اب نہ وہ علم و فضیلت اور نہ وہ عزّو کمال
اب نہ وہ ہمت نہ جرأت اور نہ وہ تاب و تواں
ہے یہ افسانہ نصیحت اہلِ عالم کے لیے
ہے زمانے کے لیے عبرت ہماری داستاں

"شباب کشمیر"

اپنی کتاب "تذکرہ سلطان زین العابدینؒ" کی بنیاد پر فوق صاحب نے یہ کتاب تحریر کی۔ اس کی ضخامت ۵۲ صفحات سے ۲۸۸ صفحات تک بڑھا دی اور اپنے اشاعتی ادارے "ظفر برادرس لاہور" کے زیرِ اہتمام ۱۹۲۹ء میں شائع کی۔ یہ ایک مکمل سوانح عمری ہے۔ مگر اس کے باوجود فوق صاحب مطمئن نہ ہوتے۔ اور وہ "تاریخ بڈشاہی" لکھنے کے لیے تیاریاں کرتے رہے جس کی طرف اشارہ "تاریخ بڈشاہی" کے دیباچے میں ملتا ہے۔ اس کا ذکر اگلے صفحات میں تفصیل سے کیا جائے گا۔ ان تینوں کتابوں کے دیباچوں میں الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ ایک ہی بات

فوق صاحب نے بیان کی ہے۔ "شباب کشمیر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"یہ کتاب اس لیے لکھی گئی ہے کہ دنیا کو اور بالخصوص ہندوستان کو معلوم ہو کہ یہ ملک (کشمیر) کبھی اخلاق و ادب اور علم و فضل کی کان تھا۔ حق گوئی و حریت اس کی عادت ثانیہ تھی۔ اور اسلام اپنے تمام زیرنگیں ممالک پر اگر کشمیر کو فوقیت نہ دیتا تھا تو بڈشاہ کی رعایا پروری و رواداری اور علما و مشائخ کی قدردانی کی وجہ سے کسی اور ملک سے اس کو کم بھی نہ سمجھتا تھا۔

یہ کتاب کشمیر کی مٹی ہوئی شان و شوکت اور اس کے گمشدہ عروج و اقبال کی ایک ولولہ انگیز کیفیت اور روشن تصویر ہے۔"

"شباب کشمیر" کے نام کے وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فوق صاحب نے بڑی دلچسپ بات کی ہے۔

"تذکرہ بڈشاہ کا نام میں نے "شباب کشمیر" رکھا ہے۔ بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر کو جو عروج و اقبال حاصل تھا اس کی رو سے یہ نام غیر موزوں نہیں۔"

فوق صاحب نے بجا طور پر کشمیر کے اس زریں عہد کو "شباب کشمیر" کہا ہے۔ اس عہد میں علوم و فنون کو ترقی ہوئی۔ سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوالے سے جو خوشحالی اور کامرانی اس خطے کو نصیب ہوئی، اس پر ہر مذہب و ملت کے کشمیری ناز کر سکتے ہیں۔ تاریخ لاہور کے ضمن میں فوق صاحب کی کتاب "لاہور عہد مغلیہ میں" کا نام "شباب لاہور" بھی ہے۔ یہ نام اپنے اندر ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔

عبداللہ قریشی صاحب لکھتے ہیں:

"کتاب "شباب کشمیر" کے مطالعے سے اس وقت کی علمی، ادبی، سیاسی، روحانی، صنعتی، تجارتی، معاشرتی اور تمدنی ترقیوں کی کیفیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اقبال پہلے ہی اس کتاب کی تجویز کو پسند کر چکے تھے، بلکہ اس کی اشاعت

کو ضروری سمجھتے تھے۔ آپ نے جب کتاب دیکھی تو فرمایا:

"شباب کشمیر" کشمیر کی تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عام لوگ بالخصوص اہالیانِ کشمیر اسے شوق سے پڑھیں گے۔ اس سے پہلے بھی جو لٹریچر آپ نے کشمیر کے متعلق پیدا کیا ہے، میرے نزدیک بہت مفید اور آپ کے علمی ذوق اور حبِ وطن پر شاہدِ عادل ہے۔" ۹۶

قریشی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شباب کشمیر" دراصل "تاریخ بڈشاہی" کا پیش خیمہ تھی (اسی کتاب کو ۵۲۵ صفحات پر پھیلا دیا گیا) "شباب کشمیر" اپنی پیشکش اور اسلوب کے لحاظ سے "تذکرہ سلطان زین العابدین" سے کسی قدر مختلف ہے۔ مگر "تاریخ بڈشاہی" اور "شباب کشمیر" میں کسی لحاظ سے کچھ فرق نہیں۔ البتہ "شباب کشمیر" کو کشمیر کے مردہ دلوں میں روح پیدا کرنے والی اپنی قسم کی پہلی کتاب کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے کل سترہ ابواب ہیں جنھیں "تاریخ بڈشاہی" میں تیس تک بڑھا دیا گیا ہے۔ "تاریخ بڈشاہی" کے تفصیلی جائزے میں "تذکرہ سلطان زین العابدین" اور "شباب کشمیر" کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ یہاں "تاریخ بڈشاہی" کے دیباچے سے یہ اقتباس بے محل نہ ہوگا جو پہلی دونوں کتابوں میں موجود دیباچوں کی تائید کرتا ہے:

"یہ کتاب اس ملک اور اس قوم کی تہذیب و ترقی کا مٹا ہوا خاکہ ہے جس نے کبھی پنجاب، سندھ، تبت و کاشغر اور کابل و بدخشاں تک کے در و دیوار سے اپنی شجاعت و بسالت اور رواداری و انصاف کی شہادت دلوائی تھی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد، کشمیر کے سیاسی اقتدار اور اس کی گزشتہ علمی عظمت و فضیلت کی یاد نوحہ خواں ہے، اہلِ کشمیر کو غور کرنا ہوگا کہ سلف ایسے تھے تو کیوں تھے، اور خلف ایسے ہیں تو کیوں ہیں۔"

"تاریخ بڈشاہی"

یہ کتاب ان عقیدتوں اور محبتوں کا مرقع ہے جو کشمیر کے لوگ سلطان زین العابدین کے ساتھ رکھتے ہیں اور کشمیر کے ساتھ فوق صاحب کی وابستگیوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ کشمیری مزدور جب اکٹھے ہو کر محنت مزدوری کرتے ہیں تو ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھانے کے لیے "یا ہمدان یا شاہ ہمدان" اور "بڈشاہ۔ بادشاہ" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ان ناموں کی تکرار سے ان میں تازہ ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی طاقت سے بڑھ کر ہمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کی اونچی اونچی چٹانوں کو گرانے میں دیر نہیں کرتے اور آسمان سے باتیں کرنے والے مضبوط درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر اپنے کندھوں پر اٹھا لاتے ہیں۔ منوں بوجھ سے لدے ہوئے چھکڑوں کو کھینچ کر کئی کئی میل لے جاتے ہیں۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ تو اپنی بزرگی، کشف و کرامات اور اپنی کتاب "ذخیرۃ الملوک" کی وجہ سے لافانی شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن کشمیری بڈشاہ کی مالا کیوں جپتے ہیں، اس کی یاد سے اپنے دل کیوں روشن رکھتے ہیں اور اس کا نام آتے ہی جوشِ عقیدت سے اتنے بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں، ان تمام باتوں کا جواب "تاریخ بڈشاہی" سے ملے گا جو منشی محمد الدین فوق کی تصانیف میں ان کی تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا شاہکار ہے۔ اس تاریخی سوانح عمری کی اپنی ایک تاریخ ہے جو کسی حد تک تو پچھلے صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

فوق صاحب نے اردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کی تمام مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد، جو اس وقت تک دستیاب ہو سکیں، یہ کتاب مرتب کی۔ اس طرح یہ کتاب ان کی پچیس سال کی محنت کا نچوڑ ہے۔ تاریخ میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں تک فوق صاحب کی امکانی رسائی کا

تعلق ہے یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ فوق صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:

"راقم کا عقیدہ ہے کہ جب تک مصنف زندہ ہے، اس کی تصنیف نامکمل ہے۔ مَیں اپنی اس پچیس سالہ محنت کے سرمایہ کو آخری اور قطعی لفظ قرار نہیں دیتا بلکہ چاہتا ہوں کہ میرے اس کام کو جاری رکھنے والے پیدا ہوں"

عبداللہ قریشی صاحب کا بیان ہے کہ کتاب کا مسودہ ایک ہزار صفحات پر پھیلا ہُوا تھا جس کا طبع کرنا اس وقت فوق صاحب کی طاقت سے باہر تھا۔ مَیں نے انھیں مشورہ دیا کہ یہ مسودہ حکومت کشمیر کی خدمت میں پیش کر کے طباعت کے اخراجات میں ان سے مدد کی درخواست کی جائے۔ اس زمانے میں سر آئنگر کشمیر کے وزیرِ اعظم نواب جعفر علی خاں اثر ہوم منسٹر اور خواجہ غلام السیدین ڈائریکٹر آف ایجوکیشن تھے۔ مسودہ اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر کے مراحل طے کرتا رہا یہاں تک کہ حکومت نے ایک ہزار روپیہ پیشگی اور ایک سو کتابوں کی منظوری دے دی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ امدادی رقم کم اور اخراجات کا تخمینہ بہت زیادہ تھا۔ فوق صاحب نے قریشی صاحب کے مشورے سے کتاب کی ضخامت کم کر کے ۵۲۰ صفحات تک گھٹا دی۔ کتاب کے شروع میں فوق صاحب نے قریشی صاحب کی اس محنت کا خاص طور پر اعتراف کیا ہے:

"مَیں لاہور کے مشہور اہلِ قلم مولانا محمد عبداللہ قریشی بی اے کا دل سے سپاس گزار ہوں جو کشمیر میں کتاب کی نظرِ ثانی میں بھی میرے معاون رہے اور بمقام لاہور میری علالت کے دوران میں کاپیوں اور پروفوں کے پڑھنے میں میرا ہاتھ بٹاتے رہے۔" (ص: ۱۴۴)۔ اپنی موت سے ایک برس پہلے ۱۹۴۴ء میں اپنے اشاعتی ادارے ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام فوق نے یہ کتاب شائع کر دی۔

"تاریخ بڈشاہی" کے مطالعہ کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بڈشاہ کے حالات کشمیر کی تاریخ کے سنہری اوراق ہیں۔ منشی محمد الدین فوق نے اس حکایت کو خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور بڈشاہی دور کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کر کے اپنے مؤرخانہ فرائض کا حق ادا کیا ہے۔ کتاب میں مصنف کی اپنی تصویر کے علاوہ بہت سی تاریخی عمارتوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ کتاب کے تیس مستقل باب ہیں اور ہر باب کو مختلف عنوانات کے تحت کئی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سے مضامین میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔

پہلے باب میں کشمیری خاندان کے ابتدائی حالات اور زوال راجگان ہنود کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور مؤرخین کشمیر کے بیانات پر بحث کر کے داد تحقیق دی گئی ہے۔

دوسرا باب بڈشاہ کے ایام شہزادگی اور تعلیم وغیرہ کے متعلق ہے۔ اس میں صحیح تاریخ پیدائش کی تحقیق کر کے بعض مؤرخین کی فروگزاشتیں ظاہر کی گئی ہیں۔

پانچواں باب اہل کشمیر کی جنگی سپرٹ کے متعلق ہے۔ اس میں قدیم مصری جغرافیہ دانوں اور غیر جانب دار مؤرخوں کی تحریروں سے سلطنت کشمیر کی وسعت، کشمیر کے ہندو راجوں اور مسلمان سلاطین کی فتوحات، محمود غزنوی کے ناکام حملوں، تیموری بادشاہوں کی کوششوں، بڈشاہ کے فوجی کارناموں اور مفتوحہ ممالک کے ساتھ اس کے حسن سلوک کے دلچسپ واقعات جمع کیے گئے ہیں۔

چھٹا باب بڈشاہ کی اولاد، اس کی بیگمات، دودھ بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے متعلق ہے۔

ساتواں، آٹھواں اور نواں باب باہمی خانہ جنگیوں، وزراء کی سازشوں، بیٹوں کی بغاوتوں، بادشاہ کی پدرانہ نصیحتوں، جلاوطنیوں اور ولی عہدوں کی

تبدیلیوں کے بارے میں ہے۔

دسویں باب میں بڈشاہ کے آخری ایام کی تلخیوں، پریشانیوں فاقہ کشیوں اور اعزہ و مصاحبین کی وفات کے صدموں کا حسرت ناک بیان ہے۔

گیارھویں باب میں بادشاہ کے فرزند ادھم خاں کی وفات اور دوسرے شہزادوں کی جد وجہد کا حال ہے جو انھوں نے بادشاہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے کی۔

بارھواں باب بڈشاہ کی وفات، تجہیز و تکفین، حلیہ اور اکبر اعظم سے مقابلے اور موازنے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں صحیح تاریخ وفات کی تحقیق کی گئی ہے اور واقعات کی کڑیاں بڑی محنت سے ملائی گئی ہیں۔

تیرھویں باب میں بڈشاہ کے متعلق اس کے ہمعصر مؤرخوں اور زمانہ مابعد کے مؤرخوں اور مصنفوں کی آرا، دی گئی ہیں۔

چودھواں باب بڈشاہ کے ہم عصر سلاطین اور ان کے ساتھ روابط کے تذکرے کے لیے وقف ہے۔

پندرھویں باب میں بڈشاہ کے عدل و انصاف کے چند دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات دیے گئے ہیں۔

سولھواں باب بڈشاہی تعمیرات اور بادشاہ کے جدت پسند شوق کے بارے میں ہے۔

سترھواں باب بادشاہ کی زرعی دلچسپیوں، رفاہ عامہ کے کاموں اور نہریں جاری کرانے کے بارے میں ہے۔

اٹھارھویں باب میں بڈشاہ کے زمانے کے قحط، سیلاب اور نرخ اجناس دیے گئے ہیں۔ اس میں ان تدابیر کا بھی ذکر ہے جو بادشاہ نے سیلاب اور آتشزدگی کے واقعات کو روکنے کے لیے اختیار کیں۔

انیسویں باب میں دولت کشمیر کے عنوان سے بڈشاہی عہد کے سکوں، پیمانوں اور معدنیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بیسویں باب میں بڈشاہ کی روادارانہ حکمتِ عملی، ہندوؤں سے سلوک، پرانے مندروں کی مرمت، جزیہ کی موقوفی، کارکن پنڈتوں کی قدردانی، تیرتھوں کی یاترا اور ہندو جوگیوں کے لیے جوگی لنگر وغیرہ کھولنے کے امور پر بحث کی گئی ہے۔

اکیسویں باب میں پھولوں کے تہوار، کمالات موسیقی کے شاہی دربار، آتش بازی اور آتشیں ناچ وغیرہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو بہت ہی دلچسپ ہے۔

بائیسویں باب بڈشاہ کی موسیقی نوازی، آلات موسیقی کی اختراع وایجاد موسیقی کے مدارس، دربار کے نامور مغنی اور کشمیری موسیقی کے زوال پر روشنی ڈالتا ہے۔

تئیسواں باب صنعت وحرفت کی ترقی، غالیچہ سازی، شال بافی، کاغذسازی، پیپرماشی، خشت، ٹائل، توپ تفنگ اور تلوار بندوق کے رواج کے بیان میں ہے۔

چوبیسواں باب بڈشاہ کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں ہے۔ علما کی سرپرستی، بادشاہی دارالعلوم، دارالترجمہ اور دارالتصنیف کے اجراء، فراوانیٔ علوم وفنون اور عہد بڈشاہی کی بعض تصانیف اور تراجم کا ذکر ہے۔ سلطان کا علمی ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ خود کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے علوم وفنون کی کتابیں جگہ جگہ سے جمع کیں اور تفسیر کشاف کی نقل حاصل کرنے کی خاطر ایک کاتب مکہ مکرمہ تک بھیجا۔

پچیسواں باب بڈشاہ کے عام اخلاق وعادات پر ہے جس میں سب سے نمایاں جوہر اس کی سادگی، زہد واتقا، معارف پروری اور رعایا نوازی تھی۔

چھبیسواں باب میں دربار بڈشاہی کے ارکان کے حالات بیان کیے

گئے ہیں۔

ستائیسویں باب میں بڈشاہی مؤرخوں قاضی حمید، پنڈت زونراج، سوم پنڈت، پنڈت شریور، ملک الشعراء ملا احمد بڈشاہی، مُلا نادری، سلطان محمد شاعر اور دیگر شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس میں بڈشاہ کی اپنی شاعری کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

اٹھائیسویں باب میں علماء و مشائخ کا ذکر ہے جن کی تعداد بہت کثیر ہے۔ چند نام یہ ہیں:

شیخ الاسلام مولانا کبیر، قاضی القضاۃ مُلا جمال الدین، مُلا پارسا، حافظ بغدادی، سید حسین قمی رضوی، امیر سید حسین منطقی، بابا زین الدین، شیخ بہاؤالدین گنج بخش، شیخ نورالدین ولی، میر سید محمد امین اویسی وغیرہ۔

انتیسویں باب میں بعض متفرق شعبوں مثلاً خفیہ پولیس، اقوام جرائم پیشہ، زنداں خانوں، حفظانِ صحت اور انسداد رشوت ستانی وغیرہ پر مختصر مگر مفید نوٹ دیے گئے ہیں۔

تیسواں باب ضمیمہ جات کے لیے وقف ہے۔ اس میں کشمیری سن لوکک مدر دیش، نزشک، قوم چک، مزار کلاں شیخ بہاؤالدین گنج بخش، راجدھانی نوشہرہ، مزار و مسجد سید مدنی پر معلومات سے پُر مقالے درج کیے ہیں۔

اور سوانح نگاری کے سلسلے میں جن جن پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی، ان سب پر سیر حاصل بحث کر کے اور بڈشاہی دور کے ہر جزوی کارنامے کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فوق صاحب نے اس کتاب کو جاں سوزی اور عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں جس کی سند میں معتبر کتب تواریخ کے حوالے نہ دیے گئے ہوں۔

ہم بلاخوف تردید اس کو مستند سوانح کہہ سکتے ہیں۔

کشمیر کی جنگی سپرٹ والے باب میں فوق صاحب نے اس تأثر کو غلط ثابت کیا ہے کہ کشمیری بزدل ہیں۔ فوق صاحب کے مطابق وہ کشمیر کی حدود سے باہر نکل کر دوسرے ممالک کا مقابلہ کر کے اپنی بہادری کا جھنڈا گاڑتے اور اپنی طاقت کا لوہا منواتے تھے۔ اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے متعدد تاریخی شواہد پیش کیے ہیں جو تاریخ کے بہترین محققین کے بیانات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بڈشاہ کے ماتحت کشمیریوں نے اپنی فتوحات دُور دُور تک پہنچائیں۔

بڈشاہ نے قحط اور سیلاب کی روک تھام اور کشمیر کی خوشحالی کے لیے جو کچھ کیا، اس کا مقابلہ جدید دَور کی قحط سالی سے کیا جائے تو کئی واقعات قصے کہانیاں معلوم ہوتے ہیں۔ بڈشاہ کے عہد میں شالی سوا تین پیسے فی خروار، انگور ڈیڑھ پیسے کا پانچ سیر اور نمک پانچ پیسے سیر تھا۔ شدید قحط کے دنوں میں بھی شالی کے ایک خروار کی قیمت ساڑھے چار پیسے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ نرخ دارالحکومت ہی میں رائج نہ تھے بلکہ تانبے کی پلیٹوں پر کھدوا کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں لٹکائے جاتے تھے۔ کم تولنے والے اور گراں فروش غلہ داروں کو سزا دی جاتی تھی۔ مالیہ، جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا اور سستے داموں فروخت کیا جاتا تھا۔ بڈشاہ نے کشمیر کو قحط سے بچانے، سیلاب اور آتش زدگی کو روکنے کے لیے جو تدابیر اختیار کیں اور غلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا انتظام جس خوبی سے کیا، اس کا اعتراف سر والٹر لارنس نے اپنی مشہور کتاب "دی ویلی آف کشمیر" میں بھی کیا ہے۔ بڈشاہ صرف اپنے ملک کے قحط زدگان ہی کی مدد نہیں کرتا تھا بلکہ ایران سے جب ایک مرتبہ قحط زدہ لوگ آئے تو اس نے ان کی بھی

دلجوئی اور دستگیری کی۔ اس کے رفاہ عامہ کے کارنامے فیروز شاہ، اکبرِ اعظم اور دیگر سلاطین تیموریہ سے کسی طرح کم نہ تھے۔

"تاریخ بڈشاہی" کا سب سے بڑا ماخذ پنڈت شریور کی "زینہ راج ترنگنی" ہے جو سنسکرت زبان میں ہے اور جسے مسٹر جے۔ سی۔ وت نے انگریزی زبان میں منتقل کیا ہے۔ فوق صاحب نے زیادہ تر اسی انگریزی ترجمے سے مدد لی ہے۔ چونکہ انگریزی میں سنسکرت الفاظ کا طرزِ املا بدل جاتا ہے، اس لیے بعض ایسے ناموں اور مقاموں کے بارے میں کچھ الجھنیں سی رہ گئی ہیں جن کا تذکرہ فارسی تاریخوں میں نہیں ملتا۔

فوق صاحب کو کشمیر کے اسی محبوب حکمران کی ہمیشہ یاد آتی جس کی اعلیٰ ظرفی نے مختلف عقاید رکھنے والوں کو اکٹھا کر دیا تھا۔ اس نے ہندوؤں کو بھی مراعات دیں۔ جب انہی کو فوق صاحب نے مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے دیکھا اور یہ کہتے سنا کہ ہم مسلمانوں کو برباد کر کے رکھ دیں گے تو انھوں نے بڈشاہ کی روح کو مخاطب کر کے اپنے دردِ دل کا اظہار کیا:

لوٹ آ اک بار پھر اے روحِ زین العابدین
جنتِ کشمیر کو پھر دیکھ اے جنت نشیں
تو نے آئینِ محبت سے جو تھے یک جا کیے
دورِ گردوں نے جدا وہ آج سب اجزا کیے
جن کو دستورِ معظم تیری شفقت نے کیا
صاحبِ شوکت جنھیں شاہی عنایت نے کیا
جس شبِ تیرہ کو تو نے دن سے روشن تر کیا
تو نے اپنے دفتروں میں جن کو سر دفتر کیا

آج صدمہ ہے انھیں مُسلم نہ بڑھ جاتے کہیں
خشک ہے برسوں سے جو دریا نہ چڑھ جاتے کہیں
دے رہے ہیں تیرے احسانوں کا بدلہ کس قدر
کہہ رہے ہیں ہم رہیں گے نام مُسلم میٹ کر

بڈشاہ کی رُوح نے جواب دیا، وہ بھی نظم کیا ہے:

انقلاب اس عالم ایجاد کی تقدیر ہے
خوابِ ماضی کی فضائے حال میں تعبیر ہے
شکر کر ہے تیری جنّت کی ابھی باقی بہار
ایک داغِ سینۂ عالم ہے تیرا لالہ زار
دشت و گلشن کی ہوائے مشکبو بھی ہے وہی
نہر اور دریا کی قائم آبرو بھی ہے وہی
زندگی کی آگ سے اب تک فروزاں ہے چنار
ہے نموئے جوش سے ہر فصل میں فصلِ بہار
کس جگہ برپا یہاں طوفان رنگ و بو نہیں
ہے وہی فیضانِ فطرت کا مگر وہ تُو نہیں
تجھ میں غیرت ہو تو تجھ پر غالب آسکتا ہے کون
تجھ میں جرأت ہو تو پھر آنکھیں دکھا سکتا ہے کون
ایک مرکز پر ترا عزم و عمل قائم نہیں
نام کا ہے تُو مسلماں، کام کا مُسلم نہیں
ہاں، مگر اِک وقت آنے کو ہے بعدِ انقلاب
فطرتِ باری کا ہوگا پھر ارادہ کامیاب

ذرہ ہائے خاک سے چمکیں گے پھر سورج نئے
ہوں گے پھر انوار کے معدن نئے، مخزن نئے
ان خرابوں سے کھنچے گی پھر یہاں تازہ شراب
آئے گا پھر اس خزاں آلودہ گلشن پر شباب
ہاں، نہ گھبرا رحمتِ حق مہرباں ہو جائے گی
جنتِ کشمیر اک دن پھر جواں ہو جائے گی[۹۷]

"تاریخ بڈشاہی" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان بہت سادہ اور اسلوب بیان مؤرخانہ ہونے کے باوجود بے حد دلنشیں ہے۔ اپنی سوچ یا فکر کو دوسروں کے لیے لائق توجہ اور قابل قبول بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت ایک دِل کش انداز اور اسلوب کی ہوتی ہے۔ فوق صاحب ایک آسان اور دِل کش اسلوب کے مالک تھے۔ ان کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو، ان کی تحریر دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ واقعات کی درستگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ حوالے موجود ہیں۔ کشمیر کی تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کے ضمن میں یہ کتاب مستند مقام کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ ہدایت اللہ اختر نے "کشمیر کے فنون لطیفہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں جگہ جگہ "تاریخ بڈشاہی" میں سے اقتباس دیے گئے ہیں۔ کتاب کے مختلف ابواب "کشمیر کی قدیم ٹکسالیں اور سکے"، "کشمیر کی تاریخ موسیقی"، "سولھویں صدی میں کشمیری قلم"، "کشمیر کی اسلحہ سازی"، "کاغذ سازی اور عہد بڈشاہی کتابیں"، "دارالاشاعت اور کشمیری شاعر" کے نام سے قائم کیے گئے ہیں۔ ان ابواب کی ترتیب میں "تاریخ بڈشاہی" سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سے بڈشاہ کے عہدِ حکومت کے کمالات کا اندازہ ہوتا ہے اور فوق صاحب کی سوانح عمری

کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ہدایت اللہ اختر لکھتے ہیں:

"تاریخ بڈشاہی" کے خالق محمد دین فوق جنھوں نے کشمیر کا گوشہ گوشہ اور قریہ قریہ گھوم پھر کر دیکھا اور تحقیق کی، لکھتے ہیں کہ موسیقی کے مدارس میں سے چند سرینگر میں تھے۔ زیادہ تر مدارس نوشہرہ کے قرب و جوار میں تھے جو بڈشاہ کا دارالحکومت تھا اور جس کو بادشاہ نے عالی شان ایوانوں، نہروں اور باغوں کے اجرا سے نمونہ بہشت بنا رکھا تھا۔

جہاں شاعران جادو بیان بزم شاہی کی رونق تھے، وہاں علم موسیقی کے ماہر بھی موجود تھے۔ بڈشاہ چونکہ علم موسیقی کا شائق ہونے کے ساتھ ساتھ کئی سازوں کا موجد بھی تھا اس لیے دیگر علوم و فنون اور علم موسیقی کے ماہرین کا قدر دان بھی تھا۔" ۹۸

"حیات نورجہاں و جہانگیر"

یہ اڑتالیس صفحات کی چھوٹی سی کتاب ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۲۰ صفحات پر مشتمل دوسرا حصہ جہانگیر کے بارے میں ہے۔ نورجہاں اور جہانگیر کی سوانحات کے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنے کی بات عجیب سی لگتی ہے جب کہ ان دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ انھیں علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ اصل میں نورجہاں اور جہانگیر کے متعلق فوق کا رویہ مختلف ہے۔ کسی حد تک نورجہاں کے لیے ہمدردانہ اور جہانگیر کے حق میں کم ہمدردانہ ہے۔ فوق صاحب نے زیادہ زور اس واقعے کی تصدیق میں صرف کیا ہے جو مولانا محمد حسین آزاد نے "دربار اکبری" میں بیان کیا ہے، جب ایک مینا بازار میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) نے مہرالنساء (نورجہاں) کو دیکھا اور پر عاشق

ہوگیا۔ کچھ محققین نے اس واقعے کو من گھڑت قرار دیا ہے۔ بالخصوص مرزا حیرت دہلوی نے اس ضمن میں خاصے اعتراضات کیے۔ فوق صاحب نے مرزا حیرت کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں جہانگیر کی پیدائش سے لے کر وفات تک کا ایک مختصر سوانحی خاکہ ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں فوق صاحب کا سب سے بڑا ماخذ "دربار اکبری" ہے۔ "توزک جہانگیری" سے بھی مدد لی گئی ہے۔ فوق صاحب نے "سلیم۔ شیخو بابا۔ جہانگیر" کے عنوان سے ان ناموں کا پس منظر بیان کیا ہے۔ جہانگیر اور اس کے دونوں بھائیوں مراد اور دانیال کی شراب نوشی کے واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ جہانگیر کی اپنے والد اکبر اعظم سے بغاوت اور معافی مانگنے کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔ جہانگیر کا ایک بیٹا راجہ مان سنگھ کی بہن، راجا ودھے سنگھ کی بیٹی، راجہ مالودیو فرماں روائے جودھپور کی پوتی کے شکم سے تھا جس کے ساتھ اکبر بہت محبّت کرتا تھا۔ اس نے اکبر اور جہانگیر کے درمیان شکر رنجی کو ہمیشہ ہوا دی۔ اس صورتِ حال کو فوق صاحب نے محلاتی سازشوں کے آئینے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خسرو کی بدنیتی کا ذکر بھی بطور خاص فوق صاحب نے کیا ہے۔ بالآخر اس نے بغاوت کی اور نامراد ہُوا۔ مگر اس کی قسمت اپنے باپ جیسی نہ ہوسکی جس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی اور صدقِ دل سے معافی مانگ کر باپ کے تخت کا وارث بنا۔ جہانگیر شاعروں کی قدردانی میں پیش پیش رہتا تھا۔ فوق صاحب نے بتایا ہے کہ وہ خود شاعری کرنے لگا تھا۔ اس کی ایک غزل بھی کتاب میں صفحہ ۴۴ پر موجود ہے جس کا مقطع اس طرح ہے ؂

وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر
اُمید آنکہ شعلۂ نور سحر رسد

فوق صاحب کے مطابق کشمیر کے ساتھ جہانگیر کو عشق تھا۔ اس کی وفات کا محرک بھی وہ واقعہ بتایا گیا ہے جب بارہ مولا کے قریب پرم کلہ کے مقام پر ایک لڑکا ہرن کو زد پر لانے کی کوشش میں پہاڑی سے گر کر شکار اجل ہوا تو جہانگیر کے دل کو چوٹ لگی اور اسی واقعے کے چار پانچ دنوں کے بعد ۱۶۲۷ء کو فوت ہو گیا۔ یہ واقعہ صفحہ ۴۴ پر درج ہے۔ اسی صفحے پر فوق صاحب لکھتے ہیں:

"جہانگیر نے شہزادگی کی عمر میں تو بہت بے اعتدالیاں کیں مگر بادشاہ ہو کر اس نے تخت حکومت کو اس طرح سنبھالا کہ اس کا بچپن کا عالم دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ گو جہانگیر کثرت سے شراب پیتا تھا مگر امراء اور ارکین سلطنت کو اس کی سخت ممانعت تھی۔ کچھ شک نہیں کہ اگر آصف جاہ، اعتماد الدولہ اور نور جہاں بیگم کو سلطنت کے کاروبار میں دخل نہ ہوتا تو جہانگیر کی سلطنت ضرور تباہ ہو گئی ہوتی۔ تمام یورپین مؤرخ معترف ہیں کہ بلحاظ دولت و قوت اور جاہ و جلال و اقبال، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب سے بڑھ کر ہندوستان کیا دنیا بھر میں کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔"

"حیات نور جہاں و جہانگیر" ۱۹۱۴ء میں پہلی بار راجپوت پریس لاہور والوں نے شائع کی تھی۔

"کشمیر کا نادر شاہ" (غیر مطبوعہ)

یہ فوق صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب ہے جو انھوں نے ۱۸ راگست ۱۹۴۰ء کو مکمل کی تھی۔ ۴۲ صفحات کی اس مختصر سی تصنیف میں کشمیر کے باغی افغان گورنر آزاد خاں کے عہدِ حکومت کا خاکہ بیان کیا گیا ہے جس سے اس زمانے کے جبر و تشدد، ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ، بدامنی، بدنظمی، کشمیریوں سے بے اعتنائی،

مصائب ارضی وسماوی اور بادشاہ کے عبرت ناک انجام کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

آزاد خاں قندھار کے حاجی کریم داد خاں کا چھوٹا فرزند تھا۔ حاجی کریم داد خاں نے احمد شاہ دُرانی (یا احمد شاہ ابدالی) کے چوتھے حملۂ ہند میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا کر صوبۂ کشمیر کے گورنر کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ وہ خود بڑا ظالم تھا۔ اس کا بیٹا اس سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر تیئیس سال سے زیادہ نہ تھی مگر اس نے شاہی احکامات کا انتظار کیے بغیر خود ہی کشمیر کا صوبہ سنبھال لیا اور مطلق العنان ہو گیا۔ کابل کے بادشاہ تیمور شاہ کو جب اس کی بغاوت کا علم ہوا تو اس نے ایک جرار لشکر اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا مگر آزاد خاں نے شاہی فوجوں کو پے در پے شکستیں دے کر ان کا منہ پھیر دیا۔ آخر تیمور شاہ خود اس باغی کا قلع قمع کرنے کے لیے پشاور تک آیا اور آزاد خاں کے چچا زاد بھائی پہلوان خاں کو اس کی سرکوبی کے لیے نامزد کیا۔ مگر اسے بھی ہزیمت کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اس پر تیمور شاہ نے سردار مدد خاں کو اس مہم پر بھیجا جس نے پکھلی، مظفر آباد اور آزاد خاں کے دیگر باجگذار راجوں کو اپنے ساتھ ملا کر آزاد خاں کو اتنا بے بس کر دیا کہ اس نے سزا سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔ اس طرح چار سال اور چند ماہ کے قہر الٰہی کے بعد کشمیر کو نجات ملی۔ ذوق صاحب نے کشمیریوں کی مظلومی اور آزاد خاں کے جبر و تشدد کی تمام تفصیلات جمع کر کے اس کو کشمیر کا نادر شاہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر وہ افغانوں اور سکھوں کو کشمیریوں پر مسلط کر کے اتنا ظلم نہ کرتا تو اس کی حکومت اس سے زیادہ دن نکال سکتی تھی کیونکہ وہ حقیقی معنوں میں آزاد اور غیر معمولی شجاع تھا۔

اس کتاب کا مسودہ مولانا محمد عبداللہ قریشی کے پاس محفوظ ہے۔ اس کا سرورق اس شذرے کے ساتھ مقالے میں شامل کیا جا رہا ہے۔

"مہاراجہ گلاب سنگھ" (غیر مطبوعہ)

یہ کتاب ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے جسے اپنی وفات سے تین سال قبل ۱۹۴۲ء میں فوق صاحب نے مکمل کیا مگر اس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔ فوق صاحب نے "مکمل تاریخ کشمیر" تین جلدوں میں لکھی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ حکومت سکھاں اور حکومت خاندان ڈوگراں کا تذکرہ ایک ہی جلد میں کر دیا جائے مگر وہ بوجوہ ایسا نہ کر سکے۔ اس بات کے علاوہ وہ "مکمل تاریخ کشمیر" کی تیسری جلد کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

اس حصے میں صرف سکھوں کے ۲۷ سالہ عہدِ حکومتِ کشمیر کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں مہاراجہ گلاب سنگھ، مہاراجہ رنبیر سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت کا حال درج ہوگا۔"

"تاریخ کشمیر" ۱۹۱۲ء کو شائع ہوئی مگر فوق صاحب اپنی زندگی میں چوتھا حصہ نہ لکھ سکے۔ البتہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے حالات و کمالات پر مبنی یہ سوانح عمری تحریر کی جو اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ اس کتاب کا مسودہ ان کے صاحبزادے ظفر احمد مرحوم کے گھر میں محفوظ ہے۔ فوق صاحب کی صاحبزادی ظفر سلیمہ کے کہنے پر ظفر احمد صاحب کے صاحبزادے ظفر عزیز نے مطالعے کے لیے یہ مسودہ راقم کو عطا کیا۔

اس کتاب کا مسودہ اور دوسرے غیر مطبوعہ مسودے بھی اس انداز میں لکھے ہوئے ہیں جیسے اشاعت کے لیے بھجوائے جا رہے ہوں۔ "مہاراجہ گلاب سنگھ" میں شامل فہرست بہت طویل ہے۔ عنوانات کی کل تعداد ۸۲ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک منفرد کتاب ہے کہ صرف فہرست دیکھ کر کتاب میں زیرِ موضوع شخصیت کی

کی مکمل زندگی کا ایک خاکہ سا بن جاتا ہے۔ اس طرح فہرست فی الواقع کتاب کا آئینہ بن جاتی ہے۔ ایک واضح تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

کشمیر میں ڈوگرہ راج کوئی قابلِ فخر زمانہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس دور میں مسلم کشمیر کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ فوق صاحب نے ادب و صحافت کے ذریعے احتجاج و اصلاح کے لیے جدوجہد بھی کی۔ مگر وہ مہاراجہ گلاب سنگھ سے بہت متاثر تھے۔ کتاب کے سرورق پر انھوں نے مہاراجہ کے لیے "ڈوگرہ قوم کے فخر، کوہستان جموں کے شیر ببر، ڈوگرہ دی گریٹ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

ذرّے نے پہاڑوں کی بنیاد ہلا ڈالی
اک مردِ سپاہی نے شاہی کی بنا ڈالی

"مہاراجہ گلاب سنگھ کے تدبّر اور ان کے اخلاق و عادات" کے موضوع پر ۲۷ مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ یہ باب بہت دلچسپ ہے اور فوق صاحب کے ذوق و شوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ "ایک عجیب مثال" کے عنوان سے یہ واقعہ رقم کیا گیا ہے:

"راجہ گلاب سنگھ ایک دفعہ کمیدان بسنت سنگھ اور دوسرے ہمراہیوں سمیت قادر آباد کے جنگل میں شکار کھیل رہے تھے۔ بسنت سنگھ کے سوا سب ملازم بہت پیچھے رہ گئے۔ آپ نے تمام ہتھیار بدن سے اتار کر بسنت سنگھ کے ہاتھ میں دے دیے اور کہا تیرے باپ کو میں نے قتل کیا تھا۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے تجھے اس سے اچھا موقع کب ملے گا۔ یہ الفاظ سن کر بسنت سنگھ کانپنے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کی حضور مائی باپ ہیں۔ ایسے مہربان آقا سے جس نے بچوں کی طرح پالا ہو، دغا کرنا اپنی بدقسمتی کے علاوہ راجپوتی شان کو بٹہ لگانا ہے۔" (ص: ۸۴)

اسی صفحے پر "ایک انگریز کے تین سوالوں کے دانشمندانہ جواب" کے تحت فوق صاحب لکھتے ہیں :

"کپتان میکسن نے مہاراجہ گلاب سنگھ سے بمقام جموں تین سوال کیے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ جموں شہر چاروں طرف سے جھاڑیوں اور جاڑ سے گھرا ہوا ہے۔ اس کی کٹائی ہونی چاہیے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ کشمیر میں آپ کی فوج میں کمی ہونی چاہیے۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ ملک میں ضبطئ اسلحہ کا حکم جاری ہونا چاہیے۔ مہاراجہ نے ان سوالات کے جو جوابات دیے، کپتان سُن کر دم بخود رہ گیا۔ آپ نے پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ جموں کے جاڑ کا ایک ایک تنکا ہماری مونچھوں کا بال ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ تھا کہ میرا تمام ملک فوج ہے۔ تیسرے سوال کا جواب تھا کہ اسلحہ کی ضبطی ہمارے دھرم کے خلاف ہے"

مہاراجہ کی مذہبی رواداری کی بات کرتے ہوئے فوق صاحب لکھتے ہیں کہ ایک حکم کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں شادیوں کو ممنوع قرار دے دیا تاکہ کسی کے ساتھ سماجی طور پر کوئی ظلم نہ ہو سکے۔

اسلوب بیان کے اعتبار سے فوق صاحب نے کوئی نیا تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ تحریر میں دلچسپی کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ کہیں بھی بات کو بے مزہ نہیں ہونے دیتے۔ واقعات کی پیشکش میں لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ نہ کسی تکلف میں پڑتے ہیں۔ اپنے ممدوح اور موضوع کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے ہیں جس پر کبھی کبھی جانبداری کا گمان گزرتا ہے۔ مذکورہ شخصیت کا دفاع کرنے میں ایک وکیل کی طرح منطقی طریقہ اپناتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں شجرۂ نسب کا عکس موجود ہے جو ڈوگرہ راج کے بانی راجہ دھروپ دیو سے شروع ہوتا ہے مہاراجہ گلاب سنگھ ان کی چوتھی پشت سے تھا۔

فوق صاحب نے مہاراجہ کی زندگی کے روایتی حالات بیان کرنے کے علاوہ
ان کی اعلیٰ صفات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مختلف واقعات کی روشنی میں مہاراجہ کی
دریا دلی، بہادری، رعایا پروری اور انصاف پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہی اوصاف
کی بنا پر فوق صاحب نے کشمیر کے اس فرزند کو اپنی سوانح عمری کا موضوع بنایا ہے۔
آخر میں ”مہاراجہ کے مشیر اور مصاحب“ کے عنوان سے ۲۱ مختلف معروف اور
مقتدر لوگوں کا مختصر تذکرہ ہے جن میں ہر مذہب و ملت اور قوم کے لوگ شامل تھے۔
سات علما کے نام بھی ہیں۔

”نامور خواتین کی سوانح عمریاں“

فوق صاحب نے خواتین کے بارے میں چھ سوانحی تصانیف تحریر کی ہیں۔
ان میں سے ”للہ عارفہ“ اور ”ابلیا بائی“ مختصر مگر مکمل سوانح عمریاں ہیں۔ دوسری چاروں
کتابوں میں سے ہر ایک کتاب میں کئی کئی خواتین کے بارے میں سوانحی مضامین
اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح انھوں نے زیادہ سے زیادہ خواتین کو متعارف
کرانے کی کوشش کی ہے۔ فوق صاحب نے زیادہ تر ان عورتوں کو اپنی سوانح
نگاری کے لیے منتخب کیا ہے جو امورِ مملکت چلانے میں کسی سے کم نہ تھیں۔ انھوں
نے معاملات حکومت میں اپنے عزیزوں کی معاونت کی۔ آزادیٔ ہند کی تحریک بھی
ایک بہت بڑی سیاسی سرگرمی تھی۔ فوق صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حکومت
اور قیادت پر صرف مردوں کی اجارہ داری نہیں۔ یہ کام ایک عورت بھی بڑی
خوش اسلوبی سے کر سکتی ہے۔ کئی حکمرانوں کی کامیابیوں میں ان کی بیویوں کی اعلیٰ
صلاحیتوں کا برابر کا حصہ شامل ہے۔ البتہ فوق کی کتابیں ”للہ عارفہ“ اور ”خواتین کشمیر“

مختلف انداز رکھتی ہیں۔ اس کتاب میں ان خواتین کا تذکرہ ہے جو درباروں اور ایوانوں سے دور تھیں مگر اعلیٰ اوصاف کی مالک تھیں۔ درویش، شاعر، فنکار، صاحب فقر و غنا اور خوبصورت جذبوں کی مالک عام گھریلو خواتین کی زندگیوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "خواتین کشمیر" مختلف رنگوں کا ایک گلدستہ ہے۔ دوسری کتابوں میں فوق نے زندگی کے ایک خاص شعبے سے متعلق عورتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ انداز بھی ایک مربوط کیفیت کا حامل ہے۔ سوانح نگاری کا یہ انداز ایک معروف اسلوب ہے۔ پروفیسر علم الدین سالک نے بھی اپنی کتاب "دختران ہند" (۱۹۳۴ء) میں صرف اہل سرکار خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔ سعید انصاری کی "سیرۃ الصحابیات" (۱۹۴۱ء) میں اگرچہ مختلف صفات و عادات کی پاکباز عورتوں کا تذکرہ ہے مگر ان سب میں وجہ مشترک یہ ہے کہ وہ سب صحابیات تھیں۔

فوق صاحب نے اپنی ان چھ کتابوں کے علاوہ بھی اپنی کئی دوسری کتابوں میں عورتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ سرسید احمد خاں کے نانا کے بارے میں اپنی سوانح عمری کے آخر میں عزیز النساء بیگم کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو کا مضمون شامل کیا گیا ہے۔ محترمہ عزیز النساء بیگم، خواجہ فریدالدین احمد کی صاحبزادی اور سرسید احمد خاں کی والدہ تھیں۔ اس کے علاوہ فوق صاحب کی تحقیق کے مطابق وہ کشمیری النسل خاتون تھیں۔ فوق نے کہیں بھی کشمیر کی عظمتوں کو تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عزیز النساء بیگم بلاشبہ ایک عظیم ماں تھیں اور فوق صاحب معاشرے کی بہتری کے لیے ایسی ماں کی خصوصیات دوسری عورتوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ فوق تعلیم نسواں کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ مضمون مولوی صاحب کے نام کے ساتھ شامل کیا ہے۔ ان کے بارے میں ایک مضمون خود لکھ کر "خواتین کشمیر" میں شامل

کیا ہے۔ رئیس الاحرار سعد زاغلول پاشا کی سوانح عمری میں فوق نے بیگم سعد زاغلول پاشا کا بھی ذکر کیا ہے۔ پاشا کی گرفتاری اور جلا وطنی کے بعد پورے عزم و استقلال سے انھوں نے قومی تحریک کے دوران مصر کی عورتوں میں نئی روح پھونک دی اور لوگوں کو ایک ولولہ تازہ عطا کیا۔ فوق نے لندن کے "ٹائمز" کے حوالے سے لکھا ہے کہ بیگم پاشا کو ام المصرین کہا جاتا تھا۔ فوق کی کتاب "تذکرۃ العلماء والمشائخ" کے آخر میں دو خواتین کا ذکر ہے۔ نورجہاں اور زیب النساء مخفی۔ شہنشاہ عالمگیر کی دختر زیب النساء مغلیہ دربار کا ایک ایسا کردار ہے جس کے بارے میں بہت ساری حکایات مشہور ہیں۔ مگر اس کی اصل حیثیت شاعرہ کی ہے۔ نورجہاں کے بارے میں فوق نے اپنی کتاب "نورجہاں و جہانگیر" میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کتاب کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ فوق نے ان دونوں کے علیحدہ علیحدہ حالات لکھے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی کا کچھ نہ کچھ حصہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن نورجہاں اور جہانگیر کی زندگیاں ایک دوسرے سے اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ وہ ایک کی سوانح لکھتے تو دوسرے کی زندگی خود بخود اس میں شامل ہو جاتی۔ ایک کتاب میں موجود دو سوانح عمریوں میں واقعات کی تکرار اچھا تاثر پیدا نہیں کرتی۔ ان دونوں کی محبت و یگانگت کو دیکھا جائے تو ان کی آپس میں ملاقات سے پہلے کے واقعات بھی غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے متعلق دکھائی دیتے ہیں۔ فوق نے ان دونوں کے الگ الگ مطالعے سے انسانی زندگی کی انفرادیت کو ثابت کیا ہے۔ نورجہاں کی زندگی کے دو ادوار متعین کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا بطور مہرالنساء اور دوسرا بطور ملکہ۔ فوق نے نورجہاں کے مقبرے کو تصویر عبرت قرار دیا ہے۔ اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں کی نظم شامل کتاب کر دی ہے جو انھوں نے ۱۹۰۲ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں پڑھی تھی۔

راقم کو فوق کی ایک غیر مطبوعہ کتاب ان کے صاحبزادے ظفر الحق صاحب کے پاس دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس میں کچھ غیر مطبوعہ مضامین کے علاوہ وہ مضامین شامل ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں چند سوانحی مضامین خواتین کے بارے میں ہیں۔ ایک مضمون مراد بیگم کے بارے میں ہے جو "قوس قزح" لاہور (فروری ۱۹۲۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ مراد بیگم لاہور کے ایک بہادر حکمران میر منو کی بیوی تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس نے مردانہ وار سازشوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور بڑی پامردی سے حکومت کی۔

فوق کے اشاعتی ادارے کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب "کشمیر کی رانیاں" ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں مصنف کے نام کی وجہ سے کچھ تاریخی اور تحقیقی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ جن کا کچھ ذکر اگلے باب میں کیا جا رہا ہے۔ سترہ رانیوں کا ذکر ہے جنھوں نے مختلف وقتوں میں حکومت کی۔ اس کتاب کا ذکر آخری باب میں کیا جاتے گا۔ فوق کی کتاب "تاریخ حریت اسلام" کا جائزہ اس باب کے پہلے حصے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مردوں کے علاوہ عورتوں کی حریت پسندی اور حق گوئی کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "زنانہ حاضر جوابیاں" بھی ہے جس میں خواتین کی ذہانت اور بذلہ سنجی کا تذکرہ مختلف واقعات و اشعار کے ذریعے کیا گیا ہے۔ ان کی مرتب کردہ کتاب "اذانِ بتکدہ" میں ہندو شاعروں کا نعتیہ کلام پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہندو شاعرہ بوادتی حاجبہ کی نعتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

اس جائزے کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ فوق عورتوں کی اہلیتوں کے معترف تھے۔ وہ زندگی میں عورتوں کی کامیابیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس زمانے میں جب آزادیٔ نسواں کی تحریک کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ فوق نے ہمیں بتایا کہ زندگی کے کسی میدان میں عورتیں مردوں سے کم نہیں بلکہ بعض شعبوں

ہیں ان کی کارکردگی مردوں سے بہتر رہی ہے۔ فوق کی سوانحی تحریروں میں عورت کی بڑائی کے ساتھ اس کے قابلِ احترام ہونے کا احساس بھی ملتا ہے۔ فوق باوقار اور متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اعلیٰ مناصب پر فائز عورت کے حالات و کمالات بیان کرتے ہوئے نہیں بھولتے کہ وہ ایک عورت بھی ہے۔ وہ حکومت اور سیاست کے سازشی ماحول میں رانیوں کے حوصلے اور بصیرت کا بالخصوص ذکر کرتے ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں موقع ملنے پر عورتوں نے یادگار کارنامے سرانجام دیے۔ اس حوالے سے فوق نے ان عورتوں کو منتخب کیا جو اپنے عورت ہونے پر فخر کرتی تھیں۔ فوق زندگی کے معاملات و مسائل میں عورتوں کی مکمل شرکت کے قائل تھے۔ اور وہ تمام عورتوں سے اسی طرح کا رویہ اختیار کرنے کی توقع رکھتے تھے تاکہ زندگی کی گاڑی آسانی سے اور روانی سے چل سکے۔ وہ تو اس بات کے بھی حق میں تھے کہ عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ وہ ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔ اس کے علاوہ عزت و وقار اور شرم و حیا کو عورت کا بنیادی وصف سمجھتے تھے۔

ان سوانح عمریوں میں بھی فوق نے عام فہم اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کے اسلوب نگارش میں ایک پختگی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے چھوٹے بڑے تمام لوگ دشواری محسوس نہیں کرتے اور ان کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔ فوق متاثر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کے سامنے کئی مقاصد تھے۔ مگر وہ مقصدی اور اصلاحی ادب کو پُرتاثیر بنانے کے فن سے واقف تھے۔

''محبِ وطن خواتینِ ہند''

۹۶ صفحات کی یہ کتاب ظفر برادرس لاہور نے پہلی بار ۱۹۲۱ء میں شائع کی۔

کتاب کے سب ٹائیٹل پر "محبِّ وطن خواتین ہنڈ کے ساتھ بھارت کی دیویاں" بھی لکھا ہُوا ہے۔ سب سے اُوپر یہ شعر بھی درج ہے ؎

بھارت کی پیاری بیٹیو بھارت کی عزت تم سے ہے
مذہب کی عظمت تم سے ہے ملّت کی وقعت تم سے ہے

کتاب کے سرورق پر اس کے موضوع کی وضاحت اس انداز میں کی گئی ہے:

"کتاب میں ۳۲۔ ایسی مُسلمان، سکھ، ہندو اور پارسی محبِّ وطن خواتین کے حالات و سوانحات عمر اور حب الوطنی کے جذبات سے لبریز ان کے خیالات درج ہیں" جنھوں نے اپنے ملک و ملت کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے ہر مصیبت اور تکلیف کو عین راحت تصور کیا۔ اپنے بھائیوں، بیٹوں، شوہروں کے جیل جانے اور نظر بند ہونے کو ملک کی آزادی کا ذریعہ سمجھا۔ ان کے لیے فوق نے بجا طور پر محبِّ وطن کا خطاب تجویز کیا ہے۔ انھیں صحیح معنوں میں دیویاں کہلانے کا حق ہے۔ جب یہ کتاب لکھی گئی تو اس وقت ان میں اکثر خواتین بقیدِ حیات تھیں۔ یہ ایک طرح سے ان کی زندگی ہی میں ان کی خدمات کا اعتراف تھا۔ مُلک کی دوسری عورتوں میں آزادی کا جذبہ اور ذوق پیدا کرنے کے لیے اس کتاب کی اشد ضرورت تھی۔

جب برطانوی سامراج سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک چل رہی تھی تو اس وقت ہر مذہب، ہر فرقے، ہر علاقے کے مردوں اور عورتوں نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق بھرپور حصّہ لیا۔ تحریکِ آزادی کے زمانے میں برِصغیر کی تاریخ میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہُوئے اور جواں ہمّت اور بلند کردار عورتیں سامنے آئیں۔ انھوں نے واقعی مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا اور قربانیاں دیں۔ آزادی کی جنگ میں شریک لوگوں کے بارے میں یہ تفریق کرنا تعصب کے ذیل میں آتا ہے کہ کس

مذہب کے لوگوں نے زیادہ قربانیاں دیں۔ فوق نے ایک دیانت دار مؤرخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے ایسے کسی احساس کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ "محبِ وطن خواتینِ ہند" میں ۳۲ عظیم خواتین میں سے گیارہ مسلمان، سولہ ہندو، دو سکھ، دو پارسی اور ایک نامعلوم خاتون شامل ہیں۔ اس خاتون کے بارے میں فوق نے جو واقعہ تحریر کیا ہے، بہت ولولہ انگیز ہے۔ مشرقی بنگال کے ڈویژن سراج گنج کے کے شہر شہزاد پور میں ۶ اپریل ۱۹۲۱ء کو ہڑتال تھی۔ سب ڈویژنل افسر شہزاد پور سے سراج گنج جانا چاہتے تھے۔ شہر میں ہڑتال کی وجہ سے چپراسیوں، اردلیوں، مزدوروں اور گاڑی بانوں نے انکار کر دیا۔ غصے سے بھرا ہوا ایس ڈی او کالو نام کے ایک گاڑی بان کے گھر جا نکلا، اور اپنے آدمیوں کے ذریعے زبردستی گاڑی جتوا کر باہر نکالنے کا حکم دیا۔ غریب بوڑھی عورت نے مقابلہ کیا اور گاڑی کے پہیے کے آگے بیٹھ گئی۔ ایس ڈی او نے اسے لالچ دی پھر دھمکی دی مگر ایک ضعیفہ نے اپنی جرأت و ہمت کے سامنے ایک ظالم افسر کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اور اسے اپنی روانگی ملتوی کرنا پڑی۔ اس کے آگے فوق صاحب لکھتے ہیں:

"اسی دن دوپہر کو آٹھ ہزار آدمیوں کا جلوس نکالا گیا جس میں کالو گاڑی بان کی ضعیف ماں سب سے زیادہ ممتاز نظر آ رہی تھی۔ اس کو نئے کپڑے پہنائے گئے اور پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے گئے۔ وہ گاڑی میں بٹھائی گئی اور گاڑی کو شہر کے لڑکے کھینچ رہے تھے۔" (ص: ۴۲)

دوسری خواتین میں سے اکثر معروف ہیں:

۱۔ ام الاحرار آبادی بانو بیگم والدہ علی برادران۔
۲۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو۔
۳۔ بیگم ظفر علی خاں ایڈیٹر "زمیندار"۔

۴۔ شریمتی ادتم دیوی۔

۵۔ شریمتی کرتار دیوی۔

۶۔ ایک سرحدی خاتون خدیجہ بیگم بی اے۔

۷۔ مسز حاجی یوسف ثوبانی۔

۸۔ مسز جے بی پٹیٹ۔

۹۔ شریمتی وید کماری۔

۱۰۔ والدہ حافظ حفیظ احمد۔

۱۱۔ شریمتی لکشمی جی۔

۱۲۔ والدہ چندر رہبل جوہری۔

۱۳۔ شریمتی سُورج بائی۔

۱۴۔ والدہ بہی رام اور بدری رت وغنو۔

۱۵۔ شریمتی لجیا دتی۔

۱۶۔ شریمتی جمنا دیوی۔

۱۷۔ اُمتہ الرؤف بیگم۔

۱۸۔ والدہ کالو گاڑی بان۔

۱۹۔ شریمتی رام دیوی۔

۲۰۔ بنت صغریٰ ملیح آبادی۔

۲۱۔ والدہ جوشی جی۔

۲۲۔ شریمتی سبنتا دیوی۔

۲۳۔ بیگم ظفر الملک۔

۲۴۔ شریمتی سیتا دتی۔

۲۵- ز - خ - ش صاحبہ -

۲۶- شریمتی باربتی دیوی -

۲۷- شریمتی رنجیت کور -

۲۸- سعادت بانو بیگم ڈاکٹر کچلو صاحب -

۲۹- احمدی بیگم نجیب آبادی -

۳۰- شریمتی چودھرانی سرلا دیوی .بی اے -

۳۱- شریمتی کرشنا کماری -

۳۲- شریمتی آر چیلا امال -

لالہ لاجپت رائے جی کا مضمون "سوراجیہ اور ہندوستانی دیویوں کا فرض" کتاب کے آغاز میں درج کیا گیا ہے - وہ لکھتے ہیں:

"آج کل ملک میں جو مُلکی بہی خواہی اور قوم پرستی کی لہر چل رہی ہے، اس میں عورتیں ہماری بہت مدد کرسکتی ہیں - ہماری تاریخ میں کئی مرتبہ یہ صداقت نمایاں ہوچکی ہے کہ عورتوں میں مردوں کی نسبت دھرم کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔"

فوق صاحب نے والدۂ علی برادران، سروجنی نائیڈو اور شریمتی چودھرانی سرلا دیوی کے حالات و واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جن خواتین کے بارے میں اختصار سے لکھا ہے ان کا بھی ایک واضح تعارف سامنے آجاتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ایک واقعہ بھی بعض اوقات ایک مکمل تصویر پیش کردیتا ہے۔

فوق تحریکِ آزادی میں عمومی طور پر عورتوں کے کردار پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے۔ اس زمانے کے سماجی پس منظر کی مناسبت سے کئی خواتین اپنے نام کی بجائے اپنے بیٹے یا شوہر کے نام سے پہچانی جاتی تھیں - فوق نے بھی ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ مگر وہ اپنے جرأت مندانہ جذبے کے طفیل اپنے بیٹوں کی پہچان بن گئی ہیں۔ فوق نے اس

ذکر کو محفوظ کر کے بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔ برِ صغیر میں نجانے اور کتنی ایسی عورتیں گوشۂ گمنامی میں پڑی ہیں جنھوں نے قومی آزادی کے لیے بے مثال ایثار کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ فوق نے چند ایسی عورتوں کو کتاب میں شامل کر کے ان سب کی نمائندگی کی ہے۔

صفحہ ۵۵ پر محترمہ ز۔ خ۔ ش صاحبہ (علی گڑھ) کا ذکر اور ان کی نظم شامل ہے جو ۱۶ر جولائی ۱۹۲۰ء کے "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ ز۔ خ۔ ش سے مراد زبیدہ خاتون شیروانی ہے جو ایک معروف شاعرہ ہیں۔ کتاب میں خدیجہ بیگم بی اے اور بنت صغریٰ ملیح آبادی کی نظمیں بھی شامل ہیں۔

والدہ علی برادران، سروجنی نائیڈو اور شریمتی چودھرانی سرلا دیوی کے حالات کے علاوہ ان کی تقریروں سے اقتباسات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ میں آل انڈیا لیگ کے سالانہ اجلاس میں چھہتر سالہ ضعیف العمر محترمہ آبادی بانو بیگم کا ایک پُر جوش پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ اس وقت بیگم صاحبہ اجلاس میں موجود تھیں۔ اس زمانے میں ان کے دونوں بیٹے نظر بند تھے۔ وہ پیغام فوق صاحب نے اس طرح تحریر کیا ہے:

"یہ سچ ہے کہ ایک ضعیف العمر ماں کا دل شوکت علی و محمد علی جیسے بچّوں کی محبت سے لبریز ہے۔ میرا دل جذبات محبت مادری سے ناآشنا نہیں لیکن میرے عزیزو تم سب اپنے ماں باپ کے فرزند ہو۔ ماں باپ سے جو قدرتی رشتہ ہے، اس سے بھی زیادہ محکم ایک اور تعلق بھی ہے جسے تم بھول سکتے ہو مگر قطع نہیں کر سکتے۔ وہ رشتہ وہ تعلق ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشۂ عافیت سے نکال کر کلکتہ لے آیا ہے۔ اس جادو کا نام اسلام ہے۔ اور وہ منتر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ ہے۔ میرے بچّو یاد رکھو کہ تم سب سے پہلے اسلام کے فرزند ہو۔"

(صفحہ: ۱۰۱)

یہ کتاب عورتوں کے بارے میں کئی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے کافی ہے۔ کوئی بھی انسانی جدّوجہد اور تحریک اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک مرد اور عورتیں مل کر آگے نہ بڑھیں۔ تاریخ عالم اس صداقت سے بھری پڑی ہے کہ کسی خطّے میں آزادی کی تحریک میں عورتوں کا حصّہ مردوں سے کم نہیں۔ کہیں یہ منظر سامنے نہیں آتا تو بھی پس منظر میں یہ داستانیں موجود ہوتی ہیں۔ فوق کا یہ نظریہ بالکل برحق ہے کہ ملک وملت کی عزّت عورتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ کتاب تحریکِ آزادی کے ایک منفرد پہلو کو سامنے لاتی ہے۔ آج عورت اپنی آزادی کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت کا یہ کردار کس قدر مختلف اور شاندار نظر آتا ہے۔

"بتانِ حرم"

"بتانِ حرم" ۱۰۴ صفحات کے ساتھ پہلی بار ۱۹۲۷ء میں ظفر برادرس لاہور نے شائع کی۔ اس میں ۲۷ رانیوں کے حالات لکھے گئے ہیں جو مختلف مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ اور ان کے حرم میں شامل ہوئیں۔

تاریخ انسانی اس بات کی شاہد ہے کہ جب کسی حاکم نے کسی ملک کو فتح کیا تو نہ صرف وہاں کے علاقے اور زر و مال پر قبضہ کیا بلکہ وہاں کے زن و مرد کو بھی اپنی ملکیت سمجھا۔ انھیں اپنی جماعت میں ملالیا اور ان سے اتحاد مل کر کے ایک جدید قومیت کی بنیاد رکھی۔ تمدّن قدیم کی تاریخیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ بعض اوقات وہ مفتوح اقوام سے اس طرح شیر و شکر ہوئے کہ فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ بعض اوقات ایک نئے رنگ روپ کی نسل پیدا ہوئی۔ سکندرِ اعظم نے

فتوحات کے دوران والیٔ پنجاب کے خاندان میں یونانی سالاران فوج کے رشتے ناطے کرا کے پنجاب کو نیم یونانی قوم کی حیثیت دے دی۔

فوق نے برصغیر کے مُسلمان بادشاہوں کی اس طرح کی شادیوں کے متعلق کچھ ہندو حلقوں کی طرف سے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ وہ ہندو لڑکیوں کو مُسلمان کیے بغیر اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے۔ فوق کے مطابق ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں۔ محلات شاہی میں جو ہندو مرد اور عورتیں ملازم کے طور پر رانیوں کی خدمت کے لیے ساتھ رہتی تھیں، ان کی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے علیحدہ انتظامات کیے جاتے تھے۔ فوق نے ہندو پریس کی ان اشتعال انگیز کارروائیوں پر غم و غصے کا اظہار کیا ہے کہ وہ ہندوؤں کو ان بے سروپا باتوں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا چاہتا ہے حالانکہ ان شادیوں کے ذریعے ایک وسیع تر اتحاد و یگانگت کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ اور اُس طرح ہندوؤں کو بہت فائدہ پہنچا۔ رانیاں مُسلمان ہو جاتی تھیں مگر ان کے رشتہ دار ہندو ہی رہتے تھے۔ اور وہ مُسلمان بادشاہوں کے ماموں اور نانا بن جاتے تھے۔ انھیں بڑے بڑے اعزاز اور مناصب بھی حاصل ہوئے۔ مغل بادشاہوں نے راجپوت عورتوں سے بہت شادیاں کیں اور اس رشتہ داری سے مقامی بن گئے، ہندوستان کے باہر کے کب رہے۔ فوق دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میں نے اس کتاب میں جس قدر حالات لکھے ہیں وہ سب کے سب مُسلمہ اور مستند تاریخی واقعات ہیں جن کی تردید ناممکن ہے اور اتنا کہہ دینا بے جا نہ ہوگا کہ ان واقعات کو کتابی شکل میں لانے کا مقصد یہ نہیں کہ غیر قومی لوگوں کے جذبات میں اشتعال پیدا کیا جائے اور ہندوستان کی مکدر فضا کو اور مکدر کیا جائے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ صحیح صحیح واقعات پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ وہ

الزامات جو آج کل متعصب ہندو عاید کر رہے ہیں ان کا ازالہ ہو جاتے۔ ایسے ایسے عجیب و غریب اور بے سروپا واقعات اخباروں میں لکھے جاتے ہیں کہ ہندو ذہنیت آپ اپنا ماتم کر رہی ہے۔"

یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس زمانے میں برصغیر کی آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف کئی محاذ قائم کر رکھے تھے۔ اس طرح دو قومی نظریے کو تقویت ملی۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو نقصان پہنچا۔ فوق نے اس کتاب میں ہندو رانیوں کے حالات لکھتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ان سیاسی مصلحتوں اور باہمی تعلقات کی صورتوں کو بھی بیان کیا ہے جس کی وجہ سے یہ رانیاں مسلمان حکمرانوں کے عقد میں آئیں۔ ان کے قبول اسلام کے واقعے کو بھی صراحت سے لکھا ہے۔ فوق ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں ہمیشہ شریک رہے۔ بظاہر یہ کتاب بھی ان کوششوں کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی کا بیان بھی ان کا موضوع تھا۔ ڈوگری رانی کے باب میں کشمیر کے سلطان شہاب الدین کو شہاب الدین غوری کا ہم پلہ قرار دیتے ہوئے فوق لکھتے ہیں:

"۷۶۱ھ کا کشمیر دیکھو جب شہاب الدین کی حکومت تھی۔ پھر ۸۱۰ھ کا کشمیر بھی دیکھو جب علی شاہ حکمران تھا۔ اس کے بعد کشمیر میں بڈشاہی کا زمانہ بھی دیکھو۔ یہ وہ ایام تھے کہ کشمیر کا جو بادشاہ تخت حکومت پر قدم رکھتا تھا، غیر ممالک بلکہ غیر مذاہب کے بادشاہ اپنی بیٹیاں تک ان کو دینا عزت و فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ آج وہی کشمیر ہے جہاں در و دیوار سے بزدلی، غلامی اور ذلت و نکبت کے آثار نظر آ رہے ہیں۔" (ص - ۶۶)

"بتانِ حرم" میں پہلے نمبر پر رانی لاڑی کا ذکر ہے جو سندھ کے راجہ داہر

کی دوسری بیوی تھی جس نے فاتح سندھ محمد بن قاسم سے برضا و رغبت مسلمان ہو کر شادی کی۔ اس کے بطن سے عمر بن محمد پیدا ہوا جو اپنے باپ کی طرح اٹھارہ برس کی عمر میں سندھ کا گورنر بنا۔ سب سے آخر میں امیر بیگم نظامی کے حالات لکھے گئے ہیں جو اعلیٰ راجپوت نسل سے تھیں۔ کاٹھیاواڑ ان کا وطن تھا۔ ان کا سارا خاندان بقول فوق مشرف بہ اسلام ہوا۔ امیر بیگم کی شادی والیٔ ریاست مانگرول کاٹھیاواڑ نواب حسین میاں صاحب یوسفی سے ہوئی۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد انہیں بیوگی کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ فوق صاحب کے مطابق وہ شعائرِ اسلام کی پوری طرح پابند تھیں۔ ورنہ کچھ رانیوں نے اپنے خاوندوں کو نیم ہندو بنا لیا۔ بیوگی کے بعد امیر بیگم نے خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بیعت کی اور اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ نظامی کا اضافہ کر لیا۔

رانی پرتھال کا تذکرہ فوق کی کتاب "تذکرہ خواتین دکن" میں بھی موجود ہے۔ دونوں کتابوں میں رانی پرتھال کے ایک سے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ پرتھال ہندو قوم کے ایک زرگر کی بیٹی تھی مگر اس نے بڑے بڑے گھرانوں سے آئے ہوئے رشتوں کو ٹھکرا دیا۔ اس کا یہ رویہ اپنے حسن پر ناز کی وجہ سے نہ تھا۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے بشارت ہوئی ہے کہ میں ایک دن مسلمان ہو کر ملکہ بنوں گی۔ اس نے دیورائے والیٔ بیجانگر کے شادی کے پیغام کو بھی ٹھکرا دیا۔ یہ اس کے خاندان والوں کے لیے بڑا تکلیف دہ وقت تھا۔ کسی سنار کی بیٹی کی طرف سے یہ اقدام حیران کن تھا۔ اس موقعے پر پرتھال نے اپنے باپ سے جو گفتگو کی، اسے فوق نے اس طرح بیان کیا ہے:

"آپ کو بیجانگر کے رنواس کا حال معلوم نہیں۔ اس میں ہزاروں عورتیں بھری ہیں۔ جو اس میں گئی مر کر نکلی۔ اس راجہ کی رانیاں لونڈیوں سے بدتر ہیں۔

نہ والدین کو مل سکتی ہیں نہ دوسرے عزیزو اقربا کو دیکھ سکتی ہیں۔ میں ایسے قید دوام کا تحمل نہیں کر سکتی۔ چاہے آپ کو میری محبت نہ ہو اور میری طرف سے آپ کا لہو سفید ہو گیا ہو مگر میں آپ کو کیونکر چھوڑ سکتی ہوں۔" (ص: ۵۵)

جب سلطان فیروز شاہ نے امیرالامرا احمد خاں کے ذریعے دیو رائے کو شکست دی تو اس کی بیٹی سے شادی کی۔ مدگل فتح ہونے کے بعد پرتھال کو فیروز شاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا یہ ہمارے بیٹے حسن خاں کے لیے موزوں ہے۔ بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی۔ اس طرح کے واقعات انسانی تقدیر کی پُراسرار باریکیوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔

رانی روپ متی کا واقعہ ذرا سا مختلف ہے۔ ولایت مالوہ کے سلطان باز بہادر نے ایک صاحب جمال اور فن موسیقی میں طاق ہندو خاتون روپ متی سے شادی کر لی۔ عیش و عشرت میں کھو جانے کے بعد جب باز بہادر نے ادھم خاں سے شکست کھائی اور بھاگ کھڑا ہوا تو ادھم خاں نے حکم دیا کہ محل میں موجود تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ رانی روپ متی بُری طرح زخمی ہوئی۔ ادھم خاں رانی کا نادیدہ عاشق تھا۔ اس کا علاج کرایا گیا۔ وہ ٹھیک ہو گئی تو اس سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ مگر اس سے پہلے رانی نے خودکشی کر لی۔ اور اس طرح اپنی وفا و حیا کا بھرم رکھ لیا۔ فوق کے مطابق مدتوں تک روپ متی کی وفا شعاری اور عصمت شعاری کا چرچا رہا۔ اس طرح کے واقعات کے ذریعے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ جن رانیوں کے حالات کتاب میں ہیں، ان کے نام یہ ہیں :

۱۔ رانی لاڑی۔ ۲۔ عبداللہ اشتر کی رانی۔

۳- رانی کنولا دیوی - ۴- رانی دیول دیوی
۵- ملکہ مریم زمانی - ۶- جے پور والی رانی جان بائی -
۷- رانی جودھا بائی - ۸- راٹھور رانی -
۹- اودھے پوری رانی - ۱۰- رانی منوہر پوری -
۱۱- شاہزادہ محمد معظم کی رانی - ۱۲- بائی بھوت دیئی -
۱۳- فرخ سیر کی جودھپوری رانی - ۱۴- رانی پرتھال -
۱۵- رانی کیماڑنی جی - ۱۶- رانی کشل دیوڑی -
۱۷- ڈوگری رانی - ۱۸ رانی شنکر دیوی -
۱۹- فتح خاتون ۲۰- رانی روپ متی -
۲۱- رانی امران بائی ۲۲- رانی نان جی -
۲۳- رانی کشل بابا اڑجی ۲۴- امیر بیگم نظامی -

موضوع کی انفرادیت سے یہ کتاب سوانح عمری کی صنف میں ایک منفرد درجہ رکھتی ہے - یہ فوق کی تاریخ و سوانح میں گہری دلچسپی اور مزاج کی تنوع پسندی کا ثبوت ہے - اپنے زمانے کے معروف رسالے "صوفی" نے "بتان حرم" پر ایک بھرپور تبصرہ کیا تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے -

"للہ عارفہ"

کشمیر کے ساتھ فوق کی وابستگی ایک حقیقت بن چکی ہے - تاریخ کشمیر کی عظیم شخصیات کو تلاش کرنا فوق کے بنیادی مقاصد میں سے ایک تھا - کشمیر کے ہر دل العزیز حکمران سلطان زین العابدین بڈشاہ کے علاوہ انھوں نے للہ عارفہ کی سوانح بہت محبت سے لکھی ہے - یہ فوق کی چند پسندیدہ شخصیات میں سے

ایک ہے۔ للہ عارفہ ایک زاہدہ وعابدہ اور عارفہ وکاملہ خاتون تھی جس کا احترام ہر مذہب وملت کے لوگوں میں یکساں طور پر کیا جاتا تھا۔ یہ ایک عجب اعتراف ہے کہ ہندو اسے ہندو سمجھتے تھے اور مسلمان اسے مسلمان سمجھتے تھے۔ یہ مقام صوفیا کے علاوہ بہت کم کسی کو حاصل ہوا۔ اس طرح کی حکایات بعض دیگر مشاہیر کے بارے میں بھی ملتی ہیں کہ ان کی موت پر مختلف فرقوں کے لوگوں نے اپنایت کا اظہار کیا۔ للہ بھی ایک پراسرار اور پرانوار ہستی کی مالک تھی مسلمان صوفیاء سے ہندوؤں کی عقیدت مندی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ بھی اولیاؤں کے آستانے سے یکساں طور پر فیض یاب ہوتے تھے۔ اللہ والوں کی طرح للہ عارفہ بھی ایک انوکھے اور بلند مرتبے کی خاتون تھی۔

للہ عارفہ کے مسلمان یا ہندو ہونے کے سوال پر فوق نے محققانہ بحث کی ہے۔ لیکن کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ شاید وہ بھی اس راز کو راز ہی رہنے دینا چاہتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ للہ ساری قوموں کے لیے ایک مقبول اور منتخب شخصیت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نہ اس کے سن پیدائش کا صحیح پتہ ہے اور نہ سن وفات کا۔ نہ اس کی کہیں سمادی ہے اور نہ کہیں قبر ہی موجود ہے۔"

اس کے باوجود فوق نے تفصیل سے اس بات پر صفحہ ۸۴ پر بحث کی ہے۔ وہ صفحہ نمبر ایک[1] پر صوفیائے کشمیر کے بارے میں دسویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی کتاب "تذکرۃ العارفین" اور گیارھویں صدی ہجری کی "اسرار الابرار" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان دونوں کتابوں میں للہ کے حالات تو بکثرت ملتے ہیں مگر تاریخ پیدائش اور وفات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ البتہ "تاریخ کشمیر اعظمی" میں اس کے نور ظہور پر تھوڑی سی روشنی ڈالی گئی ہے "تاریخ اعظمی" میں لکھا ہے کہ

وہ کشمیر کے سلطان علاؤ الدین کے زمانے میں ظاہر ہوئی۔ سلطان کا عہد ۷۴۹ھ بمطابق ۱۳۴۸ء سے ۷۶۱ھ بمطابق ۱۳۶۰ء تک ساڑھے تیرہ سال بنتا ہے۔ فوق لکھتے ہیں کہ "تاریخ کبیر کشمیر" اور "تاریخ حوالی کشمیر" موسوم بہ "ممو جز التواریخ" میں للہ کا سال پیدائش ۷۰۰ھ درج ہے۔ ایک سابق میونسپل کمشنر سرینگر مولوی مفتی محمد سعادت کی غیر مطبوعہ کتاب "کشمیری صالحات" کے حوالے سے بھی سال پیدائش ۷۰۰ھ بتایا گیا ہے۔ مگر فوق نے حضرت علی ہمدانی اور سید حسن سمنانی سے للہ کی ملاقات اور حضرت شیخ نور الدین ولی کی ولادت کے حوالے سے اس سال پیدائش کو غلط ثابت کیا ہے۔ فوق نے ملا عبد الوہاب کی منظوم تاریخ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جسے گورنر کشمیر راجہ سکھ جیون مل نے شاہنامہ فردوسی کے انداز میں لکھنے کو کہا تھا۔ اس کے قتل کے بعد یہ تاریخ نامکمل رہی اور طبع بھی نہ ہو سکی۔ ملا نے للہ کا سال پیدائش ۷۳۵ھ لکھا ہے۔ اس طرح "تاریخ اعظمی" کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ للہ کا ظہور سلطان علاؤ الدین کے زمانے میں ہوا تھا۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فوق اکثر اوقات اپنی تحریروں میں خالصتاً تحقیقی رویہ اختیار کرتے تھے۔ وہ تاریخی صداقتوں کی چھان بین کے لیے بہت محنت کرتے تھے۔ اور حتمی سچائی تک پہنچنے کے لیے کئی طریقے اختیار کرتے تھے۔

للہ عارفہ کی سوانح میں فوق کا اسلوب اپنی روایتی سادگی کے ساتھ محبت و عقیدت سے لبریز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیر میں للہ پیار کا متبادل لفظ سمجھا جاتا ہے۔ للہ کے کئی نام تھے۔ لل دو۔ لل شوری۔ للہ ایشوری۔ للہ ودی اور للہ عارفہ۔ فوق لکھتے ہیں کہ للہ ایک برہمن زادی تھی۔ ان پڑھ تھی۔ کشمیر کے عام رسم و رواج کے مطابق اس کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد اس کی زندگی

میں انقلابات کا آغاز ہُوا۔ بچپن میں بھی وہ خاموش طبع اور الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی۔ ساس اور خاوند کے ظلم و ستم کے خلاف ضبط اور صبر سے اُس کا دِل عرفان و آگہی کا مرکز بنا۔ وہ اس روشنی میں حق کو پہچاننے میں کامیاب ہُوئی۔ فوق نے اس کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"میں نے اپنے نفس کو مارا جس سے میرے اندر کا چراغ روشن ہوگیا۔ مجھے اپنی اصلیت معلوم ہوگئی۔ اندر کی چمک باہر آئی۔ اور اندھیرے میں اسے میں نے پکڑ لیا۔" (صفحہ : ۵۲)

جب سرمستیوں نے للہ کو گھیر لیا تو وہ دیوانہ وار جنگلوں کو نکل گئی۔ اپنے آپ اور اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہوگئی۔ فوق نے اس بات سے مکمل اتفاق نہیں کیا کہ وہ گلیوں میں برہنہ پھرا کرتی تھی۔ انھوں نے برہنگی اور ستر پوشی کے ضمن میں بھی بحث کی ہے۔ کشمیر میں سردی کی شدت، للہ کے اقوال اور کئی دوسرے حقائق کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ وہ کپڑے پہنتی تھی مگر کبھی کبھی پھاڑ ڈالتی تھی۔ البتہ ستر ڈھانپ کے رکھتی تھی۔ اس کی یہ بات بڑی فکر انگیز ہے کہ مجھے کشمیر میں کوئی مرد دکھائی نہیں دیتا، پردہ کس سے کروں۔ اس زمانے میں سید علی ہمدانی کی کشمیر میں آمد کے واقعے کو فوق نے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ انھیں دیکھتے ہی للہ پکاری۔ مرد آگیا مرد آگیا۔ مجھے چھپالو۔ اور وہ تنور میں گھس گئی۔ روایت کے مطابق سید نے اسے تنور میں سے نکالا تو وہ بہت شاندار لباس میں ملبوس تھی۔ اس کی اس طرح کی کئی اور کرامات کا تذکرہ بھی کتاب میں ملتا ہے۔ کئی دوسرے مسلمان صوفیاء اور ہندو سوامیوں سے اس کی ملاقات کا حال بھی لکھا گیا ہے۔ یہ لوگ للہ کی معرفت اور جذب و شوق دیکھ کر متعجب اور متاثر ہُوئے۔ ہندو، مُسلم سب اس کے عارفہ ہونے میں یقین رکھتے تھے۔ فوق

کی کتاب پڑھ کر للہ کی جو تصویر بنتی ہے، وہ ایک مجذوب خاتون کی ہے۔ فوق نے للہ کے کچھ اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ ایک ان پڑھ عورت کے مُنہ سے جو بات نکلتی تھی، لوگ اسے یاد کر لیتے تھے۔ کشمیری زبان میں "للواک" کے نام سے اس کے اقوال شائع ہو چکے ہیں جن کا انگریزی اور اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ اقوال للہ کی بصیرتوں کی دلیل ہیں۔ اس کا انداز دوسرے صُوفیاء سے قدرے مختلف ہے۔ للہ نے اپنی باطنی گہرائیوں میں اتر کر جو راز پاتے، ان کا بیان اسے ایک پُرکشش شخصیت کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ ان اقوال کی ایک ادبی حیثیت بھی متعین کی جا سکتی ہے۔ اس سے کشمیری زبان کی ندرتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے:

۱۔ حرص و ہوا اور غرور، دو لٹیرے ہیں۔ انھیں قتل کر دو۔ اس کے بعد دوسروں کی خدمت کے لیے کمر باندھ لو۔ ڈاکو تھوڑے عرصے کے لیے آتے ہیں مگر محبّت کی آواز ہمیشہ کے لیے رہتی ہے۔

۲۔ مرد اور عورت کا فرق عالم ناسوت تک ہے۔ اس کے اُوپر کوئی فرق نہیں۔

۳۔ گمنامی کا پردہ خدا کی امان اور حفاظت ہے۔

۴۔ کوئی مجھے گالی دے یا کوئی میری پرستش کرے، مَیں علم حقیقی کا امرت پی کر توانا ہو گئی ہُوں۔ اب مَیں نہ خوش ہوتی ہُوں نہ بیزار۔ (صفحہ: ۵۱)

شیخ نُورالدین ولی کی کشمیری زبان میں ایک نہایت دلگداز مناجات ہیں درج یہ الفاظ قابلِ غور ہیں، ترجمہ:

"پانپور کی للہ عارفہ نے شراب معرفت نوش کی۔ اس کاملہ جیسی کوئی ہستی روئے زمین پر نہیں۔ الٰہی مجھے ویسا ہی رتبہ اور مذہبی فیض عطا کر۔" (صفحہ: ۴۳)

فوق نے للہ عارفہ کی سوانح عمری لکھ کر کشمیر کا ایک اور دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں وادیٔ کشمیر روحانیت کا مرکز

تھی۔

"تذکرہ خواتین دکن"

گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی ضخامت ۷۶ صفحات ہے۔ اس میں سرزمین دکن کی نامور صاحب سیف و قلم خواتین کے حالات اور کمالات تحریر کیے گئے ہیں۔ ان بہادر اور ممتاز خواتین میں

۱۔ ملکہ خونزدہ ہمایوں۔ ۲۔ بہرہ دیوی۔
۳۔ جلوی دیوی۔ ۴۔ والدہ ابراہیم عادل شاہ۔
۵۔ بیگم حمید خاں۔ ۶۔ رانی پرتھال۔
۷۔ ملکہ پونجی خاتون۔ ۸۔ رُوح پرور آغا بیگم۔
۹۔ مخدومہ جہاں۔ ۱۰۔ چاند بی بی۔
۱۱۔ بیگم سلطان شامل ہیں۔

برصغیر میں کشمیر کے علاوہ دکن بھی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں بہت باہمت اور مایہ ناز خواتین پیدا ہوئیں۔ کشمیر میں ہندو رانیوں اور دکن میں مُسلمان شہزادیوں کو حکومت کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے حکمرانی کے سلسلے میں مکمل سُوجھ بُوجھ اور جرأت و ہمت کا ثبوت دیا۔ فوق لکھتے ہیں:

"اس ملک میں ایک نامعلوم عرصہ سے یہی قاعدہ چلا آتا ہے کہ مردوں کی بجائے یہاں عورتیں حکمران ہوتی تھیں۔ ان عورتوں میں بڑی بڑی قابل گزری ہیں۔ انھوں نے نہایت تدبر اور قابلیت سے اپنے ملکوں کا انتظام کیا ہے۔ ان حکمران عورتوں کے شوہر دیگر امراء و مصاحبین کی طرح درباری

ملازم سمجھے جاتے تھے۔ امورات سلطنت میں ان کا بہت کم دخل ہوتا تھا۔ بھرہ دیوی اور جلوی دیوی خود فوج کی کمان کرتی تھیں۔ افسوس ہے تاریخ نے ان کے کارناموں کو محفوظ نہیں رکھا ورنہ ان کے حالات سے معلوم ہوسکتا تھا کہ دکن میں کیسی کیسی نامور عورتیں گزری ہیں۔" (صفحہ ۱۱)

دکن کی چاند بی بی المعروف چاند سلطانہ سے تاریخ کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے لوگ واقف ہیں۔ فوق نے بھی چاند بی بی کا تذکرہ ذرا تفصیل سے کیا ہے۔ چاند سلطانہ نے جس طرح اپنے علاقہ پر حملہ آور فوجوں اور محلاتی سازشوں کا مقابلہ کیا، اس کی نظیر حکمران عورتوں کی تاریخ میں کم کم ملتی ہے۔ آج کے جدید عہد میں کئی ملکوں کی خواتین سربراہان بھی اتنی سیاسی بصیرت کی حامل نہیں۔ چاند بی بی کے عہدِ حکومت کا زیادہ عرصہ جنگوں میں گزرا۔ وہ مختلف مہموں میں مصروف رہی۔ اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں راجوں اور نوابوں کا صرف یہی کام تھا۔ انھیں اپنے اقتدار کو محفوظ کرنے کے لیے ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ آخر کار چاند بی بی اپنوں کی سازشوں کا شکار ہو کر قتل کر دی گئی۔ وہ بڑے عزم و استقلال والی خاتون تھی۔ فوق صاحب کے مطابق اگر اسے موقع ملتا تو وہ اپنے علاقے میں اصلاحات بھی کرتی۔ فوق، چاند بی بی کو دکن کی نمائندہ خاتون حکمران سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چاند بی بی عظمتِ خاندانی اور عفتِ ذاتی کے علاوہ اپنی عقل و تدبر، سخاوت و شجاعت اور قدردانی و کمال پروری کے جواہرات سے جڑاؤ پتلی تھی۔ وہ نادرۃ الزمانی کہلاتی تھی۔" (ص: ۴۹)

دکن کی دوسری جلیل القدر عورتوں کے تعارف کے لیے فوق نے اختصار کا رویہ اختیار کیا ہے۔ مگر مذکورہ خاتون کا مخصوص سیاسی کردار سامنے آگیا ہے۔ پونجی خاتون ایک مہم کے دوران اپنے سپہ سالار کو ہدایات دیتی ہے۔ اس خطاب

میں اس کی ذہانت اور خطابت کو فوق نے اس طرح اجاگر کیا ہے:

"اگر تو حافظ حقیقی کے حفظ وحمایت پر بھروسہ کر کے اور اپنے آقا کی جانثاری پر آمادہ ہو کر جان مستعار کے خیال سے درگزرے تو سمجھ لے کہ اوّل مرنا، آخر مرنا۔ پھر مرنے سے کیا ڈرنا"۔ (صفحہ: ۳۷)

ایک اور ممتاز خاتون بیگم سلطان کے بارے میں فوق لکھتے ہیں:

"بیگم سلطان ظاہری خوبصورتی کے علاوہ باطنی حسن یعنی علم وفضل اور شجاعت میں امتیاز رکھتی تھی۔ انشاپردازی، لطیفہ سنجی اور حاضر جوابی میں ضرب المثل تھی"۔ (صفحہ: ٦٤)

بیگم سلطان نے چاند بی بی کے ساتھ مل کر کئی معرکوں میں دشمنوں کے منہ پھیر دیے۔ دکن کی گیارہ معزز اور ممتاز خواتین کو فوق کی مؤرخانہ جستجو نے کھوج نکالا۔ ابھی تاریخ کے پوشیدہ اور گمشدہ گوشوں میں اور کئی ایسی خواتین ہوں گی جن کا ذکر اعلیٰ روایات کو زندہ رکھنے کے لیے معاون ہو سکتا ہے۔ فوق عمر بھر اپنے شاندار ماضی کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلوں میں روشن چہروں کو سامنے لانے میں لگے رہے۔ بلاشبہ یہ ایک علمی و ادبی کام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قومی خدمت بھی ہے۔ "تذکرہ خواتین دکن" اس لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ برِ صغیر کی مسلم تاریخ میں عورتوں نے بھی قابلِ ذکر ابواب کا اضافہ کیا ہے۔

"خواتین کشمیر"

علی محمد تاجر کتب حبہ کدل سرینگر نے پہلی بار ۱۹۴۰ء میں شائع کی۔ "خواتین کشمیر" ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

"خواتین کشمیر" میں ان عورتوں کے چھوٹے بڑے سوانحی خاکے تحریر کیے گئے ہیں جن کی یاد کسی نہ کسی حوالے سے زندہ رہنی چاہیے۔ ان خواتین کی تعداد ۲۵ ہے۔ فوق نے ایک کتاب "مشاہیر کشمیر" ۱۹۳۰ء میں لکھی تھی جس میں کشمیر کے کچھ مشہور لوگوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انھیں "خواتین کشمیر" لکھنے کا خیال آیا۔ گویا فوق "تاریخ کشمیر" کو ہر لحاظ سے مکمّل انداز میں لکھنا چاہتے تھے۔

"خواتین کشمیر" میں مُسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ ہندو عورتوں کے حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں تاکہ یہ کتاب کسی طرح بھی نامکمّل نہ رہے۔ فوق نے اس کتاب میں صرف سرکار دربار سے متعلق عورتوں کا ہی ذکر نہیں کیا، زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کام کرنے والی عورتوں کے حالات بھی لکھے ہیں۔ اس میں امیر غریب کا فرق بھی روا نہیں رکھا گیا۔ اعلیٰ اوصاف کی مالک عورتوں کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل میں فوق عورتوں میں اعلیٰ صفات دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ کتاب کے سب ٹائیٹل پر وہ لکھتے ہیں:

"خواتین کشمیر" میں کشمیر کی مردانہ صفت، پابند مذہب، عالمہ و فاضلہ، دانا و گیانی، عارفہ و عابدہ، صاحب السیف والقلم، شجاع و دلیر، نیک و پاکیزہ اوصاف مُسلم اور ہندو عورتوں کے حالات مختلف تذکروں اور تاریخوں کی چھان بین کے بعد درج کیے گئے ہیں۔ جب ہم زندہ تھے تب مرد ہی کیا، سب ماؤں، بہنوں بیٹیوں میں علم بھی تھا، مذہب بھی تھا، جرأت بھی تھی۔"

کتاب میں مندرجہ ذیل خواتین کا تذکرہ ہے:

۱۔ رانی جیشو متی۔ ۲۔ رانی سبھتا۔
۳۔ رانی واگ پشتا۔ ۴۔ سوگندا رانی۔
۵۔ دیدا رانی۔ ۶۔ کوتہ رانی۔

۷۔ لچھمہ خاتون ۔ ۸۔ حُور بانو ۔

۹۔ سدرہ ماجی ۔ ۱۰۔ دُھت بی بی ۔

۱۱۔ مریم بانو ۔ ۱۲۔ حافظہ خدیجہ بیگم ۔

۱۳۔ صالحہ ماجی بیگم ۔ ۱۴۔ ملکہ حبہ خاتون ۔

۱۵۔ والدہ قاضی موسیٰ شہید۔ ۱۶۔ روپہ بھوانی ۔

۱۷۔ حافظہ مریم بیگم ۔ ۱۸۔ رانی جموال ۔

۱۹۔ رانی جمپال ۔ ۲۰۔ آفندی بائی جی ۔

۲۱۔ فاطمہ بیگم ۔ ۲۲۔ عطر جان بیگم ۔

۲۳۔ للہ عارفہ ۔ ۲۴۔ عزیز النسا بیگم ۔

۲۵۔ عزیز بیگم ۔

خواتین کی سوانح عمریوں میں ماں کے کردار و استقلال کو فوق نے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جب کشمیر کے ایک بادشاہ یعقوب شاہ نے کسی دینی مسئلے پر اختلاف کے بعد قاضی موسیٰ کو دربار ہی میں قتل کرا دیا اور اس کی لاش ہاتھی کی دُم سے بندھوا کر گھر بھجوا دی تو ان کی بوڑھی ماں کے ردِ عمل کو فوق نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

"نہ وہ روئی نہ چلائی نہ اس نے بین کیے نہ بال نوچے نہ نالہ و زاری سے کام لیا ۔ اس نے اپنے حق پرست بہادر فرزند کی لاش کو اپنے سر کے کپڑے سے ڈھانپ دیا اور کہا موت کا وقت آگے پیچھے نہیں ہو سکتا ۔ اگر بادشاہ اس کو شہید نہ کرتا ، جب بھی اسی وقت اس نے مرنا تھا ۔ فرق یہ ہوتا کہ کسی کے مارے نہ مرتا ۔ اپنی موت مرتا ۔" (صفحہ : ۹۰)

خطۂ کشمیر کی تاریخ میں یہ واقعہ پڑھ کر تاریخ اسلام کے ایک زندہ جاوید

کردار حضرت عبداللہ بن زبیر اور ان کی عظیم والدہ کی طرف توجہ چلی جاتی ہے۔ تاریخ ہر لحاظ سے اپنے تسلسل کو قائم رکھے ہُوئے ہے۔

کتاب کے آخر میں عزیز بیگم کا ذکر ہے جن کے بارے اگرچہ وضاحت نہیں کی گئی۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلا کہ وہ فوق کی بیگم تھیں۔ فوق کی یہ تحریر عزیز بیگم کے خلوص اور وفاداری کے لیے ایک خراج تحسین کا درجہ رکھتی ہے۔ اس غیر معروف عورت نے اٹھارہ سال کی عُمر میں کئی بچوں کے باپ، چھتیس سالہ مرد سے شادی ہونے کے بعد اپنی طبعی شرافت اور اعلیٰ ظرفی کی بدولت گھر کے پُر ملال منظر کو جنّت نظیر بنا دیا۔ اس نے دُنیا والوں کو بتا دیا کہ سوتیلے بچّے اپنے بچّے ہو سکتے ہیں۔ عزیز بیگم کے پُورے تذکرے میں کہیں اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ فوق صاحب کی دوسری بیوی تھی۔ فوق نے عزیز بیگم کے شوہر کا نام ابوظفر بتایا ہے۔ اس کے علاوہ ڈار خاندان کا ذکر بھی کیا ہے۔ فوق اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ظفر الحق اور ظفر احمد ان کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی بیٹیوں کا نام بھی ظفر سے شروع ہوتا ہے۔ اب تک ان کے خاندان میں ہر پیدا ہونے والے بچّے کے نام کے ساتھ ظفر کا لاحقہ ضرور ہوتا ہے۔ ان کے ایک پوتے ظفر عزیز نے اس بات کی تصدیق میرے سامنے کی ہے۔ اس طرح یہ ڈار خاندان اب ظفر خاندان بھی کہلا سکتا ہے۔ جہاں تک عزیز بیگم کا تعلق ہے تو فوق کی صاحبزادی ظفر سلیمہ نے ایک ملاقات میں راقم کو بتایا کہ عزیز بیگم ان کی والدہ تھی۔ ایک قابلِ تقلید ماں۔ فوق صاحب عزیز بیگم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس کا اکلوتا لختِ جگر گیارہ سال کی عمر میں چند روز بیمار رہ کر مر گیا۔ یہ صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ لیکن اس نے صبر شکر سے کام لیا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہا تو یہ کہا۔ خدا کی امانت تھی۔ اس نے واپس لے لی۔ اب جو موجود ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھّے۔" (صفحہ : ۱۴۲)

"خواتین کشمیر" میں حبہ خاتون کے حالات کے علاوہ اس کے ذوق وشوق اور علوم وفنون سے اس کی دلچسپیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فوق کے مطابق وہ ایک یگانۂ روزگار ہستی تھی۔ خوبصورت تھی۔ دل بھی خوبصورت رکھتی تھی۔ اسے ملکۂ شعرائے کشمیر کہا جاتا ہے۔ فنِ موسیقی میں بھی کمال رکھتی تھی۔ سخن ور اور سخن شناس تھی۔ خوش آواز بھی تھی۔ انہی اوصاف کی بنیاد پر یہ دہقان زادی ملکۂ کشمیر بنی۔ فوق لکھتے ہیں۔

"حبہ خاتون کی زندگی کے تین دَور ہیں۔ تینوں کا رنگ اور خصوصیات جُدا جُدا ہیں۔ اوائل عمر یا دہقانی زندگی کے اشعار میں متابعتِ شوہر اور سادہ دیہاتی جذبات کی بہتات ہے۔ دوسری زندگی کے اشعار میں جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ خیالات کی بلند پروازی اور استعارات کی افراط ہے۔ تیسرے اور آخری دَور میں بے ثباتیٔ دُنیا، تصوف اور وحدانیت کے باریک نکات سادگی سے ادا کیے گئے ہیں۔ زبان خالص کشمیری اور بامحاورہ ہے۔ کلام میں درد اور سوز ہے۔" (صفحہ: ۸۹)

لیکن فوق نے نمونۂ کلام کے طور پر حبہ خاتون کے اشعار درج نہیں کیے۔ ہم یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

"محبت نے مجھے دھکتے ہُوئے تنور میں ڈال دیا ہے تاکہ مَیں جل کر راکھ ہو جاؤں"۔ اسی نظم میں آگے چل کر یہ شعر بھی موجود ہے۔

"محبت ہی نے مجھے برف کی طرح پگھلا دیا ہے تاکہ مَیں طوفان میں بہہ جاؤں"۔

ایک اور نظم کے کچھ اشعار اس طرح ہیں۔

"آ، مَیں تیرے لیے مرغزار کو گلشن بنا دوں
آ، میرے دِل کے مالک آ
ہم یاسمن کے پھُول اکٹھے کریں
مَیں تیری منتظر بیٹھی ہُوں۔

تیری تمنا میں زندہ ہوں" [۹۹]

یہ اشعار لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اپنے ایک مضمون "ملکہ حبہ خاتون کا وجود عنقا کے برابر" میں لکھا ہے کہ سلاطین چک کے عہد میں اس نام کی کسی خاتون کا وجود نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی دوسرے مؤرخین کشمیر کے ساتھ فوق پر بھی تنقید کی ہے۔ خاص طور پر فوق کی تحریروں کے حوالے سے بہت سخت باتیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

بعض جدید مؤرخوں نے تحقیق کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں۔ ان میں مولانا محمد الدین فوق پیش پیش ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "خواتین کشمیر" میں حبہ خاتون کے نام ۱۵ صفحے نذر کیے ہیں اور کئی من گھڑت اور بے بنیاد باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان کے بیان سے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ حبہ خاتون کے ہم عصر تھے۔ اور انھیں ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا شرف حاصل رہا ہو۔" [۱۰۰]

ڈاکٹر صاحب کے اس اختلافی نوٹ میں فوق کی تحسین کا پہلو بھی چھپا ہوا ہے کہ وہ سوانح لکھتے ہوئے اپنے موضوع اور ممدوح کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ حبہ خاتون کے بارے میں جو کچھ فوق نے لکھا ہے، اس کی بنیاد کشمیر کی معروف تاریخیں ہیں۔ اور وہ شاعری اور راگ راگنیاں ہیں جو حبہ خاتون کے نام سے منسوب ہیں۔ اپنے مضمون کے آخر میں خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

"راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ حبہ خاتون کا مسئلہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ کون سی حبہ خاتون تھیں جن کے اشعار لوگوں کے نوک زبان پر ہیں۔ اس کا جواب اتنا ہے کہ وہ کوئی اور حبہ خاتون ہوں گی۔ اس کا تعلق کسی اور دور کے عاشق کے ساتھ رہا ہوگا جس کے فراق میں وہ تڑپتی ہوگی۔" [۱۰۱]

"اہلیا بائی"

۵۲ صفحات کی یہ کتاب اتحاد پریس مل روڈ لاہور کے تحت پہلی بار ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ شعر درج ہے۔ جس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

سخاوت حکمرانی پارسائی عدل آرائی
یہ سب نازاں ہیں تیرے نام پر اے اہلیا بائی

اس کتاب میں نامور مرہٹہ خاتون کی معاشرتی، زاہدانہ اور سیاسی زندگی اس کی مدبرانہ، رعایا نوازاور رواداری انہ ستائیس سالہ حکومت کا تذکرہ ہے۔ اہلیا بائی کچھ ایسی خوبصورت نہ تھی لیکن بقول فوق "سیرت اور قابلیت ایسی پائی تھی کہ تمام رانیاں اور حکمران خاندان کے ممبر اس کے اخلاق اور اس کی عادات کے گرویدہ تھے۔" وہ مہاجی سیندھیا کے خاندان سے تھی۔ اس کا بچپن شاہی محلات میں گزرا۔ وہ گھڑ سواری، سپاہیانہ طور طریق کے علاوہ مرہٹی اور ہندی علم میں طاق تھی۔ اور فوق کے مطابق یہ سب کچھ اس نے پردہ میں رہ کر حاصل کیا۔ سولہ برس میں اس کی شادی ہوئی اور انتیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔ انتالیس برس کی عمر میں اس کا سسر بھی فوت ہو گیا۔ ۱۷۶۸ء میں اپنے بیٹے ملہار راؤ کو تخت کا وارث قرار دے کر ایک وسیع ملک کی راج ماتا بن گئی، مگر وہ باوجود کوشش کے بدنہاد بیٹے کو راہِ راست پر نہ لا سکی۔ ملک میں ظلم و ستم کا بازار گرم کرنے کے بعد وہ پاگل ہو گیا۔ حکماء نے اس ذہنی مریض کو پاگل قرار دے دیا۔ شفیق ماں نے بیٹے کا بہت علاج کرایا مگر وہ بیس برس کی عمر میں مر گیا۔ اس کے بعد اہلیا بائی نے خود تخت پر قدم رکھا اور ستائیس سال تک کامیاب حکومت کی۔

فوق نے ۵۲ صفحات کی مختصر کتاب میں بتیس عنوانات قائم کر کے بائی جی کی زندگی کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ''اہلیا بائی کا محکمۂ دھرم ارتھ'' کے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ اہلیا بائی کثرت سے خیرات کرتی تھی۔ اس نے رعایا کی فلاح وبہبود کے لیے بڑا کام کیا۔ قلعے تعمیر کرائے۔ مسافروں کے لیے مکان بنوائے۔ جانور اور چرند پرند بھی اس کی رحم دلی سے آرام پاتے تھے۔

''اہلیا بائی کا سیاسی تدبر'' کے باب میں فوق نے مہاراجہ ملہار راؤ کے دیوان تانیاجوگ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

''میں نے ملکی پالیسی میں اہلیا بائی کے دستور العمل کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ ساری برکت اس دیوی کے نام کی ہے جس کو لوگ اوتار سمجھ رہے ہیں''۔ (صفحہ: ۳۴)

فوق نے ''اہلیا بائی کی خوشامد اور غیبت سے نفرت'' کا عنوان قائم کر کے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

''ذکر ہے کہ ایک برہمن بائی صاحبہ کی تعریف میں ایک طویل قصیدہ لکھ کر لایا۔ اس قصیدے میں بائی صاحبہ کو سکندر و فریدوں، بکرماجیت، راجہ بھوج، محمود اور اکبر سے بھی زیادہ بااقبال ظاہر کیا گیا تھا۔ بائی صاحبہ نے بڑے غور سے سُننے کے بعد فرمایا۔ میں تو ایک کمزور، ناتواں اور ناقص العقل عورت ہوں جس عورت کی اتنی بڑی تعریف میں تم نے اتنا مغز مارا ہے، وہ کوئی اور عورت ہوگی۔ مجھ جیسی عاجز عورت اس تعریف کی کس طرح مستحق ہوسکتی ہے۔ مجھے قادر مطلق نے جس ملک کا بادشاہ بنایا ہے، اس کی حفاظت اور خدمت میرے فرائض میں سے ہے۔ اگر میں عدل و انصاف کے ساتھ یہ فرض ادا کرسکوں تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ کسی پر احسان نہیں۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ اس خوشامدی برہمن سے قصیدہ لے کر دریائے نربدا میں پھینک دیا جائے۔'' (صفحہ: ۳۹)

"اہلیا بائی کا مسلمان رعایا سے حسن سلوک" کے تحت ایک غیر متعصب ادیب کی حیثیت سے فوق نے لکھا ہے کہ اہلیا بائی کٹر ہندو عورت ہوتے ہوئے چھوت چھات کی قائل نہ تھی۔ حکمران کے طور پر اس کا مذہب عدل و انصاف تھا۔ وہ مسلمانوں کے تہواروں میں شرکت کرتی تھی اور ان کے لیے دعوتوں کا اہتمام بھی کرتی تھی۔

سوانح نگاری کے لیے اہلیا بائی جیسی عورتیں فوق کے نظریۂ فن کے عین مطابق تھیں۔ وہ حکمرانوں میں سے ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو تعصب سے بالاتر ہوں فوق نے ایک کتاب "تاریخ کا روشن پہلو" بھی اسی مقصد کو اجاگر کرنے کے لیے لکھی تھی۔ اہلیا بائی کے بارے میں فوق کی یہ چھوٹی سی کتاب ایک نمائندہ کتاب ہے۔ اس ممتاز باعظمت عادل خاتون حکمران کے سب لوگ مداح تھے۔ کسی قوم کے کسی شخص نے اہلیا بائی کی برائی نہیں کی۔ فوق نے تاریخ سے بیشتر ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن پر تمام قوموں کے افراد فخر کر سکتے ہیں۔ یہ فوق کی وسعت نظر تھی۔ جس نے ان کے قلم کو بھی تاثیر بخش دی۔

کتاب کے آخر میں اہلیا بائی کے کچھ اقوال درج کیے گئے ہیں۔

۱۔ جو آیا، آخر اس کو ایک دن جانا ہے۔ پھر ایسے کام کیوں نہ کیے جائیں کہ جس نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا ہے، اس سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

۲۔ جن کو نرگ (جہنم) کی آگ سے ذرا بھی خوف ہو، وہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتے۔

بائی صاحبہ کی زندگی اس کے اقوال کا آئینہ تھی۔

"متفرق سوانح عمریاں"

سوانح عمریوں کے لیے شخصیات کے انتخاب میں فوق کے ہاں ایک رنگارنگی پائی جاتی ہے ۔اس سے پہلے ان کی سوانح عمریوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے مگر ان میں بھی بظاہر ایک مشترک نوعیت کے باوجود تنوع نظر آتا ہے ۔ البتہ متفرق سوانح عمریوں میں فوق کا تعلق خاطر مختلف شخصیات کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

متفرق سوانح عمریوں میں شامل تین سوانح عمریاں دربار اکبری سے منسلک صاحبان دماغ کی ہیں۔ ملا دو پیازہ اور راجہ بیر برا پنی خداداد ذہانت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی بدولت دربار میں دل لگی اور خوش طبعی کا ماحول پیدا کرنے میں ید طولی رکھتے تھے ۔ راجہ ٹوڈرمل انتظامی معاملات کے علاوہ حساب کتاب کے سلسلے میں کمال کی صلاحیت کا مالک تھا ۔ یہ تینوں سوانح عمریاں اکبر اعظم سے فوق کی عقیدتوں کی بھی مظہر ہیں ۔ فوق اکبر کی اعلیٰ ظرفی، مردم شناسی اور فطری صلاحیتوں کا بہت قائل تھا ۔ دربار اس زمانے میں ایک مرکز تھا اور مختلف لوگ وہاں جمع ہو جاتے تھے ۔ نواب دبیر الدولہ بھی دربار سے متعلق تھے ۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے مصلح جنگ اور وزیر اعظم تھے ۔ مگر ان کی ایک حیثیت یہ بھی تھی کہ وہ سرسید کے نانا تھے ۔ ان چاروں کے بارے میں سوانح عمریوں کو ایک ساتھ دیکھا جا سکتا ہے ۔ مگر ایک اشتراک خصوصیت کے باوجود وہ مختلف شعبوں کے آدمی نظر آتے ہیں۔ اس فہرست میں شامل افراد مختلف میدانوں میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے

فوق کے لیے باعث کشش ہوئے۔ مختلف ہونے کے باوجود فوق کے مخصوص اسلوب کے زیر اثر ان سب میں ایک رابطہ سا محسوس ہوتا ہے۔ یکتائی مختلف شعبوں میں بھی آدمیوں کے اندر یک رنگی پیدا کر دیتی ہے۔

"تاریخ فرشتہ" کا مصنف اپنی مؤرخانہ عظمتوں کی وجہ سے مؤرخ کشمیر و لاہور محمد الدین فوق کی توجہ کا مرکز بنا۔ "مشاہیر کشمیر" کا تذکرہ کشمیر کے ساتھ فوق کی وابستگیوں کا مظہر ہے۔ "فاتح ملتان" کے نام سے ایک انگریز کی سوانح عمری بھی تحریر کی گئی ہے۔ ہربرٹ بینجمن ایک بہادر سپاہی تھا اور ایک سچا عیسائی بھی تھا۔ اس کی انہی خصوصیات نے فوق کو اس کی سوانح عمری لکھنے کی طرف مائل کیا۔

فوق ایک سچے مسلمان تھے مگر علمی و ادبی حوالے سے قطعاً غیر متعصب انسان تھے۔ جس بھی مذہب اور شعبے سے متعلق شخصیت نے انھیں متاثر کیا۔ انھوں نے اس کے بارے میں لکھنے سے کبھی ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی۔ وہ ایک غیر جانبدار اہل قلم تھے۔ بالعموم ان کی نظر اس آدمی پر پڑی۔ جس نے کسی حد تک انوکھے انداز میں اپنی حیثیتوں کو منوایا۔ کسی انسان کے بارے میں ایک بات بھی ایسی بیان کر دی جائے جو نئی ہو اور سچی ہو، پڑھنے والوں کے لیے فکر انگیز اور ولولہ انگیز ہو تو یہ سوانح نگار کی کامیابی تصور کی جانی چاہیے۔ فوق ایک ایسے معاشرے میں ادبی اور صحافیانہ خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ جس میں کئی مذاہب کے ماننے والے رہتے تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ مذہب و ملت سے متعلق اور سچے لوگوں کے بارے میں لکھا جائے۔ ان کی ترجیحات زیادہ تر کشمیریوں کے لیے مخصوص تھیں اس کے بعد مسلمانوں کا نمبر آتا ہے۔ اس کے باوجود اس وسیع المطالعہ شخص نے دوسرے اشخاص کے لیے بھی کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ایک سوانح عمری "مہاتما بدھ" کے بارے میں تحریر کی۔ برصغیر میں اور پوری دنیا میں بدھ مت کے

پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ فوق کے زمانے میں برصغیر اور پوری دنیا میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ فوق اپنے علاقے میں آزادی کی تحریک کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کی ایسی کوششوں کا تذکرہ پہلے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ سعد زاغلول پاشا کی سوانح عمری ان کے اسی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ مگر اس کے ساتھ انھوں نے "ہندوستانی وی۔سی" یعنی وکٹوریہ کراس حاصل کرنے والے فوجیوں کے حالات و واقعات لکھ کر الجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ لوگ جو برطانوی سامراج کی حفاظت کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان کی بہادری قابلِ ستائش ہے۔ مگر فوق نے اپنی کتاب میں اپنے وطن کے علاوہ انگریزوں کی حکومت کی بقا کیلئے لڑنے مرنے کو ایک قابلِ قدر خدمت قرار دیا ہے۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی امنگ سے سرشار آدمی کے قلم سے اس طرح کی بات قاری کو ایک لمحے کے لیے پریشان کر دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ فوق کے ذہن میں یہ بات ہو کہ انگریزوں نے تو یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس جنگ میں ہندوستانیوں کے تعاون سے جیتنے کی صورت میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ جب کہ انگریزوں کی شکست کی صورت میں انھیں ایک طویل مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا۔ پھر یہ ملک تو ہمارا ہے۔ اس کا دفاع قومی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ وکٹوریہ کراس بہادری کا اعلیٰ ترین اعزاز و انعام ہے۔ جو اس سے پہلے صرف برطانوی فوجیوں کے لیے مخصوص تھا یہ ایک غیر قوم کی طرف سے برصغیر کے سپاہیوں کی بہادری اور پیشہ ورانہ اہلیت کا بہت بڑا اعتراف ہے۔ فوق یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ غلام ہندوستان میں رہنے والے لوگ اپنی فطرت میں جانباز اور جفاکش ہیں۔ سپاہی کسی بھی میدان میں لڑ رہا ہو۔ بہادری اور حوصلہ ہی اس کا افتخار ہے۔ کتاب میں مختلف سپاہیوں کے ولولہ انگیز واقعات کا بیان کسی حد تک اس کا جواز پیش کرتا ہے۔

"موجد اور ایجادیں" کا مسودہ مولانا عبداللہ قریشی کے پاس محفوظ ہے اور راقم نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ اگرچہ سوانح کا مخصوص موضوع نہیں، مگر اپنے ہم وطنوں میں جدید دَور کی سائنسی ترقی اور ماڈرن ٹیکنالوجی سے رغبت پیدا کرنے کے لیے فوق نے مختلف ایجادات اوران کے موجدوں کے حالات لکھنے مناسب سمجھے۔ یہ کتاب فوق کے ذہن میں مستقبل کی ایک واضح تصویر کے اُجاگر ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ لوگوں کو آنے والے دِنوں میں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں دیکھنا چاہتے تھے افسوس ہے کہ اب تک یہ قابلِ قدر اور مفید تصنیف شائع نہیں ہو سکی۔

فوق کی یہ متفرق سوانح عمریاں ان کی ہمہ گیر صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہیں۔ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنی نظر رکھتے تھے۔ اپنے لوگوں کی ترقی واصلاح کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سوانح عمری کا مطالعہ انسانوں کی ذہنی، جذباتی اور عملی تربیت اور ذوق کا سامان مہیّا کرتا ہے۔ فوق نے ہر طرح کے اہل ادب کامیاب لوگوں کو اپنے دائرۂ تحریر میں لا کھڑا کیا۔ اور جب تک وہ زندہ رہے یہ دائرہ وسیع ہوتا رہا۔

جہاں تک طرزِ تحریر کا تعلق ہے۔ تو فوق صاحب نے آغازِ تحریر و تصنیف میں جو انداز اپنایا تھا، ساری عمر اس پر کاربند رہے۔ وہ بات اس انداز میں کرتے ہیں جو فوری طور پر اور آسانی سے سمجھ میں آجاتے۔ کچھ لوگ اس اسلوب بیان کو بے مزہ اور پھیکا قرار دیتے ہیں۔ محترمہ الطاف فاطمہ نے بھی ایسا ہی اعتراض کیا ہے[۱۷] مگر لوگ انشا پردازی کے جوہر دکھانے والوں پر بھی اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے۔ ہر انداز بیان کی اپنی کچھ خوبیاں اور خرابیاں ہوتی ہیں۔ کوئی ادیب ان میں توازن پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ بہت مرتبے کی بات ہے۔ فوق

کہیں کہیں اس کوشش میں ناکام بھی ہُوئے ہیں۔ مگر انھوں نے کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ وہ ان ادیبوں میں سے نہیں جنھیں خط اُٹھانے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ وہ سرسیّد کے دبستان فکر کے آدمی تھے۔ مگر انھیں پڑھتے ہُوئے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہیں کہیں اسلوب بیان کی خشکی کا گماں ہوتا ہے۔ اختصار نویسی فوق کا مستقل وصف ہے۔ بسیار نویسی کے باوجود ان کی اختصار نویسی قائم رہی۔

"ابوالحسن مُلا دو پیازہ"

پہلی بار ۱۹۱۱ء میں ظفر برادرس لاہور کے زیر اہتمام یہ مختصر کتاب شائع ہُوئی۔ اس کی ضخامت صرف ۳۲ صفحات ہے۔

لوگ مُلّا دو پیازہ کے لطائف و ظرائف سے تو واقف ہیں مگر اس کے حالات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اس کتاب میں بھی مُلّا کے سوانحی حالات کم اور لطائف کے ضمن میں قصے کہانیاں زیادہ ہیں۔ جتنے حالات فوق صاحب کو آسانی سے میّسر آسکے، انھوں نے مرتب کر کے لکھ دیے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے مختصر حالات کا بیان بھی غنیمت ہے جب کہ دوسرے مصنّفین نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

فوق نے لکھا ہے کہ مُلا کے والدین کا تعلق طائف (عرب) سے تھا۔ والدہ اور والد دونوں اپنے قبیلے میں معزز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ مُلّا بچپن ہی میں بہت شرارتی تھا اس کی شرارتوں سے اس کے استاد مُلّا عبدالرحمٰن اتنے تنگ آئے کہ انھوں نے اسے ایک دوسرے استاد کے سپرد کر دیا۔ والدہ نے بھی اس کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی۔ تو مُلّا نے سوتیلی ماں کی بدسلوکی کے مقابلے میں

اپنی شرارتوں کا حربہ آزمایا۔ فوق کے مطابق طُہر کے حالات سے بد دل ہو کر مُلّا کے والد گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد ابوالحسن مُلّا کو بھی آوارہ گردی کا موقعہ مل گیا شہنشاہ ہمایوں کی جلاوطنی کے دوران اس کے ایک وفادار مصاحب مرزا محمد بخش مُلّا کے لطائف و ظرائف سے بہت خوش ہُوا۔ جب ہمایوں واپس ہندوستان آیا تو مُلّا بھی مرزا محمد بخش کے ہمراہ تھا۔ مُلّا نے یہاں دو پیازہ کے نام سے شہرت پائی۔ اس کی وجہ تسمیہ فوق کے بقول یہ ہے کہ اس زمانے میں دو پیازہ ایک لذیذ کھانے کا نام تھا۔ ایک دعوت میں مُلّا ابوالحسن نے اتنا کھایا کہ دُنیا و ما فیہا کو بھُول گیا۔ لوگ حیران رہ گئے۔ اس کے بعد اس کا نام مُلّا دو پیازہ پڑ گیا۔ مُلّا دو پیازہ نے ایک مکتب قائم کیا۔ اس دوران ہمایوں کے بعد اکبر تخت نشین ہُوا۔ اور مُلّا دو پیازہ کو دربار اکبری میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اس کے بعد کتاب میں دربار اکبری میں مُلّا کے لطائف و ظرائف کے واقعات بیان کیے ہیں۔ فوق نے ایرانی مولویوں کے ساتھ مُلّا کے مناظروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مناظروں میں بھی مُلّا لطیفہ گوئی سے باز نہ آتا تھا۔ دربار کے علاوہ بھی مُلّا اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے لوگوں کو محظوظ کرتا رہتا تھا۔ فوق نے لکھا ہے کہ مُلّا دو پیازہ اتنا ہر دل العزیز ہُوا کہ اکبر کے دربار میں شہنشاہ تک سے مذاق اور دل لگی کر لیتا تھا۔ چونکہ مُلّا ایک عالم دین بھی تھا، بعض مقدمات کا فیصلہ کرتے ہُوئے بھی عجیب و غریب باتیں کر دیا کرتا تھا۔ مُلّا نہ صرف ایک اچھا قیافہ شناس تھا، اور بھی کئی اوصاف کا مالک تھا۔ فوق نے مُلّا کے ایک نصیحت نامہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ مُلّا ان لوگوں میں سے تھا جو پیدائشی طور پر بے پناہ ذہانت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر حیرت انگیز کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مُلّا کی سوانح عمری لکھتے ہُوئے فوق کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ لوگ جو معاشرے میں لوگوں کے لیے خوشی اور کشادہ دلی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہت قابل عزت لوگ ہوتے ہیں۔

فوق صاحب نے سادگی بیان کے باوجود کہیں کہیں انشا پردازی کے جوہر بھی دکھاتے ہیں۔ ہمایوں کی جلاوطنی کے دوران اکبر کی پیدائش کے واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"مگر ہمایوں کے ادبار و افلاس میں بھی ایک ایسا چمکتا ہوا جوہر تھا۔ جس کی قدر و منزلت سے تو ابھی اہلِ عالم بے خبر تھے۔ مگر تقدیر دست لبستہ التماس کررہی تھی۔ کہ اے صیبت و نکبت کے زمانے میں پیدا ہونے والے بچے اپنے باپ ہمایوں کو مژدہ سُنا کہ میری یہ ریگستان کی پیدائش تیرے لیے سرسبزی و شادابی کا باعث ہوگی" (صفحہ : ـ)

مُلّا دو پیازہ کی سوانح عمری میں بھی دربار اکبری کا منظر بار بار دکھائی دیتا ہے۔ مُلّا کی لطیفہ گوئی کی زد میں آکر اکبر کبھی غصے میں نہ آیا۔ وہ ذہین اور قابل لوگوں کی قدر کرتا تھا۔ اس کا رویہ راجہ بیربر کے ساتھ بھی ایسا ہی فراخدلانہ تھا۔

"حالات نواب دبیر الدّولہ"

ہندوستان سٹیم پریس لاہور کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ سوانح عمری ۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

فوق کے مطابق اس کتاب میں نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین بہادر مصلح جنگ وزیر اعظم (ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی) کے مختصر سوانحات عمر تحریر کیے گئے ہیں۔ وہ سر سید احمد خاں کے نانا تھے۔ مختصر دیباچے میں فوق نے بتایا ہے کہ انھوں نے ۱۳ اگست ۱۹۱۱ء کو نواب صاحب کے حالات لکھنے شروع کیے تھے۔ جو ۹ ستمبر تک مکمل ہوگئے۔ ظاہر ہے اتنی

قلیل مدت میں وہ اس سے بڑی کتاب نہ لکھ سکتے تھے۔ فوق نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ امداد سر سید احمد خاں کی تصنیف "سیرت فریدیہ" سے لی ہے۔ فوق کی اس کتاب میں سر سید کے اسلوب کی چھاپ کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ یُوں بھی مجموعی طور پر فوق کے نظریہ فن اور طرزِ تحریر پر سر سید کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ "نقوش" لاہور نمبر میں درج کتابیاتِ فوق میں "سیرت فریدیہ" کا نام بھی ہے جو غلطی سے لکھا گیا ہے۔ سوانح عمری کی تیاری میں "سیرت فریدیہ" کے علاوہ مولوی سیّد احمد دہلوی کی "بزمِ آخر" خان بہادر مولوی محمّد ذکاء اللہ کی "تاریخ ہند" اور مولانا الطاف حسین حالی کی "حیاتِ جاوید" سے استفادہ کرنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

فوق نے لکھا ہے کہ نواب صاحب کے بزرگ جناب خواجہ عبدالعزیز ہمدانی اور اِن کے فرزند خواجہ محمد اشرف سامانِ تجارت لے کر کشمیر سے خزاں رسیدہ شہر دہلی میں داخل ہُوئے جہاں اسلامی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ان کی تجارت اتنی چمکی کہ انھوں نے یہاں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا۔ خواجہ فریدالدین اپنے والد کے تیسرے بیٹے تھے۔ اور صرف یہی دُنیاوی لحاظ سے کامیاب ہُوئے۔ اُنھوں نے علوم ریاضیہ میں خاص دسترس حاصل کی۔ آخر ۱۷۷۹ء میں خواجہ فریدالدّین کی شادی ایک معزز اور شریف کشمیری گھرانے کے فرد خواجہ محمد احرار کی بیٹی سے ہُوئی۔ یہ لوگ بھی کشمیر سے آکر دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ خواجہ فریدالدّین کی کشمیر سے نسبتوں نے فوق کو ان کی سوانح عمری لکھنے کی طرف مائل کیا۔ ۱۷۹۷ء میں خواجہ صاحب نے دوبارہ لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ ان کی آمد کے چند روز پہلے ہی نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے جب وہ لکھنؤ آئے تھے تو آصف الدولہ کی حکومت عین شباب پر تھی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب

نے انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار کرلی۔ وہ مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ مقرر کیے گئے تھے۔ آپ انگریزوں کی سفارت لے کر شاہ ایران زمان اللہ کے دربار میں گئے۔ "سیرت فریدیہ" کے حوالے سے فوق نے ایران میں نواب صاحب کی سفارتی سرگرمیوں کا احوال لکھا ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد دہلی میں شاہ عالم کی آنکھیں نکالنے کا واقعہ پیش آیا جو بڑا عبرتناک اور دردناک تھا۔ غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں تباہی خاندان کی بے حرمتی اور قتل و غارت کا سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ نواب صاحب بھی اس واقعے سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ فوق نے نواب صاحب کی سوانح عمری میں اس زمانے کے سیاسی حالات کا ذکر و تجزیہ بھی کیا ہے۔ روہیلوں کا ظلم و ستم، مرہٹوں کی آمد، انگریزوں کی عملداری اور مغلوں کی بے بسی کا موثر انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی اور اس کی تنگ دستی کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے خواجہ صاحب کے داماد سید محمد متقی خاں کو سارا انتظام سنبھالنے کو کہا انھوں نے اپنے خسر خواجہ فرید الدین کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا جو بادشاہ نے قبول کرلیا۔ خواجہ صاحب کو وزارت شاہی کی خوشخبری کے ساتھ نواب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب عطا کیا گیا۔ آپ نے قلعہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی بڑی اصلاحات کیں۔ مالی معاملات میں بدعنوانیوں اور عیش پرستیوں کا خاتمہ کیا۔ خواجہ صاحب کی تدبیروں سے بادشاہ کا کئی لاکھ کا قرض بہت تھوڑے عرصے میں ادا ہوگیا۔ لیکن ان اقدامات سے وہ لوگ ناراض ہوگئے جن کے ضرورت سے زائد وظیفے اور تنخواہیں کم کردی گئی تھیں۔ ان لوگوں نے بادشاہ تک جھوٹی سچی کئی باتیں پہنچائیں۔ یہاں فوق نے خوب بات لکھی ہے "اورنگزیب کے بعد مغل بادشاہوں کے کان رہ گئے تھے، آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔" (ص: ۳۱) دبیر الدولہ نے بادشاہ کی بے رخی کو بھانپ کر وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔

دبیرالدولہ نے بادشاہ اور بادشاہ بیگم سے کہنے پر اور سید محمد متقی کی سفارش پر دوبارہ وزارت قبول کر لی مگر تھوڑے ہی دنوں بعد پھر استعفےٰ دے دیا۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے وزارت کی پیشکش اپنی دانا اور دُور اندیش بیٹی عزیز النسا بیگم کے کہنے پر ٹھکرا دی۔

"راجہ ٹوڈر مل"

کتب خانہ جڑی بوٹی لوہاری دروازہ کٹڑہ مارکشاں لاہور والوں نے پہلی بار ۱۹۱۴ء میں سٹیم پریس لاہور سے شائع کرائی۔ یہ مختصر کتابچہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دربار اکبری کے ایک نہایت زیرک اور محنتی انسان کا تذکرہ ہے جو یتیمی اور غربت کے باوجود اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑے بڑے مناصب پر پہنچا۔ اسے راجہ کا خطاب عطا کیا گیا اور مسند وزارت سے نوازا گیا۔ اس نے فوق کے بقول اکبر اعظم کا تقرب حاصل کر کے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ فوق نے لکھا ہے کہ اس کا وطن چونیاں ضلع لاہور تھا۔ اور وہ ذات کا کھتری تھا۔

فوق نے تحریر کیا ہے کہ راجہ ٹوڈر مل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اُردو زبان کے لیے انتہائی بنیادی کام کیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس عمل سے برِ صغیر کو ایک بہت بڑی زبان مل جائے گی۔ جو اس خطے کی تمام قوموں کے لوگوں میں یکساں طور پر مستعمل ہوگی۔ اس زمانے میں زیادہ تر ہندو بوجوہ فارسی عربی کی طرف مائل نہ ہوتے تھے۔ اور اسی لیے سرکار دربار سے بھی دُور تھے جس طرح برطانوی راج کے دوران ایک عرصے تک مسلمان انگریزی زبان سیکھنے سے کتراتے تھے۔ راجہ ٹوڈر مل کی کوششوں سے ہندو اس طرف مائل ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ درباری امور میں اثر انداز ہونے لگے۔ اکبر اعظم کے دور میں یہ کارنامہ بڑی قدر کی

نگاہ سے دیکھا گیا اور ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا جانے لگا۔ وہ بھاشا پہلے سے جانتے تھے۔ عربی فارسی میں دسترس کے بعد ان تینوں زبانوں کے الفاظ مل کر ایک نئی زبان کی شکل وصورت اختیار کرنے لگے۔ جو بالآخر شاہجہان کے زمانے میں ریختہ اور اس کے بعد اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ اُردو کو مغل تہذیب کا ایک تحفہ بھی کہا جاتا ہے۔ غور کیا جائے تو اس سلسلے میں راجہ ٹوڈرمل کا ذکر بھی بے محل نہیں۔ فوق کے نزدیک یہ شخص اُردو زبان کا ایک محسن بھی ہے۔ یُوں یہ مختصر سوانحی کتابچہ بہت اہمیت کا حاصل بن گیا ہے۔

فوق صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کو بھی راجہ صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ فارسی عربی کی طرف ان کی رغبت سے انھیں انگریزی سیکھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اور وہ درباروں میں رسائی کے بعد انگریز سرکار تک اپنا اثر ورسوخ بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ بات آزادئ ہند کی تحریک اور اس کے بعد ان کے لیے کئی شعبوں میں کامیابیوں کی ضامن بنی۔ فوق کے مطابق اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود وہ کٹر ہندو تھا۔ اور بادشاہ کا بہت معتمد آدمی تھا۔

راجہ ٹوڈرمل نے دو رسالے بھی تصنیف کیے، ایک حساب کتاب کی فہم حاصل کرنے کے لیے ہے اور دوسرا باطنی اسرار کو سمجھنے کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ جہاں عمدہ انتظام کرنے میں مہارت کا ذکر آئے گا، وہاں ٹوڈرمل کو یاد کیا جائے گا۔ اور فوق کو اس لیے یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے اس سوانحی خاکے میں بڑی اہم باتوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اس سوانح عمری میں فوق نے راجہ صاحب کے سوانحی حالات کم درج کیے ہیں اور ان کی علمی اور انتظامی قابلیت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے راجہ ٹوڈرمل کی شخصیت بہت بلند ہو کر قاری کے سامنے آتی ہے۔

"مہاتما بُدھ"

کارپردازدن ناول ایجنسی لاہور والوں نے دوسری بار ۱۹۱۶ء میں شائع کی۔ اس کی ضخامت ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ طبع اوّل کہیں دستیاب نہیں ہوسکی۔ طبع دوم میں بھی طبع اوّل اور اس کے سال اشاعت کا ذکر نہیں ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری سے اس کتاب کا ایک نسخہ دستیاب ہُوا ہے۔

ایک بانیِ مذہب کے طور پر بدھ کی شخصیت انسانی تاریخ کی ایک نمایاں شخصیت ہے بدھ کو 'عارفِ مشرق' بھی کہتے ہیں کیونکہ اس نے بڑی بصیرت سے انسانی زندگی اور ان کے باطن میں چھپے ہُوئے اسرار کی جستجو کی ہے اور انسانوں کو ریاضت کے ذریعے 'نروان' کا رستہ دکھایا ہے۔ اس نے ذاتی طور پر دُکھ کی گہرائی میں اتر کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ عام انسانوں کو دُکھ بھری زندگی سے کیسے نجات دلا سکتا ہے۔ فوق نے نام لیے بغیر مختلف کتابوں میں بدھ کی زندگی کے بارے میں اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ البتہ انھوں نے بدھ کے بارے میں پہلی لکھی گئی کتاب کا ذکر کیا ہے جو بدھ کی وفات کے ۳۵۴ سال بعد لنکا میں نوے سال قبل از مسیح 'والاگام باہو اوّل' کے عہد میں لکھی گئی۔ (صفحہ: ۱۸)

فوق نے اپنے مختصر دیباچہ میں لفظ بدھ کے معنی گیان یا علم بتاتے ہُوئے کہا ہے کہ خود مہاتما بدھ اپنے بارے میں کہتا تھا کہ مَیں سروگ یعنی علم کُل ہُوں۔ فوق نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ

"اس کتاب میں بدھ مت کے متعلق تمام کتابوں کا خلاصہ دیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ یہ تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو۔" (صفحہ: ۱)

فوق نے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ کہ بدھ،

کی زندگی کا ایسا خاکہ پیش کیا جائے جو قابل قبول حد تک درست ہو۔ فوق نے بدھ کے بارے میں محیر العقول واقعات کی تردید کی ہے۔ صفحہ نمبر ۳ پر فوق لکھتے ہیں:

"بدھ کی پیدائش کی نسبت عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ اس نے پیدا ہو کر سات قدم اٹھائے۔ ہر ایک قدم پر ایک کنول کا پھول پیدا ہو گیا۔ اس نے کہا میں دنیا میں سب سے افضل ہوں میں دنیا کا سردار ہوں۔ اور اس کے بعد کبھی جنم نہ لوں گا۔ دیوتاؤں نے مولود بدھ کے سامنے سر جھکائے۔ دس ہزار کاشی کانپ گئے۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہوئی یہاں تک کہ تمام سمندر اس سے ڈھانپے گئے۔"

آگے چل کر بدھ کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے بھوکے جنگلی حیوانات کو خوراک دینے کے لیے اپنے جسم کو اتنی دفعہ قربان کیا کہ اس کی آنکھوں کی تعداد ستاروں سے بڑھ گئی اور اس کا خون مقدار میں سمندروں کے پانی سے زیادہ ہو گیا۔ ان باتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فوق صاحب لکھتے ہیں:

"یہ بیانات محض فضول گپیں ہیں۔" (صفحہ: ۲۰)

آگے چل کر اپنے اس خیال کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں۔

"مگر پٹاریوں سے ثابت ہے کہ بدھ ایک عام آدمی تھا۔ وہ دوسرے آدمیوں کی طرح خوراک اور لباس کا محتاج تھا۔ وہ دوسروں کی طرح بیمار ہوتا تھا۔ اور اسے دوائی کی ضرورت پڑتی تھی۔ آخر کار وہ بڈھا ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو ایک گاڑی سے مشابہت دی۔ زیادہ کھانے سے وہ بیمار ہوا تھا۔ اور انجام کار اس دنیا سے چلا گیا۔

"انبھشن کرامانا سوتر میں لکھا ہے کہ راجہ بم بی سار نے بدھ سے سوال کیا۔ تم

کون ہو۔ کیا تم دیوتا ہو یا ناگ یا برہما یا سکھ۔ بدھ نے راستی سے جواب دیا مہاراج نہ میں دیوتا ہوں نہ برہما۔ میں صرف ایک معمولی آدمی ہوں۔ اور تمھاری طرح شانتی کا متلاشی ہوں۔" (صفحہ ۲۵)

جہاں تک خدا کی ہستی کے بارے میں بدھ کے خیالات کا تعلق ہے، فوق نے اس سوال کے بارے میں بدھ کی بے نیازی اور خاموشی کا تذکرہ کر کے اپنی طرف سے فیصلہ کر دیا ہے کہ کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔ وہ اپنے قارئین کی تشفی کے لیے لکھتے ہیں۔

"جب ہم ان پیچیدہ سوالات پر غور کرتے ہیں تو ہر سوال حل کرتے وقت ہزارہا قسم کے سوالات ہمارے سامنے آ جاتے ہیں جن کا کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے۔ سوائے اس کے کہ ایک اعلیٰ ہستی کی موجودگی کو تسلیم کر لیا جائے۔" (صفحہ: ۲۷)

کتاب میں بدھ کے اقوال بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ بدھ کہتا ہے۔

"دُنیا میں اس طرح رہو جیسے کنول کا پھول ہمیشہ پانی میں رہتا ہے لیکن پانی کے ساتھ کبھی نہیں چھوتا۔" (صفحہ: ۴۸)

بدھ کی تعلیم کا خلاصہ فوق نے ان چار اصولوں کی شکل میں بیان کیا ہے۔

۱۔ زندگی تکلیف ہے۔

۲۔ خواہش تکلیف کا موجب ہے۔

۳۔ خواہش کو معدوم کرنا تکلیف کو نیست کرنا ہے۔

۴۔ خواہش کو مارنے کے آٹھ طریقے ہیں۔

سچا ایمان۔ سچا ارادہ۔ سچا قول۔ سچا کام۔ سچی زندگی۔ سچی کوشش۔ سچا خیال۔ اور سچی سمادھی (دل کی یکسوئی)۔

کتاب کے آخر میں "بدھ کی تمثیل" کے نام سے ایک دلچسپ حکایت درج

کی گئی ہے جو بُدھ کی بصیرت کی ترجمان ہے۔ فوق کے بیان کے مطابق ایک ہندو عورت اپنے بیٹے کی لاش بدھ کے پاس لے گئی اور کہا کہ اسے زندہ کردو۔ بدھ نے کہا کہ ٹھیک ہے تم کسی ایسے گھر کی ایک مٹھی بھر سرسوں لادو۔ جس گھر میں کوئی موت واقع نہ ہوئی ہو۔ اس عورت نے سارا شہر چھان مارا اور ناکام واپس آئی۔ اور جاکر مردہ بچے کو جنگل میں پھینک آئی۔ بدھ نے اس عورت سے کہا "موت کا قانون سب پر حکمران ہے۔" (صفحہ: ۵۶)

فوق نے بدھ کی سوانح کے ساتھ ساتھ بدھ مت پر بھی خوب بحث کی ہے۔ ذاکر حسین کالج دہلی کی استاد ڈاکٹر ممتاز فاخرہ نے بھی اس سوانح عمری کا تذکرہ کیا ہے[۴۱] "ہندو اور بدھ مذہب کی مشابہت" کے عنوان کے تحت فوق لکھتے ہیں۔

"بدھ مذہب کوئی نیا مذہب نہیں تھا۔ بدھ ہندوؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندوؤں ہی میں رہے۔ اور ہندوؤں میں انھوں نے اپنا مذہب پھیلایا۔ برہمن اور ہندو لوگ بھی ان کے مقلد ہیں۔ پس ان کی نسبت یہ خیال کرنا کہ انھوں نے ہندوؤں کے خلاف کوئی بات پھیلائی، غلط ہے۔ ان کا ہر خیال ہندوؤں کی پرانی کتابوں سے لیا گیا ہے۔ جو لوگ اصل بدھ مذہب یا اصلی ہندو مذہب کے مقلد ہیں۔ ان کے عقائد میں کوئی فرق نہیں۔ بدھ مذہب زمانہ کے انقلاب کی وجہ سے بگڑتا بگڑتا حالت موجودہ کو پہنچا ہے۔" (صفحہ: ۵۳)

اس سوانح عمری میں فوق نے بدھ مت کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں لگتا ہے کہ وہ ایک مسلمان مصنف کے طور پر اس مذہب کے عقائد پر خیال آرائی کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے اسلام کے ساتھ بدھ مت کا تقابلی جائزہ نہیں لیا۔ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ بدھ مت بہر حال ہندو مت کی ایک اصلاح شدہ شکل ہے۔ بدھ کے لیے فوق کے جذبات احترام میں کمی کہیں

دکھائی نہیں دی۔

"حیات فرشتہ"

گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور والوں نے پہلی بار ۱۹۱۹ء میں شائع کی۔ اس سوانح عمری کی ضخامت ۵۴ صفحات ہے۔ یہ ہندوستان کے نامور مؤرخ علامہ محمد قاسم فرشتہ کی سوانح عمری ہے۔ محمد قاسم نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ فرشتہ" میں ہندوستان کی تاریخ لکھی۔ وہ مؤرخ کے علاوہ ایک سپاہی بھی تھا۔ اور شاعری بھی کرتا تھا۔ فوق اپنی اس کتاب کی ابتدا میں لکھتے ہیں۔

"فرشتہ کے ابتدائی حالات پر بالکل سکوت کا عالم ہے۔ اور ایسا اندھیرا چھایا ہُوا ہے کہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں پیدا ہُوا، کہاں پرورش پائی۔ اور کہاں علم وفضل حاصل کیا۔ اتنا بڑا نامی مؤرخ کہ آج سے قریباً سوا تین سو برس پہلے ہندوستان اور اس کی مشہور مملکتوں کی تاریخ لکھ کر آئندہ تاریخ نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی اپنی تاریخ کا کسی کو کوئی علم نہ ہو۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ اپنی تاریخ میں اس نے کہیں کہیں اپنا ذکر کیا ہے۔ اگر وہ یہ اشارے بھی نہ کر جاتا تو اس کی ذات خاص کے متعلق کوئی شاید ایک سطر بھی نہ لکھ سکتا۔" (صفحہ: ۱)

فوق کے اس بیان کی روشنی میں یہ سوانح عمری بڑی اہمیت کی حامل ہو گئی ہے۔

"تاریخ فرشتہ" ایک ایسی لاجواب تاریخ ہے جسے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا عزت واعتبار کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس تاریخ کی تصنیف کی ابتدا فوق نے ۱۰۰۱ھ لکھی ہے۔ (صفحہ: ۱۱)

یہ تاریخ لکھنے میں محمد قاسم کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ اس نے بڑی محنت

سے یہ کتاب مکمل کی۔ یہ بڑی حد تک مستند اور معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ بعد کے مؤرخوں نے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے۔ خود فوق نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ "تاریخ فرشتہ" سے حوالے دیے ہیں۔ اس نے اس کتاب سے فیض عام حاصل کرنے کا اعتراف بھی کیا ہے "تاریخ فرشتہ" کے مصنف کے بارے میں یہ کتاب "حیات فرشتہ" لکھ کر ایک مؤرخ نے ایک دوسرے بڑے مؤرخ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ بات فوق کے اس وصف کو سامنے لاتی ہے۔ کہ وہ ہر طرح کے محسنوں کو یاد رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ایک طرح سے ہندوستان کی تاریخ کو محفوظ کرنے والے کی زندگی کو محفوظ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ فوق نے "تاریخ فرشتہ" کو فرشتہ کی بہترین یادگار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"فرشتہ نے نہ اپنے خاندان کا کہیں ذکر کیا ہے۔ نہ وطن بتایا ہے۔ اپنے سوانحات عمر سے بھی اس نے بے خبر ہی رکھا ہے مگر جب تک دنیا میں تاریخ کا علم رائج ہے، اس کی شہرت "ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" کی طرح قائم رہے گی۔" (صفحہ: ۴۴)

آگے چل کر فوق لکھتے ہیں :

"تاریخ فرشتہ" ایک ضخیم کتاب ہے۔ ایسی کتاب کا ترجمہ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت اور اس کے مستند ہونے کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت ہے کہ فارسی زبان سے اس کا ترجمہ کئی اور زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں یہ ترجمہ مطبع نولکشور نے کیا ہے۔" (صفحہ : ۴۵)۔

فوق نے بڑی جانفشانی سے فرشتہ کے جو حالات جمع کیے ہیں وہ بھی بہت کم ہیں۔ فوق نے بتایا ہے کہ اس کے والد کا نام مولانا غلام علی ہندو شاہ تھا۔ فرشتہ کی پیدائش کے ضمن میں بھی اپنے قیاس کے مطابق ۹۸۰ھ کا سال بیان کیا ہے۔ فوق کے مطابق فرشتہ نے اپنی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جب وہ سلطان محمود خلجی

کا ذکر کر رہا تھا تو اپنے استاد مُلا احمد تنوی کا نام بھی لیا ہے۔ یہ ذکر بھی اس لیے آیا ہے کہ فرشتہ کے بقول میرے استاد مُلا احمد تنوی نے ایک کتاب "تاریخ الفی" لکھی ہے۔ فرشتہ نے اس کتاب کے حوالے بھی اپنی تاریخ میں درج کیے ہیں۔ یہاں فوق نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ

"فرشتہ کے مؤرخانہ ذوق اور اس کی تاریخی دلچسپیوں کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کا باپ ایک عالم اور شاعر تھا اور اس کا استاد ایک نامی مؤرخ تھا" (صفحہ : ۳)

تاریخ نویسی سے پہلے فرشتہ کی سپاہیانہ زندگی اور اس کے زخمی ہونے کا واقعہ بھی لکھا گیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ فرشتہ کی وفاداری ایک بہانہ بن گئی اور اس نے ایک دن اس سے کہا کہ تم "روضۃ الصفا" جیسی ہندوستان کی تاریخ لکھو۔ یہ بات فرشتہ کے مذاق کے مطابق تھی۔ اس نے تاریخ نویسی کا آغاز کر دیا۔ اس تاریخ کا دوسرا نام "نورس نامہ" تحریر کیا گیا ہے۔ ایک سچے مؤرخ کے طور پر اپنی کتاب میں فوق کے الفاظ میں فرشتہ نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔

"بعض پُرانے زمانے کے مصنّف اور مؤلف جب کوئی کتاب لکھتے تو ختم ان سطور پر کرتے کہ پڑھنے والے غلطی و خطا کو عفو فرمائیں۔ لیکن فرشتہ نے اپنے معاصرین اور آئندہ آنے والوں کو بتایا ہے کہ اگر غلطی ہوگئی ہے تو پردہ پوشی سے کیا ہوگا مناسب یہ ہے کہ دُعائے خیر کی تمنّا کے ساتھ حالات و واقعات میں اصلاح کی کوشش کی جائے تاکہ نقاش جب نقش ثانی تیار کرے تو وہ نقش اوّل سے بہتر ہو۔"

(صفحہ : ۱۵)

فرشتہ نے جن تاریخوں اور کتابوں سے مدد لی ہے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ "تاریخ فیروز شاہی"، "تحفۃ المجاہدین"

"تاریخ نظام الدین احمد بخشی"، "فرہنگ میر جمال الدین حسین رنجور دکنی"، "تاریخ مُبارک شاہی"، "تاریخ الفی"، "طبقات بہادر شاہی"، "احوال مُلا سعد اللہ لاہوری"، "تاریخ فتح اللہ شیرازی"۔

یہ سب کتابیں فوق کے بقول نایاب ہیں۔ ممکن ہے بعض شاہی کُتب خانوں میں کِسی تاریخ کی کوئی جلد موجود ہو۔ (صفحہ: ۱۳)

فرشتہ صرف بادشاہوں کا مقرب و مصاحب نہ تھا۔ وہ صُوفیاء کے ساتھ بھی عقیدت رکھتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ مگر اس کی مؤرخانہ حیثیت اتنی بھرپور تھی کہ کِسی اور حیثیت کے نمایاں ہونے کی کوئی صُورت نہ تھی۔

"حیاتِ فرشتہ" مختصر ہونے کے باوجود بے حد اہم ہے۔ اس میں اختصار اور جامعیت کا ایک امتزاج نظر آتا ہے۔ فوق کا انداز مؤرخانہ ہے۔ اُنھوں نے ایک بڑے مؤرخ کے جو حالات دستیاب ہُوئے، بڑی محبت اور محنت سے مرتب کر کے کتابی صُورت میں پیش کر دیے ہیں۔ فرشتہ کی سوانح سے زیادہ اس کی مؤرخانہ حیثیتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور اسے بھرپُور خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

"سعد زاغلول پاشا"

ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام پہلی بار ۱۹۲۲ء میں شائع ہُوئی۔ یہ کتاب چھوٹے سائز میں ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ سعد زاغلول پاشا مشہور مصری محبِّ وطن تھے جنھیں رئیس الاحرار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان کی مُلکی اور قومی خدمات، مصر کی تحریکِ آزادی اور وہاں کی سیاسی صُورتحال کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سعد زاغلول کے ساتھیوں عربی پاشا، شیخ محمد عبدہٗ

اور بیگم زاغلول صفیہ خانم جیسے بے باک اور حق پرست لوگوں کے کارناموں کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں یہ جملے دیباچے کا کام دے رہے ہیں۔

"آج کل حالاتِ مصر جو صورت اختیار کر رہے ہیں، اس میں سعد زاغلول پاشا کا نام بہت نمایاں ہو رہا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام اہلِ ہند کی واقفیت کے لیے ان کے حالات اردو میں شائع کیے جائیں۔"

اس کے ساتھ مولوی سراج الدین احمد صاحب پال ایم اے امرتسری کے ایک مضمون کا خلاصہ شامل کیا گیا ہے۔ اس خلاصے کے ابتدائی جملے مسلمانانِ برصغیر کی تحریکِ آزادی کے ساتھ متعلق نظر آتے ہیں۔

"مصر کے علمبرداران حریت کا وفد مسئلہ مصر کے تصفیہ کے لیے انگلستان میں وارد ہوا تھا۔ وہ پچھلے دنوں جب وطن واپس آیا تو رئیس وفد یعنی نہضتہ مصریہ کے "قائدِ اعظم" سعد زاغلول پاشا کے خیر مقدم میں مصریوں نے جو مظاہرات کیے، وہ ایسے مؤثر و مہیب تھے کہ سرزمین فراعنہ تے باایں ہمہ پیرانہ سالی ان کی نظیر پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مادرِ وطن کا کوئی ایسا فرزند نہ تھا جس نے ان مظاہروں میں حصہ نہ لیا ہو۔ مگر یاد رہے کہ سعد زاغلول کو جو عظمت و جلال نصیب ہوا ہے، وہ پوری طرح اس کے مستحق ہیں۔ جن اقوام میں اس قسم کے رہنما پیدا ہوں، وہاں لوگوں کا حق ہے کہ ان پر فخر و ناز کریں۔"

اس مضمون کے آخری جملے بھی فکر انگیز ہیں۔

"اس وقت مشرق کو ایسے نیک دل رہنماؤں کی ضرورت ہے جو خدمت عمومیہ (پبلک سروس) کے معنی سمجھتے ہوں۔ جو حمایت حق کی راہ میں خطرات و مصائب سے ہرگز خائف نہ ہوں۔"

فوق کا یہ طریقہ ہے کہ وہ زیرِ بحث شخصیت کے ہمعصروں کے بعض واقعات

بھی اپنی کتاب میں شامل کر دیتے ہیں۔ فوق نے بہت سے عنوانات قائم کر کے زاغلول پاشا اور اس کے زمانے کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ وہ غیر ضروری باتوں سے موضوع کو بوجھل نہیں بناتے۔ جہاں تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے بھی اپنے قلم کو نہیں روکا۔ مگر ان کی اکثر سوانح عمریاں اختصار کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ فوق کی سوانح عمریوں سے زیر مطالعہ شخصیت کی زندگی کا ایک خاکہ بن جاتا ہے۔ سعد زاغلول پاشا کی سیاسی سرگرمیوں کا حال کسی پیچیدگی کے بغیر آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے۔ فوق کے مطابق پاشا ۱۸۶۰ء میں بلدہ ابیانہ میں پیدا ہوا۔ اس نے جمال الدین افغانی کے قابل فخر شاگرد شیخ محمد عبدہٗ سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی صحبتوں میں سعد کی ذہانت اور حریت فکر کو اجاگر ہونے کا موقع ملا۔ شیخ صاحب کی ساری زندگی اپنے عظیم اُستاد کی طرح اس جدوجہد میں گزری کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کا سچا جوش پیدا کیا جائے۔ اور اپنے ملک کو اغیار کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ یہ جذبہ سعد کے دل میں بھی موجزن تھا۔ تعلیم کے بعد سعد سرکاری گزٹ "الوقائع المصریہ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر اُن کے نامور اُستاد شیخ محمد عبدہٗ بھی رہ چکے تھے۔ یہاں فوق لکھتے ہیں۔

"ہر چند یہ اخبار سرکاری تھا مگر مصر کا گزٹ ہمارے ہندوستان کے سرکاری اخباروں کی طرح نہیں تھا۔ آپ نے پندرہ ماہ تک صحافت نگاری کے فرائض انجام دیے۔ استبدادیت کے خلاف زبردست مقالات تحریر کیے۔ جس سے مصر میں دھوم مچ گئی۔ اور آپ کی علمی قابلیت کا سکّہ ہر طرف بیٹھ گیا۔ میدان صحافت میں قدم رکھتے ہی زبان کی تنقید و تہذیب میں آپ نے نمایاں حصّہ لیا۔ اس میں بلاغت و سلاست پیدا کی۔ اور اپنی آزاد نگاری سے نوجوان دلوں میں ملکی خدمت کی امنگیں پیدا کر دیں۔" (صفحہ: ۴)

اس کے علاوہ "جریدۂ مصر" "البرہان" "المحروسہ" اور "التجارۃ" جیسے معروف اخبارات میں بھی آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ جب انگریزوں نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا تو عربی پاشا گرفتار ہوئے۔ شیخ محمد عبدہٗ (جو اس وقت مصر کے مفتیٔ اعظم تھے) جلاوطن ہوئے۔ زاغلول کو گرفتار کر لیا گیا مگر سزا نہ دی گئی۔ البتہ وزارتِ قضا سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان کی قابلیت کی وجہ سے کہ جس کے مخالفین بھی معترف تھے۔ ۱۸۸۴ء میں ایڈووکیٹ بنائے گئے۔ اس کے بعد کئی محکموں میں وزیر رہے۔ آخر ۱۹۱۳ء میں انھوں نے تمام سرکاری خدمات سے علیحدگی اختیار کر لی۔ عالمگیر جنگ کے دوران انھوں نے سیاستِ حاضرہ پر زبردست مضامین لکھے۔ حکومت کو مجبوراً پریس سنسر لگانا پڑا۔ اس زمانے میں انھوں نے جرمن زبان سیکھ لی حالانکہ ان کی عمر پچاس برس سے زائد تھی۔ ان کے استاد شیخ محمد عبدہٗ نے بھی جلاوطنی کے دوران فرانسیسی زبان سیکھی تھی۔ برطانیہ کے لیے جنگ کے دوران مصر نے اتحادیوں سے مکمل تعاون کیا۔ مگر انگریزوں نے وعدے کے مطابق خود مختاری دینے کے بجائے زیادہ سختیاں کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد تحریکِ آزادی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ زاغلول کئی بار گرفتار ہوا۔ کئی دفعہ اپنے ملک سے انھیں باہر جانا پڑا۔ انگریزوں کے کئی وفدوں سے مذاکرات ہوئے۔ مگر وہ اپنے مشن پر پامردی سے ڈٹے رہے۔ کتاب کا یہ حصہ بالکل وہی منظر پیش کرتا ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی اپنے حقوق کی تحریک کے وقت نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کئی مقامات پر آزادی و خود مختاری کے لیے تحریکیں چل رہی تھیں۔ فوق کی نظر اس وقت پورے عالمِ اسلام پر تھی۔ اور وہ ہر طرف جوش و ولولے اور قیادت و قربانی کی فضا دیکھ رہے تھے۔

کتاب کے آخر میں ایک نازک صورتِ حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

"مصر کے محبوب و عزیز لیڈر جن میں سعد زاغلول پاشا سب سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، نظر بند ہوگئے۔ صدہا بلکہ ہزارہا فرزندان مصر جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں حب الوطنی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ کئی قیمتی جانیں گولیوں کا شکار ہوگئیں۔ اب انگلستان سے تار آتا ہے کہ مصر کو ہم نے آزاد کر دیا ہے۔ مصر کا نام نہاد بادشاہ فواد پاشا بھی اعلان کرتا ہے کہ مصر آزاد ہے اور رابد دولت نے لقب سلطان کے طرۂ افتخار میں شاہ (کنگ) کے زریں تار کا اضافہ کر لیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آزاد مصر نہ زاغلول کو رہا کرا سکتا ہے جس کی جانفروشانہ جدوجہد نے فواد پاشا کو بادشاہ کا لقب دلایا ہے نہ آزادی کی شرائط سے کسی کو مطلع کیا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقی آزادی ہوتی تو اہل مصر ایسے ناشکرگزار نہ تھے کہ جس کے لیے انھوں نے اپنی جانیں تک قربان کیں۔ اس آزادی کے مل جانے پر مظاہرے کرتے۔ فرمانروائے مصر نے خدیو کا جامہ تبدیل کر کے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ لیکن کیا اس لقب سے اسے حقیقی آزادی حاصل ہوگئی۔ اب اس نے بڑے فخر کے ساتھ اپنی شاہی کا اعلان کیا ہے۔ مگر ہم نہیں سمجھتے کہ سلطان میں وہ کون سی بات نہیں ہے جو شاہ میں ہوگی۔ کیا لفظ شاہ میں وہ آزادی پنہاں ہے جو سلطان کے لفظ میں نہیں۔ اگر یہی بات ہے تو شاہ حجاز اور شاہ عراق کی نسبت کیا کہا جائے گا جو شاہ ہونے کے باوجود محض مجبور ہیں۔ محض لفظوں کی تبدیلی بے معنی ہے۔" (صفحہ: ۹۴، ۹۳)

اس کے بعد "زاغلول پاشا اور دیگر جلا وطنوں کی موجودہ حالات" کے عنوان سے جلا وطن اور ضعیف العمر زاغلول پاشا کے لیے کچھ انگریزوں کے اعتراف عظمت کے طور پر بیانات درج کیے گئے ہیں۔ ان کی نظر بندی کے دوران ان کا خاص خیال رکھنے کی ہدایات کا ذکر بھی ہے۔ اس کتاب میں فوق کے اختتامی کلمات یہ ہیں۔

"ہر چند یہ سب لوگ حب الوطنی کے جرم میں نظر بندی اور قید اور جلا وطنی کی سزائیں بھگت رہے ہیں مگر ان کا دل ان کا ضمیر ان کی رُوح بالکل آزاد ہے۔ اور ہمارا یقین ہے کہ مصر کو جو تھوڑی بہت آزادیاں مل رہی ہیں، وہ صرف ان فدا کاران ملت کی جانبازانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اور جب مصر حقیقی طور پر آزاد ہو گا تو آزاد مصر کی تاریخ میں سعد زاغلول پاشا کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا" (صفحہ: ۹۵)

فوق کی اس سوانح عمری میں سادگی و سلاست کے ساتھ جوش و جذبہ کی ایک لہر لفظوں میں چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ فوق خود ادب اور صحافت کے محاذ پر آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہ آزادی کے متوالوں کے لیے نیک تمنائیں رکھتے تھے۔ برصغیر اور عالم اسلام میں وہ چلنے والی تحریکوں سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ ان کی کامیابی کی اُمید بھی رکھتے تھے۔ ان کی کتابیں اس جدوجہد میں شامل ہونے کا اعلان ہیں۔

"فاتح مُلتان"

۲۴ صفحات پر مشتمل یہ مختصر ترین سوانح عمری الیکٹرک پریس لاہور سے حکیم رام کشن جنرل بک مرچنٹ کٹڑہ نار کشاں لوہاری گیٹ لاہور والوں نے پہلی بار ۱۹۲۷ء میں شائع کی۔ یہ ایک انگریز افسر کی سوانح عمری ہے۔ اس کی اہلیتوں، ریاضتوں اور کامیابیوں کا موازنہ مقامی لوگوں کی بے کار سرگرمیوں سے کرتے ہوئے فوق نے حواشی لکھے ہیں بہت فکر انگیز ہیں۔ اور دل میں تحریک پیدا کرتے ہیں۔ انگریز کا نام ہربرٹ ایڈورڈ ہے۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک جاں نثار اور بہادر سپاہی تھا۔

اس کے علاوہ ایک سچا مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے محبت کی اور اس میں مکمل استقامت کا ثبوت دیا۔ شاید اس کی یہی ادا فوق کو اچھی لگی ہو۔ سوانح عمری کے آغاز میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کے لیے کسی شخص کے بارے میں ایک کتابچہ تحریر کر کے شائع کر دیا جائے۔ فوق کے ساتھ بھی اس کا کسی طرح کا تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ کتاب کے آخر میں سر جان لارنس وائسرائے کے ساتھ اس کی قریبی دوستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس نے سر جان لارنس کی سوانح عمری لکھنے کا آغاز کیا تھا مگر موت نے اسے مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔ فوق لکھتے ہیں۔

"اس کے طرزِ تحریر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کام سر ہربرٹ ایڈورڈ نے دلی شوق اور محبت بھری محنت سے شروع کیا تھا" (صفحہ : ۲۲)

لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تحریر فوق نے کہاں دیکھی تھی۔ نہ یہ معلوم ہوتا کہ سر ہربرٹ کے حالات انھیں کہاں سے میسر آئے۔

اس کتاب میں قارئین کی دلچسپی کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ موضوع کے ساتھ مصنف کی عدم توجہی کا واضح احساس ابتدا سے آخر تک محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عام لوگ اس شخصیت سے واقف نہیں، اس لیے ایک نامعلوم تجسس ضرور ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ سر ہربرٹ ایڈورڈ کی اچھی خاصی زندگی ہندوستان میں گزری تھی۔ فوق کے مطابق اگست ۱۸۴۶ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ والیٔ جموں و کشمیر کے خلاف ایک سردار کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ایڈورڈ کو مہاراجہ کی کمک کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے میدان کارزار میں ایسی مردانگی دکھائی کہ مہاراجہ عش عش کر اٹھا۔ بہادری، نیک دلی اور محبت میں ثابت قدمی ایسی خصوصیات ایڈورڈ کی شخصیت میں موجود تھیں کہ فوق اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ جالندھر کے ڈپٹی کمشنر

کے طور پر فوق اس کی ایک تحریر کا حوالہ دیتے ہیں مگر یہ نہیں بتلاتے کہ یہ تحریر کسی روزنامچے سے لی گئی ہے، ذاتی ڈائری یا خط یا کسی رپورٹ کے حوالے سے دستیاب ہوئی ہے۔ فوق لکھتے ہیں۔

"چنانچہ وہ اپنی واقفیت اور معلومات کی نسبت (جو اسے ضلع جالندھر میں حاصل تھیں) لکھتا ہے۔

اس ضلع میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو میں نہ جانتا ہوں۔ کوئی سڑک ایسی نہیں جس پر میں نے سفر نہ کیا ہو۔ کوئی تحصیل اور پرگنہ ایسا نہیں جس کو میں نے دیکھا نہ ہو۔ کوئی ایسا معاملہ نہیں جس کو میں نے پڑتال نہ کیا ہو۔" (صفحہ: ۱۳)

مسٹر ایڈورڈ کے بارے میں مسٹر مکلی آڈ کمشنر نے مندرجہ ذیل تاثرات تحریر کیے کہ "وہ خوش خلق، رعیت پرور، ہوشیار، دیانت دار اور مستقل مزاج افسر ہے۔" (صفحہ: ۱۴)

صفحہ ۱۳ پر فوق نے ایک فٹ نوٹ تحریر کیا ہے۔ جسے اس کتاب کا محرک اور جواز کہا جا سکتا ہے۔

"کیا اب بھی اس دل و دماغ کے افسر جو رعایا کو خوشحال رکھنے اور ان کے نیک و بد حالات سے مطلع ہونے کے لیے اپنے عیش و آرام کو حرام کر کے رات دن گاؤں گاؤں پھرتے ہوں جو لوگوں کے آرام کو اپنا آرام اور ان کے رنج کو اپنا رنج سمجھتے ہوں، مل سکتے ہیں۔"

کتاب میں ملتان کی بغاوت اور ایڈورڈ کی کامیاب فوج کشی کا واقعہ دو صفحوں میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس طرح بنوں، افغانستان، پشاور اور سرحدی علاقوں میں لڑائیوں کا مختصر حال بھی لکھا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے کے سلسلے میں بھی ایڈورڈ کی فوجی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نجی زندگی،

ہندوستان سے وابستگی اور انگلستان سے محبت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ فوق نے اپنی اس کتاب کا نام "فاتح ملتان" کیوں رکھا ہے۔ ملتان کی فتح سے زیادہ کارہائے نمایاں ایڈورڈ کی زندگی میں موجود ہیں۔

"راجہ بیربر"

کیشو رام جنرل بک مرچنٹ کٹڑہ تارکشاں لوہاری گیٹ لاہور والوں نے پہلی بار ۱۹۲۸ء میں شائع کی۔ یہ سوانح عمری ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ فوق نے سرورق پر راجہ بیربر کے لیے شہنشاہ اقلیم لطافت و ظرافت والیٔ مُلکِ زندہ دِلی و خوش طبعی خداوندِ مملکتِ بذلہ سنجی و حاضر جوابی سریر آرائے سلطنتِ شوخی و دِل لگی کے القابات تحریر کیے ہیں۔ راجہ بیربر صحیح معنوں میں ان القابات کا مستحق ہے۔ اپنی انہی خداداد خوبیوں کی وجہ سے وہ اکبر اعظم کا چہیتا مصاحب بن گیا۔ فوق کے بقول وہ اکبرِ اعظم کا ہم عمر تھا۔ جن دِنوں اکبر کی پیدائش امرکوٹ میں ہوئی، اسی سال بیربر پیدا ہُوا۔ (صفحہ : ۱)

فوق نے مولانا محمد حسین آزاد کی "دربارِ اکبری" اور ملا عبدالقادر کی "تاریخ بدایونی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ذات کا برہمن جاٹ تھا۔ (صفحہ : ۲)

بچپن میں یتیم ہوگیا۔ بڑا شریر، شوخ اور گستاخ نکلا۔ بے بسی، حسرت اور بیروزگاری میں بھی اس کی خوش طبعی اور بذلہ سنجی میں کمی نہ آئی۔ اپنی اسی شہرت کی بدولت دربار اکبری تک رسائی ہُوئی۔ اور اس کی قسمت جاگ اُٹھی۔ دربار سے راجہ کا خطاب ملا اور منصب دو ہزاری عطا ہُوا۔ بادشاہ کی ضیافت طبع کے ساتھ ساتھ میدانِ جنگ میں بھی دادِ شجاعت دی۔ افغانوں کی ایک شورش فرو کرنے کے لیے ایک لڑائی میں لاپتہ ہوگیا۔ لاش تک نہ ملی۔ بادشاہ کو اس حادثے کا عمر بھر رنج رہا۔ اس سے

پیشتر اس نے کئی بار اپنی موت کی خبر اڑا دی۔ وہ اپنے آپ سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد کے حالات بیان کرتے ہوئے فوق نے اکبر بادشاہ کے تاثرات ان الفاظ میں تحریر کیے ہیں۔

"بادشاہ نے لاش کی بڑی تلاش کرائی مگر افسوس کہ نہ پائی۔ اس کے مرنے کا ایسا غم ہوا کہ کبھی کسی کے مرنے پر نہ ہوا تھا۔ بادشاہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ افسوس لاش کو گڑھے سے نکال کر نہ لا سکے تاکہ اسے آگ تو مل جاتی۔ پھر آپ ہی اپنے تئیں تسلّی دیتے تھے۔ چونکہ وہ سب سے الگ، آزاد اور پاک تھا، اس لیے صرف نیّر اعظم کی روشنی ہی اس کے پاک کرنے کو کافی ہے۔ اگرچہ ضرورت اس کی بھی نہیں"

(صفحہ : ۸)

فوق نے بیربر کا حلیہ، عادات و معمولات بھی کتاب میں درج کر دیے ہیں۔ وہ شکل، صورت کے اعتبار سے بے کشش آدمی تھا۔ مگر اپنی خوش کلامی اور برجستہ گوئی سے اپنوں بیگانوں کو گرویدہ بنا لیتا تھا۔ بیربر کے شاعرانہ مذاق کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اور اس کے کئی لطائف درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کا دو تہائی حصہ انہی باتوں پر مشتمل ہے جسے فوق نے حصہ دوم قرار دیا ہے۔ کتاب کا اصل حصہ یہی ہے۔ وہ اکبر بادشاہ کا اتنا لاڈلا ہو گیا تھا کہ دربار میں بادشاہ سے بھی بے تکلفی کر لیتا تھا اور بادشاہ نے کبھی کچھ محسوس نہ کیا تھا۔ فوق کے مطابق بیربر درد مند اور رحم دل آدمی تھا۔ اس نے اپنی ذہانت اور برمحل فقرہ بازی کے ذریعے کئی لوگوں کو عتاب شاہی سے بچا لیا۔ بادشاہ بیربر کی لاش تلاش نہ کرا سکا۔ مگر زندگی میں بیربر کئی دفعہ بادشاہ سے ناراض ہو کر چھپ گیا تو بادشاہ کو اس کی تلاش میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اس ضمن میں فوق نے چند بہت دلچسپ واقعات لکھے ہیں جن سے بیربر کی ذہانت اور عقلمندی کے علاوہ بادشاہ کی بیربر کے ساتھ دلی وابستگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

ایک واقعہ فوق نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک دفعہ بادشاہ سے ناراض ہو کر بیربر کسی گاؤں میں جا رہا۔ کچھ دنوں بعد بادشاہ کو اضطراب ہُوا تو اس کی تلاش کا حکم دیا۔ مگر کہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ ناچار بادشاہ نے یہ تجویز نکالی کہ تمام دیہات کے زمینداروں کو ایک ایک بکری دے کر کہا۔ خبردار یہ بکری نہ اس سے زیادہ موٹی ہو نہ دُبلی۔ کچھ دِنوں بعد سب کو طلب کر کے بکریوں کو دیکھا تو کوئی دُبلی نکلی کوئی موٹی۔ مگر ایک گاؤں کی بکری جیسی تھی، ویسی پائی۔ بادشاہ نے زمیندار سے پُوچھا۔ یہ کیونکر ہُوا۔ اس نے کہا۔ مَیں اس بکری کو کھلا پلا کر شیر بھی دکھا دیتا تھا۔ اس واسطے جُوں کی تُوں رہی۔ بادشاہ نے فوراً کہا جا تیرے گاؤں میں بیربر ہے۔ اسی نے تجھے یہ تدبیر بتائی ہے۔ اسے ہمارے حضور میں حاضر کرو۔ چنانچہ زمیندار نے راجہ صاحب کو حضور میں پیش کر دیا۔" (صفحہ: ۲۹)

جتنے لطائف کتاب میں تحریر کیے گئے ہیں، وہ سوانح عمری سے غیر متعلق نہیں لگتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ لطیفے نہ ہوتے تو راجہ بیربر کی یہ سوانح عمری نامکمّل ہوتی۔ اس سوانح عمری پر تبصرہ کرتے ہُوئے ڈاکٹر ممتاز فاخرہ بیربر کے لطائف کے بارے میں لکھتی ہیں: "بیربر کے کچھ لطیفے نامہذب اور فحش بھی ہوتے تھے مگر ہوتے تھے برمحل اور باموقع۔ اُنہی خوش طبعی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے واقعات سے کتاب دلچسپ ہو سکتی تھی، اس لیے فوق نے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ فوق کا اسلوب بیان بھی شگفتہ اور رواں ہے۔ یہ بھی فوق کی ایک منفرد خصوصیت بنتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی قلم اٹھانے کی ہمّت کرتے ہیں جن کے متعلق سوانحی مواد بہت کم ملتا ہے۔

"مشاہیر کشمیر"

ظفر برادرس۔ لاہور کے زیرِ اہتمام ۱۹۳۰ء میں دوسری بار شائع ہُوئی۔ یہ کتاب

۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

طبع دوم کے مختصر دیباچے میں فوق لکھتے ہیں۔

"مشاہیر کشمیر" کا دوسرا ایڈیشن مطبع میں جا رہا ہے۔ اس میں بہت سے مشاہیر نئے درج کیے گئے ہیں۔ اور سابقہ ایڈیشن میں سے کئی ایک خارج کیے گئے ہیں۔ ابھی بہت سے مشاہیر کے حالات لکھے ہوئے موجود ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جن کے حالات ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس لیے "مشاہیر کشمیر" کا جب تک ایک اور حصہ مرتب نہ کیا جائے یہ تمام حالات جو ملک اور قوم کے لیے ترقی و کامیابی کا گر بتانے اور با عزت زندگی بسر کرنے کا رستہ بتانے والے ہیں محفوظ نہیں رہ سکتے۔ "مشاہیر کشمیر" کا دوسرا حصہ بھی امید ہے ہم جلد تر شائع کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔"

ان الفاظ سے فوق کے اس عزم کا پتہ چلتا ہے کہ وہ خطہ کشمیر کے تعارف و ترقی کے لیے اپنی کوششوں کو مسلسل جاری رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ "مشاہیر کشمیر" کا دوسرا حصہ شائع کرنے کا انھیں موقع نہ ملا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ راقم الحروف کے خیال میں فوق کی کتاب "خواتین کشمیر" کو "مشاہیر کشمیر" کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہیے جس کا تذکرہ پہلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ خطہ کشمیر کے ساتھ فوق کی وابستگیوں اور خدمات کا ذکر اس مقالے میں بار بار کیا جا چکا ہے کشمیر کی تاریخی عظمت کا سراغ لگا کر وہ یہاں کے لوگوں کو از سر نو بیدار کرنا چاہتے تھے۔

"مشاہیر کشمیر" کے ذریعے بھی یہ بتانا مقصود تھا کہ کیسے کیسے لوگ اس خاک سے پیدا ہوئے، ساری دنیا جن کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئی۔

"مشاہیر کشمیر" میں کسی راجہ مہاراجہ یا سلطان اور بادشاہ کا ذکر نہیں۔ وہ لوگ جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی محنت اور استعداد کی بدولت اعلیٰ مقام پر فائز

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قوم باہر جا کر اس قدر عروج اور ترقی اور کامیابی حاصل کرتی ہے، وہ اپنے گھر یعنی کشمیر میں کیوں قابلِ رحم حالت میں پڑی ہے۔ نہ اس کے پاس دولت ہے نہ اتفاق کی خوبیوں سے وہ آگاہ ہے۔ نہ قومی اخبارات و رسائل کا اس کو شوق ہے۔

تعلیم نہ ہونے سے ہدف سب کا ہے کشمیر
جو چاہے وہ اب تیر ملامت کے چلائے" (صفحہ: ۱۱۴)

نوابانِ ڈھاکہ کے ضمن میں بھی ایسے ہی تاثرات کا اظہار رفوق نے کیا ہے۔

"یہ عالی حوصلہ لوگ کشمیر سے تجارت کے لیے نکلے۔ اور آخر تجارت ہی کے زور سے ڈھاکہ بلکہ مشرقی بنگال کے بے تاج بادشاہ کہلائے۔ آج کتنے کشمیری ہیں جو ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے سامنے اس خاندان کے عروج و اقبال کی زندہ مثال دیکھ رہے ہیں۔" (صفحہ: ۱۵۱)

"مشاہیر کشمیر" میں جن شخصیات کے حالات اور کارہائے نمایاں تحریر کیے گئے ہیں، ان کی تعداد چالیس ہے۔

۱۔ مفتی صدر الدین خان صدر الصدور۔ ۲۔ آنریبل جسٹس شمبھو ناتھ پنڈت۔
۳۔ مرزا سعد الدین سعد۔ ۴۔ پنڈت شیام نرائن ریکنا۔
۵۔ دولت مآب خواجہ ثناء اللہ شاہ شال۔ ۶۔ پنڈت سبھے رام توسل۔
۷۔ فاضلِ اجل مولانا حافظ ولی اللہ۔ ۸۔ رائے بہادر پنڈت شیو نرائن سمیم۔
۹۔ کپتان عبدالرحمٰن بے شہید۔ ۱۰۔ پنڈت برج موہن و تاتریہ کیفی۔
۱۱۔ حکیم غلام حسین خاں نائب الحکومت۔ ۱۲۔ راؤ بہادر پنڈت سکھدیو پرشاد سی۔آئی۔ای۔
۱۳۔ خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث۔ ۱۴۔ پنڈت برج نرائن چکبست۔

نے بڑا حصہ لیا تھا۔ وہ زبان اُردو کی تاریخ میں ایک پُر لطف اور یادگار سرگزشت ہے۔ مرزا محمد شفیع شیرازی لکھنوی نے اپنی بے نظیر کتاب "چکبست و شرر" میں یہ مباحث نہایت خوبی سے بیان کر دیے ہیں۔ چکبست کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ چکبست کی شاعری زیادہ تر پولیٹیکل شاعری ہے۔ جس میں حب الوطنی اور جذباتِ قومی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔

روشن دِل ویراں ہے محبّت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اجڑے ہُوئے گھر میں!" (صفحہ: ۵۶)

مفتی صدرالدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپ کے انتقال کے لیے برسوں پہلے یہ بات زبان زد خاص و عام تھی کہ جس نے آپ سے فیض پایا وہ ضرور اعلیٰ مدارج پر پہنچا۔ آنریبل سر سید احمد خان بہادر بانیٔ دارالعلوم علی گڑھ پر تو آپ کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ آپ کاملین کے نہایت قدردان تھے۔ کسی اجلاس میں حضرت غالبؔ مرحوم نے یہ شعر بطور جواب دعویٰ پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب نے یہ شعر سُن کر ان کے قرض کا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔"
(صفحہ: ۳)

غالبؔ کے بارے میں اس واقعے کے لیے کوئی سند یا حوالہ فوق نے درج نہیں کیا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ غالبؔ۔ صہبائی اور شیفتہ سے مُفتی صاحب کو دِلی لگاؤ تھا۔

سب سے طویل مضمون فوق نے ڈاکٹر محمد اقبال کے بارے میں لکھا ہے جو ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اقبال اور فوق کے درمیان بڑا تعلقِ خاطر تھا۔ اس کا

تذکرہ فوق کی حیات والے باب میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔ فوق کا یہ مضمون
اس لیے بھی اہم ہے کہ تفہیم اقبالیات کے لیے ابتدائی تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔
علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ بھی مختلف شعبوں سے متعلق لوگوں کے بارے میں
بہت دلچسپی سے لکھا ہے جن میں آنریبل جسٹس شمبھوناتھ پنڈت۔ کپتان عبدالرحمٰن
بے شہید۔ شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ اور منشی غلام محمد خادم کے علاوہ بھی کئی
نام لیے جا سکتے ہیں۔ شیخ الحدیث صاحب علومِ دینی کے بہت بڑے عالم تھے۔ دیوبند
کے صدر مدرس بھی رہے۔ اپنے وقت کے نابغہ تھے۔

"مشاہیر کشمیر" میں شامل کثیر تعداد ان شخصیات کی ہے جو کشمیر سے ہجرت کر کے
چلے گئے تھے۔ یہی لوگ کشمیر کے لیے سرمایۂ افتخار ہوئے۔ فوق کشمیر کے لوگوں میں
زندگی بسر کرنے کا یہی قرینہ زندہ کرنا چاہتے تھے۔

محمد الدین فوق جس شخص کے بارے میں لکھتے ہیں تو اس کے حالاتِ زندگی۔
اس کی زندگی کے اہم واقعات۔ مختلف معروف لوگوں سے اس کا رابطہ۔ اس کے
مشاغل و معمولات۔ اس کے کارہائے نمایاں اور اس کی ادبی یا قومی خدمات کا
جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کا میلان شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی طرف ہوتا
ہے۔ وہ بالعموم ایسی شخصیات پر قلم اٹھاتے ہیں جن کے بارے میں منفی انداز
میں لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ لکھتے ہوئے کسی پیچیدگی کو راہ نہیں دیتے۔ صاف اور
واضح انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ شاذونادر انگریزی زبان کے
الفاظ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ جو ان کے زمانے کے ادیبوں کی عام خصوصیت
تھی۔ وہ اپنے زمانے کے معروف اسلوب میں لکھتے تھے۔ "مشاہیر کشمیر" بھی
ان کے اسی اسلوب کی نمائندہ کتاب ہے۔

"مشاہیر کشمیر" پہلی بار ۱۹۱۱ء میں اسلامیہ سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

اس میں بھی چالیس شخصیات کے بارے میں سوانحی مضامین لکھے گئے۔ ان میں سے گیارہ شخصیات کو طبع دوم میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان کے نام یہ ہیں :

مہاراجہ پرتاپ سنگھ، خان صاحب منشی فخر الدین، چودھری جان محمد گنائی، میاں کریم بخش، خواجہ غلام محی الدین، نواب حکیم مہدی علی خان، صوبیدار محمد بخش، پنڈت مادھو پرشاد، چوہدری کمال الدین، منشی نظام الدین، حافظ عبد الرحمٰن۔

اس مقالے میں اس لیے "مشاہیر کشمیر" کے طبع دوم کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اسے فوق نے نظر ثانی کر کے شائع کیا۔ اس میں شامل کئی مضامین میں ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ دوم میں شامل اقبال کے بارے میں مضمون طبع اول میں لکھے گئے مضمون سے قدرے مختلف اور خاصا مفصل ہے۔ البتہ طبع اول اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ سوانح نگاری میں بھی فوق نے کشمیر سے ابتدا کی۔

"ہندوستانی وی۔سی"

۴۶ صفحات کی یہ کتاب ظفر برادرس لاہور کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس سوانحی کتاب میں ان بہادر، جوانمرد اور جانباز فوجی سپاہیوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے جو جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء) اور جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۹ء) میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر کے وکٹوریہ کراس کے مستحق قرار پائے۔ یہ برطانیہ کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے۔ ان سپاہیوں کے نجی اور عسکری حالات کے علاوہ فوق نے دیباچہ اور دو مضامین "فوجی زندگی کی اہمیت اور اس کے فوائد" اور "وکٹوریہ کراس کا تمغا اور اس کی تاریخ و تفصیل" کے عنوان سے تحریر کیے ہیں۔ مہاراج بہادر برق دہلوی کی نظم بعنوان "مادر وطن کا پیام ہندوستانیوں کے نام" کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ نظم کی واحد خصوصیت جوش و خروش ہے جو صرف عسکری ادب کے لیے

مخصوص ہے۔

فوق کی یہ کتاب سرکار برطانیہ کے ساتھ ان کے روابط کو ظاہر کرتی ہے۔ اور انگریزوں کے لیے ان کے دل میں نرم گوشے کا پتہ دیتی ہے۔ البتہ برصغیر کے لوگوں کی بہادری کے حیرت انگیز واقعات سے دلوں میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ فوق غربت و بے روزگاری کے مسئلے کی سنگینی سے واقف تھے۔ بہت لوگوں کے پاس فوج میں بھرتی ہونے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ مگر ان میں سے اکثر نے ملازمت کے حصول کے بعد اسے صرف پیشہ نہیں سمجھا۔ بلکہ اپنی اعلیٰ عسکری خصوصیات کی بدولت جرأت اور دلیری کی دھاک بٹھادی۔ فوق دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ہندوستانی فوج کے جن نامور بہادروں کا یہ مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہر چند ان کے حالات مکمل نہیں اور ہر چند ایسے بہادروں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی حیرت انگیز اور ہیبت ناک جانبازیوں سے امن، تہذیب، انسانیت اور وعدہ خلافیوں کے سب سے بڑے دشمنوں کو ان کے تمام منصوبوں اور ارادوں سمیت پامال کرتے رہے۔ اور جنھوں نے اپنی وفاداریوں سے سرکار برطانیہ کا نام پوری دُنیا میں خاص اقتدار کے ساتھ روشن کر رکھا ہے۔"

جب کہ فطرتِ انسانی کی روشنی میں یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ کوئی سپاہی جب میدان میں اترتا ہے تو وہ اپنی ملت اور وطن کی محبت میں تو سرشار ہوتا ہی ہے، وہ اپنے لیے بھی لڑتا ہے۔ اپنے سپاہیانہ وقار اور ذاتی عزت نفس کے لیے بھی لڑتا ہے۔ اس زمانے میں غلامی ہند کا مقدر تھی۔ اور انگریز سروں پر مسلط تھے۔ ان کی دلیری اور عسکری مہارت کا فائدہ انگریزوں نے بھی اُٹھایا۔ اس کے بعد وکٹوریہ کراس انگریزوں کی اتنی بڑی مہربانی نہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ انگریزوں اور پوری دُنیا کو جس دشمن کا سامنا تھا، اس کی کامیابی کی شکل میں بڑی تباہی کا خطرہ تھا۔

جرمنوں کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ سپاہی کا کام ہی وفا ہے۔ سپہ سالار اور حکمران کوئی بھی ہو۔ وفا جان پر کھیلے بغیر کیسے ممکن ہے۔ غلام ہندوستان میں ان جانبازوں کی تعداد سولہ ہے۔ جن کی شجاعت و مہارت کا اعتراف غیر ملکی حکمرانوں نے بھی کیا۔ دیباچے میں فوق نے یہ تعداد چودہ بتائی ہے۔ جب کہ پانچ سپاہی جنگِ عظیم دوم میں وکٹوریہ کراس کے مستحق قرار دیے گئے تھے۔ ان میں سے چار مُسلمان۔ پانچ ہندو اور چھ سکھ ہیں۔ ایک انگریز کا نام بھی ہے۔ اس انگریز نے ہندوستان کے علاقے وزیرستان میں بہادری اور فرض شناسی کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ اس لیے اس کا ذکر فوق نے اس کتاب میں مناسب اور ضروری خیال کیا ہے۔ میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے سب لوگ صرف سپاہی ہوتے ہیں۔ اس میں ذات، مذہب اور ملک کی بظاہر کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ سپاہی اپنے مقابلے میں کسی قوم یا ذات یا ملک کے آدمی کو صرف اپنا دشمن خیال کرتا ہے۔ اس وقت اس کا نام دشمن ہوتا ہے۔

(جنگِ عظیم اوّل کے وی سی)

وکٹوریہ کراس حاصل کرنے والوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ جمعدار خداداد خان وی۔سی۔ ۲۔ جمعدار میر دوست محمد بہادر آئی او۔ایم۔وی سی۔
۳۔ لینس نائک لالہ وی۔سی۔ ۴۔ سپاہی چتا سنگھ وی۔سی۔
۵۔ صوبیدار دردان سنگھ سینگی وی۔سی۔ ۶۔ رائفل مین گوہر سنگھ وی۔سی۔
۷۔ جمعدار گوبند سنگھ وی۔سی۔ ۸۔ جمعدار شہامد خان وی۔سی۔
۹۔ رائفل مین کلبیر تھاپا وی۔سی۔ ۱۰۔ رائفل مین کرن بہادر رانا۔وی۔سی۔
۱۱۔ رسالدار بدلو سنگھ وی۔سی۔

جنگِ عظیم دوم کے وی۔ سی

۱۲۔ کپتان پی ایس بھگت وی۔ سی۔ ۱۳۔ صوبیدار چھپال رام وی۔ سی۔

۱۴۔ لیفٹیننٹ کرنل اے ای کمنگ ایم سی۔ وی۔ سی۔

۱۵۔ سپاہی بشیر سنگھ۔ وی۔ سی۔ ۱۶۔ نائک شمشاد خان وی۔ سی۔

ہندوستان کے جس شخص کو سب سے پہلے وکٹوریہ کراس ملا۔ وہ ایک مُسلمان جمعدار خداداد خان تھا جو ضلع جہلم کا رہنے والا تھا۔ اسے جس عسکری معرکے میں بے مثال قربانی کی بنا پر وکٹوریہ کراس دیا گیا، اس کی تفصیل فوق نے اس طرح بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جنگِ عظیم اوّل میں پلٹن نمبر ۱۲۹۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مقام ہولبیک کے نزدیک ان مورچوں پر پہنچی جس کو نمبر ۲ برٹش کیولری نے بنایا تھا۔ اس پلٹن میں نائک خداداد بھی تھا۔ جرمنوں کی سخت گولہ باری کے نتیجے میں جب دو توپوں میں سے ایک بالکل بے کار ہوگئی۔ اور دستہ کا انچارج برطانوی افسر بھی زخمی ہوگیا۔ تو خداداد زخمی ہونے کے باوجود دوسری توپ چلاتا رہا۔ اس غیر معمولی ہمّت اور حوصلے سے کئی فوجیوں کی جان بچ گئی بلکہ اس نے خاصی دیر تک دشمنوں کو روکے رکھا۔ ۳۱۔ اکتوبر کو خداداد خان کو وکٹوریہ کراس کا تمغہ دیے جانے کی پُرزور سفارش کی گئی۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور اخبار "لندن گزٹ" نے حکومت کی طرف سے یہ خبر ہندوستان پہنچائی تو برصغیر کے فوجی حلقوں اور عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی"

وکٹوریہ کراس پانے والے دوسرے سپاہیوں کے حوالے سے بھی ایسے واقعات تحریر کیے گئے ہیں جس کو پڑھنے سے مسرت اور فخر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فوق کا یہ فقرہ بہت خوبصورت اور بامعنی ہے۔

"ایسے جواں مردانہ کارنامے چونکہ کبھی کبھی ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے یہ تمغہ خاص خاص بلکہ خال خال لوگوں کو ملتا ہے۔"

فوق نے اپنے مضمون "فوجی زندگی کی اہمیت اور اس کے فوائد" میں موت سے نہ ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر ان کی یہ بات اچھا تاثر پیدا نہیں کرتی کہ:

"فوجی جوان اگر اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کی حفاظت و عزت کے لیے میدانِ جنگ میں مارا جائے تو شہید وطن ہے۔"

آگے چل کر وہ لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے اکساتے ہیں۔ اور اس کے لیے خالصتاً مادی فوائد گنوانا شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فوق کا یہ طرزِ استدلال عجب محسوس ہوتا ہے۔

"اگر خدانخواستہ ہمارے کچھ سپاہیوں یا افسروں کو دشمن گرفتار کر کے جنگی قیدی بنا لے تو ان کے خطوط اور پارسل ریڈ کراس سوسائیٹیوں کے ذریعے ان کو پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ میدانِ جنگ سے سپاہیوں کی ڈاک کا تمام خرچ حکومت برداشت کرتی ہے۔"

اس کے علاوہ فوق نے حکومت ہند کی طرف سے نمایاں خدمات انجام دینے والے فوجیوں کو جاگیریں عطا کرنے کی عنایت کا ذکر کیا ہے جس سے اس کتاب کی تھوڑی بہت ادبی حیثیت کو سخت دھچکا پہنچا ہے۔ وہ وکٹوریہ کراس پانے والوں کے حالات ان باتوں کے بغیر بھی لکھ سکتے تھے۔ اور اس کا زیادہ اچھا اثر ہوتا۔ فوق نے وکٹوریہ کراس کے تمغے کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ جس میں ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء سے کسی بھی ہندوستانی جوان یا افسر کو یہ تمغہ دیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے اس اعزاز کے مستحق صرف برطانوی فوجی ہوتے تھے۔ برطانوی قانون کے مطابق وکٹوریہ کراس

پانے والے فوجی کو نوجوان اور افسر باقاعدہ سلامی دینے کے پابند ہوتے ہیں۔ اس لیے اس تمغے کو فوق نے بقامت کہتر بقیمت بہتر کی ضرب المثل کے مصداق قرار دیا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ بھی فوق کی کچھ دوسری کتابوں میں کہیں کہیں انگریزوں کے ساتھ ان کے تعلقات اور ان کے لیے نیک جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ مگر اس کتاب میں فوق کھل کر سرکار برطانیہ کے مفادات کی حفاظت کرتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ فوق کی اکثر تحریروں سے حریت پسندانہ حالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس مقالے میں "فوق اور تحریک حریت کشمیر" کے نام سے ایک پورا باب تحریر کیا گیا ہے۔ ان کی ایک ضخیم کتاب "تاریخ حریت اسلام" کے نام سے موجود ہے "سعد زاغلول پاشا" اور "محبِ وطن خواتین ہند" میں برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کو فوق نے زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ لگتا ہے کہ زیر مطالعہ کتاب میں وہ اپنے ہم وطنوں کو وکٹوریہ کراس ملنے کی خوشی میں جذباتی ہو گئے تھے۔ اس کتاب کی اہمیت تو یہ بنتی ہے کہ ان ہندوستانی فوجیوں کی شجاعت کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں جن کے بارے میں زیادہ مواد نہیں ملتا۔ مگر انگریزوں کی تعریف و حمایت کی بات کھٹکتی ہے۔ فوق، سر سید احمد خان کی شخصیت اور ان کے نظریۂ فکر و فن سے بہت متاثر تھے۔ ممکن ہے وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر ایسا کر رہے ہوں۔ اور اس کے بعد انھیں اچھے نتائج کی امید ہو۔

"موجد اور ایجادیں" (غیر مطبوعہ)

اس غیر مطبوعہ کتاب کے دیباچے کے نیچے یکم اگست ۱۹۴۰ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ ۴۲ صفحات پر مشتمل دیباچے کے سوا کتاب کے اوراق پھٹے ہوئے

ہیں۔ اور صفحات کی ترتیب بھی ٹھیک نہیں۔ درمیان میں فوق نے کانٹ چھانٹ بھی بہت کر رکھی ہے۔ فوق کی غیر مطبوعہ کتابیں بہت صاف ستھرے خط میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کا اپنا خط بہت اچھا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے کتابت کی گئی ہو۔ مگر "موجد اور ایجادیں" کی ترتیب و تیاری سے ابھی فوق صاحب مطمئن نہیں تھے طویل دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کا لمبا چوڑا منصوبہ تھا۔ جسے مکمل کرنے کے لیے ابھی وہ کام کر رہے تھے۔ "موجد اور ایجادیں" اُردو سوانح عمری کا معروف موضوع نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فوق صاحب تاریخ و سوانح کے حوالے سے کچھ مقاصد اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ ہر طرح کی شخصیت پر لکھنا چاہتے تھے۔ ایسی شخصیات کہ جن پر پہلے نہ لکھا گیا ہو یا بہت کم لکھا گیا ہو۔ اس زمانے میں موجدوں کے بارے میں اُردو میں مواد نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس وجہ سے یہ کتاب فوق کے لیے ایک اہم کا درجہ رکھتی تھی۔ جب وہ مغربی دُنیا میں نت نئی ایجاد و اختراع کی خبریں سُنتے تھے تو ان کی ترقی و خوشحالی اور کامیابیاں ان کے دل میں طوفان برپا کر دیتی تھیں۔ انگریزوں کے ذریعے یہ چیزیں ہندوستان میں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان اور کشمیر کی حالتِ زار انھیں بے چین کر دیتی تھی۔ وہ اس صُورتِ حال پر راضی نہ تھے۔ اور ادب و صحافت کے محاذ پر لوگوں کے دلوں میں کوئی ایسا ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ بھی اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو کام میں لا کر کوئی معرکہ سر کریں۔ سرورق کے بعد دوسرے صفحے پر موٹے حروف میں یہ عبارت درج ہے۔ نیچے فوق کا نام بھی ہے۔

"یورپ اور امریکہ اور دوسرے ایسے ملکوں کے موجدوں کی دماغ سوزیاں۔ حکومتوں اور سرمایہ داروں اور عام پبلک کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائیاں، ان کی جگر کاویوں اور ایجادوں کی برکتیں اور ان کے فوائد۔ ان ایجادوں سے ذہنی،

دماغی اور اقتصادی اور سیاسی انقلاب کی بنیاد۔ اور ان کے مقابلہ میں آہ ہمارا بدنصیب ملک۔

اِک وہ کہ ان کے واسطے پر آنکھ ہیں جگہ
اِک ہم غریب ہیں کہ ٹھکانا کہیں نہیں!

"خودنوشت سوانح عمری"

"سرگزشت فوق"

فوق نے اپنی پوری زندگی علمی و ادبی کاموں میں گزاری۔ یہ مقالہ ان کی انھی خدمات کا ایک جائزہ ہے۔ انھوں نے دیگر تصانیف کے علاوہ سوانح عمریاں بھی تحریر کیں جن میں اولیاء، بادشاہ، علما، وادبا، اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے متعلق شخصیات شامل ہیں۔ جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں موجود ہے۔ عمر کے آخری حصے میں انھیں اپنی سوانح عمری لکھنے کا خیال آیا۔ جب زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھی۔ مگر یہ خواہش بہت پہلے سے ان کے دل میں تھی۔ فوق نے اپنے رسالے "کشمیری میگزین" کا ایڈیٹر نمبر شائع کیا تھا۔ اس میں ملک کے کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹروں نے اپنے خود نوشت حالات تحریر کیے۔ فوق نے بھی اپنے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ ۱۹۱۲ء میں یہ رسالہ "اخبار نویسوں کے حالات" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں "تاریخ اقوام کشمیر" میں کشمیر کے علاوہ اپنے خاندان کا بھی تعارف کرایا۔ اس دوران وہ "سرگزشت"

بھی کام کرتے رہے۔ "سرگزشت فوق" کے قلمی نسخے کے سرورق پر ۱۹۴۰ء کی تاریخ درج ہے۔ فوق کی حیات اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا سب سے بڑا ماخذ "سرگزشت فوق" ہے، اس کا خلاصہ شائع ہو چکا ہے[105] اس کا ایک حصہ مشہور کشمیری صحافی میر عبدالعزیز نے اٹھارہ قسطوں میں اپنے رسالے میں شائع کیا ہے[106] یہ تفصیل اس مقالے کے آغاز میں بیان کی جا چکی ہے۔ "سرگزشت فوق" کی اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں جگہ جگہ "سرگزشت فوق" سے حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی اس کتاب کی علمی و ادبی اور تاریخی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سرگزشت میں سے مختلف موضوعات پر پیش کیے گئے اقتباسات کے مطالعے سے فوق کے اسلوب اور قومی و ملکی معاملات کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ فوق نے کھل کر اپنی زندگی کے علاوہ اپنے زمانے کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے والے فوق کی آنکھوں میں بھی ایک تاریخ محفوظ تھی۔ انھوں نے ایک بھرپور زندگی بسر کی تھی۔ اور اپنے عہد کو اپنی مختلف حیثیتوں کے حوالے سے متاثر کیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، ناول نویس، صحافی، ناشر، مصلح قوم اور ایک تحریکی آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے عہد میں بہت سرگرم رہے۔ ایک اخبار نویس ہونے کے حوالے سے وہ روزمرہ کے ملکی و قومی معاملات سے باخبر رہتے تھے۔ تقریباً تمام ہمعصر ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، دانشوروں، رہنماؤں، نوابوں، راجوں، مہاراجوں اور انگریزوں سے ان کے تعلقات تھے۔ پچھلے صفحات میں اپنے زمانے کے مشاہیر سے ان کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کا ذکر کیا گیا ہے۔ فوق فطری طور پر ایک سیاح کا مزاج بھی رکھتے تھے۔ ان کی سیاحتوں کا حال "سرگزشت" میں ہے۔ اور پہلے اس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ خاص طور سے کشمیر اور ڈھاکہ کے

سفرنامے بھی لکھے۔ "سفرنامہ ڈھاکہ" غیر مطبوعہ ہے۔ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ ان کے دل پر گزری، وہ سب کچھ ایک دیانت دار ادیب کے طور پر فوق نے بلا کم و کاست اپنی آپ بیتی میں تحریر کر دیا ہے۔ ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ ان کا عہد بھی ایک اہم زمانہ ہونے کی حیثیت سے کتابوں، تاریخوں، تحریروں میں محفوظ ہے۔ اس لیے "سرگزشت فوق" میں بیان کیے گئے حالات و واقعات اور حقیقتوں تک آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے۔ ابھی تک فوق کے زمانے کے کئی لوگ زندہ ہیں۔ "سرگزشت فوق" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ فوق نے کمال سچائی سے کتاب تحریر کی ہے۔ اور کسی آپ بیتی کے لیے سب سے بڑی خصوصیت یہی سچائی ہوتی ہے۔ ورنہ اپنے حالات بیان کرتے ہوئے لوگ دوسروں کی برائیاں یاد رکھتے ہیں اور اپنی بھول جاتے ہیں۔ اگر خود نوشت میں سچی باتیں اپنی تمام ضروری جزئیات کے ساتھ بیان کر دی جائیں تو بہر حال یہ سوانح عمری زیادہ دلچسپ اور بہتر ہوتی ہے۔ دوسرے آدمی کے بارے میں لکھتے ہوئے آدمی اس کی ذات میں چھپے ہوئے اسرار سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ آدمی خود جو کچھ اپنے بارے میں جانتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ کچھ نہ کچھ ہوتا ہے جو آدمی دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ اگر وہ یہ سب کچھ احتیاط اور وضعداری کے ساتھ ادب و فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر کر دیتا ہے۔ تو خود نوشت ایک مؤثر اور مفید کتاب ہو سکتی ہے۔ اس میں شرط صرف یہ ہے کہ لکھنے والا دیانت اور قدرت بیان کی صفات رکھتا ہو۔ اگر آپ بیتی لکھنے والا آدمی سوانح نگار بھی ہو تو اس کے لیے اور بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ سوانح نگار کے لیے خود نوشت کو سب سے بہتر اور مستند مواد تصور کیا جاتا ہے۔ خود نوشت میں بعض اوقات مصنف اپنی ذات کو منکشف کرتا ہے۔ اب تو بائیوگرافی (سوانح) اور آٹو بائیوگرافی (خود نوشت سوانح) کی سرحدیں آپس میں مل گئی

ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو خود نوشت اور تاریخ میں اور خود نوشت اور فکشن (ناول و افسانہ) میں بھی مماثلتیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ فوق نے ان تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی ان سب حیثیتوں کا الگ الگ باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ فوق نے تو اپنے دونوں شعری مجموعوں میں اپنی نظموں اور غزلوں سے پہلے پس منظر کے طور پر جو کچھ تحریر کیا ہے، اسے اگر ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا جائے تو وہ بھی ان کی ایک نامکمل خود نوشت بن جائے گی اور ان کے زمانے کی ایک بھرپور تصویر سامنے آجائے گی۔ "سرگزشت فوق" میں بھی اپنے عہد کے اہم واقعات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ یہ قومی درد رکھنے والے ایک مخلص ادیب و شاعر کی آپ بیتی ہے۔ اگرچہ اس میں انکشافِ ذات کا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا گیا۔ سیدھے سادے انداز میں اپنے ساتھ پیش آنے والے اور اپنے سامنے وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات تحریر کر دیے گئے ہیں بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فوق آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صاف ذہن کے مالک تھے۔ ان کی زندگی میں فکری پیچیدگیوں کا گزر نہ تھا۔ اس لحاظ سے "سرگزشت" میں کوئی تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں ملتی۔ جس طرح فوق نے زندگی بسر کی اور ان کے زمانے میں جو سماجی اور سیاسی صورتِ حال تھی، اسے بغیر کسی لگی لپٹی کے اور بغیر کسی خاص تبصرے کے بیان کر دیا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے زمانے کی صحیح تصویر دکھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے "سرگزشتِ فوق" ایک کامیاب خود نوشت ہے۔ امارانا تھا جانے اپنی ایک تحریر "آن آٹو بائیوگرافیز" میں لکھا ہے کہ ضروری نہیں کہ کوئی خود نوشت سوانح صرف اس لیے بڑی سمجھی جائے کہ

وہ کسی بڑے آدمی یا کسی بڑے ادیب کی تصنیف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں نہ ادیبانہ مہارت دخل رکھتی ہے نہ ہی کامیاب زندگی کسی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ بلکہ اچھائی تک ایک اضافی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی سوانح میں کردار و شخصیت پوری طرح ظہور کرتی ہے اور کسی زندہ انسان کی تصور کشی ہوتی ہے تو پیرایۂ اظہار چاہے کتابی، کھردرا اور روکھا پھیکا ہو اور الفاظ قلم پر بھاری پڑ رہے ہیں پھر وہ ایک مکمل خود نوشت ہے۔ اما رانا تھا جا کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"An Autobiography needs not necessarily be great, because the Author is a greatman or even a great writer. Literary skill avails little. Success in life is of no moment. Even virtue is irrelevant. Character, genius, personality if this is revealed, if the picture of a living man is brought before us, what matters that the canvas is coarse, the words halting, the pencil rough"

۱۰۷

"سرگزشت فوق" میں تحریک حریت کشمیر اور سیاحت کشمیر کے سلسلے میں فوق نے اپنی مصروفیات کا بہت ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر میں آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی دوسری تنظیموں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خاص طور سے "مجلس خدمت"، "مجلس احرار"، "تحریک خاکسار" کے رول کا جائزہ لیا ہے۔ اپنے اخبارات و رسائل کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ "پیسہ اخبار"، "اخبار عام"، "زمیندار"، "قوس قزح" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں بطوالت

کے ڈر سے "سرگزشت فوق" سے یہاں اقتباسات پیش کرنے سے احتراز کیا جا رہا ہے۔ یہ تمام حالات و واقعات ۱۸۹ بڑے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد فوق کے نام مشاہیر اور معاصرین کے خطوط کی نقلیں ہیں جن میں اقبال، اکبر، داغ، احسن مارہروی، خواجہ حسن نظامی، خوشی محمد ناظر کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ پچھلے ابواب میں ایسے کئی خطوط مختلف موقعوں پر شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب میں شامل خطوط کی تعداد ۲۸۶ ہے۔

فوق نے اپنے دوسرے معاصرین کے علاوہ "سرگزشت فوق" میں مشہور شاعر و ادیب عبدالمجید سالک اور کشمیری رہنما شیخ محمد عبداللہ کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں اصحاب نے بھی اپنی اپنی آپ بیتی میں فوق کے ساتھ اپنے تعلقات اور ان کی خدمات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات اس کتاب کی اہمیت کا ایک ثبوت ہے کہ فوق نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں، چھ سات رسالے جاری کیے۔ اپنے زمانے کی کئی تحریکوں میں حصہ لیا۔ اتنا زیادہ کام کیا کہ اس پر صرف حیرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی حیات اور علمی و ادبی خدمات کے لیے یہ کتاب ایک مستند معاون کا کام دیتی ہے۔ اس آپ بیتی کے بارے میں پروفیسر علم الدین سالک نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے عبداللہ قریشی کے پاس اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ سالک صاحب نے مضمون میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میرے دوست منشی محمد الدین فوق مرحوم اپنے زمانے کے ایک قابلِ قدر انسان تھے۔ انھوں نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اور شہرت کو لات مار کر اتنا کام کیا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کامیاب صحافی، نغزگو شاعر، تاریخ کے جید عالم اور اصلاحِ معاشرہ کے بہت بڑے داعی تھے۔ انھوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے

کے لیے پچاس برس کام کیا اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی ہی میں کشمیری نشۂ حریت سے سرشار ہو کر اپنے بنیادی حقوق طلب کرنے کے لیے میدان عمل میں کود پڑے۔
"سرگزشتِ فوق" ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئی۔ وہ مسودے کی صورت میں میرے دوست مولوی محمد عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے۔ اس کے سرسری مطالعہ سے چند ایسی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو کسی اور سرگزشت میں نہیں ملتیں۔ منشی صاحب بہت بڑے سیاح تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب، وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں کی سیاحت کی، بنگال پہنچے اور اپنے تأثرات سرگزشت میں درج کیے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی دنیا برطانوی ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ راجے مہاراجے ایسی ہستیاں تھیں جن کے بارے میں شیخ سعدی نے فرمایا تھا:

گہے بہ سلامے برنجند گاہے بہ دشنامے خلعت می بخشند

وہ رعایا کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے بلکہ انھیں اپنا زر خرید غلام سمجھتے تھے۔ پڑھنا پڑھانا ان کے نقطۂ نظر سے ایک فضول کوشش تھی اور یہ دردِ سر انھوں نے کبھی مول نہیں لیا۔ اخلاقی پستی حد سے گزر چکی تھی۔ انسانوں سے بیگار لی جاتی اور قسم قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ پھر سازشوں کا یہ حال تھا کہ بڑے سے بڑا عہدیدار بھی اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی عزت اور اس کا عہدہ اسی وقت تک محفوظ تھا جب تک ریاست کا سربراہ اس سے خوش رہتا۔ ان چیزوں کے علاوہ فوق صاحب کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فوق صاحب خود اس کا مرکزی کردار ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ اپنی سرگزشت لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص ان سے ملا، اس

کا تذکرہ انھوں نے اس انداز سے کیا کہ اس کی خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں اور وہ زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ ان کے بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے۔ مگر حقیقت کو ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس میں فسانے کا مزا آتا ہے۔ ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلابات ہندوستان میں آئے، کئی تحریکیں اُبھریں، جماعتیں بنیں اور بگڑیں، پُرانی قدریں مٹیں اور نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ ان سب کا ذکر اور اثر آپ کی زندگی کی ہر منزل میں نظر آتا ہے۔"[۱۸]

الغرض یہ کتاب زندگی پر انسان کے ایمان کو مضبوط کرتی ہے۔ ذاتی محنت سے ترقی اپنے زمانے کے اہم اور قابل ذکر آدمی کے طور پر اُبھرے اور اس قابل ہوئے کہ اپنی کہانی دوسروں کو سُنا سکیں۔

تذکرہ "مزار الشعرائے کشمیر"

"مزار الشعرائے کشمیر" کشمیر کے چند فارسی شعرا کا سوانحی مجموعہ ہے۔ چونکہ ان شاعروں کے حالات کے ساتھ ان کی شاعری کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اس لیے یہ کتاب سوانح کے ساتھ ساتھ تذکرہ کے ذیل میں بھی آسکتی ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ۱۹۶۶ء میں عبداللہ قریشی صاحب نے "ادبی دُنیا" کے کشمیر نمبر موسوم بہ "آئینۂ کشمیر" میں ایک مختصر سے ابتدائیہ کے ساتھ شائع کرادی۔ یہ ۲۴۹ سے ۲۸۰ تک ۳۱ بڑے صفحات پر مشتمل ہے۔ ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی۔ اس میں مندرجہ ذیل گیارہ شاعروں کا تذکرہ ہے۔

۱۔ شاہ فتح اللہ شیرازی۔

۲۔ میرزا ابوطالب کلیم۔

۳۔ میرزا محمدؐ قلی سلیم۔

۴۔ حاجی محمدؐ جان قدسی۔

۵۔ شیدا فتح پوری۔

۶۔ عنایت خان آشنا۔

۷۔ مُلا طغرائی مشہدی طغرا۔

۸۔ میرزا ابوالقاسم۔

۹۔ مرزا صائب اصفہانی۔

۱۰۔ میر الٰہی ہمدانی۔

۱۱۔ محمد طاہر غنی۔

اس تذکرے کے ابتدائیے میں عبداللہ قریشی نے وضاحت سے لکھا ہے کہ فوق کو یہ تذکرہ لکھنے کا کس طرح خیال آیا۔ قریشی صاحب کی تحریر سے اس طرف نشاندہی ہوتی ہے کہ فوق کی اس تحریر کو تذکروں میں شمار کیا جائے۔ عبداللہ قریشی لکھتے ہیں۔

"سری نگر کا سب سے بارونق علاقہ امیراکدل ہے۔ اس سے ایک میل دُور تخت سلیمان (شنکر اچاریہ) کے نیچے دروازہ ڈل کے بالکل متصل محلہ دُرگجن آباد ہے۔ یہاں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر مقبرۂ شعراء واقع ہے۔ اس مقبرہ کی بنا اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ڈالی گئی تھی۔ اس میں اُستادان خوش فکر، شعرائے قادر الکلام اور نامور سخنور و فنکار دفن ہیں۔ یہ غالباً کشمیر ہی کی خصوصیت ہے کہ یہاں شعراء کے لیے مزار الشعراء، بادشاہوں کے لیے مزار السلاطین اور قرآن مجید کے حافظوں کے لیے مزار الحفاظ وغیرہ الگ الگ احاطے وقف ہیں۔

مزار الشعراء کا یہ چھوٹا سا سنگین ٹیلہ وہ حسرت کدہ ہے جس کے ذرّے ذرّے

سے عبرت وبصیرت ظاہر ہو رہی ہے، جہاں علم وفضل اور شعر وادب کے گنجینے دفن ہیں، جہاں وہ منتخب روزگار شعراء ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں جو مغل شہنشاہوں کے علمی درباروں کی زینت تھے۔ زمانہ کی دستبرد، انقلاب روزگار، فرمانروایان کشمیر کی بے ذوقی اور اہل کشمیر کی غفلت وبے حسی نے ان کی قبریں تک مٹا دیں۔ بعض قبروں کے تعویذ منتشر حالت میں ادھر اُدھر پڑے ہیں۔ خدا جانے کس قدر شعراء بظاہر اس سنگلاخ چٹان اور بہ باطن علم وفضل کے اس ٹیلہ پر دفن تھے جو آج بے نشان ہو چکے ہیں۔ زمانہ ان کی قبروں کو مٹا سکتا ہے، اس ٹیلہ کو نابود کر سکتا ہے لیکن تاریخ ان کے ناموں کو فراموش نہیں کر سکتی۔

منشی محمّد الدین فوق مرحوم نے ۱۹۴۴ء میں مختلف تاریخوں کے مطالعہ کے بعد ایک چھوٹا سا رسالہ مرتب کیا تھا جس کا نام "مزار الشعراء" رکھا تھا۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور پہلی مرتبہ "ادبی دُنیا" کے صفحات کی زینت کیا جا رہا ہے۔ اس میں ان شعراء کے علاوہ جو یہاں دفن کیے گئے تھے، ان شعراء کے حالات بھی ہیں جو مزار الشعراء کے حالات بھی ہیں جو مزار الشعراء میں دفن نہیں لیکن ان کا ذکر اس بناء پر کیا گیا ہے کہ یہ سب ہم عصر اور ہم جلیس تھے۔ ان میں صائب اصفہان میں دفن ہے، میر الٰہی سرینگر کے مزار کلاں میں مدفون ہے، غنی کی آخری آرام گاہ سری نگر ہی میں کسی دوسری جگہ ہے۔"

مزار الشعراء میں مدفون ان شعراء کا تذکرہ فوق نے کیا ہے جو ہم عصر وہم جلیس تھے فوق نے ان کی تاریخ وفات کے اعتبار سے ترتیب قائم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کا بھی ایسا التزام نظر نہیں آتا۔ میرزا محمّد قلی سلیم کا سال وفات ۱۰۵۷ھ اور اس کے بعد حاجی محمد جان قدسی کا سال وفات ۱۰۵۶ھ ہے۔ ایک سال کا فرق ایسا نہیں مگر حاجی قدسی کو میرزا سلیم سے پہلے بھی رکھا جا سکتا تھا۔ کچھ شاعروں کا سال وفات تحریر نہیں کیا گیا۔ البتہ شیدا فتح پوری اور مُلا طغرائی مشہدی طغرا کے احوال میں ان کے عہد

کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شاعر بھی گیارہویں صدی ہجری میں کشمیر میں تھے۔ دوسرے شعراء کے ساتھ ان کے تعلقات کا تذکرہ بھی ہے۔ البتہ اس تذکرے کے پہلے شاعر فتح اللہ شیرازی کے مرض الموت کا سال ۹۹۷ھ تحریر کیا گیا ہے۔ غالباً وہ گیارہویں صدی ہجری کے آغاز سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ یہ مُغل بادشاہ اکبر کا زمانہ ہے۔ فوق نے لکھا ہے کہ وہ بھی بیمار تھے، اس سفر میں فتح شیرازی ان کے ہمراہ تھے۔ اکبر انھیں اپنے ساتھ کشمیر سے واپس لانا چاہتے تھے۔ مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ فوق کے بقول بادشاہ ابھی لاہور بھی پہنچنے نہ پایا تھا کہ شیرازی فوت ہو گئے۔ فوق نے مولانا آزاد کی "دربار اکبری" کے حوالے سے لکھا ہے کہ بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ ابوالفضل نے بھی ان کے کمالات فن کا اعتراف کیا ہے۔ (صفحہ : ۲۵۰)

دوسری بات جو تمام شاعروں کے حالات میں مشترک ہے، ان کی یا ان کے آباواجداد کی کشمیر میں آمد اور قیام کا تذکرہ ہے۔ آخری تین شاعروں کے علاوہ تمام شعراء مزار الشعراء میں مدفون ہیں۔ فوق کے بیان سے معلوم ہے کہ مزار الشعراء میں دفن ہونا ایک اہم بات تھی۔ میرزا ابوالقاسم کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:

"ابوالقاسم چونکہ اپنے زمانہ کا مشہور شاعر اور خوش گو شاعروں کا قدردان تھا، اس لیے انتقال کے بعد اس کو بھی مزار الشعراء میں جگہ ملی۔" (صفحہ : ۲۶۷)

بعد کے زمانے میں مزار الشعراء کا جو حال ہُوا، اس طرف عبداللہ قریشی نے اشارہ کیا ہے۔ فوق بھی اس ضمن میں فتح اللہ شیرازی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"کاش کشمیر کا محکمہ آثار قدیمہ مزار الشعراء کے گرد ایک جنگلہ ہی لگا دیتا اور قبروں کے جو تعویذ اور کتبے منتشر حالت میں ہیں، ان کو ان کے اصلی مقاموں پر پہنچا سکتا۔" (صفحہ: ۲۵۱)

اس تذکرے میں صائب، میر الٰہی اور غنی کاشمیری کو فوق نے شامل کر کے یہ تاثر دیا کہ ان تینوں شعراء کو بھی مزار الشعراء میں دفن کرنا چاہیے تھا۔ اور بعد میں بھی اس روایت

پر عمل کیا جاتا رہتا تو یہ مقام دُنیائے ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کرلیتا۔ اس تذکرے کے ذریعے بھی کسی حد تک فوق نے اس جگہ کی اہمیّت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

فوق نے اس تذکرے کی تیاری میں "تاریخ اعظمی"، "ماثر الکرام"، "شعر العجم"، "دربار اکبری" اور "بیاض شعری" (قلمی) سے استفادہ کیا ہے۔ ان کتابوں میں "بیاض شعری" بہت اہم ہے۔ یہ بیاض کشمیر کے ایک ممتاز شاعر شعری کشمیری کی ذاتی بیاض تھی جس میں مختلف شعراء کے اشعار جمع کیے گئے تھے۔ شعری کا اصل نام محمد حسن ہے اور اس کا زمانہ ۱۲۲۳ھ تا ۱۲۹۸ھ ہے۔ بیاض شعری کے بارے میں "کشمیری میگزین" دسمبر ۱۹۱۰ء کے حوالے سے عبداللہ قریشی اپنے مضمون "شعری کشمیری" میں لکھتے ہیں۔

"منشی محمد الدین فوق مرحوم کے کتب خانے میں "بیاض شعری" قلمی موجود ہے جو نہایت خوشخط ہے اور جس میں ایران و ہندوستان اور کشمیر کے قادر الکلام فارسی گو شاعروں کی غزلیں درج ہیں۔ بعض غزلیں نہایت نایاب ہیں۔ مثلاً دارا شکوہ۔ ہمایوں۔ شاہان بہمنی دکنی وغیرہ کی غزلیں۔ یہ بیاض نومبر ۱۹۰۸ء میں منشی خلیل سوداگر پشمینہ امرتسر نے فوق کو عنایت کی تھی۔ کاغذ اور خط سے شان کشمیریت ٹپکتی ہے۔"[۱۱]

"مزار الشعرائے کشمیر" میں شامل اکثر شاعروں کے تذکرے میں "بیاض شعری" میں موجود ان کی غزلیں اور اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کئی اشعار یقیناً کسی دوسری کتاب میں نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں فارسی زبان کا کوئی محقق توجہ کرے تو یہ بڑی اہمیّت کا کام ہوگا۔ اس بیاض کے ذکر سے فوق کی یہ تحریر بھی خاصی اہمیّت اختیار کرگئی ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت ایک باقاعدہ تذکرے والی بن گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب "اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" میں لکھتے ہیں۔

"جن لوگوں کی نظر سے اُردو فارسی شعرا کے دو چار تذکرے بھی گزرے ہیں۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ تذکرے عام طور پر بیاض اشعار کے ڈھب پر

مرتب کیے گئے ہیں۔ اگر تذکروں کی عام روش کو نظر میں رکھ کر تذکرہ نگاری کا مفہوم یا اس کی تعریف کا تعین کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ بیاض کی ترقی یافتہ صورت کا نام تذکرہ ہے۔ بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتا ہے۔ جب اس انتخاب اشعار کے ساتھ صاحبان اشعار کے نام اور تخلص میں خاص ترتیب پیدا کی گئی۔ کہیں ابجدی ترتیب ملحوظ رکھی گئی کہیں تہجی ترتیب کو ترجیح دی گئی۔ اس کے ساتھ مختصر حالات زندگی اور کلام پر مختصر تبصرے کا اضافہ ہوا۔ اور کام بیاض سے آگے بڑھ کر نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی فضامیں داخل ہو گیا تو تذکرہ کہلایا۔"[۱۱۱] فارسی لغت میں بھی تذکرہ کے دوسرے متعدد معانی کے ساتھ ساتھ ایک معنی یہ بھی بتلائے گئے ہیں کہ ایسی کتاب جس میں شعرا کا حال بیان کیا جائے۔

ان بیانات کی روشنی میں اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ "مزار الشعرائے کشمیر" فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جو اُردو میں لکھا گیا ہے۔ یہ سب مُغل عہد حکومت کے شعرا ہیں۔ مغل بادشاہوں اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی کشمیر میں سیاحت کے لیے آمد اور ان شعرا سے ملاقات کا حال بھی درج ہے۔ مغلوں کی طرف سے شعرا کی قدردانی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے کتاب کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس تذکرے میں "آبِ حیات" کا انداز ملتا ہے۔ البتہ فوق کی زبان سادہ ہے۔ اور انھوں نے آزاد کی طرح قوت متخیلہ کا آزادانہ استعمال نہیں کیا۔ تمام حقائق کو سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔ غنی کاشمیری کے تذکرے میں فوق لکھتے ہیں:

"غنی کے استغنا کا حال ذیل کے واقعہ سے معلوم ہوگا کہ ایک دوست اس سے ملنے کے لیے آئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ لیکن غنی اندر نہ تھا۔ دوسری مرتبہ پھر آئے تو دروازہ بند تھا۔ دستک دی۔ غنی اندر تھا۔ دروازہ کھولا اور دوست کو خوش آمدید

کہا۔ انھوں نے حیرت سے استفسار کیا کہ میں ایک مرتبہ پہلے آیا تھا تو آپ نہ تھے اور کواڑ کھلے تھے۔ اب آپ موجود ہیں اور کواڑ بند۔ یہ کیا؟ غنی نے جواب دیا متاعِ دکان تو میں ہوں۔ جب میں نہ ہوں تو دروازہ بند کرنا بے سود۔ اب کہ میں موجود ہوں تو دروازہ بند ہونا ضروری ہے۔" (صفحہ : ۲۷۷)

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ غنی نے کسی بادشاہ یا کسی امیر کی مدح سرائی نہیں کی۔ کسی کا قصیدہ نہیں لکھا۔ ہمیشہ اپنی آزاد و بے نیاز زندگی کو شاہی مصاحبت پر ترجیح دی۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بھی نہایت اہم ہے۔ لکھتے ہیں :

"عالمگیر نے غنی کے کمالات سے آگاہ ہو کر ناظم کشمیر سیف خان کو لکھا کہ ملا محمد طاہر غنی کو بہ عزت و احترام ہماری خدمت میں دہلی روانہ کیا جائے۔ سیف خاں جا کر غنی کو یہ خوش خبری سناتا ہے۔ لیکن غنی دہلی جانے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے لکھ دو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے، چنانچہ اسی وقت کپڑے پھاڑ کر دیوانوں کی طرح سیف خان کے دربار سے غنی نکل جاتا ہے اور تیسرے دن فوت ہو جاتا ہے۔" (صفحہ: ۲۷۸)

اسی واقعے کے حوالے سے فوق نے غنی کا صحیح سال وفات ۱۰۸۲ھ قرار دیا ہے۔

اسی طرح دوسرے شعرا کے ضمن میں بھی واقعات درج کیے گئے ہیں۔

فوق کوئی باقاعدہ نقاد تو تھے نہیں۔ لہٰذا کسی شاعر کے بارے میں خالص تنقیدی رائے نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں انھوں نے دوسروں کی رائے پر بھروسہ کیا ہے۔ شیدا فتح پوری کے تذکرے میں میر غلام علی آزاد کی کتاب "مآثر الکرام" (صفحہ: ۱۴۰) کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"صاحب ذہن رسا و فکر آسماں پیما بود۔ و شعر را بہ سرعت تمام می گفت۔ و بہ چشم زدن جواہر فراواں می سُفت۔" (صفحہ : ۲۶۳)

میرزا صائب کے بارے میں لکھتے ہیں :

"بیاض صائب" ایک ایسی چیز ہے جو بقول علامہ شبلی سخندانوں کے لیے دلیل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ اس بیاض کا ایک نسخہ علامہ شبلی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔"

(صفحہ : ۲۷۱)

حاجی محمد جان قدسی کے بارے میں آزاد کا یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے۔
"قصیدہ اور مثنوی میں استاد ہے لیکن غزل میں اس کا پایہ بلند نہیں"

(صفحہ : ۲۵۹)

اس سے آگے فوق خود تحریر کرتے ہیں۔
"کشمیر کے متعلق اس کی مثنوی لاجواب ہے۔ کوہ پیر پنجال کی مشکلات رستے کی صعوبتوں اور پھر کشمیر کے نظاروں، سبزہ زاروں، شاہجہان کے ورودِ کشمیر اور کشمیر کے باغوں کا ذکر جداگانہ عبارت والفاظ کے ساتھ کچھ اس خوبی سے نظم کیا گیا ہے کہ کوئی دوسری مثنوی اس سے لگا نہیں کھاتی۔ (صفحہ : ۲۵۹)

"مزارالشعرائے کشمیر" میں شامل تمام شعراء کی کشمیر کے بارے میں نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ نظمیں دوسری کتابوں میں شاید نہ ہوں۔ اس ضمن میں فارسی داں حضرات کی توجہ و تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ کتاب میں وہ قطعات تاریخ بھی اپنی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں جو ان شاعروں نے پہلے فوت ہونے والوں کے بارے میں تحریر کیے۔ ان سے سال وفات معلوم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ فوق لکھتے ہیں۔
"کلیم نے اس (قدسی) کے مرثیہ میں ایک ترکیب بند لکھا۔ اس مصرعہ سے اس کا سالِ وفات (۱۰۵۶ھ) برآمد ہوتا ہے۔ ع

"دور از اں بلبل قدسی چمنم زنداں شد"

(صفحہ: ۲۶۱)

میرالٰہی ہمدانی نے ۱۰۶۴ھ میں انتقال کیا۔ غنی نے اس مصرع سے اس کی تاریخ نکالی۔ ع

"برد الٰہی ز جہاں گوئے سخن" (صفحہ: ۲۷۲)

"مزارالشعرائے کشمیر" میں شامل کئی شعرا کے ایک مضمون کے اشعار کا آپس میں موازنہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "آئینۂ کشمیر" میں شامل "مزار الشعرائے کشمیر" کے صفحہ۔ ۲۷۹ پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

مشاطہ را جمالِ تو دیوانہ می کند
کائینہ را خیال پری خانہ می کند

سلیم

دِل را نگاہِ گرم تو دیوانہ می کند
آئینہ را رخ تو پری خانہ می کند

صائب

ہر کس کہ دید روئے تو دیوانہ می شود
آئینہ از رُخِ تو پری خانہ می شود

غنی

ان اشعار کے بعد فوق لکھتے ہیں:

"مثالیہ شاعری میں غنی کو استاد الکل تسلیم کیا جاتا ہے۔ قدسی، کلیم، صائب، میرزا اجلال اسیر بڑے پائے کے شاعر گزرے ہیں، لیکن وہ تمام عمر میں چند شعروں کے سوا مثالیہ اشعار نہیں لکھ سکے۔ ان کے مقابلے میں غنی کا سارا دیوان چند شعروں کے سوا مثالیہ شاعری کا بحر زخار ہے۔" اس عبارت کے بعد غنی کے ایسے تیرہ اشعار درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں سب سے طویل مضمون فوق نے غنی کے بارے میں

لکھا ہے۔ غنی سے فوق کو خاص مناسبت تھی۔ انھوں نے اکبر شاہ نجیب آبادی کا طویل مضمون "مولانا غنی" کے نام سے اپنے اشاعتی ادارے ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیا تھا۔ قدسی اور سلیم کے بارے میں بھی فوق نے خاص توجہ دی ہے۔ البتہ عنایت خاں آشنا ۔ ملا طغرائی مشہدی طغرا اور میرزا ابوالقاسم کے بارے میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ تذکرہ اپنی انفرادیت اور اہمیت کے اعتبار سے اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ شعرائے کشمیر کے بارے میں زیادہ تر تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ فوق کے اس تذکرے کی اہمیت کا اندازہ علامہ اقبال کے اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو اس کی تصنیف کے وقت انھوں نے فوق کے نام ۱۲ر مارچ ۱۹۲۲ء کو تحریر کیا تھا۔

"مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی ہے کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھ رہے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے ادھر توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں اللہ برکت دے۔

افسوس ہے کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس کی تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانانِ کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش و حفاظت کے لیے ایک سوسائٹی بنائیں۔ ہاں، تذکرہ شعرائے کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی "شعر العجم" آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ محض حروفِ تہجی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بار آور ہوگی۔ اور اگر کبھی خود کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کا کورس ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے[۱۱۲]"

حوالہ جات (دوسرا باب)

ا۔ مہدی افادی: "افاداتِ مہدی" لاہور: مبارک علی، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء، ص: ۲۱۲۔

۲۔ Jaffer, S.M, History of History Vol. 1, Peshawar Sadiq Sons, 1961, P. 2.

۳۔ History of History Vol. 1, P. 504.

۴۔ Themas carlyle, Heroes, Heroworship and Heroc London: Ed. I 1965, P. 27.

۵۔ بحوالہ ڈاکٹر شاہ علی، اُردو میں سوانح نگاری"، کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس طبع اوّل، ۱۹۶۱ء، ص: ۹۔

۶۔ بحوالہ صادق علی گل، "سرگزشت تاریخ" لاہور: عزیز بک ڈپو۔ طبع اوّل، ۱۹۷۱ء، ص: ۱۹۔

۷؎ "اُردو میں سوانح نگاری" طبع اوّل، صفحہ نمبر ۳۸ -

۸؎ الطاف فاطمہ : "اُردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء" کراچی :
اُردو اکیڈمی سندھ، طبع اوّل، ۱۹۶۱ء - ص : ۱۷۵ -

۹؎ ع "اُردو میں سوانح نگاری" طبع اوّل، ص : ۲۵۷ -

۱۰؎ ایضاً ص : ۳۰۳ -

۱۱؎ ایضاً ص : ۳۵۳ -

۱۲؎ "اُردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء"، طبع اوّل، ص : ۱۷۶ -

۱۳؎ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ : "اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" دہلی :
رونق پبلشنگ ہاؤس، طبع اوّل، ۱۹۸۶ء، ص : ۱۰۲ -

۱۴؎ حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں، ص : ۳۷۲ -

۱۵؎ "اُردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء"، طبع اوّل، ص : ۱۷۹ -

۱۶؎ بحوالہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، "طیف نثر" لاہور : لاہور اکیڈمی -
طبع دوم، ۱۹۶۸ء، ص : ۱۹۵

۱۷؎ "قوس قزح" لاہور - "دلگداز" لکھنؤ، "شباب" لاہور -
"نیرنگ خیال" لاہور -

۱۸؎ "شیرازہ" فوق نمبر ص : ۱۳۷، ۱۳۶ -

۱۹؎ "آئینہ کشمیر"، ص : ۳۵۷ -

۲۰؎ "مکمل تاریخ کشمیر"، دیباچہ - ص : ۲ -

۲۱؎ قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی : "نگارستان کشمیر" صفحات : ۳، ۳۵،
۴۰۴ - دہلی : جید برقی پریس، مطبوعہ ۱۳۵۲ھ،

۲۲؎ "شیرازہ" سرینگر کشمیر - فوق نمبر صفحات : ۷۵ - ۷۶ -

۲۳ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۲۴ ۔

۲۴ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۲۷ ۔

۲۵ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۳۵ ۔

۲۶ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۲۷ ۔

۲۷ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۳۲ ۔

۲۸ے "دیباچہ" مکمل تاریخ کشمیر" جلد اول ۔ ص: ۲ ۔

۲۹ے "کشمیری میگزین" اکتوبر ۱۹۰۹ء، ص: ۲۵ ۔

۳۰ے "کشمیری میگزین" اکتوبر ۱۹۰۹ء، ص: ۲۸ ۔

۳۱ے "سرچشمہ" گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ، ص: ۲۱۱ ۔

۳۲ے Acton, Cambridge Modern History. I. P. 4.

بحوالہ ڈاکٹر اختر علی "سید سلیمان ندوی" (مقالہ پی۔ایچ۔ڈی) پنجاب یونیورسٹی لاہور:

۱۹۸۳ء، ص: ۱۷۶ ۔

۳۳ے Kent, Sherman. Writing History, Ed. First 1941

Appleton. Century Crofts, INC. New York. P.42.

۳۴ے ٹھاکر اچھر چند (مترجم و مؤلف) "راج ترنگنی" نئی دلی: لایٹ اینڈ لائف پبلشرز۔

طبع اول۔ ۱۹۷۶ء، صفحہ: ۸۳

۳۵ے "باقیات اقبال"، طبع اول صفحہ: ۳۲ ۔

۳۶ے مولانا سعد حسن خان یوسفی مترجم، "مقدمہ ابن خلدون"، کراچی: کارخانہ تجارت کتب آرام باغ فرید روڈ، سن اشاعت درج نہیں۔ باب دوم فصل ۱۷، ص: ۱۶۵ ۔

۳۷ے امام ترمذی، "سنن ترمذی" بیروت: دارالاحیا التراث العربیہ۔ مطبوعہ ۱۹۶۲ء،

جلد ۴ باب ۹۴ ص: ۳۵۱

۳۸ے دی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (مائیکرو پیڈیا) جلد ۱۰، طبع ۱۵، ۱۹۶۸ء، ص: ۱۱۵
۳۹ے "تاریخ اقوامِ کشمیر"، جلد سوم، دیباچہ۔ ص: ۸۔
۴۰ے "تاریخ اقوامِ پونچھ" جلد اوّل، دیباچہ۔
۴۱ے "شیرازہ سرینگر" (فوق نمبر) ص: ۱۰۰۔
۴۲ے "تاریخ سلطنت خداداد" بحوالہ "تاریخ اقوامِ کشمیر" جلد اوّل، ص: ۵۳۱۔
۴۳ے "تاریخ اقوامِ کشمیر" جلد اوّل صفحات: ۲۷۵، ۲۷۷۔
۴۴ے "تاریخ اقوامِ کشمیر" جلد اوّل، صفحات: ۵۳۱، ۵۳۲۔
۴۵ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۱۴۔
۴۶ے ڈاکٹر یوسف بخاری: "کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی جائزہ" لاہور: مرکزی اردو بورڈ، طبع اوّل، ۱۹۸۲ء۔ صفحہ: ۱۸۔
۴۷ے "مخزن پنجاب"، "حدیقۃ الاولیاء"، "گنج تاریخ"۔
۴۸ے "تاریخ لاہور"،
۴۹ے "تاریخ لاہور"، (انگریزی)
۵۰ے "تحقیقات چشتی"۔ لاہور۔
۵۱ے "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، طبع اوّل، ص: ۲۵۹۔
۵۲ے "شالامار باغ"، سلسلہ جدید طبع اوّل ۱۹۲۴ء ص: ۳۔
۵۳ے "شیرازہ"، فوق نمبر۔ ص: ۱۴۲۔
۵۴ے نقوش لاہور نمبر، ص: ۹۵۶۔
۵۵ے "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" طبع اوّل، ص: ۲۶۰۔
۵۶ے " " " " " " ص: ۲۶۱۔
۵۷ے "تذکرۃ العلماء والمشائخ"، ص: ۳۹، ۳۸۔

۵۸؎ ڈاکٹر حسن اختر: "تہذیب و تحقیق" لاہور، یونیورسل بکس ۱۹۸۵ء، ص: ۲۰۳ تا ۲۵۴۔
۵۹؎ منشی محمد الدین فوق، ابتدائیہ "مآثر لاہور" مطبوعہ "نقوش لاہور نمبر"۔

فروری ۱۹۶۲ء، ص: ۱۴۱۔

۶۰؎ مثلاً (۱) عہدِ غزنویہ، عہدِ غلاماں، تغلق و لودھیہ وغیرہ (۲) شباب لاہور عہدِ مغلیہ (۳) عہدِ حکومت خالصہ (۴) عہدِ انگلشیہ تاحال۔
۶۱؎ مولانا محمد حسین آزاد: "آبِ حیات" لاہور، مکتبہ و سن ندارد صفحہ: ۲۵۵۔
۶۲؎ مولوی سید محمد: "ارباب نثر اردو" لاہور: مکتبہ معین الادب، طبع سوم ۱۹۵۰ء،

صفحہ: ۲۴۳

۶۳؎ ڈاکٹر معین الرحمٰن (مرتب): "فورٹ ولیم کالج" (تحریک و تاریخ) لاہور: یونیورسل بکس، طبع اوّل ۱۹۸۶ء، صفحہ: ۱۳۶۔
۶۴؎ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، "اُردو کی منظوم داستانیں" کراچی: انجمن ترقی اُردو، طبع اوّل۔ ۱۹۷۱ء، ص: ۵۸۲۔
۶۵؎ فوق "تحقیقات طلسم بکاؤلی" لاہور: پنجۂ فولاد پریس، طبع اوّل ۱۹۰۵ء۔
۶۶؎ "اخبار کشمیری" لاہور: جنوری ۱۹۱۰ء
۶۷؎ ڈاکٹر گیان چند جین، "اُردو کی نثری داستانیں" کراچی: انجمن ترقیِ اُردو۔ طبع اوّل ۱۹۵۴ء، ص: ۲۱۹۔
۶۸؎ سہ ماہی "صحیفہ" لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء۔
۶۹؎ سہ ماہی "صحیفہ" لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء
۷۰؎ "نقوش" لاہور: دس سالہ نمبر، جون ۱۹۵۸ء، صفحہ: ۳۸۰
۷۱؎ سہ ماہی "صحیفہ"، جولائی ۱۹۷۳ء۔
۷۲؎ سہ ماہی "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۳ء۔

۷۳؎ سید احمد دہلوی: "فرہنگِ آصفیہ" جلد اوّل لاہور: مکتبہ حسن سہیل، مطبوعہ ۱۹۱۸ء صفحہ: ۱۰۱۔

۷۴؎ سہ ماہی "صحیفہ" جولائی ۱۹۷۳ء۔

۷۵؎ "فرہنگِ آصفیہ"، صفحہ: ۴۰۲۔

۷۶؎ "فرہنگِ آصفیہ"، مطبوعہ ۱۹۱۸ء، ص: د

۷۷؎ "فرہنگِ آصفیہ"، مطبوعہ ۱۹۱۸ء، ص: ز

۷۸؎ "ملک العلماء" طبع اوّل، ص: ۹۸۔

۷۹؎ "ملک العلماء" طبع اوّل، ص: ۱۰۰۔

۸۰؎ اقبال "کلیات اقبال"، (بانگِ درا)، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مطبوعہ ۱۹۷۵ء، ص: ۲۶۷ تا ۲۷۰۔

۸۱؎ "انوارِ اقبال"، طبع اوّل، ص: ۶۹۔

۸۲؎ "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، طبع اوّل، ص: ۲۶۴۔

۸۳؎ امام نسائی، "سنن نسائی"، بیروت: دارالکتاب العربیہ، سن ندارد۔ جلد ۷۔ ص: ۱۶۱۔

۸۴؎ "شیرازہ" فوق نمبر، ص: ۱۳۸۔

۸۵؎ ماہنامہ "طریقت" لاہور، جون ۱۹۱۷ء۔

۸۶؎ "انوارِ اقبال" طبع اوّل، ص: ۶۲۔

۸۸؎ سورہ الحشر، آیت نمبر ۲۱۔

۸۹؎ "اُردو میں سوانح نگاری"، طبع اوّل، ص: ۳۲۹۔

۹۰؎

۹۱؎ ڈاکٹر سید عبداللہ، "سرسید اور ان کے نامور رفقاء"، لاہور: مکتبہ کارواں۔

طبع دوم ۱۹۶۵ء، صفحہ : ۱۱۵ -

۹۲ "صوفی" منڈی بہاؤالدین : مطبوعات صوفی ، نومبر ۱۹۲۷ء ص: ۵۳ -

۹۳ ڈاکٹر یوسف بخاری، "کاشمیر شاعری" لاہور : حکیم یوسف فہیم یوسف۔

طبع اول ۱۹۸۴ء ، ص: ۶۷

۹۴ "ملک العلماء" طبع اول، ص : ۱ -

۹۴ سید سلیمان ندوی : "سیرت النبیؐ" جلد سوم ۔لاہور : ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار،

عام کتابی تقطیع میں پہلا ایڈیشن ۱۳۹۵ھ ، صفحہ : ۱۳۶ -

۹۵ "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" ، طبع اول - ص : ۱۷۸ -

۹۶ "حیات، اقبال کی گمشدہ کڑیاں" طبع اول ،ص : ۲۷۲ -

۹۷ "کلام فوق" ص : ۲۰۸ - ۲۱۰ -

۹۸ ہدایت اللہ اختر : "کشمیر کے فنون لطیفہ" سیالکوٹ ۔ القلم ریلوے روڈ ،

طبع اول، ۱۹۷۷ء ، ص : ۳۹ - ۳۸ -

۹۹ "آئینہ کشمیر" طبع اول ، ص : ۳۸۳ -

۱۰۰ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری "تحقیق نوادر" لکھنؤ : اردو پبلشنگ ز ... تا ... مارگ ،

۱۹۷۷ء ، ص : ۶۳ -

۱۰۱ تحقیق نوادر ، ص : ۶۵۲ -

۱۰۲ "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" طبع اول ، ص : ۱۷۵

۱۰۳ "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" طبع اول ...

۱۰۴ [illegible]

۱۰۵ "نقوش" ، آپ بیتی نمبر ۔ ص : ۶۷۰ تا ...

۱۰۶ ہفت روزہ "انصاف" راولپنڈی ... مارچ ... [illegible]

۱۰۷ Amaranatha Jha, Some Autobiographies, London: Oxford University Press, Ed I, 1930 P.VII.

۱۰۸ "نقوش" آپ بیتی نمبر۔ ص: ۵۸/۵۹ -

۱۰۹ "کشمیری میگزین" میں ۱۹۱۰ء کا سال درج ہے۔ ۱۹۴۰ء کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۱۱۰ "آئینۂ کشمیر" ، ص: ۳۴۵ -

۱۱۱ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، "اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" لاہور: مجلس ترقیِ ادب، طبع اوّل، ۱۹۷۲ء، ص: ۱۱

۱۱۲ "انوارِ اقبال"، طبع اوّل، ص: ۷۰، ۷۱ -

فوق — شاعرِ کشمیر

باب ۳

فوق — شاعرِ کشمیر

فوق کی زندگی اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ ان کی شاعری کے تذکرے کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ ادیب اور صحافی کے طور پر ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اس کے ساتھ شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا ایک مقام ہے۔ پچھلے ابواب میں ان کی مختلف علمی و ادبی حیثیتوں کے تذکرے میں ان کی شاعری کا بھی ذکر ہوتا رہا ہے۔ ان کے علمی و ادبی معمولات میں شعر گوئی کو اوّلیت حاصل ہے۔ اگرچہ ان کی نثری تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر انھوں نے علمی و ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ چونکہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے اس بارے میں یہ واقعات درج کیے گئے ہیں، اس لیے انھیں یہاں دُہرانے سے احتراز کیا جا رہا ہے۔ البتہ ان کی غزل پر بحث کرتے ہوئے ان کی ابتدائی زمانے کی شاعری کے ذریعے ان کی سرگرمیوں پر نظر ڈالی گئی ہے

"کلام فوق" کے نام سے پہلی بار ۱۹۰۹ء میں فوق صاحب کا شعری مجموعہ شائع ہُوا۔ اس مجموعے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۱ء تک کا کلام ہے۔ اس حصے میں غزلیں زیادہ ہیں۔ دوسرا حصہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کے کلام پر محیط ہے۔ اس حصے میں نظموں کی تعداد بھی خاصی ہے "کلام فوق" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں شائع ہُوا۔ اس کی ضخامت ۴۰ صفحات سے بڑھ کر ۲۴۰ صفحات تک پہنچ گئی ہے۔ اس میں پروفیسر علم الدین سالک کا مفصل دیباچہ بھی شامل ہے۔ فوق کا دوسرا مجموعۂ کلام "نغمہ وگلزار" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہُوا۔ اس کی ضخامت ۱۸۴ صفحات ہے۔ اس کا دیباچہ مولانا عبداللہ قریشی نے لکھا ہے۔

"کلام فوق" میں موجود سالک صاحب کا دیباچہ فوق صاحب کی شاعری کو سمجھنے کی پہلی کوششوں میں سے ایک ہے۔ اس ضمن میں سالک صاحب کی یہ رائے بہت اہم ہے۔

"کلام فوق" کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک شعر وطن کی محبت اور اسلام کے درد میں ڈوبا ہُوا ہے۔ فوق صاحب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مستقل طور پر مسلمانانِ کشمیر کی ترجمانی کرتے ہُوئے اہل عالم کو ان کی مظلومی سے روشناس کرایا۔ آپ نے نہ صرف اہالیانِ کشمیر کی مظلومی کا رونا رویا بلکہ اسلاف کے شاندار کارناموں کو کشمیریوں کے سامنے پیش کرتے ہُوئے انھیں غیرت دلائی کہ وہ ان کے نقشِ قدم پر گامزن ہوں۔ اور اس طرح دینی اور دنیوی فلاح حاصل کریں۔ اس لحاظ سے فوق کشمیر کے حالی ہیں۔ اگر "مسدس حالی" نے مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت سے چونکایا تو "کلام فوق" اور "اخبارِ فوق" نے اہالیانِ کشمیر کے اندر ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی مثال بہت کم شاعر اور

بہت کم ایڈیٹر پیش کر سکتے ہیں۔ شاعر کا یہی مشن ہوتا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ حضرت فوق اس فرض سے بدرجۂ اولیٰ سبکدوش ہو رہے ہیں۔"

حالی کے ساتھ فوق کے موازنے سے سرسید کی علی گڑھ تحریک کے سارے مقاصد سامنے آجاتے ہیں۔ اس مقالے کے تیسرے اور چوتھے باب میں بحث کی جاچکی ہے کہ فوق کے خیالات اور اسلوب میں حالی کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی قدیم وجدید رنگ کی واضح تقسیم دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح وہ تاریخی طور پر شاعری کی اس تحریک سے منسلک ہو جاتے ہیں جو مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے جدید شاعری کے حوالے سے شروع کی تھی۔ فوق صاحب کی شاعری موضوعاتی نظموں سے بھری پڑی ہے۔ بہ اندازہ "کلام فوق" اور "نغمہ و گلزار" کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔

حالی اور آزاد کے علاوہ اکبر الہ آبادی ایسے شاعر ہیں جن کے ساتھ فوق صاحب کی ملاقات اور خط وکتابت تھی۔ فوق صاحب کی طنزیہ انداز کی شاعری کے علاوہ بھی اکبر کا اندازِ فکر وسخن کہیں کہیں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال کے اثرات فوق صاحب کی مجموعی شخصیت وفن پر واضح نظر آتے ہیں۔ فوق صاحب ایک با اثر صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے رسالوں میں بھی اپنے زمانے کے مختلف واقعات کو نظم کیا ہے۔ یہ نظمیں ان کے شعری مجموعوں میں شامل ہیں۔ نظم گوئی کا یہ انداز ظفر علی خاں کے ہاں زیادہ قوت سے دکھائی دیتا ہے۔ فوق صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے زمانہ کے مختلف شعری اسالیب کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ رشید نازکی اپنے مضمون "فوق کی شاعری" میں لکھتے ہیں کہ:

فوق نے اپنی شاعری کی ابتدا انیسویں صدی کے بالکل آخری دنوں میں کی۔ یہ وہ وقت تھا جب اُردو ادب میں نئے رجحانات پہلی بار متعارف ہو رہے تھے۔

آزاد، حالی اور اکبر الٰہ آبادی شاعری کو غزل کی ڈگر سے آگے بڑھانے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے وطنی اور ملی نظمیں لکھنا شروع کردی تھیں۔ مناظر فطرت کے حوالے سے موضوعاتی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن ماحول میں غزل کی بو باس بھی اپنے پُورے جوبن پر تھی۔ اقبال اس اقلیم شعر وسخن میں نئے خدنگ ناجستہ لے کر آگئے تھے۔ یہ وہ فضا ہے جس میں بعد کے شعراء میں ظفر علی خاں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایسے وقت میں فوق کی شاعری کی اٹھان، اس کا انداز سخن طرازی اور اس کی نغمہ نوازی اس سے زیادہ اور کیا ثمر لا سکتی ہے۔ ایک اور بات جس کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے یہ کہ فوق تاریخ کے لق ودق صحراؤں کے مسافر بادیہ پیما تھے۔ عمان صحافت کے زبردست شناور تھے۔ وہ ایک ایسی زندگی گزار رہے تھے جو ہزار محشر در پردہ و ہزار صلیب بر دوش تھی۔ روزمرہ زندگی میں انھیں روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینا پڑتا تھا۔ ایسی صبر آزما اور مخدوش زندگی میں صلابت شعری کا زندہ رہنا بھی ایک اعجاز ہے۔ اس کے باوصف، اگر فوق کی شاعری کا بہ تحمل مطالعہ کیا جائے تو راکھ کے ڈھیروں میں جذبات و تخیلات کی چنگاریاں دبی نظر آتی ہیں۔ فوق کی شاعری دھوم دھڑکے کی شاعری نہیں۔ آتش چنار کی دہیمی آنچ والی شاعری ہے جس میں قومی دردمندی اور اخلاقی آرزومندی کی تاثیر گھلی ہوئی ہے۔"[۱]

ظفر علی خان کی اکثر نظموں میں سیاست کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ایک خطیبانہ انداز کی گھن گرج سنائی دیتی ہے جب کہ فوق سیاسی معاملات کو بھی سماجی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنے کے قائل تھے۔ فوری طور پر کسی واقعہ یا منظر سے متاثر ہو کر بھی شعر کہتے رہتے تھے مگر اس کے سیاق وسباق پر ان کی پوری نظر ہوتی تھی۔ موضوعات کی براہِ راست پیش کش کا اسلوب ان کے ادبی اور شعری مزاج کا حصہ تھا۔ وہ جس موضوع پر چاہتے تھے لکھ لیتے تھے لیکن ان کے ہاں موضوعات کا تنوع نہیں۔ انھوں نے خود کو کشمیر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف میں لکھا ہے اور کشمیر

کو اولین حیثیت دی ہے۔ بحیثیت شاعر وہ اپنے آبائی خطّے کے لیے جس والہانہ پن کا مظاہرہ کرتے ہیں اس پر انھیں شاعرِ کشمیر کا خطاب دیا گیا۔ عبداللہ قریشی صاحب نے "شاعرِ کشمیر" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، جسے ظفر برادرس لاہور نے شائع کیا۔ اس پر سن اشاعت درج نہیں۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے "شاعرِ کشمیر" کے نام سے ایک نظم لکھی جو "نغمہ و گلزار" کے صفحہ نمبر ۳۰ پر موجود ہے، جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

فوقؔ صاحب ہیں جو میرے خواجہ تاش
خوش خیال و خوش مزاج و خوش معاش

پیرو و شاگردِ داغؔ دہلوی
زندہ اک تاریخ ہے کشمیر کی

والہانہ عشق ہے کشمیر سے
رُوح زخمی ہے وطن کے تیر سے

ان کے نغمے جب سنیں گے اہلِ دل
کیف حاصل ہوگا ان کو مستقل

حضرت اقبالؔ کے ہیں ہم نشیں
صاحب وجدان و عرفان و یقیں

فوقؔ صاحب کی ہے سب پہ فوقیت
درس و حکمت سے ہے ان کو نسبت

ان کی نظمیں نسخۂ اکسیر ہیں
وہ حقیقی شاعرِ کشمیر ہیں

فوق صاحب نے کشمیر کے بارے میں مستقل نظموں کے علاوہ دوسری نظموں اور غزلوں میں بھی جا بجا یہ دِل نشیں حکایت چھیڑی ہے۔ فوق صاحب نے کشمیر کی کہانی عنوان اور پیرایہ ہائے بیان بدل بدل کر بیان کی ہے۔ کبھی وہ کشمیر کے فطری حُسن اور اس کے قدرتی ذخائر کا تذکرہ چھیڑتے ہیں۔ کبھی یہاں کے باشندوں کی ذہنی اور وجدانی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ کبھی مشاہیر کا ذکر کرتے ہیں اور نسلِ نوجوان کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔ فوق صاحب کی شاعری کے بارے میں عبداللہ قریشی صاحب لکھتے ہیں:

"آپ نے فلسفیانہ پیچیدگیوں اور پُرکیف بندشوں میں اُلجھے بغیر سیدھے سادے الفاظ میں کشمیر کا راگ الاپا ہے اور پُرسوز نغموں سے کشمیری قوم کے تن مردہ میں زندگی کا خون دوڑایا۔ آپ نے بلند پاکیزہ خیالات کو نہایت شستہ پیرائے میں پیش کیا ہے اور غزل کا رنگ بھی اتنا گہرا کر دیا ہے کہ سُننے والا غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ آپ نے کیا کہا ہے۔ دراصل ایسا مؤثر کلام ہی اندھی بصیرت کو بینائی بخش سکتا ہے۔ دِل کی آنکھیں کھول سکتا ہے۔ نیند کے ماتوں کو جگا سکتا ہے۔ مایوسیوں کی ڈھارس بندھا سکتا اور جمود و خمود کو توڑ سکتا ہے۔ فوق صاحب خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے اپنی کوششوں کا مآل اور اپنے کلام کا اعجاز و کمال اپنی زندگی ہی میں دیکھ لیا۔ انھیں فخر تھا کہ:

ہمارے دِل نے آخر کر لیا پیدا کنارہ بھی
بہت گو راہ میں دریائے ناپیدا کنار آئے

پھر تڑپ اُٹھے ہوا خواہِ وطن
اے کلامِ فوق تُو نے کیا کیا

بلا شبہ یہ فوق صاحب کے حیات افروز پیغامات کا اثر تھا کہ لوگوں میں حب الوطنی اور اعلیٰ حوصلگی کے جذبات موجزن ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خطۂ کشمیر پہلے اور تھا، اب اور ہے۔"[۲۸]

فوق کی غزل میں بھی کشمیر کی تصویر نظر آتی ہے۔ فوق کی نظم کے مطالعے کے بعد ان کی غزل کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔ حالی کی طرح ان کی غزل بھی قدیم و جدید میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ فوق کی غزل اقبال کا انداز تو اختیار نہ کر سکی مگر جدید غزل کے موضوعات و مضامین کی رنگا رنگی اس میں دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر کے تو سارے رنگ ان کے کلام میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔

فوق نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی مگر چونکہ "شاعرِ کشمیر" ہونے کی حیثیت سے ان کی نظم ان کی زیادہ نمائندگی کرتی ہے، اپنے کچھ ابتدائی کلام کو چھوڑ کر انھوں نے غزل سے بھی وہی کام لیا جو وہ نظم سے لے رہے تھے۔ انھوں نے خود اس ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے جس کا تذکرہ اگلے صفحات میں کیا جائے گا۔ انھوں نے ایک جگہ خود اپنی غزل کو "قومی غزل" کا نام دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا نظریۂ شعر کیا تھا اور وہ اس سلسلے میں کیا کیا مقاصد لے کر چلے تھے۔ اگر خطۂ کشمیر کو ان کے فنی سفر کا مرکز و محور بنا کر دیکھا جائے تو اُردُو شاعری کی تاریخ میں ان کو جو اوّلیت اور اہمیت حاصل ہے، کسی دوسرے شاعر کو نہیں۔

کشمیر کے علاوہ بھی فوق نے اپنے دَور کے بعض اہم واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک اپنے دَور کے حالات سے اثر پذیر ہو کر لکھی جانے والی نظمیں ہنگامی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں۔ یہ دلیل عموماً دی جاتی ہے کہ ظفر علی خاں کی شاعری کا بڑا حصہ ہنگامی موضوعات پر مبنی ہے، مگر اس کی اہمیت

ختم نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون "ظفر علی خاں کی شاعری" میں کہتے ہیں:

"مولانا ظفر علی خاں بیسویں صدی کے نامور ادیبوں اور صحیفہ نگاروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ مولانا کو محض سیاسی لیڈر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یا پھر ایک صحیفہ نگار کی حیثیت سے، حالانکہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ محفوظ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میدان خاص میں بھی اُنھوں نے اُردو کے ادبی ارتقا کی ایسی خدمت انجام دی ہے جس کو نہ ماننا ادبی ناشکر گزاری ہی نہیں، ایک شدید یہ قومی یا اخلاقی جرم بھی ہے۔

ظفر علی خاں کے تخلیقی مزاج کی بھی عجیب شان ہے کہ کوئی ایک رنگ ان سے مخصوص نہ تھا۔ وہ کچھ ہمہ رنگ قسم کا مزاج تھا۔ طلسماتی انداز کا کہ اس کی بوقلمونی کے اندر سے ہر قسم کا رنگ اُبھرا چلا آتا تھا ابھی شاعری کر رہے ہیں۔ ابھی نثر لکھ رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں خطیبانہ انداز ہے۔ پھر مزاح وظرافت ہے۔ پھر ہجو ہے۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ استعداد کے اعتبار سے ایک شاعر کا دِل و دماغ لے کر آئے تھے۔ مگر ان کی شاعری صحافت کی پریشان نگاری میں دب کر رہ گئی اور ہمیں ان کی شاعری میں وہ کچھ نہ مل سکا جو مل سکتا تھا۔ وہ بہت بڑے شاعر بن سکتے تھے مگر نہ بن سکے"۔ [۳۵]

ڈاکٹر صاحب کی اس بات کے تسلسل میں فوق کے بارے میں کلیم اختر کی یہ بات بہت بجا ہے جو ان کے مضمون "فوق کی شاعری" میں موجود ہے۔

"فوق نے بھی ظفر علی خان کی مانند شاعری کو اپنے مقصد کا وسیلۂ اظہار بنایا اور ان کا مقصد کشمیری عوام کی بیداری رہا اور اس میں وہ کامیاب رہے"۔ [۳۶]

فوق نے ہنگامی اور سیاسی موضوعات پر لکھا۔ اس اعتبار سے مولانا حالیؔ اور

مولانا ظفر علی خان ان کے پیش رو تھے۔ اگرچہ وہ ایسی شاعری کو دائمی قدر کی چیز نہ بنا سکے لیکن اس شاعری کی پھر بھی ایک اہمیت اور قدر ہے۔ مثلاً فوق کی نظم "اتحادِ ثلاثہ اور دُنیائے اسلام" (کلام فوق ص - ۱۵۲) ایسی شاعری کی درخشندہ مثال ہے۔ اس نظم کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں۔

"۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو جب اٹلی نے یکایک ٹرکی کو اعلانِ جنگ دے کر دُنیا کو متحیر و ششدر کر دیا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اضطراب عظیم پیدا ہُوا۔ ۴ نومبر ۱۹۱۱ء کو قیام سرینگر کے دوران میں اسی اضطراب سے متأثر ہو کر عنوان بالا پر ایک نظم لکھی جو ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کے اخبار "زمیندار" میں چھپ گئی۔

اس نظم کا پہلا بند درج ذیل ہے۔

چھائی ہیں کالی گھٹائیں عالمِ اسلام پر
اس میں ایراں ہو، مراکو ہو کہ ترکستان ہو
نوچ کھایا حرصِ یورپ نے ہمارے جسم کو
کیوں نہ وقفِ کاہشِ واندوہ دِل اور جان ہو
اپنی کوتاہی سے پھر بڑھنے کو ہے دستِ دراز
اب بھی مسلم بچ رہیں قائم اگر ایمان ہو
جرمنی کی اے مثلث طاقتو سچ سچ بتاؤ
آدمی ہو یا بہ شکلِ آدمی شیطان ہو
کیا ہوئے حفظِ مساوات واخوت کے اصول
کیا تمھیں آزادی و تہذیب کی پہچان ہو

(کلام فوق - ص : ۱۵۲)

قومی شاعری

فوق ہمارے قومی شعراء کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان کی فکریات اور اسلوب فکر و اظہار سے مولانا حالی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

"کلام فوق" (۱۹۰۹ء) کے حصہ دوم کے دیباچہ میں فوق نے غزل اور قومی شاعری کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اب شاعری دو قسم کی ہو گئی ہے۔ ایک پرانی اور دوسری نئی۔ پرانی تو وہی ہے جس میں زیادہ تر حسن و عشق کے مضامین کے ساتھ زبان کی تکمیل اور فصاحت و بلاغت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر غزلوں پر مبنی ہے۔ دوسری نیچرل شاعری کہلاتی ہے جس میں اخلاقی، قومی اور ملکی حالات منظوم کیے جاتے ہیں۔

اس شاعری میں غزل بہت کم ہوتی ہے۔ ایک زمانہ آتے گا کہ شاعری کے یہ دونوں صیغے ایک ہو جائیں گے اور جیسا کہ موجودہ حالات سے معلوم ہو رہا ہے کہ "قومی شاعری" کامیاب ہو جائے گی۔ یہ شاعری وہ کام کرے گی جو کسی فوج کا سپہ سالار اپنی شکستہ دل فوج کو ابھارنے، غیرت دلانے اور جرأت پیدا کرنے کے لیے کرتا ہے یا ایک قوم کا ریفارمر اپنی جادو اثر تقریر سے قوم کو جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔"

"کلام فوق" طبع اوّل، ص : ۶۵

قومی شاعری ایک وسیع المعانی اصطلاح ہے اور ہر طرح کی اخلاقی اور اصلاحی نظموں پر محیط ہے۔ قومی حوالے سے اجمالی طور پر بھی فوق کے یہاں کچھ اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

اب کہاں قومی چمن میں وہ بہار
اختلاف رنگ و بُو نے کیا کیا

("نغمہ وگلزار"۔ ص: ۸۹)

اُدھر ہے جشن تاج کامیابی
ادھر تقدیر کو تُو رو رہا ہے
تجھے مُردہ سمجھ کر کیوں نہ روئیں
زمانہ جاگ اٹھا تو سو رہا ہے

("نغمہ وگلزار" ص: ۹۱)

سماجی اور معاشرتی موضوعات

کوئی حساس اور روشن ضمیر شاعر اپنے سماجی اور معاشرتی مسائل سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ فوق کے یہاں بھی یہ موضوعات اپنی پُوری اہمیت اور حسنِ بیان کے ساتھ موجود ہیں۔ معاشرہ کے پسے ہُوئے طبقات خصوصاً ان کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں، چنانچہ انھوں نے مزدوروں اور کسانوں کے لیے متعدد نظمیں کہیں۔ مثلاً ایک نظم میں رسولؐ پاک کے اس ارشاد کو نظم کرتے ہیں کہ "مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دینی چاہیے" ۔

مزدور کو خوش رکھنے سے ملتی ہیں دُعائیں
ناخوش اسے رکھنا نہیں اچھا یہ قرینہ
اے صاحب سرمایہ نہیں یاد تجھے کیا
اس بارے میں کیا کہہ گئے سرکار مدینہ

مزدور کی جو مزد ہے فوراً وہ ادا کر
قبل اس کے کہ مزدور کا ہو خشک پسینہ

("نغمہ وگلزار" ص: ۱۲٦)

اسی طرح فوق صاحب کی نظم "مزدور کی قیمت" ایک پُر تاثیر طنزیہ نظم ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ دورانِ کار کوئی مزدور کسی حادثہ کی وجہ سے جاں بحق ہو جائے تو اربابِ اختیار اس کا خون بہا ادا کرنے کی بجائے فیصلہ دے دیتے ہیں کہ حادثہ مزدور کی ہی بے وقوفی سے پیش آیا ہے ؎

انجینئر نے اپنا دیا اس طرح بیان
یہ امر چھان بین سے آخر ہُوا عیاں
اس بے وقوف سے تو بہت کچھ کہا گیا
وہ خود ہی اپنی موت کے منہ میں چلا گیا

("نغمہ وگلزار" ص: ۱۳۳)

مزدوروں کی طرح کسانوں کے بارے میں بھی فوق نے بکثرت لکھا ہے۔ اس موضوع پر ۱۹۳۹ء میں انھوں نے ایک کتابچہ بھی بعنوان "ہمدرد زمیندار" تالیف کیا تھا جس میں دیگر شعرائے کلام کے علاوہ ان کی اپنی بھی نظمیں شامل تھیں۔ بعد میں یہ نظمیں "کلامِ فوق" میں شامل کر لی گئیں۔ ان کی ایک نظم "منظوم رپورٹ" سے پٹواری کے بارے میں چند اشعار نقل کیے جا رہے ہیں ؎

یہ مسلّم ہے کہ ایسا کوئی پٹواری نہیں !
"ناس مشکہ" کی ازل سے جس کو بیماری نہیں
اور بیماری بھی پھر ایسی کہ جو ہے لاعلاج
برص کی ممکن دوا ہے، کوڑھ کا کیا ہو علاج

ان کی رشوت اب رواج و رسم کی صورت میں ہے
بڑھ کے تنخواہوں سے ان کو آمدِ رشوت میں ہے

("نغمہ و گلزار" ص : ۱۴۶)

فوق نے زمینداروں کے مختلف مسائل و معاملات پر اپنی نظموں میں اظہار خیال کیا ہے۔ کہیں وہ تعلیم بالغاں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں، کہیں پنچایتی نظام کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ کہیں کھاد کے انباروں کی حفاظت کا سبق دیتے، کہیں باہمی اتحاد و تعاون اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی مختلف نظموں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎

جس گھڑی جاتے گی یہ ناخواندگی
دُور ہو گی اس گھڑی درماندگی
بالغوں کو کُچھ پڑھانا چاہیے
عِلم کُچھ ان کو سکھانا چاہیے
خط کا لکھنا اور پڑھنا جان لیں
ہند سے بھی کچھ نہ کچھ پہچان لیں

(تعلیم بالغاں) "ہمدرد زمینداراں" صفحہ: ۳۰

کیا اس نے خلقت پہ احساں بڑا
رکھی جس نے پنچایتوں کی بنا
خدا نے ہے گر کی عنایت سمجھ
انھیں اپنے گھر کی حکومت سمجھ
مقدمات میں ان سے گو ہے کمی
بہت فائدے ان سے ہیں اور بھی

(پنچایتوں کے فوائد) "ہمدرد زمینداراں" صفحہ: ۲۶

کھاد کے انبار ظاہر میں غلاظت کا ہیں ڈھیر
تو اگر سمجھے تو ہے کانِ طلا تیرے لیے

(نظم۔ غلاظت کے انبار یا سونے کی کان) "ہمدرد زمینداران"
صفحہ: ۴۶

فوق کا کتابچہ "سکاؤٹوں کے گیت" بھی ان کی معاشرتی نظموں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سولہ صفحات کے اس کتابچہ میں بارہ گیت ہیں۔ اور ان گیتوں میں ان وعدوں کو نظم کیا گیا ہے جو مختلف درجوں میں سکاؤٹ اپنے ملک و قوم اور اپنی تحریک سے کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ نظمیں فوق نے کسی کی فرمائش پر لکھی ہوں لیکن ان نظموں کے مرکزی خیال خود فوق کی رُوحِ شاعری کے عین مطابق ہیں۔ یہ نظمیں بچوں اور نوجوانوں میں احترامِ انسانیت اور حُبِّ وطن کے مقدس جذبات پیدا کرتی ہیں اور انہیں قابلِ تقلید شہری بنا سکھاتی ہیں۔ یہ نظمیں ۱۹۲۶ء میں لکھی گئیں۔ سکاؤٹوں کے ساتویں گیت سے دو اقتباسات:

کوئی کرتا نہیں شفقت نہ سہی
عیش دیتا نہیں دعوت نہ سہی
اہلِ دُنیا میں مروّت نہ سہی
نہ سہی ان کی عنایت نہ سہی
آؤ ہم اپنی مدد آپ کریں

کیوں پسند آتے ہمیں رسوائی
ہم پہ کیوں ہو اثرِ خود رائی
کیوں نہ قوت کی کریں یکجائی
ہم سب آپس میں ہیں بھائی بھائی

آؤ ہم اپنی مدد آپ کریں
"نغمہ و گلزار" صفحہ : ۱۸۲
"سکاؤٹوں کے گیت" صفحہ : ۹

منظر نگاری

اُردو میں منظر نگاری کی روایت بہت پُرانی ہے۔ دکنی زبان کے قدیم قصّوں سے لے کر دَورِ جدید کی بیانیہ نظموں تک ہر جگہ منظر نگاری کے جاذبِ دِل و نگاہ نمونے مِل جائیں گے البتہ ۱۸۷۴ء میں جب "انجمنِ پنجاب" کے زیرِ اہتمام جدید شاعری کا آغاز ہُوا تو منظر نگاری کو بھی اِک حیاتِ تازہ ملی۔

"انجمن پنجاب" کے جدید طرز کے مشاعرہ کے بارے میں مولانا حالی فرماتے ہیں :

"۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب گورنمنٹ بکڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در و بست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے"۔ ؎

"انجمن پنجاب" کے مشاعروں میں جہاں نظم کے لیے قومی اور سماجی موضوعات دِیے جاتے تھے وہاں منظر نگاری کے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی تھی۔ چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد کی نظمیں "شب قدر"، "ابرِ کرم" اور "زمستان" وغیرہ اور مولانا حالی کی نظمیں "برکھا رُت" اور "حبِّ وطن" وغیرہ منظر نگاری کے اعلیٰ

نمونے پیش کرتی ہیں۔

فوق بھی منظر نگاری کی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کی منظریہ نظمیں ان کے اپنے مشاہدہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ جس منظر کو پیش کرتے ہیں وہ متحرک اور متنفس ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم "کشمیر کے ایک جنگل کا نظارہ" سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ نظم فوق نے ۲۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کی رات کے نو بجے بمقام "بڈ مقام" لکھی ہے

جنگل میں زندگی کا کیا لطف آرہا ہے
سبزہ ہر ایک جانب مخمل بچھا رہا ہے

اے سرزمین حمرا رونق ہو کیوں نہ تجھ میں
خود باغبانِ قدرت تجھ کو سجا رہا ہے

ہے کوہ پر الاؤ یا ثرونگ کی جھلک ہے
یا چرخ پر ستارہ یہ جھلملا رہا ہے

چھائی ہے گو خموشی ساری فضا میں لیکن
دلکش سی ایک سیٹی کوئی بجا رہا ہے

گو ہر ہے بزم شہ میں ہم ہیں غریب ہم کو
ہر طائر خوش الحان گانا سنا رہا ہے

کیا لطف دے رہی ہیں ابر کرم کی بوندیں
ہر برگ گل نکھر کر جوبن دکھا رہا ہے

شاہوں کو بھی نہیں یہ بے فکریاں میسر
چرواہا جس مزے سے بھیڑیں چرا رہا ہے

پانی کے مٹکے سر پر ان لڑکیوں کے دیکھے
جوبن پری بنا کر ان کو اڑا رہا ہے

("کلام فوق"۔ ص : ۱۰۷)

ایک اور نظم میں ایک ندی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

اِک ندی آتی ہے لہراتی ہُوئی
زور پر پانی کے اتراتی ہُوئی
راہ کی ہر شئے کو ٹھکراتی ہُوئی
بلکہ آگے آگے لے جاتی ہُوئی

ہے نڈر وہ حق پرستوں کی طرح
چال بھی ہے اس کی مستوں کی طرح
شور و غل کرتی ہُوئی گاتی ہُوئی
سانپ کی مانند بل کھاتی ہُوئی
جوش میں کچھ جھاگ سی لاتی ہُوئی
پتھروں سے سر کو ٹکراتی ہُوئی

سوئے پستی ہے رواں کس شوق سے
سوئے بستی ہے رواں کس شوق سے

سیاحت کشمیر کے حوالہ سے فوق صاحب کی کئی نظمیں ہیں جو منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

طنز و مزاح

ہمارے اکثر مصلح شعراء نے طنز و مزاح سے کام لیا ہے۔ طنز و مزاح

دونوں زندگی میں ہر طرح کے عدم توازن کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق شدت یا intensity کا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات معاشرتی اور سماجی برائیوں کا گرد و غبار خالص مزاح کی پھوار سے نہیں بلکہ طنز کی تند و تیز بارش ہی سے دھویا جا سکتا ہے۔

فوق نے بھی اپنی اصلاحی شاعری میں طنزیہ انداز سے بھرپور کام لیا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول کی سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کو نشانہ بنایا جن کی وجہ سے معاشرہ ایک کربناک صورتحال سے دوچار تھا۔ اپنے زمانے میں لوگوں کی بے عملیوں اور ناکامیوں کی نشاندہی بھی کی۔

ایک وہ ہیں کہ جو اجداد کو دیتے ہیں فروغ
ایک ہم نام سلف کو جو مٹا دیتے ہیں
ایک وہ کرتے ہیں تاریکی میں پیدا تنویر
ایک ہم نور کو ظلمت میں چھپا دیتے ہیں

("کلامِ فوق" ص: ۲۴-۱۲۳)

غضب غضب کہ جو دنیا کے بھی نہیں قابل
ستم ستم کہ وہ دیں کا امام ہوتا ہے

("کلامِ فوق" ص: ۱۳۰)

کہیں کہیں فوق کے ہاں خالص مزاح کے نمونے بھی مل جاتے ہیں مثلاً

کہتے ہیں قصہ ترا سنتے تو سنتے کس لیے
وہ کوئی افسانۂ آرائشِ محفل نہ تھا

("کلامِ فوق" ص: ۲۲۹)

ایک عالم دیکھ کر حیران ہے
حُور کے پردے میں تو انسان ہے
فکرِ دُنیا، فکرِ دیں، فکرِ مآل
کِس مصیبت میں ہماری جان ہے
بھاگتا پھرتا ہوں آبادی سے بس
شاعری ہے یا کوئی خفقان ہے

("نغمہ و گلزار" ص: ۱۷۵)

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب "اُردو ادب میں طنز و مزاح" میں لکھتے ہیں: "اکبر الٰہ آبادی نے ہنگامی مسائل اور اکابر کے طرزِ عمل پر طنز کا آغاز کیا تھا۔ ان کی طنز اُن سماجی اور غیر سماجی رجحانات پر تھی جو اس زمانے میں بہت عام ہو رہے تھے۔ ظفر علی خان نے اکبر کی طنز کا تتبع کیا۔"[۱۶] مزاحیہ و طنزیہ شاعری کا ایک غالب حصہ اکبر الٰہ آبادی کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ فوق بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ظفر علی خان کے ساتھ ان کی شعری مطابقتوں کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

"نقوش" کے طنز و مزاح نمبر میں عبداللہ قریشی صاحب لکھتے ہیں:

"فوق صاحب نے ایک ثقہ انسان کی طرح زندگی بسر کی۔ ساری عمر اخبار نویسی کی یا پھر تاریخ نویسی پر بیش بہا کتابیں لکھیں۔ ایک مؤرخ میں جس قسم کی متانت ہونی چاہیے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لیکن متین اور سنجیدہ ہونے کے باوجود جب کبھی بے تکلف دوستوں کی محفل میں کھلتے تو اس وقت ان کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اخبار نویس کی حیثیت سے بھی آپ کو قارئین کی دلبستگی کا خیال رکھنا پڑتا تھا، چنانچہ شروع شروع میں لطائف و ظرائف کے نام سے آپ کے اخبار میں ایک مستقل کالم ہوتا تھا جس پر آپ کا یہ شعر درج ہُوا کرتا تھا۔

روتی صورت ہو کوئی لاکھ ہنسا دیں اس کو
دل پھڑک جائے لطیفہ وہ سنا دیں اس کو

آپ کی تالیفات میں دو کتابیں "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" اور "استادوں شاگردوں کے لطیفے" بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ لطیفہ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

کبھی کبھی حالات و واقعات سے متأثر ہو کر آپ طنز و مزاح کے تیر بھی برساتے تھے جو بے حد کامیاب ہوتے تھے۔ اس قسم کی نظموں سے آپ "خفتگان کشمیر" کو بیدار کرنے کا کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خاص قسم کی لطیف طنز و ظرافت پائی جاتی ہے مگر آپ کی طنز و ظرافت سمجھنے کے لیے الفاظ کی غرابت کے پردے ہٹانے اور ہر واقعہ کا پس منظر جاننے کی ضرورت ہے اور یہ بات آپ نے اپنی نظموں کی ابتدا میں بیان کر دی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آجائے تو آپ کی طنز و ظرافت پوری طرح دل میں اتر جاتی ہے۔" اپنے مضمون میں قریشی صاحب نے فوق کی شاعری میں سے جو مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۹۱۹ء میں لاہور کی نکلسن روڈ پر بمبئی ہیر کٹنگ سیلون کے نام سے مسٹر محمد اسماعیل باربر کی ایک فیشن ایبل دکان تھی جس میں ایک نوخیز یورپین لڑکی انگریز عورتوں کے بال سنوارنے پر ملازم تھی۔ ایک پنجابی نوجوان اس کو دیکھ کر ریشہ خطمی ہو گئے۔ فوق نے اس واقعہ پر مندرجہ ذیل اشعار کہے۔

اتفاقاً کل میں جا نکلا نکلسن روڈ پر
جس جگہ تھے جمع کچھ نظارے سائٹ کے لیے
بمبئے ہیر کا سرِ راہ اک وہاں سیلون ہے
شب تو شب جو وقف ہے دن کو بھی لائٹ کیلیے

اِک مس کم سن کہ ہے مست شباب حُسن وعشق
بوالہوس مرتے ہیں جس پہ اپنے رائٹ کے لیے
جب اسے دیکھا جبینِ ناز پر بل آگئے
گفتگو جب کی، ہُوئی تیار فائٹ کے لیے
تخلیہ چاہا تو فرمایا کہ قدرِ خود شناس
کوششیں بیکار ہیں کالے کی وائٹ کے لیے

شہر آشوب قسم کی ایک نظم کے چند اشعار:

گر زبان فوق سے ہو کچھ بیانِ کاشمیر
ہے یقیں بے چین کردے داستانِ کاشمیر
میرِ بزمِ فتنہ و شر و اعظانِ کاشمیر
عاملانِ شرک و بدعت عالمانِ کاشمیر
چاہیے تو اِک اردلی گٹھڑی میں سب کو باندھ لے
ہیں بظاہر رشکِ صد رستم جوانِ کاشمیر

کچھ اور اشعار ہیں اپنے عہد کے سیاسی اور معاشرتی حوالے سے گہری طنز کی گئی ہے۔

خلقِ نادار کی بھی سُن زاری
نام تیرا ہے خالقِ باری
پی گئے خون تیرے بندوں کا
جن کو بخشی ہے تُو نے سرداری
ان کی نظریں ہماری روزی پہ
چھین کر لے گئے زمیں ساری

ان کا سرمایہ اپنی پامالی
ان کی تفریح اپنی ناداری
خُون اتنا سفید ہے ان کا
روز روشن میں ہے سیہ کاری
ان کے کُتّوں کو نعمتیں حاصل
تیرے بندوں کو ذِلّت و خواری
ٹوک سکتا نہیں کوئی ان کو
ڈر سے خاموش خلق بے چاری
ہم غریب اور تُو غریب نواز
ہے تجھی سے اُمّید غم خواری

انجام ظلم کا کبھی اَچھا نہیں ہُوا
سو بار ہم تو کہہ چکے سر پیٹ کر انُھیں
معلوم ہو حقیقتِ دردِ جناب فوق
کشمیر کا بنا دیں گورنر اگر انھیں

اُبل پڑنے پہ آمادہ ہیں چشمے دیدۂ تر کے
جسے طوفاں سے بچنا ہو سمندر پار ہو جائے
تماشا ہو اگر تُو بھی کسی پر جان دے ظالم
مزا ہو گر مسیحا بھی کبھی بیمار ہو جائے

خدا ہی آبرو رکھے تو رکھے فوق اس گھر کی
میاں ہو جس کا جاہل اور ہو اخبار خواں بی بی

کیوں سوم ناتھ رکھے اس کو بھلا ملازم
عرضی پہ جس نے لکھا محمود نام اپنا

قحط جائے گا تو جائے گی وبا
ساتھ سالے کے ہی سالی جائے گی
ضعف معدہ کی شکایت ہے مجھے
ایک گالی خیر کھا لی جائے گی
فوق کو کشمیر میں جانے تو دو
اس کی توبہ آزما لی جائے گی

چل گئے وہ چال "ماموں بھانجا" کشمیر میں
قافیہ ہے تنگ "شمو جان" کا کشمیر میں
کافروں سے بھی ہے بدتر وہ مسلماں کے لیے
میر زادہ ہو کہ کوئی میرزا کشمیر میں
خونِ مسلم تیغِ مسلم سے جہاں ہو رات دن
کی یزیدوں نے وہ پیدا کربلا کشمیر میں

فوق کی شاعری پر اقبال کا اثر

کوئی سچا شاعر اپنے متقدم اور معاصر عظیم شعراء سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ وہ ان شعراء سے بعض اوقات متاثر ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ ان کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ فوق پر بھی بعض شعراء کا اثر ہے مثلاً غالب کا مشہور شعر ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغ راہگزار بادیاں

اور فوق کا شعر ہے۔

آفرینش کے فنا آمادہ ہیں اجزا تمام
اس دبستان میں یہی درسِ خرد افزا پڑھا

("کلامِ فوق" ص : ۲۲۲)

ظاہر ہے فوق نے غالب کے شعر کے پہلے مصرع کو اختلافِ ترتیب الفاظ کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ یہ توارد نہیں۔ سرقہ بھی نہیں کیونکہ معروف اشعار کا سرقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسے اثر پذیری کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح استاد ذوق کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

جس انسان کو سگِ دُنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا

اسی زمین میں فوق نے بھی غزل کہی ہے اور ذوق اور فوق کے اتحادِ طبع و مزاج نے فوق کی غزل کو ذوق کی غزل کا ہم رنگ بنا دیا ہے۔ فوق کی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

جسے اخلاق میں اچھا نہ پایا
برابر ہے اُسے پایا نہ پایا
حصولِ علم سے نفرت ہے جس کو
کبھی اُس نے کوئی رتبہ نہ پایا
ہوئیں اے فوق با سٹھ منزلیں طے
ابھی تک راستہ سیدھا نہ پایا

("نغمہ و گلزار" ص : ۱۰۶، ۱۰۷)

لیکن اپنے کلام میں فوق سب سے زیادہ حضرت علامہ اقبال سے متاثر ہوئے۔ فوق اور اقبال کے ادبی و نجی مراسم و تعلقات پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف فوق کی اقبال سے اثر پذیری کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ "ضربِ کلیم" پہلی بار جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک نظم بعنوان "ایک بحری قزاق اور سکندر" ہے۔ اس میں قزاق، سکندر سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

سکندر حیف تُو اس کو جواں مردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں تُو میدانی مَیں دریائی

اس زمین میں فوق نے اگست ۱۹۳۸ء میں پرتاپ کالج سری نگر کشمیر کے ایک مشاعرہ میں جو بیادگار حضرت علامہ اقبال ہوا تھا، ایک نظم پڑھی۔ اس نظم سے فوق کی علامہ سے عقیدت کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔ نظم کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

گزر میرا ہُوا جب جانب دروازہ رُشنائی
مزار حضرت اقبال سے مجھ کو ندا آئی
مرے پیغام کے عاشق مرے شعروں کے شیدائی
عمل بھی کر کبھی ان پر نہ بن خالی تماشائی

اکیس ۲۱ اشعار پر مشتمل اس نظم میں فوق نے اپنے الفاظ میں پیام اقبال دُہرایا ہے لیکن آخر میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ؎

کہاں سطحی مضامین فوق کے بے کیف شعروں کے
کہاں اقبال تیرے دِل کے دریاؤں کی گہرائی

(نغمہ وگلزار ص : ۷۳ تا ۷۵)

"بانگِ درا" میں حضرت علاّمہ کی ایک نظم بعنوان "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے۔ اس نظم کا ٹیپ کا مصرعٔ یہ ہے ع

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اسی مصرع کو ٹیپ کا مصرع بنا کر ۱۹۳۸ء میں فوق نے ایک نظم اپنے وطن کشمیر کے لیے لکھی۔ اس نظم کا پہلا بند تحریر کیا جاتا ہے۔

گلمرگ ولدر و وانگت کی وادیاں جہاں ہیں
فردوس کی فضا میں آبادیاں جہاں ہیں
صحت فزا ہوا کو آزادیاں جہاں ہیں
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

("نغمہ وگلزار" ص : ۷۵)

فوق کے کچھ اور اشعار جن میں حضرت علاّمہ اقبال کا کسی نہ کسی پہلو سے ذکر ہُوا ہے۔ درج ذیل ہیں ؎

حالِ دِل ہم انھیں اس طرح جتا دیتے ہیں
شعر اقبال کے دو چار سنا دیتے ہیں

(کلامِ فوق - ص : ۶۲)

کیا اے فوق چاک اقبال نے اسرار کا پردہ
جو باقی رہ گئے تھے کر دیئے وہ بھی عیاں تُو نے

("نغمہ و گلزار" ص : ۷۰)

اقبال کے حوالے سے فوق کی یہ بات شاعرانہ تعلّی کے زمرے میں آسکتی ہے مگر فوق کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف اقبال نے کئی بار کیا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں جب پہلی بار "کلامِ فوق" شائع ہُوا تو اقبال نے تاریخ نکالی اور یہ اشعار کہے۔ ان اشعار کا تذکرہ پہلے باب میں بھی موجود ہے۔

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار
معلوم ہُوا مجھ کو حالِ نضرِ فوق
شستہ ہے زبان جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نضرِ فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہُوئی اقبال
ہاتف نے کہا لکھ دے کمالِ نضرِ فوق

۱۳۲۷ھ [8]

یہاں نضر بفتح نون تر و تازگی اور زیبائی وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے نظر پڑھا ہے جو صحیح نہیں۔ اس سے سو عدد بڑھ جاتے ہیں اور تاریخ غلط ہو جاتی ہے۔[9]

"فوق کی غزل"

شاعری کی مختلف تعریفوں اور شاعری کے بارے میں مختلف نظریات کو بنیاد بنا کر کسی شاعر کے کلام کو دیکھا اور پرکھا جائے تو اس سے شاعر کے فکر و فن سے اِنصاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس شاعر کی صحیح تعیّنِ قدر کے لیے ضروری ہے کہ اس شاعر کے دَور کا اور اس دَور کے فکری اور وجدانی رویّوں کا مطالعہ کیا جائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ دیکھا جائے کہ خود شاعر اپنے فکر و فن اور اپنے ذہنی و وجدانی رشتوں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ وہ ادب و فن کی کن تحریکوں اور سلسلوں سے مربُوط ہونا پسند کرتا ہے اور کن سے گریز یا اختلاف کرتا ہے؟ فوق کی شاعری پر رائے زنی کرنے سے پہلے خود انہی کی زبانی ان کے فکری اور وجدانی میلانات کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"میں منشی صاحب (منشی سُورج نرائن صاحب مہر دہلوی) کی طرح شاعری کے معنی یہ سمجھتا ہُوں کہ" دُنیائے خارجی میں جو نظارے نظر سے گزرتے ہیں اور دُنیائے داخلی میں جو کیفیات دِل محسوس کرتا ہے اُنھیں اس طرح الفاظ موزوں کے کپڑے پہنائے جائیں کہ جو اثر خود شاعر کے دِل پر ہوا ہے وہی پڑھنے والے کی طبیعت پر بھی ہو اور جس قدر اسے کامیابی ہو اتنا ہی اس کا کمال ہے۔"

("کلام فوق" طبع اوّل، ص : ۲)

شاعری کے بارے میں عوام میں ایک تاثر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ شاعری بے کار مشاغل میں سے ہے اور اس سے ذہنی تعیش کے سوا کچھ حاصِل نہیں ہوتا اور یہ مشغلہ قوم کو بیکار کر دینے والا ہے۔ شاید انہی احساسات نے حضرت

علامہ اقبال سے ایک زمانے میں یہ کہلوایا تھا ؎

مدیرِ "مخزن" سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے۔

یہ علامہ صاحب کی وقتی سوچ تھی۔ بعد میں خود ان کی شاعری نے مُسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔

شاعری کے بارے میں فوق بھی تعمیری نظریات رکھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے بڑے کرب سے لکھا ہے:

"آج کل چاروں طرف سے گُل و بُلبل کی شاعری پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے اور بعض حضرات کے خیال میں تو جس قدر قومی امراض ہیں ان میں سب سے زیادہ یہ عشقیہ شاعری ایک خطرناک اور تباہ کُن بیماری ہے .... لیکن تمام قومی امراض کو چھوڑ کر صرف غریب شاعری کے عضوِ ضعیف پر ہی نزلہ گرانا انصاف سے کچھ بعید معلوم ہوتا ہے۔ شاعری سے ملک کو وہ نقصان نہیں پہنچا جو باہمی نا اتفاقی، حسد و بغض اور ملک کے بیکار مشغلوں چانڈو نوشی، بٹیر بازی، عیاشی، شراب نوشی وغیرہ سے پہنچ رہا ہے۔ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ غرض شاعری کسی قابل نہ سہی پھر بھی ایک علمی مشغلہ ہے اور علمی مشاغل کسی علم دوست کے نزدیک زندگی کا بہترین اور کار آمد حصّہ ہیں۔" [۱۸]

اپنے اس دیباچہ میں فوق صاحب نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ گُل و بُلبل وغیرہ شاعری کے رموز و علائم ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"قمری و شمشاد اور گُل و بُلبل کے الفاظ محض استعارہ و اشارہ کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو بات تمثیل کے طور پر بیان ہو وہ نہایت مؤثر ہوتی ہے۔ یہی اشعار ہر موزوں مقام اور موزوں جگہ پر عائد ہو سکتے ہیں۔ گُل و بُلبل کے دو لفظ

لے کر شاعر ہزار ہا نکات اور رمز و کنایہ کے دفتر کے دفتر کھول کر رکھ دیتا ہے"۔[11]

فوق اپنی ایک غزل کے تمہیدی نوٹ میں لکھتے ہیں:

۴ار دسمبر (۱۹۰۷ء) کو مصرع طرح ع

"میرے تمھارے چرچے سب کی زبان پر ہیں"

پر کچھ لکھنا چاہا۔ طبیعت پر زور بھی ڈالا لیکن شاعری تو ایسی چیز ہے جو کسی دباؤ اور جبر میں نہیں رہتی۔ بلاؤ تو آتی نہیں۔ نہ بلاؤ تو اڑی چلی آتی ہے۔ ایک گھنٹہ تک بحر تفکر میں غرق رہا۔ دو چار شعر بھی ہوئے مگر وہ پسند نہ آئے"۔[12]

فوق کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ان کے نظریۂ شعر پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(الف) وہ اپنے احساسات و جذبات کو موزوں الفاظ کے ذریعے دوسروں کے دلوں میں منتقل کر دینے کو منتہائے شاعری سمجھتے ہیں۔

(ب) شاعری ان کے نزدیک بیکاروں کا مشغلہ نہ تھی بلکہ ایک علمی مشغلہ تھی جسے زندگی کا بہترین اور کارآمد حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

(ج) شاعری میں وہ طبیعت کی آمادگی کے قائل تھے۔ طبیعت پر جبر اور دباؤ ڈال کر شعر نہ کہہ سکتے تھے یعنی فطری جوش کے زیر اثر شعر کہتے تھے۔

شاعری کا آغاز

فوق کی شاعری کی ابتدا (۹۲-۱۸۹۱ء) میں ہوئی وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"شاعری کا شوق (۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء) میں طالب علمی ہی سے تھا۔ قصبہ جالکے (ضلع سیالکوٹ) سے جہاں میں پڑھا کرتا تھا شاعری کی ابتدا ...... ہوتی ہے۔ وہاں سے ۱۸۹۴ء میں لاہور چلا آیا۔ یہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا لیکن طالب علمی

کی غزلیں اور نظمیں (جواب مضمون وغیرہ) کی عجیب قسم ہُوا کرتی تھیں،"^{۱۳}

فوق کے اس زمانے کے حالات اور لاہور کے مشاعروں کا حال پہلے باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہاں ان کے فلسفۂ شعر کو سمجھنے کے لیے ان حالات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"طالب علمی کے زمانے میں کئی دفعہ ایسا ہُوا کہ ایک ایک دِن میں کئی کئی غزلیں کہی گئی ہیں۔ لیکن جب شاعری کی تمیز ہُوئی اور معلوم ہُوا کہ ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صُورت

تو پچھلی مضحکہ خیز غزلوں کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ اب یہ نوبت ہے کہ برسوں میں کوئی اچھی غزل یا اچھا شعر زبان سے نکل جاتا ہے۔ لاہور کے ایامِ طالب علمی میں بھی ایک دفعہ تاریخ ہند کا ایک مضمون منظوم کر کے سکول میں لے گیا تھا۔ اُردو کی خوش خطی ہمیشہ بجائے نثر کے نظم میں ہُوا کرتی تھی۔ عرصہ ہُوا یہ تمام مسودات اور اشعار جن کا غالباً وزن تک بھی درست نہ تھا اور جو ایک عجیب قسم کا مجمُوعہ تھے۔ بے توجہی اور لاپرواہی (بے پرواہی؟) کے سمندر میں خس وخاشاک کی طرح بہہ کر بے نام ونشان ہو چکے ہیں۔ مَیں نے اپنی نظموں کو دو حصّوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے کا نام نظم قدیم ہے۔ اس میں ابتدائے شوق کی وہ نظمیں (غزلیات ونعت وسلام) درج ہیں جو سیالکوٹ جموں۔ گھڑنل اور لاہور میں جون ۱۸۹۵ء سے نومبر ۱۹۰۱ء تک کے ایام میں وقتاً فوقتاً کہی گئیں ہیں۔ اس زمانہ میں جب کہ دنیاوی مصائب اور تفکرات سے دِل بے پروا اور مستغنی تھا، شاعری کا شوق بلکہ خبط عین شباب پر تھا۔ جب جمّوں گیا تو وہاں بہ مشورہ قاضی فقیر علی صاحب عاقل، حضرت احسان شاہجہانپوری کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ حصّہ

اول کی اکثر غزلیں حضرت احسان کی نظر فیض اثر سے گزری ہوئی ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لینی شروع کی۔ اب سارے کلام کو ایک دفعہ پھر دیکھنے کی ضرورت ہے، مگر یہ دردسری کون کرے ؟"[۱۴۱]

پہلی غزل

خود فوق کا بیان ہے کہ انھوں نے پہلی غزل جون ۱۸۹۵ء میں کہی اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

جوشِ سودا میں چلے ہیں جانبِ کہسار ہم !
تم سے رخصت ہوتے ہیں اب اے دَر و دیوار ہم

فوق کے ابتدائی کلام پر اصلاح دینے کے بعد حضرت داغ نے فوق کو جو چند الفاظ لکھے ان سے اس زمانے کی استادی شاگردی کے آداب پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے اس نوٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ فوق اپنی اس پہلی غزل کی تمہید میں لکھتے ہیں :

"یہ غزل جون ۱۸۹۵ء میں بعمر ۱۸ سال بمقام سیالکوٹ جن دِنوں میں بندو بست کا کام سیکھ رہا تھا، کہی گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی اکثر شعر اشعار کہا کرتا تھا لیکن وہ بے پروائی کی ندر ہوتے رہے۔ در حقیقت یہی غزل پہلی غزل کہلائی جانے کی مستحق ہے۔ ۱۸۹۷ء میں لاہور سے یہ غزل چند اور غزلوں کے ہمراہ جب نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ مرحوم کی خدمت میں بمقام حیدر آباد دکن اصلاح کے لیے بھیجی گئی تو آپ نے اصلاح فرمانے کے بعد مندرجہ ذیل الفاظ بھی لکھے جو آپ کی یادگار سمجھ کر تبرکاً درج کیے جاتے ہیں۔

"فوق صاحب اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمھارا نام شاگردوں میں درج

کر لیا ہے ۔ نیاز دلا دینا ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ ۔ حضرت نظامی گنجوی ، شیخ سعدی ، حافظ شیرازی ، حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ ، خواجہ میر درد رحمۃ اللہ ، حضرت شاہ نصیر رحمۃ اللہ ، حضرت اوستاد ذوقؔ مرحوم کے نام کی ۔) ۵ے

ترتیب کلام

فوق نے اپنے کلام کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے ۔ اس ترتیب کے بارے میں خود لکھتے ہیں :

"ترتیب غزلیات کے متعلق میرا خیال موجودہ شعراء کو خدا جانے پسند آئے یا نہ آئے لیکن ایجاد بندہ کے لحاظ سے شاید بعض اصحاب "کُل جدیدٌ لذیذٌ" پر عمل کریں ۔ کلام فوق کی ترتیب بالکل نرالی طرز پر ہے ۔ اس سے پہلے جس قدر دیوان یا کلیات وغیرہ چھپے ہیں ان میں ردیف وار غزلیات کا خیال رکھا گیا ہے ۔ اور کسی شاعر نے کبھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس نے غزل کہاں لکھی ، کس وقت لکھی اور اس وقت طبیعت پر کیا خاص اثر تھا ۔ میرا خیال ہے کہ ان باتوں کے ظاہر کر دینے سے شاعر کی طبیعت کا ایک خاص انداز معلوم ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری کی یادگار تاریخی طور پر قائم رہ جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ پڑھنے والے اور خود شاعر کے دل پر اس وقت ، اس مقام اور طبیعت کی اس محویت کے (جس میں وہ غزل یا نظم کہی گئی ہے) کے یاد آنے سے دِل پر ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے ۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر بیم و رجا کے ساتھ سب سے پہلے نیاز مند فوق نے نئی طرز کے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے ۔ خدا کرے یہ طرز احباب کو پسند آ جائے ۔ اس طرز کو نباہنا فی الواقع مشکل ہے ۔ ہر غزل یا نظم لکھتے وقت موسم ۔ طبیعت ، وقت ، مقام وغیرہ کی یادداشت لکھنا مُفت کی دردسری ہے اور باوجود التزام خاص

کے مجھ سے بھی بعض اوقات (بالخصوص نظمِ قدیم میں) وقت اور تاریخ کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکا، لیکن جب عادت ہو جائے گی اور یہ طرز مقبولیت اختیار کرے گی تو کوئی تکلیف محسوس نہ ہو گی بلکہ ایک خاص لطف اور ایک خاص اثر حاصل ہُوا کرے گا۔"[۱۶]

فوق کی غزل کی درج ذیل خصوصیات اپنے اندر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

صداقت فکر و احساس

فوق، شاعری میں شاگرد تو داغ کے تھے لیکن دراصل وہ اقبال، حالی اور ظفر علی خان کی روایت کے شاعر تھے، اور داغ کی فکریات اور مضامین کے متبع نہ تھے۔ اس زمانے میں مسدس حالی کے ان اشعار کا ہر طرف بہت غلغلہ تھا۔

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

صداقت احساس اور اصلیت پر مولانا حالی نے ابن رشیق اور ملٹن کے تتبع میں بہت زور دیا ہے۔[۱۷] ویسے بھی صداقت احساس ہمیشہ شعر و ادب کی ناگزیر خوبی قرار دی جاتی رہی ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب ریاست

("ناموس" میں شاعروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اس سلسلے میں جناب عزیز احمد لکھتے ہیں :

"بہر حال افلاطون کی ریاست میں شاعروں کے لیے جگہ نہیں، لیکن اس کتاب میں افلاطون کے پیش نظر یونان کے شعراء ہیں جن کا کلام اس کے نزدیک جھوٹ کا مجموعہ ہے"۔ [۱۸]

فوق کے کلام کی ایک خصوصیت اصلیت اور سادگی ہے جو حالی کے بقول شاعری کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔

اخلاقی موضوعات

فوق کی غزل میں جا بجا اخلاقی مضامین کی روش نظر آتی ہے۔ یہ شاعری میں ان کی مقصدیت نوازی کا پرتو بھی ہے اور شعوری سطح پر اپنے استاذ الاساتذہ حضرت ذوق کی پیروی بھی کی۔ چنانچہ لہو و لعب کے خلاف اور شراب اور عیش و تساہل کے خلاف ان کے یہاں اکثر اخلاق آموز اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً شراب کی مذمت میں فرماتے ہیں۔ ؎

کہاں تک دخترِ رز کی بڑھتی جائے گی یہ بدمستی
کہ آخر ہو کے وہ رسوا تری محفل سے نکلے گی

لہو و لعب کے خلاف یوں متنبہ کرتے ہیں ؎

غور سے دیکھو تو ہوں عبرت نما
گو بظاہر "کھیل" سرتا سر ہوں میں

بھلائی کی ترغیب اس طرح دی ہے ؎

بھلائی کر جو ہے مقصود نام کی خواہش
کہ نیک کام ہی سے نیک نام ہوتا ہے
کہیں سُنا ہے ملا اوج پست ہمت کو
کہیں رذیل بھی عالی مقام ہوتا ہے
حلال کرتے ہیں سب کو وہ بے گنہ اے فوق
نہ کیجے غصہ کہ غصہ حرام ہوتا ہے

سادگی

سادگی فوق کی زبان میں بھی ہے اور فکر میں بھی۔ زبان کی سطح پر سادگی شاعر کی قادر الکلامی کی دلیل ہُوا کرتی ہے۔ جو شاعر سادہ اسلوب اور سادہ زبان میں اپنے مافی الضمیر کو قاری تک کامیابی کے ساتھ منتقل کر دے اسے ایک کامیاب شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ فکری سادگی یہ ہے کہ فوق عام معاشرتی اور اخلاقی مضامین کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں شوخیٔ بیان بھی کہیں کہیں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مثال دیکھیں ؎

پہلے جو تھے زمیں پر اب آسمان پر ہیں
یعنی مکان والے اب لامکان پر ہیں
تیر و کمان پر ہیں، تیغ و سنان پر ہیں
قاتل تری نگاہیں اونچی اُڑان پر ہیں
اک میں کے میرا قصہ سُنتا نہیں ہے کوئی
اک تُو کے تیرے چرچے سب کی زبان پر ہیں
اے فوق یہ تخلص کیا خوب ہے ہمارا
اس سے ہے اوج ہم کو ہم آسمان پر ہیں

("کلامِ فوق"، ص: ۹۶)

تغزل

تغزل غزل کی بنیادی خوبی ہے۔ یہ بظاہر سادگی، جوش اور اصلیت کی طرح ایک لفظ ہے لیکن حقیقتاً یہ کیفیت متعدد اور پیچ در پیچ عوامل کا حاصل ہوتی ہے۔ تغزل میں تفکر اور اظہار کے سارے سلیقے آجاتے ہیں۔ فوق کی غزل میں فکر و خیال کے متعدد زاویے ہیں اور ان زاویوں کو حسن اظہار کے متنوع اسالیب میں بیان کیا گیا ہے لیکن تغزل کا دامن بھی عموماً ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آتا۔ اس حسن تغزل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

کہہ نہیں سکتے زور سے کچھ ہم
بات مانو تو مہربانی ہے

انسان ہوں خمیر میں ہے نسیاں
رسوا تو نہ کر اب اے خطا پوش
آیا بھی گیا بھی دم زدن میں
جھونکا تھا کہ تھا شباب کا جوش
اے شرم گنہ نہ کر کنارہ
اے رحمتِ خاص کھول آغوش

("کلام فوق"۔ ص : ۱۲۴)

دین کا رکھا نہ دنیا کا مجھے
چشم مست دوست تو نے کیا کیا

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنے آپ کو
آہ تیری جستجو نے کیا کیا

(نغمہ وگلزار۔ص : ۸۹)

حسنِ روایت

فوق کی غزل میں حسن روایت اپنی بھرپور اداؤں کے ساتھ موجود ہے۔ موضوعات غزل میں اور اسالیب اظہار و بیان میں ان کے یہاں روایت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ کلیم اختر اپنے مضمون "فوق کی شاعری" میں لکھتے ہیں۔

"فوق مرحوم غزل کے روایتی اور کلاسیک سکول کے نمائندہ ہیں...... وہ جس صنف میں لکھتے ہیں اس کے آداب کو قائم رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیات میں جو مضمون باندھے گئے ہیں وہ اگر انوکھے نہیں ہیں تو بوسیدہ بھی نہیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ انھوں نے پرانے تخیلات کو نئے انداز و نئے زبان و بیان میں لکھا ہے۔" [۱۹]

حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں مضمون آفرینی ایک مشکل بات ہے اور ہر شاعر سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اردو شاعری کا بڑا سرمایہ تکرار مضامین ہی پر مشتمل ہے لیکن اسی طرح جیسے شکیل بدایونی کا مشہور شعر ہے۔

پیتا ہوں پلاتا ہوں وہی بادۂ کہنہ
ہر روز مگر ڈھونڈ کے لاتا ہوں نیا جام

حسنِ روایت فوق کی غزلوں سے مترشح ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

یہ مذاق درد یہ ذوق خلش حاصل نہ تھا
تجھ سے جب الفت نہ تھی پہلو میں شاید دل نہ تھا

کاش اپنا گھر سمجھ کر آپ آ جاتے کبھی
دل جہانِ عیش تھا اجڑی ہوئی محفل نہ تھا

کہتے ہیں قصہ ترا سنتے کس لیے
وہ کوئی افسانۂ آرائشِ محفل نہ تھا

قصۂ غم عرض کرنے کی اجازت کیوں نہ دی
کہنا مشکل تھا مجھے سننا تجھے مشکل نہ تھا

ہم بڑی مدت سے سنتے تھے کہ ہے دیندار فوقؔ
جب اُسے پرکھا تو وہ دنیا کے بھی قابل نہ تھا

("کلامِ فوق" ص : ۲۲۹-۲۳۰)

غزل میں نعتیہ اشعار

غزل میں حمد و نعت کے اشعار کہہ جانا اُردو غزل کی مسلمہ روایت ہے۔ مثلاً غالبؔ کے ان اشعار کو نعتیہ قرار دیا گیا ہے۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زرد گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

ممتاز حسن ان اشعار کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ پہلے شعر میں "الفقر فخری" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے دو شعروں میں "معراج کی طرف"۔[۲۰]

فوق کی متعدد غزلوں میں بھی حمدیہ و نعتیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ پہلے چند حمدیہ اشعار دیکھیں ؎

باغ عالم میں عجب رنگ دکھایا تُو نے
درس عرفان ورق گل میں پڑھایا تُو نے
طُور پر حضرت موسیٰؑ کو جو آیا تھا نظر
مجھ کو ہر رنگ میں وہ جلوہ دکھایا تُو نے
پردۂ برق میں رہ رہ کے چمکنے والے
ابرِ باراں کی طرح مجھ کو رُلایا تُو نے

("کلامِ فوق"۔ ص : ۱۲۳)

حمد کی طرح نعت بھی فوق کا خاطر نشیں موضوع ہے۔ ان کی چند غزلوں سے نعت کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

یُوسفِ مصر بھی گر آئے زلیخا ہو کر
آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں ترا شیدا ہو کر
مدد اے جلوۂ نظارۂ محبوبِ خُدا
آنکھیں بے کار ہُوئی جاتی ہیں بینا ہو کر

معاشرتی احساس

شاعر معاشرہ کا عکاس ہوتا ہے۔ اس آئینے میں معاشرہ کے کیف وکم کی واضح شبیہیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال ؒ

شاعرِ رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

ڈاکٹر سید عبداللہ کے تجزیہ کے مطابق ڈرائیڈن نے مسرت بخشی اور بصیرت افزائی کو ڈرامائی شاعری کا مقصد قرار دیا ہے[۱۲] اور ظاہر ہے کہ اس مسرت بخشی بصیرت افزائی کا تصور معاشرہ سے قطع نظر کرکے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دراصل معاشرتی احساس ہی مقیاس فن اور معیار ہنر ہے۔ معاشرتی احساس سے عاری تحریروں کو ادب و فن کا نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ فوق کی غزل میں بھی گہرے معاشرتی احساس کی جھلکیاں ملتی ہیں ؎

بتائے زورِ فہم و عقل سے رازِ نہاں تُو نے
خدائی کی دکھائی شان مشت استخواں تُو نے
کبھی سرمایہ داروں کو بھی کھینچ اپنے شکنجہ میں
غریبوں پر زمیں کیوں تنگ کر دی آسماں تُو نے

("نغمہ و گلزار" میں صفحہ : ۶۹)

بڑھ گئیں کچھ اور بدکرداریاں
مژدۂ لاتقنطو نے کیا کِیا
پھر تڑپ اُٹھے ہوا خواہِ وطن
اے کلامِ فوق تُو نے کیا کِیا

("نغمہ و گلزار" ص : ۸۹)

چاند سُورج بھی چھُپے جاتے ہیں اے ابرِ محیط
ہند پر کیسی نحوست کی گھٹا آئی ہے
کام بے جا ہیں، عمل بد ہیں خیالات خراب
جو وبا آئی ہے ہم پر وہ بجا آئی ہے

آگے چل کر ابھی دیکھو گے جو ہیں فعل یہی
دہر پُر فتنہ میں آفت ابھی کیا آئی ہے

("کلام فوق"، ص: ۱۰۳)

قومی غزل

اُردو شاعری میں قومی غزل کا آغاز مولانا حالیؔ سے ہوتا ہے۔ مولانا حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی غزل میں اخلاقی نقاط اور قومی اور ملی مضامین باندھنے کی اہمیت پر زور دیا[۲۲] اور خود اپنی غزل میں بھی ایسے مضامین باندھے مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو جس کا مطلع یہ ہے ؎

رونا نہ ہوگا حالیؔ شاید کہ کم تمھارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمھارا[۲۳]

اس اسلوب کو علامہ اقبال نے بھی بغایت کمال برتا اور گویا اسے انتہا پر پہنچا دیا۔ فوق کے ہاں بھی غزل میں قومی اور ملی موضوعات بیان ہوئے ہیں البتہ فوق کی جدت کہیں یا جرأت، یہ ہے کہ انھوں نے ایسی غزل کو باقاعدہ "قومی غزل" کا عنوان دیا۔ ان کی ایک قومی غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

ہے پھٹے کپڑوں میں پوشیدہ پریشانئ قوم
دلِ حیراں ہے آئینۂ حیرانئ قوم

لاج ہے پردۂ ناموس کی ستّار کے ہاتھ
ننگ اسلام ہوئی جاتی ہے عریانئ قوم

کچھ نہیں اپنے بھلے اور بُرے کی پروا
کس قدر قابلِ افسوس ہے نادانئ قوم

("کلام فوق"۔ ص: ۱۳۴)

فوق کے یہاں غزل میں قومی مضامین کی کچھ اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بھیک دینی ہی پڑی آخر فقیر قوم کو
ایک جھڑکی پر جو ٹل جاتا ہیں وہ سائل نہ تھا
قصۂ اسلاف سن کر آپ کیوں برہم ہوئے
قصۂ ماضی تھا وہ فریادِ مستقبل نہ تھا

("کلام فوق"۔ ص : ۲۲۹)

دین کا رکھا نہ دنیا کا مجھے
چشم مست دوست تو نے کیا کیا
اب کہاں قومی چمن میں وہ بہار
اختلاف رنگ و بو نے کیا کیا

("نغمہ و گلزار"۔ ص : ۸۹)

ذاتی حالات کی عکاسی

جہاں فوق کی نظم میں ان کے ذاتی حالات بالتفصیل بیان ہوئے ہیں وہاں ان کی غزل بھی ان نقوش سے معریٰ نہیں ہے۔ دراصل فن کی ساری اہمیت ہوتی ہی داخلی اور ذاتی ہے۔ شاعر کائنات بھر کو اپنی ذات کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ جب وہ بظاہر دوسروں کے دردوالم کو اپنا موضوع بنا رہا ہوتا ہے اس وقت بھی دراصل اس کی ذات اس کے ساتھ شریک ہوتی ہے۔ فوق کے ذاتی حالات کی عکاسی زیادہ تر ان کے مقطعوں میں ہوئی ہے۔ ان اشعار سے ان کی ذاتی زندگی کے کئی رخ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

فوق پھر تیرا سخن مقبولِ عالم کیوں نہ ہو
فیض ہو تجھ پر اگر کچھ داغ سے استاد کا

("کلامِ فوق"۔ ص: ۱۱)

پھروں رویا ہُوں کلیجہ تھام کے
یاد جب آیا ہے مجھ کو جا مکے

("کلامِ فوق"۔ ص: ۶)

لکھی ہے صنعت توشیح میں اے فوق غزل
نام اس طرح بتاتے ہیں بتانے والے

("کلامِ فوق"۔ ص: ۱۶)

اے فوق شاعری کو ادب سے سلام کر
صُورت نکال جا کے کہیں روزگار کی

("کلامِ فوق"۔ ص: ۲۳)

دِلّی دروازے رہا کرتا ہے فوق خستہ جاں
اس قدر کیوں جستجو میں اے اجل حیراں ہے تُو

("کلامِ فوق"۔ ص: ۵۹)

اِنگلش زبان ہی سے جو نا آشنا ہو تم
اے فوق پھر ایڈیٹر اخبار کیوں ہُوئے

("کلامِ فوق"۔ ص: ۶۰)

نظم اقبال بھی بے چین تو کرتی ہے مگر
تیرے اشعار بھی اے فوق مزا دیتے ہیں

("کلامِ فوق"۔ ص: ۶۳)

اے فوق رہا خوف اگر مال کا جاں کا
پھر کاہے کو جاری کوئی اخبار کرے گا

"کلامِ فوق"

غزل کی تمہیدیں یا پس منظر

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ فوق نے ترتیب کلام میں ایک جدت یہ کی ہے کہ ہر غزل اور نظم سے پہلے اس کی شان نزول بھی درج کر دی ہے۔ اس پس منظر سے غزلوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح ضمنی طور پر بعض اہم تاریخی حقائق بھی سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس پس منظر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری وجدانی طور پر شاعر کا ہم سفر ہو جاتا ہے اور وہ غزل کو اس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح شاعر نے اسے لکھتے ہوئے محسوس کیا۔ فوق کے کلام کی اس خصوصیت کی داد دیتے ہوئے پروفیسر محمد علم الدین صاحب سالک لکھتے ہیں۔

"یہ تمہیدا تنی مختصر اور نپے تُلے الفاظ میں ہوتی ہے کہ پڑھنے والا پہروں مزے لیتا رہتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو اُردو شعرا میں تو بالکل مفقود ہے۔ البتہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی مثنویات اور آپ کے دیوان میں پائی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق تک کے دَور اسلامیہ کی تاریخ کی بہت سی غلطیاں اس کے مطالعہ سے دُور ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ کلام ہمارے درمیان سے معدوم ہو جاتا تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ کا یہ دَور بالکل پردے میں جا چھپتا اور ہمارے حریفان چابک دست جنھیں مسلمانوں کی تاریخ سے قلبی خصومت ہے، اسے بگاڑ کر خدا معلوم کیا کچھ بنا دیتے۔" [۲۴]

فوق کی یہ تمہیدیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں مثلاً ایک غزل کی تمہید میں فرماتے

ہیں۔

"میں اچے گڑھ ہی میں تھا کہ پنجابی کے ایک پرانے شاعر بردہ کا یہ مشہور مصرع میری زبان سے نکل گیا ؎

بردہ سیاں درختاں دی کرے راکھی پھل پکسن تے کھان نصیب والے

نواب شمشیر بہادر راخگر میرے پاس بیٹھے تھے۔ کہنے لگے اس مصرع کا کچھ مطلب سمجھا ہے کچھ نہیں سمجھا۔ پنجابی زبان سے ناواقف ہوں ذرا مطلب سمجھا دیجیے۔ میں نے تھوڑے سے فکر کے بعد کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے ؎

وائے ناکامی جواں ہو کر ہوئے وہ نذر غیر

پک گیا جب پھل تو دشمن آئے کھانے کے لیے

۱۵ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو اس زمین میں چند اور شعر کہہ کر نواب شمشیر بہادر کو سنائے۔"[۲۵]

مسلسل غزل

فوق کے کلام کی تمہیدوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی ہر غزل کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر کہی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کی بیشتر غزلوں میں غزلِ مسلسل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ غزلِ مسلسل ہیئت میں تو غزل ہی رہتی ہے لیکن معنوی طور پر وہ نظم سے قریب تر ہو جاتی ہے۔ فوق کی اس خصوصیت کی وضاحت کے لیے کلام فوق کی یہ غزل خصوصاً قابلِ ذکر ہے جس کا مطلع ہے ؎

مصورِ فکر و پریشانی ہوں میں

مرجع تشویش و حیرانی ہوں میں

اس غزل میں فوق نے انسان کی سرگزشت بیان کی ہے اور خدا اور

کائنات کے ساتھ اس کی نسبتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

کیا ہوں میں برق تجلی کی چمک
کون ہوں موسیٰ عمرانی ہوں میں
سجدہ کرتے ہیں مرے در پر ملک
گو بظاہر شکل انسانی ہوں میں
میں نے جو مانگا وہی مجھ کو ملا
مظہر تائید یزدانی ہوں میں
گاہ میں ہوں مخزن انوار عقل
گاہ وقف جہل و نادانی ہوں میں
گاہ میں معموریٔ کشت چمن
گہ بیابانوں کی ویرانی ہوں میں
گاہ میری آفرینش کالعدم
گہ خضر کی عمر طولانی ہوں میں
میں غلام صاحب لولاک ہوں
فوق شان اعظم الشانی ہوں میں

(''کلام فوق''۔ ص : ۱۲۸ - ۱۲۹)

فنی محاسن

فوق کی غزل میں فنی محاسن بھی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کا کلام عموماً صاف اور ہموار ہے جو ان کی قدرت کلام کا آئینہ دار ہے۔ وہ عموماً ردیف کا اہتمام کرتے ہیں۔ غیر مردف غزلیں ان کے یہاں برائے نام ہیں۔ ان کی ردیفیں

عموماً سادہ اور مروج ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ ردیفوں سے بھی دلفریبی کا سامان پیدا کر لیتے ہیں مثلاً

رفعت کہسار کی پروا نہ کر
راہ ناہموار کی پروا نہ کر

("نغمہ و گلزار۔ ص: ۱۲۱)

بعض اوقات وہ اظہار فکر کے لیے تشبیہات سے بھی کام لیتے ہیں تاہم ان کی تشبیہات سادہ اور مستعمل قسم کی ہوتی ہیں۔

پردۂ برق میں رہ رہ کے چمکنے والے
ابرِ باراں کی طرح مجھ کو رلایا تو نے

("کلام فوق"۔ ص: ۱۲۳)

اسی طرح ان کے یہاں تلمیحات کا حسن بھی پایا جاتا ہے مثلاً

بڑھ گئیں کچھ اور بد کرداریاں
مژدۂ لا تقنطو نے کیا کیا

("نغمہ و گلزار"۔ ص: ۸۹)

یوسفِ مصر بھی گر آئے زلیخا ہو کر
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں ترا شیدا ہو کر

در پر او ظالم کھڑے ہیں جانثار
مثلِ نادر حکم قتل عام کر

("کلامِ فوق۔ ص: ۶۳)

لف و نشر مرتب کی مثال

مُسلم و ہندو و ترسا میں ہے تیرا ہی ظہور
کعبہ و دیر و کلیسا کو بسایا تُو نے

("کلامِ فوق"۔ ص : ۱۲۳)

اس شعر میں مُسلم، ہندو، ترسا لف کے الفاظ ہیں اور کعبہ، دیر اور کلیسا علی الترتیب نشر کے الفاظ ہیں۔

رعایت لفظی

بات کچھ ہو کہ نہ ہو اب وہ دبا لیتے ہیں
روز جو کہتے تھے آ کر کبھی آداب مجھے

دبا اور آداب میں رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔

ضلع جگت کی مثال

قوم کی یونیورسٹی کا کوئی حال نہیں
ہم یہ کس طرح کہیں قوم کا حال اچھا ہے

("کلامِ فوق"۔ ص : ۱۳۵)

حسن روزمرہ اور لطافت زبان

ملتی نہیں ہے جنس وفا کی طرح کہیں
"اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا؟"

مے خانہ اور شیخ بہ ایں ریش وفش چہ پوش
ہم تو بھلا تھے خیر یہ حضرت کو کیا ہوا؟
("کلامِ فوق"۔ ص : ۹۹)

فوق اپنی غزل کے مجموعی تاثر کے اعتبار سے ایک خوش لہجہ غزل گو قرار پاتے ہیں۔ غزل کو غم ذات اور غم کائنات کے اظہار کا کامیاب وسیلہ بنانے والوں میں انھیں شامل کیے بغیر چارہ نہیں۔

کلامِ فوق کے محاسن کے متعلق لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے جو رائے ظاہر کی تھی وہ مجموعی طور پر ان کے پورے کلام پر صادق آتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی فرماتے ہیں۔

"کلامِ فوق بلا شبہ قابل داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہیں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلامِ فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں۔ شوخی کا اظہار بھی ہے۔ قافیے برجستہ ہیں بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصّہ ہے اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مئے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاقی وہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں اور بعض اشعار پر توجہ چاہتا ہے داد دوں اور لوٹوں۔ بہت سے اشعار میرے حسبِ حال ہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں اور غزلوں کی شانِ نزول نے آپ کی جدّت آفرینی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔" [۲۶]

فوق اپنے زمانے کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا کلام آسان زبان میں روایتی عروض کی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ فوق صاحب کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو علم و ادب کے کئی شعبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس

لیے تصنیف و تالیف کے معاملے میں ان کی شخصیت میں بکھراؤ نظر آتا ہے چنانچہ وہ دوسری ادبی مصروفیات کے پیشِ نظر شاعری پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری اپنے عہد کے حوالے سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک زبان میں سادگی اور پختگی، سلاست و صراحت، محاورات کے استعمال میں مکمل دسترس، صحت بیان میں روانی اور ندرت، ادائے مطالب میں بے ساختہ پن کا تعلق ہے تو اس میں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اس ضمن میں مولانا ظفر الملک علوی مدیر "الناظر" لکھنؤ کی یہ رائے ایک بڑے ثبوت کے طور پہ پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے ۱۹۲۵ء کو دی تھی۔

"اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد دین فوق اور میر غلام نیرنگ کے سوا شاید کوئی اور پنجابی ایسا نہ تھا جس کا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک ہو اور جس کی اِنشاء صحیح اُردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں اس وقت اہلِ پنجاب میں شمار نہیں کیے جا سکتے مگر نئی نسل نے بہت سے اہلِ قلم ایسے پیدا کر دیے ہیں جن کی نظم و نثر زبان دانوں کے معیار پر پوری اترتی ہے۔"[۲۷]

مدیر رسالہ "فصیح الملک" احسن مارہروی نے بزبان شعر اس طرح فوق کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس زمانے میں تنقید و توصیف کا یہ ایک معروف انداز تھا۔

لُطف اٹھائیں اس کو پڑھ کر عشق دوست
مایۂ اُلفت کلامِ فوق ہے
جتنے مضمون اس میں ہیں چوٹی کے ہیں
قابلِ عزت کلامِ فوق ہے[۲۸]

وجاہت جھنجھانوی کی طویل نظم پہلے باب میں موجود ہے۔ انھوں نے جس شعر میں "کلامِ فوق" کی تاریخ نکالی ہے۔ اسے یہاں بھی درج کیا جاتا ہے۔

لکھا ہے میں نے وجاہت یہ مصرعِ تاریخ
کلامِ فوق سے ہے آج وقعتِ اُردو [۲۹]

۱۳۲۷ھ

تیسرا باب

حوالہ جات

۱۔ ”شیرازہ“ سرینگر۔ص : ۴۵۔

۲۔ ”شاعر کشمیر“، ص : ۳۹۔

۳۔ ”مرغزار“ ادبی مجلہ، گورنمنٹ کالج شیخوپورہ، ۱۹۸۱ء، ص : ۱۰۲۔

۴۔ ماہنامہ ”تخلیق“، دسمبر ۱۹۸۵ء۔

۵۔ بحوالہ بر جموہن دتاتریہ کیفی، ”راوی“ محمد حسین آزاد نمبر، گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۸۳ء، ص : ۴۳۔

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ”اُردو ادب میں طنز و مزاح“ لاہور: مکتبہ عالیہ، طبع سوم، ۱۹۷۷ء، ص : ۱۱۰

۷۔ ”نقوش“ لاہور، طنز و مزاح نمبر، ص : ۴۸۷۔

۸۔ ”حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں“ طبع اول، ص : ۲۶۱۔

۹۔ ایضاً

۱۰؎ "کلامِ فوق"، طبع اوّل، دیباچہ حصہ دوم، ص: ۶۳۔

۱۱؎ ایضاً ص: ۶۴۔

۱۲؎ "کلامِ فوق"، طبع دوم، ص: ۹۵۔

۱۳؎ "کلامِ فوق"، طبع اوّل، ص: ۴۔

۱۴؎ "کلامِ فوق"، طبع اوّل، ص: ۴، ۵۔

۱۵؎ "کلامِ فوق"، طبع اوّل، ص: ۵۔

۱۶؎ "کلامِ فوق"، طبع اوّل، ص: ۳

۱۷؎ حالیؔ، "مقدمہ شعروشاعری" دہلی: ہندوستانی کتب خانہ جامع مسجد، سن ندارد، ص: ۶۲، ۶۶۔

۱۸؎ "بوطیقا" لاہور: کل پاکستان انجمن ترقی اُردو، طبع اوّل، ۱۹۶۱، ص: ۹۔

۱۹؎ ماہنامہ "تخلیق" لاہور، دسمبر ۱۹۸۵ء۔

۲۰؎ ممتاز حسن "خیر البشر کے حضور" لاہور: ادارۂ فروغ اردو" ۱۹۷۵ء، ص: ۳۵

۲۱؎ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، "اشاراتِ تنقید" لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۲ء، ص: ۷۴۔

۲۲؎ "مقدمہ شعروشاعری" ص: ۱۷۔

۲۳؎ "کلیاتِ نظمِ حالیؔ" لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اوّل، ۱۹۶۸ء، ص: ۹۳۔ (مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)۔

۲۴؎ "کلامِ فوق"، طبع دوم (دیباچہ) ص: ج۔

۲۵؎ "کلامِ فوق"، طبع دوم، ص: ۷۱ - ۷۰ -

۲۶؎ بحوالہ "نغمہ و گلزار" (دیباچہ) ص: ۱۵ -

۲۷؎ "شاعرِ کشمیر"، ص - ۲۴ - ۲۳ -

۲۸؎ "کلامِ فوق"، طبع اوّل، ص: ۱۲۶ -

۲۹؎ ایضاً ص: ۱۲۶ -

فوق کا افسانوی ادب

(ناول، حکایات اور ڈرامہ)

باب ۴

فوق کا افسانوی ادب

(ناول، حکایات، ڈرامہ)

کسی بھی صنف سخن میں لکھتے ہُوئے فوق کی شخصیت میں مؤرخ اور مصلح یک جان ہو کر ہمیشہ موجود رہے۔ صحافت، سوانح اور شاعری میں بھی تاریخ کے ساتھ ان کی وابستگی پُوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے ابواب میں اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قوم و معاشرہ کی اصلاح اور فلاح کا جذبہ ان کے خون میں گھُلا ہُوا تھا۔ تاریخ نویسی کے دوران بھی یہ لگن موجزن رہی۔ ان کی ذات مؤرخ اور مصلح کا ایک مرقع تھی۔ اپنے زمانے میں وہ ایک بے حد متاثر کرنے والے انسان کے طور پر معروف ہُوئے۔ بالخصوص کشمیر، بالعموم برصغیر اور کسی حد تک عالمِ اسلام کی پُرانی بازیافت ان کی منزل تھی۔ وہ عمر بھر کئی حوالوں سے اس منزلِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ علمی اور ادبی سرگرمیوں کے علاوہ وہ عملی طور پر بھی مختلف

تنظیموں اور تحریکوں میں شامل رہے۔ اِن کی اس جِدّوجہد کا بھی پچھلے ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ہر طریقے سے لوگوں کو ان کی اپنی تاریخ سے واقف کرانا چاہتے تھے۔ اور اپنے زمانے میں اصلاحِ احوال کے لیے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاریخ نویسی، سوانح نگاری۔ شاعری اور صحافت کے علاوہ فوق نے ناول لکھے اور حکایات لکھیں۔ ان کے ایک غیر مطبوعہ ڈرامے کا بھی راقم نے مطالعہ کیا ہے۔ یہ ڈرامہ مولانا عبداللہ قریشی کے پاس محفوظ ہے۔ ان کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

ناول

۱۔ انار کلی۔
۲۔ رام کہانی۔
۳۔ اکبر۔
۴۔ نیم حکیم خطرۂ جان۔
۵۔ ناکام۔
۶۔ خانہ بہ بادی۔
۷۔ عِصمت آرا۔
۸۔ غم نصیب۔
۹۔ محروم تمنّا۔
۱۰۔ مہذب ڈاکو۔
۱۱۔ مسٹریز آف امرتسر۔
۱۲۔ غریب الدّیار۔
۱۳۔ سٹوڈنٹس لائف۔

۱۴- حرف مطلب۔

حکایات

۱- حکایات کشمیر۔

۲- بچوں کی کہانیاں۔

۳- دبستان اخلاق۔

۴- چودہ حکایتیں (غیر مطبوعہ)۔

ڈرامہ

۱- زمیندار کی سرگزشت (غیر مطبوعہ)

فوق کے ناولوں میں ''اکبر'' اور ''انارکلی'' کے علاوہ ''حکایات کشمیر'' اور ''بچوں کی کہانیاں'' کی نوعیت تاریخی ہے۔ ان کے علاوہ اس طرح کی تمام تصانیف معاشرتی مسائل کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ فوق کے ناول، حکایات اور ڈرامہ افسانوی ادب FICTION کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس طرح کی تمام تحریروں میں ان کا نظریۂ فن اور مطمع نظر ایک جیسا ہے۔ لیکن انداز و اسلوب کے لحاظ سے ان کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ مختلف اصناف کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔

ناول

فوق کی ناول نگاری پر بات کرتے ہوئے یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فوق کی ناول نگاری کے حوالے سے یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان کے ناولوں کے

بارے میں ادبی تاریخوں اور ناول کے تنقیدی جائزوں میں کوئی مواد نہیں ملتا جب کہ فوق کی دیگر حیثیات پر مشاہیر اور اہم ہم عصروں کی آرا موجود ہیں۔ لیکن ناول نگاری کے فن پر کسی متعلقہ کتاب یا مضمون میں فوق کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف ایک مختصر مضمون "محمد دین فوق بحیثیت ناول نگار" کے نام سے ملتا ہے جو کلیم اختر نے لکھا ہے[1]۔ یہ مضمون بھی فوق کی ناول نگاری پر ایک عمومی تبصرے سے زیادہ نہیں۔ اس بات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مؤرخ، سوانح نگار، شاعر اور صحافی کے طور پر فوق کی حیثیت اس قدر اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ ان کی ناول نگاری کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ورنہ ان کی شخصیت اور فن کے مطالعے اور تجزیے کے لیے ان کے ناول اور حکایات بھی معاون ہو سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ فوق پر مختلف النوع تصنیفی مصروفیتوں کا دباؤ تھا مگر انھوں نے جس صنف میں لکھا، پورے خلوص اور جذبے سے کام لیا۔ اور اپنی تمام اہلیتوں کو بھرپور طریقے سے آزمانے کی کوشش کی۔ اُردو ناول کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے فوق کے ناولوں کو نظر انداز کرنا کسی طور مناسب نہیں۔ فوق اہم ناول نگار نہ تھے نہ ہی انھوں نے ناول نگاری میں کوئی نیا تجربہ کیا ہے۔ مگر ان کی یہ تحریریں اُردو ناول کی تاریخ و ارتقا کے سلسلے میں قابل مطالعہ چیز ہیں۔ فوق نے قریب قریب اسی زمانے میں ناول نویسی شروع کی جب اُردو میں ناول کا آغاز ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ فوق کے دو ناولوں پر ۱۹۰۰ء کا سال لکھا ہوا ہے۔ تاریخ و مہینہ درج نہیں۔ لہٰذا یہ فیصلہ ممکن نہیں کہ "انار کلی" اور "رام کہانی" میں سے کونسا ناول پہلے لکھا گیا۔ "انار کلی" تاریخی ناول ہے اور "رام کہانی" معاشرتی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں پہلا ناول "مرأۃ العروس" لکھا جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اور ان کا آخری ناول "رویائے صادقہ" ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا[2]۔ اس کے بعد سرشار۔ محمد علی طبیب۔ شرر۔ رسوا۔ راشد الخیری۔ مرزا محمد سعید

اور دوسرے ادیبوں نے ناول لکھے۔ شرر کا ناول "ملک العزیز ورجنا" (۱۸۸۸ء) میں ان کے رسالے "دل گداز" میں شائع ہوا۔ "فردوس بریں" ۱۸۹۹ء میں اور ان کا آخری ناول "نیکی کا پھل" ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔[۲] نقادان فن نے رسوا کو چھوڑ کر تمام ناول نگاروں پر اعتراضات کیے ہیں۔ رسوا کے بھی ایک ناول "امراؤ جان ادا" کو چھوڑ کر "اختری بیگم"، "ذات شریف" اور "شریف زادہ" اعتراضات کی زد میں آئے ہیں۔ اس ضمن میں دوسرے مضامین کے علاوہ اردو ناول کی تاریخ و ارتقا کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں فاضل مصنفین نے ان خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابتدائی دور کے ناول نگاروں کے ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔ اردو ناول کے کچھ نقادوں نے ابتدائی دور کے اکثر ناولوں کو ناول تسلیم کرنے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں۔

"مرکب قصوں کے فن سے مولانا بالکل ہی ناواقف دکھائی دیتے ہیں مگر پھر بھی نقادوں کی نگاہ میں ناول نگار ہیں۔"[۴]

ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"مولانا کے پلاٹ سادہ اور سپاٹ ہیں۔ نہ ان میں کوئی جدت ہے نہ دلکشی۔ "توبۃ النصوح" کو چھوڑ کر باقی تمام قصوں کے پلاٹ منازل حیات اور حسن تناسب سے محروم ہیں۔"[۵]

نذیر اور شرر کے بارے میں یہ تنقیدی آرا اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ فوق ان دونوں ناول نگاروں کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور شرر کے علاوہ دوسرے ناول نگاروں کے بارے میں نقادوں کے اعتراضات کے باوجود نذیر اور شرر کی اہمیت برقرار رہتی ہے۔ اس طرح فوق کے ناول اپنی حدود کے اندر کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر فوق نے صرف ناول لکھے ہوتے اور ان

کی دوسری حیثیتیں زیادہ معروف نہ ہو جاتیں تو وہ ناول نگار کے طور پر قابلِ ذکر حیثیت کے حامل ہوتے ۔ انھوں نے خود بھی اپنے ناول نگار ہونے کی حیثیت کو خاص طور سے سامنے لانے کی کوشش نہیں کی ۔ انھوں نے یہ سوچ کر ناول نہیں لکھے تھے کہ انھیں بڑا ناول نگار تسلیم کیا جائے ۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ناول نگاری کا چرچا عام تھا ۔ مولوی نذیر احمد کو سماجی اور معاشرتی ناول لکھنے کے بعد جو مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کے بعد شرر نے تاریخی ناول لکھ کر جو شہرت حاصل کی ہیں پر کئی لکھنے والوں نے اس فن کی طرف توجہ دی ۔ اس زمانے میں قومی اور اصلاحی تحریکیں بھی شروع ہو گئی تھیں ۔ حالی نے مسدس لکھ کر، شبلی نے تاریخ لکھ کر اور شرر نے ناول لکھ کر اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے اپنا اپنا حصہ شامل کیا ۔ ابتدائی دور کے ناول نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں ۔

"جب ہم ان تمام ناول نگاروں پر اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سب میں کچھ ایسی مشترکہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو اُن کو ان کے زمانے سے وابستہ کرتی ہیں ۔ سرشار، شرر، رسوا، طبیب، سجاد حسین یہ سب اس زمانے کے لوگ ہیں جس کے سب سے اہم نمائندے مولانا حالی تھے ۔ یہ لوگ سرسید کے پیرو ہیں ۔ مگر کورانہ تقلید نہیں کر رہے ۔ ان کو کرنا وہی کچھ ہے جو سرسید چاہتے تھے ، مگر اپنے قومی کلچر کا خیال رکھتے ہوئے ۔" [۱۳]

فوق نے سرسید، شبلی، حالی اور شرر کی اپنے اپنے میدان میں تقلید کی ۔ حالی، شبلی اور شرر نے تاریخ اسلام کی عظمتوں کی یاد تازہ کر کے مسلمانوں کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ فوق نے تاریخ اسلام کے ساتھ مسلم ہندوستان کی تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے ۔ پچھلے ابواب میں سرسید، حالی اور شبلی کے ساتھ فوق کی

فکری اور فنی مماثلتیں بیان کی گئی ہیں۔ مولوی نذیر احمد کو بھی سرسید کے رفقاء میں سے سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے سماج و معاشرہ میں اعلیٰ اقدار کو مٹنے سے بچانے کے لیے قصے تحریر کیے جو اس زمانے میں بے حد مؤثر ثابت ہوئے۔ راشد الخیری اور دوسرے کئی ادیبوں نے مولوی نذیر احمد کی پیروی کی۔ شرر نے بھی تاریخی ناولوں کے علاوہ کئی معاشرتی ناول تحریر کیے۔ فوق کی ناول نگاری کے مطالعہ کے دوران شرر کی کامیوں کو سامنے رکھا جائے تو کوئی رائے قائم کرنے میں زیادہ آسانی ہو گی۔ فوق کی طرح شرر بھی صحافی، مضمون نگار، تاریخ دان اور ریفارمر تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تاریخی ناول نگار کے طور پر زیادہ مشہور ہوئے۔ اور فوق صرف ناول نگار کے طور پر معروف نہ ہو سکے۔ فوق نے اپنے سماجی ناولوں میں پہلے سے موجود معروف انداز کی پیروی کی۔ ان کے سماجی ناول ان کے تاریخی ناولوں کے مقابلے میں نسبتاً کم تر درجے کی تصانیف ہیں۔ فوق کا تاریخی ناول "اکبر" خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شرر کے بارے میں کم و بیش یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ شرر کا تاریخی ناول "فردوس بریں" ان کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ صلاح الدین احمد اپنے ایک مضمون "اردو ناول کی چند منزلیں" میں لکھتے ہیں۔

"شرر نے اگرچہ معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان کی امتیازی حیثیت ان کی تاریخی ناول نگاری ہے۔ چونکہ وہ ایک پائے کے تاریخ داں تھے اس لیے ان کے ناولوں میں تاریخ اور افسانے کا امتزاج چنداں غیر معتدل نہیں۔" [۲۵]

فوق نے تاریخ نگاری کی لگن میں کئی انداز اختیار کیے۔ انھوں نے جو سوانح عمریاں تحریر کی ہیں، ان میں قصوں کے ذریعے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ متعدد سوانح عمریوں میں سے تین سوانح عمریاں اکبر کے نورتنوں، راجہ بیربر، راجہ ٹوڈرمل اور ملا دو پیازہ کے بارے میں ہیں۔ راجہ بیربر اور ملا دو پیازہ کی سوانح حیات مختلف واقعات اور لطائف سے ترتیب دے کر تحریر کی گئی ہے۔ زیادہ تر واقعات کا تعلق

اکبر کے دربار سے ہے۔ اکبر اعظم کے ساتھ فوق کو قلبی لگاؤ تھا۔ فوق نے اکبر کے بارے میں ناول لکھ کر مسلم ہندوستان کے ایک بہت بڑے نمائندے اور متحدہ قومیت کے ایک بڑے ترجمان کی حیثیت سے اسے لوگوں کے سامنے لانے کی کوشش کی۔ تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں۔

"اچھی تاریخی کہانی یا ناول لکھنے سے پہلے قصہ گو ماضی کے کسی خاص عہد کے ساتھ جذباتی وابستگی اور ذہنی مناسبت پیدا کرتا ہے۔ اس عہد کی تفصیلات اور جزئیات سے واقف ہو کر اس میں لمس و کیفیت پیدا کرنے کی صورتیں فراہم کرتا ہے۔ اپنے آپ میں ماضی کی رُوح کو مقید کر کے اس کی چمک اور جھنکار کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔" [۸]

فوق کے دل میں ناول لکھتے ہوئے اکبر کے ساتھ تمام نسبتیں زندہ تھیں۔ اور عہد اکبری کی مکمل تصویر ان کی آنکھوں میں موجود تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ شرر اور فوق میں بہت حد تک فنی اور فکری یگانگت دکھائی دیتی ہے۔ کلیم اختر اس ضمن میں دو ٹوک الفاظ میں لکھتے ہیں۔

"فوق ناول نویسی میں مولانا عبدالحلیم شرر سے متاثر نظر آتے ہیں۔" [۹] شرر نے تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی اور اردو ناول کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ فوق نے نذیر اور شرر سے ملاقات کی تھی۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ انھوں نے شرر سے کشمیر کے پس منظر میں ناول لکھنے کی فرمائش بھی کی تھی۔ شرر بوجوہ یہ ناول نہ لکھ سکے۔ [۱۰] فوق نے اپنی اس خواہش کی تکمیل اپنے ناول "اکبر" کے ذریعے کی۔ اس ناول کا آغاز ایک کشمیری نوجوان سدھا کی ایک گوشہ نشین اور اپنی منگیتر کے ساتھ ملاقات سے ہوتا ہے۔ بعد میں سدھا، اکبر کے دربار میں پہنچتا ہے۔ کشمیر پر اکبر کے کامیاب حملے تک پورا ناول سدھا کی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ فوق، سدھا کو "ہمارا نوجوان" کہہ کر پکارتا ہے۔

ناول میں کشمیر میں طوائف الملوکی، مسلمان حکمرانوں کی عیاشیوں اور ان کے خلاف ہندو امیروں کی سازشوں کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اس ناول کی صورت میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فوق نے ہر صنفِ سخن میں لکھتے ہوئے کشمیر کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔

فوق کا ناول "انارکلی" بھی اکبر کے عہد کا واقعہ ہے۔ ناول میں اکبر کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ گویا فوق کے دونوں ناولوں کا تعلق عہدِ اکبری سے ہے۔ یہ دونوں ناول ایک مخصوص مغل عہد کے معاشرے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تاریخی ناولوں میں مذکورہ عہد کا معاشرہ مکمل طور پر دکھائی نہ دے تو وہ کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معاشرتی ناولوں میں زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی تاریخ بھی بیان ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم مولوی نذیر احمد کے ناول پڑھتے ہوئے اس زمانے کے سماجی ماحول کے آئینے میں تاریخی حالات کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ناول "ابن الوقت" ایک پورے عہد کی مخصوص ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور اس عہد میں تاریخی اور تہذیبی طور پر ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔ تاریخ ماضی میں گزرے ہوئے حالات کا نام ہے تو آخر لمحۂ حال نے ہی ماضی کا روپ دھارنا ہے۔ اب تاریخ کے سائنٹیفک مطالعے کے دوران جدید طریقوں کی روشنی میں سماجی صورت حال کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخی ناولوں میں کرداروں کے نام صحیح ہوتے ہیں۔ واقعات بالعموم مکمل صحیح نہیں ہوتے۔

معاشرتی ناولوں میں نام فرضی ہوتے ہیں۔ لیکن واقعات بہت حد تک صحیح ہوتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں معاشرتی اور تاریخی ناولوں میں فرق اتنا زیادہ اہم نہیں رہتا۔ فوق کے ناول "نیم حکیم خطرۂ جان" میں جس مرکزی کردار کا تذکرہ ہے، وہ ہر دور میں موجود رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے کہ جب تک تعلیم عام نہیں ہوتی۔

جدید سائنسی نقطۂ نظر لوگوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کے نیم حکیم سے ہمارا واسطہ پڑتا رہے گا۔ فوق نے ایک عام شخص کو بتدریج حکیم صاحب اور پھر ڈاکٹر صاحب بنتے ہُوتے دکھایا ہے۔ یہ شخص اپنے معاملات میں ایسا ماہر ہے کہ آخر وقت تک لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود فوق کا یہ ناول بھی کردار نگاری کے حوالے سے اپنا تأثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس معاملے میں فوق بھی نیم حکیم ہی لگتے ہیں۔ "مسٹریز آف امرتسر" میں امرتسر کے ایک ایسے خاندان کا حال بیان کیا گیا ہے جس کی عورتیں خراب ہیں۔ یہ گھرانہ بے رہروی کا ڈیرہ ہے۔ ایک ترقی پذیر معاشرے میں اس طرح کی مثالیں عام ہیں۔ "خانہ بربادی" میں ایک امیر کبیر گھر اپنے افراد کے باہمی نفاق اور لڑائی جھگڑے کی بدولت تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس ناول کے کردار غلط مشیروں کے نرغے میں پھنس جاتے ہیں اور دولت کا زعم انھیں خود غرض لوگوں کی محبت میں مبتلا کر کے ذلیل و خوار کرتا ہے۔ یہ واقعہ بھی ہمارے ہاں کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔ ایسے واقعات ہماری روزمرہ زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔ فوق اپنے اردگرد کے ماحول میں چھوٹے چھوٹے واقعات چُن چُن کر ناول بنانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ جس واقعہ سے متاثر ہوتے ہیں، اسے ناول بنا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے واقعات کا بھی انتخاب کرتے ہیں جن میں سانحہ بننے کے امکانات ہوتے ہیں۔ ان کے ناول "ناکام" اور "عصمت آرا" اس سلسلے کے خاص مسائل پیش کرتے ہیں۔ یہ ٹیکنیک بعض اوقات ایک کامیاب ناول کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بالعموم ناول نگار واقعے کی سطحی جذباتیت کا شکار ہو کر اس کے پس منظر میں چھُپی ہُوئی حقیقتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ خبر میں بھی کہانی ہوتی ہے مگر یہ کہانی فوری طور پر متأثر کرنے کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ فوق صحافی بھی تھے۔ وہ بیان واقعات میں ایک اکہری دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر وہ گہرائی جو

کسی کہانی کو تخلیقی لہر عطا کرتی ہے، ان کے ناولوں میں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ ان کے تاریخی ناول "اکبر" میں اسلوب و بیان کے حوالے سے خاصی توانائی نظر آتی ہے۔ اکبر اعظم اس ناول میں ایک عام انسان کی حیثیت سے متعارف ہوتا ہے۔ یہی تاریخ اور تاریخی ناول کا فرق ہے۔ فوق، اکبر کو جس پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ پڑھنے والے کے دل میں بھی جاگ اٹھتی ہے۔ تاریخی ناول کا مقصد بھی یہی ہے۔ "اکبر" فوق کا ایک کامیاب تاریخی ناول ہے۔ فوق اپنے ناول "انارکلی" میں انارکلی کے لیے کوئی خاص ہمدردی قاری کے دل میں پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انارکلی سے انھیں کوئی ایسا لگاؤ بھی نہیں۔ البتہ "اکبر" میں کشمیری لڑکی اراوتی قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب رہتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سدھا کی بے وفائیوں کا ذکر سننے کے باوجود شہزادہ سلیم کے مکمل اظہار محبت اور بے تاب آمادگیوں کے سامنے ناقابل تسخیر چٹان بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ انارکلی بھی محبت میں قربانی کے بعد مظلومیت کا پیکر بن جاتی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں اراوتی شہزادہ سلیم کی محبت کو ٹھکرا کر ایک ان جانی مقبولیت کی علامت بنتی ہے۔ اراوتی کے ساتھ فوق کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک کشمیری لڑکی ہے۔ فوق کے معاشرتی ناولوں کے کرداروں میں سے کوئی بھی مولوی نذیر احمد کے کرداروں جیسی اہمیت حاصل نہیں کر سکا۔ فوق کے نسوانی کرداروں میں ایک بھی اصغری جیسا نہیں۔ آج بھی بڑی بوڑھی عورتیں اپنی بیٹیوں کو اصغری کے کردار کے آئینے میں دیکھنے کی خواہش کرتی ہیں؛ البتہ یہ بات اہم ہے کہ فوق کے معاشرتی ناولوں کے کردار کسی کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں تو وہ نذیر احمد کے کردار ہیں۔ فوق کے کچھ کردار حسن اخلاق اور نیکی کے نمائندے بن کر رہ گئے ہیں اور باقی برائی اور بد اخلاقی کے ترجمان بن چکے ہیں۔ "عصمت آرا"، "ناکام"، "نیم حکیم خطرۂ جاں"، "مسٹر بیز آف امرتسر" اور "خانہ بربادی" کے کردار اس طرح کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان

ناولوں کا انداز اصلاحی ہے۔ باقاعدہ نتائج اخذ کر کے سماجی برائیوں سے اجتناب کرنے کے لیے تنبیہہ کی گئی ہے۔ ان کی دوسری تصانیف کی طرح ان کے ناول بھی اسی ذہنی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس زمانے میں اصلاح معاشرہ کے لیے ناول ایک مؤثر ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔ فوق کا ناول "رام کہانی"، "غم نصیب" اور "محروم تمنا" معاشرتی ناول ہیں مگر ان میں ایک رومانوی فضا فوق کے اسلوب کو ایک البیلا پن عطا کر دیتی ہے۔ فوق کے تاریخی اور دوسرے ناولوں میں تمام کردار باذوق لوگ ہیں۔ وہ اکثر اشعار میں باتیں کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اشعار برمحل اور مؤثر ہوتے ہیں۔ لیکن اشعار کی تکرار بیت بازی کا سماں پیدا کر دیتی ہے۔ فوق کو جتنے اشعار یاد ہیں وہ اپنے کرداروں کے مکالموں میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ فوق کے ہاں مکالموں میں اشعار کا استعمال طبیعت پر بار گزرتا ہے۔ فوق کے اپنے اشعار بھی خاصی تعداد میں ان ناولوں میں موجود ہیں۔ اس طرح فوق کے ناولوں میں اپنے عہد کے معروف شعراء کے اشعار کا ایک انتخاب موجود ہے۔ لیکن کوئی ناول شعراء کا مجموعہ کلام تو نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کوئی کردار پوری پوری غزل باقاعدہ ترنم سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ فوق کے ناول "ناکام" میں یہ عمل کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔ فوق اشعار کے ساتھ شاعر کا نام بھی لکھ دیتے ہیں تو یہ مکالمہ نہیں بن پاتا۔ اشعار کے استعمال سے ناول میں ماحول کی فضا بندی میں خلل پڑتا ہے۔ کبھی کبھی بے محل شعر عبارت میں اکھڑی ہوئی اینٹ کی طرح لگتا ہے۔ فوق کے ناولوں میں احسان شاہجہان پوری کی غزلیں اور اشعار بہت زیادہ ملتے ہیں۔ فوق کے ناول "ناکام" میں صفحہ ۶۸ پر ان کا ناکام محبت ہیرو رشید احسن محرومیوں کی کیفیت میں احسان شاہجہان پوری کی یہ غزل بار بار گنگناتا ہوا ملتا ہے۔ غزل کا مطلع ہے۔

مکتوب نہ آیا کوئی پیغام نہ آیا
لکھا مری تقدیر کا کچھ کام نہ آیا

اس ناول میں مختلف کردار اشعار کی صورت میں تبادلۂ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔
فوق کے تاریخی ناولوں کا بھی یہی حال ہے۔ ”انارکلی“ میں شہزادہ سلیم اشعار کے ذریعے حالِ دل بیان کرتا ہے بلکہ وہ ایک طوائف بی مُنّا جان سے جو غزل سُنتا ہے، وہ داغ کی ایک اُردو غزل ہے جس کے اشعار کی تعداد بائیس (۲۲) ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری جان مانیے
اللہ! تیری شان کے قربان جائیے

(”انارکلی“۔ صفحہ : ۴۸)

فوق کے بعد ایم اسلم کے ہاں ناولوں میں اشعار کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔
فوق کے ناولوں میں مکالموں کی کثرت سے ڈرامے کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ فوق کے ناولوں کو تھوڑی سی کوشش کے بعد ڈرامے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ایک غیر مطبوعہ ڈرامے کا تذکرہ آگے چل کر ہو گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈرامے لکھنے کا خیال بھی فوق کے دل میں تھا۔ فوق کے ناولوں میں کہانی مکالموں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ بعض اوقات ان کے ناولوں میں مکالموں کے علاوہ صرف اتنی ہی بات تحریر کی گئی ہے جو صورتِ حال کی وضاحت اور منظر بدلنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ناول ”اکبر“ میں فوق کی مکالمہ نگاری کمال پر ہے۔ دوسرے باب میں دو محبت کرنے والے کردار سدھا اور اراوتی کی گفتگو دل پر اثر کرتی ہے جس میں اراوتی کا والہانہ پن اور بے چینی ایک مشترک اظہار بن کر سامنے آتے ہیں۔
گیارہویں باب میں شہزادہ سلیم اور اراوتی کا مکالمہ بہت زوردار ہے جس میں

اراوتی اپنی وفا کی حفاظت کے لیے شہزادے کے اظہارِ محبت کے جواب میں احتیاط کا ایک خاص سلیقہ اپناتی ہے۔ صفحہ ۱۷۰ پر اراوتی اپنے محبوب سدھلے سے ان الفاظ میں مخاطب ہوتی ہے۔

"تمھاری محبت بھری باتوں پر کتنا ہی اعتبار کیوں نہ ہو مگر کون جانتا ہے کہ آگرہ میں کونسی زبردست ترغیب تمھیں کشاں کشاں لیے جا رہی ہے۔ یک عشق و ہزار بدگمانی! لیکن میں مانتی ہوں، اور دل سے جانتی ہوں کہ سدھا اب بھی اور آئندہ بھی ہمیشہ کے لیے میرا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی حسین عورت نہیں ہے جو مجھ سے اس کے دل کو چھین کر لے جا سکتی ہو۔"

صفحہ ۱۷۸ پر اراوتی، شہزادہ سلیم کی پرجوش شیفتگی کے جواب میں اس طرح کلام کرتی ہے۔

"میرے آقا! درحقیقت اگر کسی نے میرا دل اور ایمان پہلے نہ چھین لیا ہوتا تو میں محبت کا بدلہ محبت میں دے سکتی تھی، مگر اب میں اپنے عہد و پیمان کو مرتے دم تک نبھاؤں گی۔ اگر میں اپنے اقرار کو توڑ دوں تو میری عزت آپ کے دل سے اٹھ جائے گی۔ مگر اے میرے مالک! ہم ان خیالوں اور وہموں میں کیوں اپنا وقت ضائع کریں جو پورے نہیں ہو سکتے۔ وہ نامعلوم طاقت جو کل عالم کی تقدیر پر حکومت کرتی ہے جو کچھ کر رہی ہے، بالکل ٹھیک اور مناسب ہے۔ بس اے میرے مہربان شہزادے! مجھے اسی ادنیٰ حالت میں رہنے دو اور مجھے ہمیشہ کے لیے فراموش کر دو، اور اگر ایسا ہونا مشکل ہے تو بے شک مجھے یاد رکھو مگر آپ کے خیالات ایسے ہی نیک اور بے غرض اور صاف ہونے چاہئیں جیسے کہ پہلی ملاقات کے وقت تھے۔ میں خداوند کریم سے متمنی ہوں کہ وہ آپ کی زندگی کو آپ کے لیے اور رعایا کے لیے قابلِ رشک بنائے۔ آپ کی بے شمار رعایا میں سے جس کو سب سے زیادہ آپ کے طریقے، زندگی اور بہتری

کا خیال ہوگا، وہ بھی اراوتی ہے"۔

اس کے آگے فوق خود اس مکالمے کی تاثیر کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"یہ جواب سن کر سلیم اس نوجوان لڑکی کے سامنے تصویر کی طرح چُپ چاپ کھڑا رہا کہ اس کی عمر میں کسی نے اس جرأت اور ادب کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ کیا تھا۔ اس نے اراوتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے لبوں تک پہنچایا اور بغیر کچھ کہے سُنے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ دوسرے دِن شہزادہ صرف ایک نوکر ہمراہ لے کر چلا گیا اور اس کی روانگی کا حال سوائے ایک آدمی کے کسی کو معلوم نہ ہُوا"

بلاشبہ فوق کا ناول "اکبر" ایک مکمل ناول ہے۔ شرر نے اپنے ایک ناول "فردوسِ بریں" کے ذریعے ناموری حاصل کی۔ فوق کے ناول "اکبر" کے گہرے مطالعہ کے بعد ناول نگار کے طور پر ان کی بھی حیثیت متعین کی جاسکتی ہے۔ اس ناول کا پلاٹ اور اسلوب بیان خوبصورت اور جامع ہے۔ کرداروں کی تعمیر میں فوق نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ تاریخی کرداروں کو ماضی کی رہگزاروں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ لمحۂ موجود کے ساتھ بھی مربوط ہوتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ اکبر ایک دوست حکمران کے طور پر ہم سے متعارف ہوتا ہے۔ "اکبر" میں کئی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، مگر کسی جگہ بھی مرکزی کہانی سے بہت دُور نہیں جاتیں۔ آخر کار یہ سب کہانیاں مرکزی کہانی میں مل جاتی ہیں۔ فوق کے معاشرتی ناول "نیم حکیم خطرۂ جان" میں بھی دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے باہم مربُوط ہیں۔ فوق نے اپنے ناولوں میں زبان کا خاص خیال رکھا ہے۔ ناول "اکبر" میں فوق نے اس فن کے لیے اعلیٰ زبان کے معیار کو نبھانے کی کوشش کی۔ اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ زبان سادہ ہے مگر اس میں شان وشوکت پُوری طرح موجود ہے۔ صفحہ ۳ پر فوق لکھتے ہیں۔

"دھیمی اور خوشگوار ہُوا، ان درختوں اور پھُولوں کی خوشبو جو صبح سے شام اور

شام سے صبح تک گھاٹیوں میں اڑتی رہتی ہے، پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا رہی تھی۔ غروب ہونے والے سورج کی ارغوانی رنگ کی آخری کرنیں بدری ناتھ کی برفوں اور ہمالہ کی چوٹیوں پر اپنا سنہری عکس ڈالنے لگیں۔ یہ چوٹیاں اور برفانی مقام انسانی قدوم سے بالکل ناآشنا تھے، اور یہ کہنا بھی قرین قیاس ہے کہ اڑتے ہوئے پرندوں کی آواز یا کیڑوں کی بھنبھناہٹ نے بھی شاذ و نادر ہی اس مقام کی سنسانی اور خاموشی میں دخل دیا، تاہم یہ جگہ اتنی ویران نہ تھی جتنی ایک بے پروا اور غافل ناظر خیال کر سکتا ہے۔"

اپنے ناول "اکبر" کے دیباچے میں فوق نے وہ بات کہہ دی ہے جو اُن کے نظریۂ فن اور ناول نگاری کے اسلوب کی وضاحت کرتی ہے۔ فوق لکھتے ہیں۔

"میرے خیال میں اب وہ زمانہ نہیں ہے جو آج سے دس سال پہلے تھا جس میں ان ناول اور افسانوں کی قدر کی جاتی تھی جو چوما چاٹی، ہجر و وصل بلکہ فسق و فجور کے مضامین سے لبریز اور قریباً بے نتیجہ اور یقیناً مخرب الاخلاق ہوتے تھے۔ اب پبلک بُری اور بھلی کتابوں میں تمیز کرنا سیکھ گئی ہے۔ اس لیے جو کتاب ملکی اور قومی بہبود کے خیالات لے کر نکلے گی وہ ضرور دل میں جگہ کرے گی۔"

اس زمانے میں طوائف کا کردار خاص حیثیت رکھتا تھا۔ اُردو ناولوں میں طوائف کا ذکر بہت دلچسپی سے ہوا ہے۔ رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" اس ستم رسیدہ عورت کی کہانی ہے جو طوائف بننے پر مجبور ہوئی فوق کے ناولوں میں وہ صرف گانا سنانے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ یہی صورت نذیر کے "فسانۂ مبتلا" میں نظر آتی ہے۔

فوق کے ناول مختصر ہوتے ہیں۔ مختصر ناول زیادہ مؤثر ہو سکتے ہیں۔ اس طرح قاری کی توجہ بکھرتی نہیں اور کہانی کا تاثر قائم رہتا ہے۔ فوق کے بہت سے ناولوں کو طویل مختصر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

اُردو ناول کا جائزہ لیتے ہوئے فوق کے ناولوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے بالواسطہ طور پر کتنی متعلق اور برمحل دکھائی دیتی ہے۔ وہ ناول کے "ابتدائی دَور کا جائزہ" میں لکھتے ہیں۔

"اس دَور کی نمایاں ترین ہستیاں سرشار، شرر اور رسوا ہیں۔ اور ان کی خصوصیات سے اس دَور کی خصوصیات متعین ہوتی ہیں۔ ان کی اہمیت ہی سے اس دَور کی اہمیت ہے۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جو ناول نگاری کے سلسلہ میں یاد کیے جاتے ہیں اور جن کی ایک آدھ تصنیف ضرور توجہ کے قابل ہے۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ اس دَور میں ناول نگاری کا رواج پڑ گیا اور اس کے محرک اور لیڈر پہلے سرشار اور پھر شرر ہوئے، اور دوسرے ناول نگار یا تو ان کے حریف بن کر سامنے آئے یا ان کے پیرو ہوئے۔"[۱۱]

ڈاکٹر احسن فاروقی نے جن کو "کچھ اور لوگ" کہا ہے، وہ کون ہیں؟ ان لوگوں میں کا نام ضرور شامل ہو گا۔ اب اس روشنی میں کلیم اختر کی فوق کے بارے میں یہ رائے بہت بامعنی ہے۔

"اگر فوق ناول نگاری کی طرف پوری توجہ دیتے تو بلا شبہ ان کا مقام نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا اور پریم چند کی صف میں ہوتا۔"[۱۲] فوق نے جو ناول لکھے ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد اگر نقاد ہمدردانہ انداز میں دیکھے تو سرشار کے بعد ایک اور کشمیری النسل ناول نگار اُردو ناول کی تاریخ میں ظاہر ہو گا۔ سرشار کا خاندان کشمیر سے آ کر لکھنؤ میں آباد ہوا تھا۔ فوق کا خاندان بھی کشمیر سے سیالکوٹ آیا، اور پھر فوق لاہور منتقل ہو گئے۔ سرشار کے ناول "فسانۂ آزاد" کا ہیرو کشمیری ہے۔ فوق کے ناول "اکبر" کا ہیرو بھی کشمیری ہے۔ فوق اُردو ناول کی تاریخ میں، پڑھنے والوں کے لیے خاص دلچسپیوں کا موجب بن سکتے ہیں۔

اب ہم فوق کے چند نمائندہ ناولوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

انارکلی

یہ ناول ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۰ء میں منرولاس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہُوا۔

اس ناول میں عہدِ اکبری کے ایک مشہور عشقیہ قصّے کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں روایت کے مطابق شہزادہ سلیم اور انارکلی کی محبت بالآخر انارکلی کی موت کی صورت میں انجام کو پہنچی۔ یہ ایک ایسا پُرکشش موضوع ہے کہ ہمارے کئی شعراء، ادیب اور ڈرامہ نگار حضرات نے اس پر قلم اٹھایا ہے اور اس کہانی کو اپنی ضرورت اور رجحان کے مطابق تبدیل کر لیا ہے۔ بیشتر لوگ اب اس واقعے کو حقیقی نہیں سمجھتے۔ فوق کا بھی یہی خیال تھا، مگر پہلے وہ اسے ایک حقیقی واقعہ سمجھتے تھے۔ فوق اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"خاکسار مصنّف اپنے مکرم دوست بابو احمد الدّین صاحب بی۔ اے کا دل سے ممنون ہُوں کہ جنھوں نے چند انگریزی تواریخوں اور دیگر ذرائع سے انارکلی کا پلاٹ انتخاب کر کے مجھے اس کے متعلق ناول لکھنے کی تحریک کی۔ معزز ناظرین اس نئے اور انوکھے نام کے ناول اور اس کے پلاٹ سے ہچکچائیں گے۔ مگر دراصل یہی پلاٹ فرضی نہیں بلکہ اوریجنل ہے اور اکثر تواریخیں اس کی شاہد ہیں۔ البتہ زیبِ داستان کے لیے مضمون کو طول ضرور دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی لیاقت، علمیت اور نوآموزی معلوم ہے اس لیے نہ کبھی مَیں نے زباندانی کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی ایسا دعویٰ کرنے کی جرأت ہی کر سکتا ہُوں۔ مَیں نے اپنی تصانیف میں اپنی نسبت ہمیشہ عجز و انکسار سے کام لیا ہے۔ اور اسی وجہ سے افتخار الشعراء حضرت

اِحسان شاہ جہانپوری کا یہ شعر

؎ عجز سے ہو گئی احسان بہت قدرِ سخن
اس لیے معترفِ ہیچمدانی ہُوں مَیں

پبلک کی قدردانی نے اکثر دفعہ تو میری زبان سے نکلوا دیا ہے اور اس وقت بھی مَیں اسی کو دُہرا رہا ہُوں۔"

دیباچے کے آغاز میں انگریزوں کی لکھی ہُوئی تاریخوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ انگریز مؤرّخوں نے مُسلمان بادشاہوں کو بدنام کرنے کے لیے اس طرح کی کئی روایتیں گھڑ لی تھیں۔ لیکن انگریز مؤرّخوں کے اس تعصب کو اپنی ہر تاریخی روایت کے لیے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ فوق کے ناول کے (۲۲) بائیس برس بعد تاج نے "انارکلی" کے نام سے ایک ڈرامہ ۱۹۲۲ء میں لکھا جو پہلی بار ۱۹۳۲ء میں کتابی شکل میں ظاہر ہُوا۔ یہ ڈرامہ عِلمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہُوا۔ تاج نے اپنے دیباچے میں اس قصّے کی صداقت پر شبے کا اظہار کیا ہے۔ ان کے سامنے بھی انگریزوں کی طرف سے پیش کی گئی روایت ہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"جہاں تک مَیں تحقیق کر سکا ہُوں، تاریخی اعتبار سے یہ قصہ بے بنیاد ہے۔"[۱۴]

سول سیکرٹریٹ لاہور میں محکمہ آثار قدیمہ نے جس کمرے کو انارکلی کا مقبرہ کہا ہے، وہاں ایک فریم میں لکھی گئی عبارت میں یہ شعر بھی درج ہے۔

؎ تا قیامت شکر گویم کرد گار خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را

(مجنون سلیم اکبر)

ایک دوسرے فریم میں اس عمارت کی تاریخ لکھی ہے کہ کس زمانے میں اس

عمارت سے کیا کام لیا گیا۔ اس سلسلے میں انارکلی کے زندہ گاڑنے کی تاریخ ۱۵۹۹ء ہے۔ اور مقبرے کی تکمیل کی تاریخ ۱۶۱۵ء درج ہے۔"[۱۴]

تاج کے اس دیباچے سے بھی اصل حقیقت کی طرف کوئی نشاندہی نہیں ہوتی۔ فوق کے ناول اور تاج کے ڈرامے کا موازنہ کیا جائے تو دونوں تصانیف ایک دوسرے سے خاصی مختلف نظر آتی ہیں۔ مختلف واقعات کے سلسلے میں یہ اختلاف بھی اس قصے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ دونوں کا پلاٹ الگ الگ ہے۔ اگر اس واقعے کی بنیاد کسی ایک حقیقی روایت پر ہوتی تو فوق اور تاج کی تصانیف میں اتنا فرق نہ ہوتا۔ دونوں کتابوں میں انارکلی کے اصل نام سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ اس کے ابتدائی خاندانی حالات، دربار اکبری میں آمد، اکبر کی طرف سے اسے انارکلی کے خطاب کا واقعہ، شہزادہ سلیم کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات اور پھر معاملات عشق کی تفصیل، دونوں کے عشق کا اکبر پر ظاہر ہونا، اکبر کی ناراضگی کا اظہار، انارکلی کے لیے سزا کے حکم، اور اس کی المناک موت تک کے تمام واقعات میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ بذاتِ خود ایک خاص دلچسپی کا موجب ہے۔ البتہ اس دوران محسوس ہوتا ہے کہ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے حوالے سے فوق کا ناول تاج کے ڈرامے سے کم تر درجے کی تحریر ہے لیکن فوق کو اوّلیت کی اہمیت بہر حال حاصل ہے۔ تاج کی طرح فوق نے بھی بالآخر یہ محسوس کر لیا تھا کہ واقعی یہ ایک من گھڑت قصہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میرا ناول "انارکلی" کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ محض افسانہ تراشا گیا ہے۔ عہدِ اکبری اور عہدِ جہانگیری کی کسی تاریخ میں اس واقعے کا ذکر تک نہیں"[۱۵]

اس کے بعد فوق نے اپنے ایک اور مضمون میں اس بات کا واضح طور پر

اعتراف کر لیا کہ اس واقعے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"انارکلی کا نام زمانۂ اکبری کے یورپین سیاحوں کے علاوہ تاریخ لاہور کے مصنفوں کے ہاں ملتا ہے۔ ان تاریخوں کے علاوہ سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں راقم نے "انارکلی" کے نام سے ایک ناول لکھا جو ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ اسی ناول کی بنیاد پر ڈھاکہ کے ایک بنگالی ادیب نے ایک تھیئٹر کے لیے ڈرامہ تصنیف کیا اور سب کے آخر میں سید امتیاز علی تاج نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر ایک ضخیم ڈرامہ لکھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود محققین کے نزدیک انارکلی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس کی حقیقت ایک افسانہ سے زیادہ نہیں"۔ [۱۶]

ممتاز مؤرخ پروفیسر علم الدین سالک نے، جو فوق کے بہت گہرے دوست تھے، انارکلی کے ضمن میں مختلف تاریخوں کے مطالعے کے بعد یہی کچھ ثابت کیا کہ تاریخ ہند میں انارکلی کے حوالے سے کسی عشقیہ داستان کا کوئی وجود نہیں۔ [۱۷]

انارکلی کے مقبرے کے علاوہ، جس میں اب کوئی قبر موجود نہیں، لاہور میں ایک بازار کا نام بھی انارکلی ہے۔ یہ نام اپنے اندر اتنی جاذبیت رکھتا ہے کہ خواہ مخواہ اس کی طرف توجہ چلی جاتی ہے۔ اور کوئی چیز اپنی مقبولیت کی بدولت طرح طرح کی روایتوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ شہزادہ جہانگیر کی بیگم صاحب جمال وفن تھی۔ جہانگیر نے اس کے مرنے پر بے حد رنج والم کا اظہار کیا تھا اور وہ شعر کہا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اصل واقعہ تو لوگ بھول بھال گئے اور طرح طرح کے افسانے گھڑ لیے۔ [۱۸]

فوق نے بھی اس واقعے کو بنا سنوار کر ناول لکھ دیا۔ انھوں نے ناول لکھتے ہوئے تاریخی واقعات کے بیان میں وہ تمام آزادیاں روا رکھیں جو تاریخی ناولوں کو تاریخ کے

مقابلے میں دلچسپ اور پُر لطف بناتی ہیں۔ تاریخ کو دلکش طریقے سے پیش کرنے کے ذوق کی تسکین کے لیے فوق نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ تاریخی ناولوں میں زیبِ داستان کے لیے مضمون کو طول دینے میں فوق، شرر کے پیروکار ہیں۔ وہ حسبِ منشا گل بوٹے کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس شوق میں جزئیات نگاری کرتے ہوئے بعض اوقات عجیب صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً پہلے باب میں نادرہ "انار کلی" کی والدہ اپنی بیٹی سے کہتی ہے۔

"تمھارے میاں (والد) کو چاء کی کچھ ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ جب تک دِن میں دو مرتبہ پی نہ لیں ان کی سیری نہیں ہوتی۔" (ص: ۴۰)

واضح رہے کہ یہ گفتگو عہدِ اکبری میں ہو رہی ہے۔ یہ وہ دَور تھا کہ چائے ابھی ہندوستان میں متعارف نہیں ہوئی تھی اور فوق کے بقول اکبر کے زمانے کا ایک امیر "بیڑی" کا عادی ہے۔ اسی طرح دوسرے باب میں اکبر کے محل کی زیب و زینت بیان کرتے ہوئے فوق لکھتے ہیں۔

"بادشاہ کا دِل چونکہ رنگارنگی کا عجائب نمونہ تھا۔ اس لیے اسی شوق میں مجبور ہو کر اکبر منزل کی تمام آرائش و زیبائش بالکل انگریزی طرز سے کی گئی تھی۔ کرسیوں کے درمیان ایک بہت بڑی نفیس اور خوبصورت میز ہوتی تھی جس پر انگریزی دعوت ہوا کرتی تھی۔ تمام انگریزی کھانے نہایت لذیذ ہوتے تھے۔ اور باری باری میز پر چُنے جاتے تھے۔ مطبخ شاہی کا مہتمم ایک اعلیٰ درجہ کا انگریز تھا اور سب کھانے اسی کی زیرِ نگرانی تیار ہُوا کرتے تھے۔" (صفحہ: ۱۴)

یہ بات قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ اکبر انگریزی وضع کی خوراک و پوشاک میں رغبت رکھتا ہو۔ یہ ناول نگار کا تخیل ہے اور اپنے زمانے کے ساتھ ماضی کو مربوط کرنے کی خواہش ہے۔ جس زمانے میں یہ ناول لکھا گیا اس وقت مغلوں کے لال قلعہ

دہلی پر انگریزوں کا پرچم لہرا رہا تھا اور لوگ مغربی بُودو باش کے دلدادہ ہو رہے تھے۔ فوق اپنے زمانے کے لوگوں کی کچھ پسندیدہ باتیں مختلف کرداروں کے ذمّے ڈال دیتے ہیں۔

ناول میں مغلوں کے انداز زیست پر مغربی انداز کے رہن سہن کے اثرات تحریر کر کے قارئین کو مخمصے میں ڈال دیا گیا ہے۔ مُغل اپنے عروج کے زمانے میں اس وقت کے انگریزوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ انگریز مؤرخین آج بھی اکبر کو مغلِ اعظم سمجھتے ہیں۔ فوق کے ناول "انارکلی" میں کہیں کہیں اکبر کو مغرب کے رنگ میں رنگا ہُوا دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ البتہ فوق کے ناول "اکبر" میں اس طرح کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

جہاں تک اس ناول کے عشقیہ واقعے کا تعلق ہے، فوق نے خاصی رنگیں بیانی سے کام لیا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات تحریر پر قصیدے کی تشبیب کا گمان گذرتا ہے۔ ناول کا آغاز اس منظر سے ہوتا ہے۔

"صبح کا وقت ہے اور ایک خوبصورت لڑکی جس کا چمکتا ہُوا چہرہ اپنی جنس میں ایک امتیازی حالت بھی رکھتا ہے، دیدار طلب آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ آفتابِ حُسن کی تیز مگر سنہری شعاعیں بار بار نکل رہی ہیں اور نگاہوں کو خیرہ کرتی ہُوئی کچھ اس طرح زمین پر پھیل جاتی ہیں جس طرح دوپہر دن کی دھوپ یا چودھویں رات کی چاندنی۔ خوبصورت لڑکی ایک چھوٹے سے مگر خوشنما باغیچہ کی خوش وضع روشوں پر ٹہل رہی ہے۔ اس کا بے چین اور شوقین دِل پھُولوں کا ایک گلدستہ بنانے کے لیے مچل رہا ہے۔ مگر جب اس کے نازک ہاتھ پھُول توڑنے کے لیے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو وہ جھجک جاتی ہے اور اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نازنین اپنی نازک انگلیاں جب گلاب کی پتیوں کے پاس لے جاتی ہے تو اس کا شوقین مگر رحم والطاف

سے بھرا ہوا دل اس کے کان میں کچھ منتر پھونک دیتا ہے۔

پھول آہستہ توڑ اے گلچیں
دیکھ ظالم کہیں صبا نہ سُنے

وہ اپنے عزم بالجزم کو ملتوی ہی نہیں بلکہ فسخ کر دیتی ہے۔ نازنین کی عمر ٹھیک چودہ سال کی ہے اور بقول حضرت امیر مینائی۔

باقی نہ دل میں کوئی بھی یارب ہوس رہے
چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے

نازنین ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک جوان عورت جس کی عمر یقیناً ۲۳ سال سے کم نہ ہوگی، اسی باغیچہ میں آئی۔ یہ عورت ایسی حسین تھی کہ اس وقت بھی زاہدان خشک کا دل چھین لینے کے لیے اس کا اپنے آپ کو دکھا دینا کافی تھا۔" (صفحہ: ۲)

فوق نے منظر نگاری کرتے ہوئے بھی اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لیا۔ وہ مکمل نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ منظر دیکھنے والے کردار کی اندرونی کیفیات بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شمس النساء بیگم جب کبھی اس باغ میں آنکلتی تھیں تو باوجود آزادی اور ازخود رفتگی کے اس طائر تیز پر کی طرح کچھ دیر اسیری اور دل بستگی کے لطف اٹھا لیا کرتی تھی جو ہوا پر اڑتا آرہا ہو اور ایک جگہ جال بچھا ہوا دیکھ کر گر پڑا ہو لیکن پھڑک پھڑک کر پھر اس طرح نکل گیا ہو کہ جس طرح سنبلستان سے نگاہوں کے تیر یا ہوا کے نرم نرم جھونکے پار ہو جاتے ہیں۔ مگر اب وہ عالم ہی نہیں تھا۔ دل کچھ اس طرح بجھ گیا تھا کہ باوجود اس فرح بخش باغ کی ہوا دینے کے بھی ایسا مشتعل نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہونا چاہیے۔" (صفحہ: ۵۱)

ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ واقعات کی ترتیب میں فوق نے محنت سے

کام لیا ہے۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک فرضی قصے کے گرد ایک دلچسپ کہانی کا دائرہ بنایا ہے۔ واقعہ نادرہ (شمس النساء بیگم) کے گھر سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں اس کا باپ اعجاز نبی اپنے بھائی کی موت کے بعد دربار اکبری میں بلایا جاتا ہے۔ اعجاز نبی کا بھائی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اکبر کے مقربان خاص میں سے تھا۔ اکبر اس کی جگہ اعجاز نبی کو یہ ذمہ داری سونپ دیتا ہے۔ اس طرح نادرہ اپنے باپ کے ساتھ آگرہ پہنچتی ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ محل میں اس کی آمدورفت شروع ہوتی ہے۔ نادرہ کی والدہ اپنی سیرت اور شخصیت کی وجہ سے اور نادرہ اپنے حُسن اور سلیقے کی وجہ سے قابلِ عزت مقام حاصل کر لیتی ہے۔ نادرہ ایک دِن باغ میں ٹہل رہی ہوتی ہے کہ شہنشاہ اکبر کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ شہنشاہ اس کے لیے اپنے دِل میں پسندیدگی محسوس کرتا ہے اور اسے شمس النساء کا لقب عطا کرتا ہے۔ چونکہ شمس النساءؔ کو انار کے درخت سے بہت انسیت تھی اس لیے بادشاہ محل میں انار کا باغ لگاتا ہے جس کی نگہداشت شمس النساء کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ وہ یہ ذمہ داری ایسی خوش اسلوبی سے نبھاتی ہے کہ پُورے محل میں انارکلی کے نام سے مقبول ہو جاتی ہے۔ اس دوران صاحب عالم شہزادہ سلیم کی اتفاقاً انارکلی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی عاشقانہ مزاجی کے طفیل اسی وقت انارکلی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ انارکلی کو بھی اپنے عشق میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دونوں دِلوں میں محبت اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ اور کچھ دِنوں کی جُدائی بھی شہزادہ سلیم کو بے تاب کر دیتی ہے۔ یہ پابندیاں اور احتیاط اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہیں اور وہ اسی کشمکش میں مضطرب ہو کر انارکلی کو خط لکھ بھیجتا ہے جو پکڑا جاتا ہے اور اس کی خبر اکبر کو ہو جاتی ہے۔ وہ غصے میں آکر انارکلی کو قید کر دیتا ہے مگر شہزادے کی بیتابیوں کو لگام نہیں دے سکتا۔ بالآخر اکبر ہر طرف سے مایوس ہو کر انارکلی کو اس بات پر

مجبور کرتا ہے کہ اس کی پسند کے مطابق کہیں شادی کر دی جاتے، مگر وہ صاف انکار کر دیتی ہے جس سے بادشاہ ناراض ہو جاتا ہے اور انارکلی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔

ناول میں دو مقامات پر فوق بہت پُر تاثیر طریقے سے جذبات نگاری کرتے ہیں۔ انارکلی، سلیم کے ساتھ پہلی ملاقات کے وقت ذہانت کا ثبوت دیتی اور آخری ملاقات کے وقت جرأت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس وقت وہ اکبر کے روبرو کھڑی ہوتی ہے۔ فوق، سلیم اور انارکلی کی پہلی ملاقات کے موقع پر لکھتے ہیں۔

"شمس النساء بیگم۔ صاحب عالم! آپ ہمارے بادشاہ اور ہم لوگ آپ کی رعیت ہیں۔ آپ غور کریں کہ کیا آپ، کو مجھ سے اس طرح کلام کرنا واجب اور انسب ہے۔

شہزادہ: تم بادشاہِ حُسن دخوبی ہو اور میں ایک بے نوا عاشق۔

شمس النساء: حضور! آپ بہت زیادتی سے کام لے رہے ہیں۔

شہزادہ: میں عشق و محبت میں تکلف کو پسند نہیں کرتا میں تمھاری زبان سے حضور، صاحب عالم اور آپ کے الفاظ نہیں سُننا چاہتا۔ مجھے تو تم شوق سے تُو، تجھ اور تُم سے مخاطب کیا کرو۔ ہاں تو تم کس خوش نصیب گھر کا روشن چراغ ہو؟

شمس النساء بیگم: پیشتر اس کے کہ میں اپنے والدین کا حضور کو بتاؤں، مجھ ایسی بے غیرت اور بے شرم کو ڈوب مرنا چاہیے۔

شہزادہ: تمھارے اور تمھارے والدین کے لیے باعثِ فخر ہونا چاہیئے کہ میں تم پر دل و جان قربان کر دینے کو تیار ہوں۔

شمس النساء بیگم: اس خوشی کے وہی لوگ بھوکے ہیں جو عزت، دولت اور

نام آوری کے خواہاں ہوں۔ خدا کے فضل اور بادشاہ سلامت کی توجہ سے اس وقت ہم کو کسی چیز کی کمی نہیں۔" (صفحہ : ۳۸ - ۳۷)

ناول میں وہ لمحہ بہت رُوح فرسا ہے جب انارکلی، اکبر کے سامنے کھڑی ہے اور سلیم بھی آ پہنچتا ہے۔

اکبر : کیوں بی لڑکی! پھر تم نکاح نہیں کرو گی؟

انارکلی: حضور! مجھے معاف رکھا جائے (سلیم کی طرف ایک آہ سرد بھر کر دیکھتی ہے)۔

اکبر : کیوں ری دیدہ دلیر! یہ شوخیاں اور ہمارے سامنے۔

انارکلی: حضور! چاہے میرا سر تن سے جُدا کر دیا جائے، مگر اب مَیں ایک کی ہو کر دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔

اکبر : (سلیم سے)۔ تمھیں تو اس کی محبت سے انکار ہے نا۔

سلیم : ہاں حضور! مَیں بھی جُرمِ اُلفت کا مرتکب ہُوں۔

اکبر : بہت بہتر۔

انارکلی: حضور! میری تقدیر کا جو فیصلہ کرنا ہے، ابھی ان کے سامنے کر دیجیے۔

(صفحہ : ۸۳)

انارکلی کی حقیقت جانتے ہُوئے بھی ناول میں فوق اس کے ساتھ ہلکی سی وابستگی پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ناول نگار کی کامیابی ہے کہ کِسی کردار کے دردناک انجام پر لوگوں کا دِل بھر آئے۔

"اکبر"

راجپوت گزٹ مشین پریس لاہور کے زیرِ اہتمام یہ ناول پہلی بار ۱۹۰۹ء میں

شائع ہوا، اس کی ضخامت ۳۸۷ صفحات ہے۔ یہ تاریخی ناول فنی لحاظ سے فوق کے دوسرے ناولوں سے بہتر ہے۔ فوق نے اپنے دیباچے میں اس ناول کے بارے میں چند وضاحتیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اس کتاب کا پلاٹ اسی نام کی ایک انگریزی تصنیف "اکبر" سے لیا گیا ہے مصنف نے اس کتاب کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن جب ناول کے بعض واقعات و حالات کا مقابلہ تاریخ سے کیا گیا تو زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے یہ ناول سرے سے نیا لکھنا پڑا۔ عشق و محبّت کے افسانے، باقی جس قدر تفصیلات ہیں ان کو ترتیب دینے میں مندرجہ ذیل اخباروں اور کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی"۔

(۱) دربار اکبری (۲) مہا بھارت (اردو) (۳) گلزار کشمیر۔
(۴) تاریخ جلسہ قیصری دہلی۔ (۵) تاریخ بندھیل کھنڈ (۶) مرآۃ التاریخ۔
(۷) تاریخ جدولی (۸) گلدستۂ کشمیر (۹) تاریخ فرشتہ۔
(۱۰) صحیفہ (۱۱) روزانہ "پیسہ اخبار" (۱۲) آئینۂ اکبری۔

اکبر کے ساتھ فوق کی عقیدتوں کا ذکر پہلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ فوق عہدِ اکبر کو اپنے ناول کا موضوع بنا کر برِصغیر میں مسلمانوں کا شاندار ماضی دلوں میں زندہ کرنا چاہتے تھے۔ فوق کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے "اکبر" کا مطالعہ حیرت انگیز نتائج کا باعث بنتا ہے۔ اس ناول میں فوق کا فن اپنے کمال پر ہے۔ فوق نے کوشش کی ہے کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ چلا جائے۔ ناول میں جزئیات نگاری سے فوق کے مؤرخانہ کمالات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں ان کی نظر چھوٹی باتوں پر بھی ہوتی ہے۔ وہ ماضی کی ایک تہذیب کو ایک انوکھا رنگ روپ عطا کرنا چاہتے تھے۔ ناول میں ایک واقعے کے دوران کشمیری نوجوان سدھا کے ساتھ اکبر کی

ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے فوق بتاتے ہیں کہ اکبر، سدھا کو یہ پتہ نہیں چلنے دیتا کہ وہی شہنشاہ ہے۔ وہ اسے عام آدمی کے طور پر ملتا ہے۔ سدھا کی صاف گوئی اور اپنے بارے میں تنقیدی گفتگو تحمل سے سنتا ہے۔ اس طرح سدھا کو وہ اپنے اعتماد میں لیتا ہے اور اپنے بارے میں پتہ چل جانے کے بعد بھی سدھا کے اندر ایک قابلِ اعتماد دوست کے جذبات بیدار رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس ناول کو ہم ایک تہذیبی دستاویز بھی کہہ سکتے ہیں۔ فوق ایک قدیم اور عظیم عہد کی اقدار اپنی نسل کے رجحانات کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ماضی کی خوبصورت دُنیا میں پناہ لینے کے خواہش مند ہیں تاکہ ٹوٹے رشتے استوار کیے جاسکیں۔ وہ عہدِ اکبر کا موازنہ برٹش انڈیا یعنی اپنے زمانے سے کرتے ہیں۔ دونوں زمانوں میں چیزوں کی قیمتوں کا بھی موازنہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدِ اکبر میں قیمتیں کم تھیں۔ وہ فنِ حکمرانی کا مقابلہ کر کے بھی دیکھتے ہیں۔ اور ثابت کرتے ہیں کہ عہدِ اکبر میں امن و امان کی صورتِ حال زیادہ اچھی تھی اور رعایا مذہب و ملت میں اختلاف کے باوجود سُکھ چین سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اس طرح فوق اپنے عہد کی انحطاطی حالت کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ اس ناول میں مغل ہندوستان کے سیاسی حالات کا نقشہ بھی نظر آتا ہے جس میں بعض ایرانی اور ہندو عناصر بادشاہ کے خلاف در پردہ سازشیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تختِ دہلی کے ارد گرد واقعات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی طرف بھی نظر اُٹھ جاتی ہے۔ کشمیر کی صورتِ حال اس ناول کا نمایاں حصّہ ہے جہاں مقامی حاکموں کی باہمی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کے اندازِ حکومت پر ادبار کی سی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال میں ہندوؤں کی بددیانتی اور مسلم دشمنی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کشمیر میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہیں مگر مغلوں کو ناکام کرنے کے لیے وہ ان کا بظاہر ساتھ دیتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اصل میں

یہ ناول کشمیر کے تاریخی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کا اصل ہیرو ایک کشمیری نوجوان سدھارام ہے جسے فوق "ہمارا خوبصورت نوجوان" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ فوق آگرہ جانے سے پہلے ایک تارک الدنیا، پُراسرار انسان سے ملتا ہے جسے فوق "ہمالہ کا گوشہ نشین" کہتا ہے۔ سدھا کا مہربان اتالیق "کلوکا" بھی اس کے ساتھ ہے۔ گوشہ نشینی کے بارے میں فوق نے سدھا کے جذبات کا اظہار کھُلی عقیدت سے کیا ہے۔ گوشہ نشینی کی محفل سے شہنشاہ اکبر کے دربار تک سدھا کی روانگی کی کیفیات بہت فنکارانہ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"سدھا دل ہی دل میں کہتا تھا کہ کیا انقلاب عالم ہے اور یہ ہستیٔ ناپائیدار کیسی بے اعتبار اور دنیاوی تعلقات کیسے رنج دہ ہیں۔ آج ان سب کا نمونہ میں نے اسی جنگل میں دیکھا ہے جس میں ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے پاس کسی وقت بے حد طاقت اور عیش و عشرت کے تمام سامان موجود تھے مگر جو اپنے ملک کی خاطر سب کچھ قربان کر کے اب موجودہ تنہا سادہ زندگی پر بڑا خوش اور مطمئن نظر آتا ہے۔ ہر چند اس کے پاس سوائے ایک ایماندار نوکر اور ایک شکاری جانور کے اور کچھ بھی نہیں مگر گوشہ نشین کے طرح طرح کے خیالات ہی خود ایک چھوٹی سی بستی کا نمونہ ہیں۔

؎ تجھ میں آبادی ہے ارمانوں کی اے صحرائے عشق
گرچہ میرے خانۂ دل کی طرح ویراں ہے تو

انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ یکایک اس عظیم الشان شہنشاہ کے دربار کا خیال آیا جو اپنے ملک اور اپنی رعایا پر رعب اور سختی سے حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے پاس محبت و قدردانی اور جوہر شناسی و عدل گستری کے چند ایسے جوہر ہیں کہ تمام لوگ خود بخود اس کے دامِ تسخیر میں پھنس جاتے تھے۔ وہ شہنشاہ اکبر تھا اور اس کا دربار آگرہ تھا۔" (صفحہ: ۹)

سدھا کو اپنی منگیتر ارادتی اور اپنے وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کا چچا اور اس کی منگیتر کا والد سلہنا، اکبر کی طرف سے گنگا و جمنا کی جائے ملاپ پر واقع قلعے کا حکمران ہے جہاں ارادتی، سدھا کے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ فوق نے ان دونوں کی محبت کو روایتی عشقیہ انداز کی کہانی کے طور پر تحریر کیا ہے۔ سلہنا اپنے بھتیجے سدھا کو دربار اکبری میں اپنے ملک کے مفادات کی حفاظت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ سلہنا کی سدھا سے گفتگو ایک کٹر ہندو کے فکر و خیال کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں خاندان چکاں کا چوتھا فرمانروا یوسف خاں چک اپنے باپ علی خاں چک کی وفات کے بعد ۱۵۷۸ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اپنے چچا ابدال خاں چک کے ساتھ یکے بعد دیگرے اس کی کئی جنگیں ہو چکی تھیں جنھیں خانہ جنگی کہنا چاہیے۔ ہندو اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن ان کو اصل خطرہ اکبر کی طرف سے محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ دربار اکبری میں شامل ہو کر خفیہ طور پر سازشوں میں مصروف تھے۔ ناول میں سدھا کے ساتھ سلہنا کا مکالمہ قابلِ غور ہے مگر سدھا جو سیدھا سادا اور سچا نوجوان ہے ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

سلہنا: اکبر اس سے زیادہ شہرت اور عزت کا مستحق ہے جو آج اسے چار دانگ عالم میں حاصل ہے، مگر میرا مطلب یہ ہے کہ وہ شہنشاہ جس نے اپنی دلیری و دُور اندیشی سے بہت سی ریاستوں اور اکثر اچھے اچھے طاقتور رئیسوں کو مطیع کر لیا ہو اور جس کی ملک گیری کی ہوس کی ابھی ابتدا ہی ہو، تمھاری یا میری یا کسی اور کی سلطنت کو کب آزاد رہنے دے گا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے بدقسمت ملک کشمیر کے بادشاہ اور اس کے رشتہ داروں کے درمیان کھلم کھلا جھگڑے ہو رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ ملک کئی حصّوں

میں تقسیم ہو جائے گا۔ اکبر اس بہانہ سے کشمیر پر اپنی بے تعداد فوج سے حملہ کر دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کشمیر بھی آگرہ اور دہلی کی بادشاہی میں داخل ہو جائے گا۔

سدھا: اگر یہ سچ ہے تو آپ ایسے آدمی کی خواہ بادشاہی کیوں نہ ہو، کس طرح ملازمت کر سکتے ہیں جس نے ہمارے ملک کے برباد کرنے کی قسم کھالی ہو۔

سلہنا: میں بادشاہ کے خیالات اور تجاویز سے واقف کار ہو کر ملکی خدمت بجا لا رہا ہوں۔ اور تم کو بھی اسی لیے اس عظیم الشان شہنشاہ کے دربار میں بلوایا ہے کہ در پردہ اپنے ملک کی حفاظت کا سامان کر سکو۔

سدھا: مگر گرو کلوکا کی یہ نصیحت ہے کہ راہِ راست پر چلو اور کسی سے دغا یا بے ایمانی نہ کرو۔

سلہنا: کلوکا عالم ہے، فاضل ہے مگر پیارے سدھا! پولیٹیکل معاملات میں علم و فضل سے اتنا کام نہیں لیا جاتا جس قدر کہ چال بازیوں اور ظاہر داریوں، بلکہ زمانہ سازیوں سے۔" (صفحہ: ۱۳-۱۲)

اس مکالمے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس ناول کا مرکز کشمیر ہے۔ فوق خطۂ کشمیر کی تسخیر تک کئی واقعات کا رُخ بار بار اس وادی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ فوق کے نزدیک تسخیر کشمیر کا واقعہ بہت اہم ہے کہ اس طرح یہ علاقہ خانہ جنگیوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے کچھ مدت کے لیے محفوظ ہو گیا اور اہلِ کشمیر نے سکھ کا سانس لیا۔ فوق نے ایک کتاب "شاہی سیر کشمیر" بھی لکھی ہے۔ جس میں اکبر سے لے کر عالمگیر تک مغل بادشاہوں کے سفر کشمیر کا حال لکھا ہے۔ اس کا ذکر اس مقالے کے ساتویں باب میں آئے گا۔ سدھا اکبر بادشاہ سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ اکبر نے اسے ایک فوجی سردار بنا دیا اور وہ آخر دم تک اکبر کا وفادار رہا۔ اس نے دربار

میں اکبر کے خلاف سازشوں کا پردہ چاک کیا اور انھیں ناکام بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

فوق نے اکبر کو اکبرِ اعظم کے خدوخال میں پیش کیا ہے۔ اس کا مسلک روشن خیالی اور انسان دوستی تھا وہ مصلحِ کُل طبیعت کا مالک تھا۔ جاسوسی کے نظام سے لے کر فلاح و بہبود کے انتظامات تک ہر کام پر نظر رکھتا تھا۔ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا۔ فوق نے دینِ الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ کے باطنی اضطراب کو نمایاں کیا ہے۔ لگتا ہے کہ بادشاہ مظاہرِ فطرت کی مدد سے اس بنیادی اصول کی دریافت کے لیے بے قرار ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہ جہالت کو دُور کرنا چاہتا تھا اور اشیاء کو ان کی اصل میں دیکھنے اور سمجھنے کی خواہش رکھتا تھا، اس لیے وہ ہر مذہب و ملّت اور خیالات و نظریات کے حامل لوگوں کی بات پُورے غور سے سُنتا تھا۔ اس کے زمانے میں ہر کسی کو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ دوسرے کے مذہب پر اعتراض نہ کیا جائے۔ فوق کے مطابق اکبر نے کبھی اسلام کو ڈِس اون نہیں کیا، تاہم دینِ الٰہی کے ضمن میں فوق کا اپنا نقطۂ ملّا عبدالقادر بدایونی کے خیالات سے متاثّر دکھائی دیتا ہے۔ ملّا عبدالقادر ایک کٹّر عالمِ دین تھا۔ وہ دربارِ اکبری میں ابوالفضل اور فیضی کی آزاد خیالی پر سخت تنقید کرتا تھا۔ وہ بادشاہ پر بھی نکتہ چینی کرتا تھا۔ اکبر یہ سمجھتا تھا کہ عبدالقادر تنگ نظر ہے مگر دِل کا اچھا ہے۔ فوق نے اگرچہ مذہب کے معاملے میں اکبر کے خیالات کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر بحیثیت مُسلمان وہ اس کے نظریات کو قبول نہیں کرتے۔ اس لیے اس ناول میں تمام تر بے اعتدالیوں کا ذمہ دار فیضی اور ابوالفضل کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ ملّا عبدالقادر کا خیال تھا۔ فوق ان دونوں دانشوروں کی عالمانہ وجاہت سے بہت متاثر ہے۔ ابوالفضل

کی موت کے واقعے پر فوق بہت جذباتی دکھائی دیتے ہیں۔ علم و فضل میں درجۂ کمال رکھنے کی وجہ سے اکبر ان دونوں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ ابوالفضل کی موت کا اکبر کو گہرا صدمہ ہُوا اور اس نے پہلی بار اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ بیسویں باب میں ابوالفضل کے قتل کی واردات کو بیان کیا گیا ہے۔ جس وقت ابوالفضل پر حملہ ہُوا، سدھا دو سواروں کو ہمراہ لے کر سرکاری خطوط پہنچانے فتح پور جا رہا تھا۔ سدھا مقابلہ میں شریک ہُوا مگر ابوالفضل زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نیچے گر چکا تھا۔ سدھا نے ابوالفضل کا سر اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ابوالفضل نے مرنے سے کچھ دیر سے پہلے، کراہتے ہُوئے، سدھا سے جو کچھ کہا، وہ اس کے کردار کی بلندی کی عکاسی کرتا ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

"افسوس! میری آواز بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اکبر کو کہنا کہ میرا آخری خیال اس کی طرف تھا اور یہ کہنا کہ مَیں جن اصولوں کا ذکر اکثر کرتا تھا، ان کی سچائی پر پُورے اعتقاد کے ساتھ مرتا ہُوں۔ روشنی نہ صرف سُورج میں ہے بلکہ اس وقت میرے اندر بھی ہے اَب بہت جلد زائل ہونے والی ہے۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ مَیں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ ہمدردی اور انسانیت اور نیکی کا برتاؤ کیا ہے۔ مَیں اطمینان کے ساتھ جان دیتا ہُوں۔ اے میرے دوست! تم بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرو۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد سدھا کے ہاتھوں کو دبا کر ابوالفضل نے کمزور الفاظ میں کہا "اب الوداع!"۔ اس کا سر اس کی چھاتی پر گر پڑا۔" (صفحہ: ۱۳۰)

ابوالفضل اور فیضی کی علمی بحثوں کے علاوہ گوا کے پادریوں کے ساتھ مناظرہ کے دوران عالمانہ مجلسوں کو بھی بڑے اہتمام سے ناول کا حصّہ بنایا گیا ہے۔ گوا کے پادریوں میں خاص طور سے پادری ایکوا مغل سلطنت کو مسیحی سلطنت بنانے کی جدوجہد

ہیں آگے آگے دکھائی دیتا ہے۔ اس خیال سے گوا کے پادریوں کی اعلیٰ کونسل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ چونکہ بادشاہ حسن پرست ہے اور امراء عیاش ہیں، اس لیے خوبصورت عیسائی لڑکیوں کو مشن میں شامل کیا جائے تاکہ عیسائیت کے فروغ میں مدد دے سکیں۔ ایک دوشیزہ میری (مریم) کو منتخب کیا گیا جو اکبر کے حرم میں پہنچ کر مریم زمانی بیگم کہلائی۔ اس خاتون کا تذکرہ فوق کی سوانحی کتاب "بتانِ حرم" میں بھی ہے۔ ناول کے پندرھویں باب میں پادریوں کی چال بازیوں کا حال لکھا گیا ہے۔

مختلف سرگرمیوں کی روشنی میں اس ناول کے کئی ابواب میں شہزادہ سلیم کی موجودگی پائی جاتی ہے۔ ساتویں باب کا نام ہی "سلیم" ہے۔ اکبر کی وفات تک شہزادہ سلیم پڑھنے والے کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ شہزادہ سلیم اپنے باپ کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں۔ وہ ابوالفضل اور فیضی کے بھی خلاف تھا۔ دربار کے شرپسند اور مفاد پرست عناصر نے اسے اپنے باپ کے خلاف بُری طرح اُکسائے رکھا، اور اس کے دل میں اس طرح بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لیکن اکبر نے اپنے بیٹے کی تمام خودسرانہ حرکات کو بڑے تحمل سے برداشت کیا کیونکہ وہ اسے مغل سلطنت کی بقا کا ایک وسیلہ سمجھتا تھا۔ اکبر کی کوششیں رنگ لائیں اور سلیم ایک ناکام بغاوت کے بعد اپنے باپ کے قدموں میں آگرا۔ ناول میں اکبر اور سلیم کی صلح کا منظر بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ بیسویں باب میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں جو "سلیم اور اکبر" کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ فوق نے دو فقروں میں پوری کیفیات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب سلیم حاضر ہُوا تو اکبر بالکل تنہا تھا، اور یہ تنہائی اس مصلحت سے تھی کہ سلیم کو عام لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے، تاکہ اس کے ذاتی رعب میں فرق نہ آئے۔ (صفحہ: ۱۵۲)

جب سدھا کی منگیتر اراوتی نے شہزادہ سلیم کے اظہارِ عشق کے جواب میں جرأت مندانہ بے نیازی سے جواب دیا تو سلیم نے قوت و حشمت ہوتے ہوئے اراوتی کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اراوتی کے ساتھ بھی عشق و محبت میں جذباتی ہو گیا مگر آپے سے باہر نہ ہوا۔ فوق نے ناول کے آخری باب میں جہانگیر کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات کے بعد سلیم اب جہانگیر کے نام سے ہندوستان کا عظیم الشان اور جلیل القدر شہنشاہ ہے۔ اس نے بادشاہ ہو کر شہزادگی کے زمانہ کی تمام بے اعتدالیاں ترک کر دیں۔ اور ہر چند اس کی حکومت اکبری اقبال کے برابر نہ تھی، تاہم ہندوستان کے مشہور مسلمان بادشاہوں میں اس کا نام دوسرے درجے پر ہے۔"

فوق کے ناول "اکبر" میں سلیم کا سدھا کے ساتھ کوئی خاص رابطہ نہیں دکھایا گیا۔ ایک واقعہ دونوں کے درمیان تعلق کا راستہ بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ رضیہ نام کی ایک خاتون نے سدھا کو ایک سازش میں پھنسا کر اپنے ساتھ ملوث کرنے کی کوشش کی۔ سدھا کو اصل بات کا دیر بعد پتہ چلا۔ اس دوران وہ اپنی محبوبہ اراوتی کو بھلا بیٹھا۔ البتہ رضیہ کے ساتھ تعلق کے بعد سدھا کو محلاتی سازشوں کا علم ہوا۔ اور وہ اکبر کو ان سازشوں سے آگاہ کر کے اسے ایک بہت بڑی پریشانی سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ واردات "ایک نئی ملاقات" کے عنوان کے ساتھ پانچویں باب سے شروع ہو کر اٹھارہویں باب "افشائے راز" تک چلتی ہے جب سدھا نے اپنے چچا سلہنا کو رضیہ کے گھر میں دیکھ لیا۔ سلہنا، رضیہ کو اختر بانو کہہ کر پکارتا ہے۔ سدھا نے دونوں کو شہزادہ سلیم کی بادشاہت کے لیے مختلف منصوبوں پر ساز باز کرتے ہوئے سن لیا۔ اسے اپنے چچا اور اس عیار عورت سے نفرت

ہوئی۔ اور ایک بار پھر اس کے اندر پہلی محبت جاگ پڑی۔ اس دوران اراوتی نے سدھا کے لیے جو مصیبتیں جھیلیں، ان کا ذکر بھی ناول میں بڑے درد سے کیا گیا ہے۔ ناول کے پچیسویں باب کا نام "اراوتی کی بے چینی" ہے۔ آخری باب میں سدھا اور اراوتی کو اپنے بیٹے کے ساتھ اکبر کے مزار پر دکھایا گیا ہے۔ سدھا اور اراوتی کے علاوہ فوق بھی مقبرے کی ویرانی اور کس مپرسی دیکھ کر ایک اداسی کا سامنا کرتا ہے۔ اس لمحہ میں ایک عظیم بادشاہ کی عظمت فوق کے اندر کے مؤرخ اور ریفارمر کو آواز دیتی ہوئی لگتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تاریخ ایسے بادشاہ کا نام بتلانے سے ہمیشہ قاصر رہے گی جس کو اس کی رعایا متفقہ طور پر ادب و احترام اور سچی محبت و عقیدت کے ساتھ اکبرِ اعظم کی مانند پوجتی ہو۔ اکبر نے آئندہ سلطنتوں اور بادشاہوں کے لیے بے تعصبی اور عدل و انصاف کا میدان وسیع کر دیا اور ان کو صاف راستہ بتا دیا ہے کہ جو حکومت رعایا سے سختی اور نفرت کا اظہار کرے گی وہ کبھی ہر دلعزیزی حاصل نہیں کر سکتی، اور ہر چند کہ جابر سخت گیر اور رعایا کی اصلی حالت سے لاپرواہ حکومت کیسا ہی عروج اور اقبال کیوں نہ حاصل کرے مگر نتیجہ ایک دن وہی ہوگا جو آفتاب نصف النہار کا دن ڈھلنے کے بعد ہوتا ہے۔ اکبر کی یادگار مقبرہ ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ کہیں زیادہ عزت کا مستحق ہے۔" (صفحہ : ۱۷۳)

فوق خود ۱۹۰۴ء میں اکبر کے مزار پر حاضر ہوئے تھے۔ وہ اس کی پریشان کُن حالت دیکھ کر دکھی ہوئے۔[19] فوق اس جلیل القدر بادشاہ کے سچے عاشق تھے۔ ان کا ناول اکبر سے محبت اور عقیدت کا فنکارانہ اظہار ہے۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ تاریخی ناولوں میں بیان کیے گئے واقعے سے قارئین پہلے ہی آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ناول نگار کے پاس صرف دو کام رہ جاتے ہیں۔ ایک

کردار نگاری اور دوسرا اسلوب تحریر۔ فوق کے ناول "اکبر" میں کردار نگاری اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ تاریخی کرداروں کے علاوہ دوسرے کردار بھی اپنی اپنی جگہ مکمل دکھائی دیتے ہیں۔ یوگی۔ سادھو۔ صوبیدار ہندو لڑکیاں اور بظاہر غیر متعلق کردار بھی غیر ضروری نہیں لگتے۔ اسلوب کو پُر کشش بنانے میں فوق نے بہت محنت کی ہے ان کی زبان فکشن میں استعمال ہونے والی زبان کے معیار کے مطابق ہے۔ انھوں نے ناول نگاری میں اسلوب شعر کی دل کشی شامل کر دی ہے۔

"رام کہانی"

۸۱ صفحات پر مشتمل یہ ناول پہلی بار ۱۹۰۰ء میں مترولاس پریس لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔ اس ناول میں ایک عاشق نامراد کی اپنے رقیب کے ساتھ کی گئی نیکیوں کا تذکرہ ہے۔ اس طرح یہ ایک اخلاقی ناول کا سا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ مختلف قربانیوں کے واقعات دل پر اثر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ تحریر پوری طرح ناول نہیں بن سکی "رام کہانی" کے نام سے ذہن روایتی آپ بیتی کی طرف جاتا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے اس تاثر کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس ناول کے کردار اپنے ناموں سے یورپ کے لگتے ہیں اس لیے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ ناول ترجمہ ہے یا طبعزاد۔ فوق نے اس ضمن میں کوئی وضاحت نہیں کی۔ اس لیے ہم اُسے طبعزاد ناول ہی کہیں گے۔ فوق کے مغربی کردار اُردو کے اشعار پڑھتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ اشعار موقع محل کے مطابق استعمال کیے جاتے ہیں۔ انگریزوں والے نام کے کردار اپنے انداز و اطوار میں مشرقی نظر آتے ہیں۔

یہ ایک انگریز سپاہی بے جان بلمرج کی کہانی ہے۔ جو محبت میں جدائی

کے باوجود مختلف موقعوں پر قربانی کا بے مثال مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ اپنے مہمان دوست پادری مسٹر کیری ویل کو اپنی داستان حیات سناتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اسے کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ جب جوان ہوا تو محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ وہ چاہتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح غیر ممالک میں جا کر اپنی قسمت آزماتا اور خوشحال ہو جاتا۔ لیکن وہ کلیرا نامی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ کلیرا نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ مگر کچھ مدت بعد فوج کے کپتان ہیلوڈ نے کلیرا کو اپنے دام میں پھنسا لیا۔ اور دونوں نے شادی کر لی۔ کپتان نے پلمرج کی بے عزتی کی۔ پلمرج نے ہر طرف سے مایوس ہو کر فوج میں سپاہی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اسے ایک جنگ میں شرکت کے لیے ملک سے باہر جانا پڑا۔ افریقہ کے کسی علاقے میں نیم وحشی لوگوں سے مقابلہ تھا۔ اس علاقے کا درجہ حرارت بھی زیادہ تھا۔ خوراک بھی مناسب نہ ملتی تھی۔ جنگ میں پلمرج زخمی ہو گیا۔ لشکر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے ایک مردہ سپاہی کی چھاگل سے پانی پی کر پیاس بجھائی۔ اور اس طرح کچھ بسکٹ حاصل کرکے اپنی جان بچائی۔ اسے پاس ہی سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس شخص کے پاس پہنچا۔ تو دیکھا کہ وہ کپتان ہیلوڈ تھا۔ جس نے اسے زندگی میں بڑا ذلیل کیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ مگر اس نے اپنے رقیب کی جان بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ کپتان ہیلوڈ کو پتہ نہ چلا کہ وہ سپاہی پلمرج ہے۔ جنگ کے بعد وہ فوج سے ریٹائر ہو گیا۔ شادی کر لی۔ اس کی بیوی ایک بچے کو جنم دینے کے بعد مر گئی۔ اس کے بعد اتفاق سے بوڑھے سپاہی نے دو مرتبہ کپتان ہیلوڈ کی جان بچائی۔ ایک دفعہ جلتے ہوئے مکان سے ہیلوڈ کے ساتھ اس کی بیٹی کو بھی نکالا۔ مگر کپتان اور کلیرا کو معلوم نہ ہونے پایا کہ ان کی جان بچانے والا شخص کون ہے۔ پادری کیری ویل نے ڈیلوڈ کے مرنے

کے مرنے کے بعد سب کچھ کلیرا کو بتا دیا۔ کلیرا پلمرج کے گھر شکریہ ادا کرنے آئی مگر وہ اندھا ہو چکا تھا۔ ناول کا اختتام پلمرج کے بیٹے اور کلیرا کی بیٹی کی شادی کی صورت میں ہوتا ہے۔

فوق نے کہانی کو ایک دلچسپ اختتام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ ایک روایتی قسم کا انجام ہے۔ مگر واقعات کے تسلسل میں فوق نے ایک لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی اتفاقات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ اور اس کا انجام ایک حسنِ اتفاق کی طرح ہے۔ فوق کا اسلوب سپاٹ اور بے جان ہے۔ جس وقت سپاہی پلمرج اپنے دشمن کی جان بچاتا ہے۔ فوق نے اس واقعے میں بھی کوئی زور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ پلمرج اور کلیرا کی آخری ملاقات کے دوران بھی قاری کے دل میں کوئی کیفیت پیدا کرنے میں فوق کامیاب نہیں ہو سکے۔ جلتے ہوئے مکان سے ڈیوڈ اور اس کی بیٹی کے زندہ بچانے کا واقعہ اخباری بیان کی طرح لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جلتے ہوئے مکان سے کسی شخص کو کس طرح باہر نکالا جا سکتا ہے۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ پلمرج یہ تمام واقعات پادری کیبری ویل کو سنا رہا ہے۔ مگر بیانیہ انداز میں بھی فوق جذبات سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ فوق کا انداز بھی ان کے اس ناول کے مرکزی کردار پلمرج جیسا ہے۔ پلمرج نے اپنے دشمن کی جان بچانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنے مخاطب سے جو کچھ کہا۔ فوق نے اس طرح قارئین تک پہنچایا ہے۔

پلمرج کا کردار ایک بے غرض انسان کا ہے جس کا رویہ غیر جذباتی ہے اور وہ زندگی کو حقیقت پسندانہ انداز میں گزارنے کا قائل ہے۔ ناول کے آخر میں جب کلیرا اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی کہتی ہے "کہ کیا تم وہ تمام غم والم اور رنج واندوہ معاف کر دو گے جو صرف میرے اور میرے ہی باعث تم کو نصیب ہوئے"۔

تو بوڑھے سپاہی کا جواب زندگی کے جاری وساری عمل پر اس کے یقین کا روشن ثبوت ہے۔ فوق، ہلمرج کا یہ مکالمہ اس طرح لکھتے ہیں۔

"ایک لمحے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو بھول جانا چاہیے کیونکہ اب ایک ایسی زندگی میرے پیشِ نظر ہے۔ جو مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ یعنی میرے بیٹے کی زندگی۔"

"ناکام"

۱۰۸ صفحات پر مشتمل یہ ناول صدائے ہند پریس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہُوا۔ تاریخ اشاعت درج نہیں۔

کسی حد تک یہ ایک عشقیہ قصہ ہے۔ مگر اس میں ایک سماجی مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ لڑکیوں سے رائے لیے بغیر ان کی شادی کر دینا کس قدر اذیت ناک اور تباہ کُن ہوتا ہے۔ اس ناول میں ایک لڑکی زینب کی شادی اس کی رضامندی کے بغیر طے کر دی جاتی ہے۔ لڑکی کو معلوم نہیں کہ جس کے ساتھ اس کی شادی ہو رہی ہے، وہ کون ہے۔ اور کیسا آدمی ہے۔ کن عادات واطوار کا مالک ہے۔ وہ مختلف وہموں اور وسوسوں میں گھر جاتی ہے۔ ستم یہ ہے کہ زینب کے والدین نے بھی اس معاملے میں کوئی تحقیق نہیں کی۔ شادی ہو جانے کے بعد زینب کی زندگی تلخیوں اور عذابوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

اس ناول کی تصنیف میں ایک اصلاحی جذبہ فوق کے دل میں موجود تھا۔ ناول کے آخری باب کا نام فوق نے "نتیجہ" رکھا ہے۔ جو فوق کے تشریحی اور وضاحتی انداز کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس باب میں فوق نے ان مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن کو ملحوظ رکھ کے انھوں نے یہ ناول لکھا ہے۔ اگر ناول میں بیان کیے گئے واقعات

کے ذریعے بات پڑھنے والوں تک نہیں پہنچتی۔ تو یہ ناول نگار کی خامی سمجھی جاتی ہے۔ مزید برآں ناول نگار کی براہ راست وضاحتیں ناول کو اور کمزور کر دیتی ہیں۔ آخری باب "نتیجہ" کے آغاز میں فوق لکھتے ہیں۔

"مانو نہ مانو آپ کو یہ اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جائیں گے

ناظرین! آپ نے اس ناول کے سولہ باب پڑھے۔ ہر ایک باب میں جُدا جُدا مضمون جُدا جُدا چاشنی اور جُدا جُدا لذت ہے۔ کسی باب میں لاہور کی ان برقع پوش فاحشہ عورتوں کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔ جنھوں نے برقع کے استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر میں حقیر کر دیا ہے۔" (صفحہ : ۱۰۷)

اسی طرح ہر باب کا مرکزی خیال بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات ناول کی تکنیک سے لگا نہیں کھاتی۔

فوق اپنے کرداروں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اور اپنی طرف سے قارئین کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جب تک پڑھنے والا ناول کے کرداروں سے متأثر نہ ہو، بات نہیں بنتی۔ حالانکہ فوق نے زینب کی جو حالت زار بیان کی ہے وہ کسی حد تک اس مسئلے کی شدّت کو محسوس کرنے پر اکساتی ہے۔ حتّٰی کہ وہ مایوسی کے عالم میں اپنے ہمسائے شیدا حسن کی محبت میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شیدا حسن میڈیکل کالج کا طالب علم ہے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی ہوتی ہے۔ زینب، شیدا حسن کے ساتھ کہیں چلے جانے کا پروگرام بناتی ہے۔ شیدا حسن اس کو بیاہ کر لے جانے کا وعدہ کرتا ہے۔ زینب، شیدا حسن کے ساتھ اس لیے جانا چاہتی ہے کہ وہ اس کو جانتی ہے۔ اور اپنے لیے اس کی محبت کو محسوس کرتی ہے۔ وہ مشرقی ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود اتنے اضطراب میں مبتلا ہے۔ کہ نتائج سے

بے پروا ہو کر انتہائی اقدام کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ فوق لڑکیوں کی مرضی کے بغیر شادیوں کے نقصانات ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہانی میں یہ موڑ آتا ہے کہ ایک معمولی سی غلطی پر شیدا حسن کو کالج سے نکال دیا جاتا ہے۔ اور وہ شہر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ زینب کو اب شیدا حسن کی جُدائی کا غم بھی نڈھال کر دیتا ہے۔ اس حالت میں اس کے ہاتھوں کو مہندی لگائی جاتی ہے۔ اور شوہر کے ساتھ رخصت کرایا جاتا ہے۔ جس کے لیے اس کے دِل میں سوائے اندیشوں کے اور کچھ نہیں۔ زینب کا شوہر شرابی اور زانی نکلتا ہے۔ وہ زینب کا زیور تک بیچ کھاتا ہے۔ اور زینب سوائے آہ و زاری کے کچھ نہیں کر سکتی۔ آہ و زاری تو شادی سے پہلے سے اس کا مقدر بن چکی تھی۔ یہی ناول کا نقطۂ عروج ہے۔ زینب کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ فوق ایک سماجی مسئلے کی نزاکت کو بیان کرتے کرتے کہانی کو یہیں تک لانا چاہتے تھے۔ لیکن فوق نے ایک اصلاحی ناول میں جس طرح ایک عشقیہ داستان کی گنجائش نکالی ہے۔ وہ غیر ضروری معلوم نہیں ہوتی۔ شادی طے ہو جانے کے بعد لڑکی کے کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ تعلقات کو ایک بہت بڑا عیب خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح فوق جذبات بیدار کر کے اصلاحِ احوال کے لیے ایک انتہائی صورتِ حال ناول میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جب فوق ناول میں زینب اور شیدا حسن کی محبت کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں تو اچھا نہیں لگتا۔ اس طرح لگتا ہے جیسے وہ زینب کی ہمدردی میں اس کے ہر فعل کو جائز ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ شیدا حسن کے کالج سے نکالے جانے کے واقعے کو بھی بہت جذباتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زینب اور شیدا حسن کے ساتھ فوق کو ایک جیسی ہمدردی ہے۔ دونوں کا مستقبل تباہ ہونے کا خطرہ ہے۔ بعض اوقات کوئی اتفاقی حادثہ بہت بڑے رواجی مسئلے سے زیادہ

گمبھیر ہو جاتا ہے۔

ناول کا پلاٹ سادہ ہے۔ زبان سادہ ہے مگر انداز بیان رنگین ہے۔ اشعار کے جا و بیجا استعمال سے تحریر کو نقصان پہنچا ہے۔ ناول میں مکالمہ نگاری کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ مکالمہ اور اشعار فوق کی ناول نگاری کی ایک مستقل خصوصیت بن گئی ہے۔ فوق کا ناول "ناکام" ڈرامہ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔

"نیم حکیم خطرۂ جان"

یہ ناول ۱۹۱۳ء میں راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۱۰۴ صفحات ہے۔

ایک معروف ضرب المثل کو موضوع بنا کر ناول لکھنا اپنے آپ کو پابند کرنے کے مترادف ہے۔ مقصدی ادب کی تخلیق میں ادیب اپنے اوپر بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال لیتا ہے۔ فوق شعر و ادب کے حوالے سے بہت سے مسائل کا حل پیش کرنا چاہتے تھے۔ ابتدائی دور میں زیادہ تر ناول کسی نہ کسی سماجی مسئلے کو بنیاد بنا کر لکھے گئے۔ یہ طریقہ بیک وقت مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ وہ لوگ کامیاب ہوئے۔ جنھوں نے اپنی مشکلات اور آسانیوں کو یکجا کر لیا۔ فوق نے صرف آسانیوں کو اختیار کیا۔ "نیم حکیم خطرۂ جان" ہمارے معاشرے کی عمومی نوعیت کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ جس نے کہاوت کا روپ دھار لیا ہے۔ اس طرح کے کئی واقعات ہماری زندگیوں میں پیش آتے ہیں جو اس ضرب المثل کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے نیم حکیم ہمیں ہر دور اور ہر شہر میں مل جاتے ہیں۔ جن کی حکمت کا شکار ہو کر لوگ زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ کردار ان لوگوں کا نمائندہ ہے جو ہمیشہ سے غریب اور اَن پڑھ لوگوں کی جانوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ فوق ناول کے آغاز میں

لکھتے ہیں۔

"اس ضرب المثل کو سچّا ثابت کر دکھانے والا افسانہ"

ایک واضح اعلان کے ساتھ کچھ لکھنا جرأت مندی تو ہو سکتی ہے۔ ہنر مندی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ بھی ایک نیم کامیاب ناول ہے۔ ابتدائی دَور کے ناول نگاروں کا مطالعہ کیا جائے تو اس فن میں بھی نیم حکیم لوگوں کی کمی نہیں۔ فوق کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ مخلص آدمی تھے۔ اور شعر و ادب کے میدان میں بھی پُوری دیانت کے قائل تھے۔ اور معاشرتی فلاح و بہبُود اور اصلاح احوال کے لیے کسی تکلف یا تردد میں پڑنے والے نہ تھے۔

اپنے ناول "نیم حکیم خطرۂ جان" میں وہ لوگوں کے جان و مال کو ہوس پرست ظالم آدمیوں سے بچانے کے لیے بہت بے چین نظر آتے ہیں۔ ناول میں ایک عام سا آدمی حکیم بن بیٹھتا ہے۔ وہ حکمت و طبابت کی ابجد سے واقف نہیں۔ ادھر اُدھر سے مختلف رنگوں کی شیشیاں اکٹھی کر کے کچھ کچّے پکّے نسخے تیار کر کے مطب بنا لیتا ہے۔ نتھو سے حکیم نتھوا اور پھر ڈاکٹر محمد مصاحب ایم۔ڈی بن جاتا ہے۔ یہ شخص بہت عیّار ہے۔ شروع شروع میں غریبوں کا مُفت علاج کرتا ہے۔ جب لوگ اس کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں تو پیسے بٹورنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنا مطب چلانے کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کرتا ہے۔ اخبار میں اشتہار دلواتا ہے۔ معزز لوگوں کی طرف سے اپنے نام فرضی خط لکھواتا ہے۔ اس طرح غریبوں اور مجبور لوگوں کو پھانسنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی اسے ان ہتھکنڈوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر وہ کوئی بات نہیں سُنتا۔ جب اس کے پاس پیسہ آ جاتا ہے تو وہ عیاشی میں پڑ جاتا ہے۔ طوائفوں کے ساتھ تعلقات بنا لیتا ہے۔ اور شراب نوشی کرنے لگتا ہے۔ وہ دوسری اور تیسری شادی کرتا ہے۔ اس طرح اس

کے گھر میں ہر وقت جوتم پیزار اور ہنگامہ وفساد شروع ہوتا ہے ۔ اب وہ مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے ۔ غلط کاریوں کی وجہ سے اس کی صحت اور پیسہ بھی برباد ہونے لگتا ہے۔ آخر ایک دِن ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ کر اپنے آپ کو لٹوا بیٹھتا ہے اور زخمی ہو کر مر جاتا ہے ۔ نیم حکیم کے اس انجام سے فوق اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ناول میں جو دوسری کہانی چلتی ہے ۔ وہ نیم حکیم کے انجام میں مدد دیتی ہے ۔ وحید اور رشید چچازاد بھائی ہیں ۔ وحید غلط عادات کا شکار ہو کر بیمار ہوتا ہے ۔ اور نیم حکیم کے پاس پہنچتا ہے ۔ وہ اسے بغیر کسی تشخیص کے بتاتا ہے کہ تمھیں تپ دِق ہے ۔ وحید گھبرا جاتا ہے ۔ اور حکیم صاحب کی چرب زبانی میں آ کر اس کا علاج شروع کر دیتا ہے ۔ چونکہ بیماری فرضی ہے ۔ اور دوائیں جعلی ہیں ۔ لہٰذا وحید کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ اور وہ اندر ہی اندر گھلنا شروع کر دیتا ہے ۔ اور چارپائی پر پڑا رہتا ہے ، آخر اس کا سُسر اُسے دہلی میں ایک قابل حکیم کے پاس لے جاتا ہے ۔ اور وہ چند دنوں کے علاج سے ٹھیک ہو جاتا ہے ۔ اور اس کی عادات بھی ٹھیک ہو جاتی ہیں ۔ وحید اور نیم حکیم ایک سی عادات رکھنے کے باوجود مختلف انجام سے دوچار ہوتے ہیں ۔ وحید کے اندر اچھی تربیت کے اثرات موجود تھے جبکہ نیم حکیم ہوس زر میں اندھا ہو گیا تھا ۔ نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" کے اثرات اس ناول میں محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔ فوق کا یہ ناول ان کے دوسرے معاشرتی ناولوں سے بہتر ہے ۔ اس کا پلاٹ بھی نسبتاً مضبوط ہے ۔ دو کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر چلتی ہیں ۔ اور اپنے مطلوبہ انجام تک پہنچتی ہیں ۔ اس ناول میں اشعار کے استعمال میں فوق زیادہ پُرجوش دکھائی نہیں دیتے ۔

نیم حکیم کی بے اعتدالیوں کے ساتھ ساتھ حکمت و طبابت کی اہمیت اور ضرورت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اگر اس فن کی مناسب سرپرستی ہوتی تو آج

یہ مشرقی طریقۂ علاج حیرت انگیز اثرات کا حامل ہوتا۔ فوق لکھتے ہیں۔

"نئی تعلیم پر الزام دینے کی کیا ضرورت ہے۔ خود اس کے اندرونی نقصان رساں کیا کم ہیں۔ وہی طِب ہے جس کے جاننے والے کسی زمانہ میں عزت و ثروت اور ہر حیثیت میں بے نظیر تھے۔ اس کی وہ روشنی جس نے ایک عالم کی نگاہوں کو چکا چوند میں ڈال رکھا تھا، چراغ گورِ غریباں یا ستارۂ سحر ہوگئی۔ اس کا باعث وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس پیشہ کو کاسۂ گدائی بنالیا ہے۔ جن کی ہمتیں صرف اس پر محدود ہوگئی ہیں کہ کِس طرح اس کے ذریعے سے چار پیسے کما لیے جائیں۔ اور ایک سبب یہ ہے کہ گورنمنٹ طِب یونانی کی قدر ہی نہیں کرتی۔" (صفحہ : ۸۲)

"حکایات"

تاریخِ انسانی میں حکایت کی روایت بہت پرانی ہے۔ قِصہ، کہانی، واقعہ اور کوئی دلچسپ بات مزیدار اسلوب میں پیش کی جائے تو وہ حکایت کا روپ دھار لیتی ہے۔ بچوں کی تربیت کے لیے حکایات بہت مؤثر سمجھی جاتی ہیں۔ یہ تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ انسانی اور زندگی کی حقیقتوں کو حکایت کی صورت میں بیان کرنے کی روایت ملتی ہے۔ لوگوں کی تعمیر و اصلاح کے لیے خاص طور پر حکایات سے کام لیا گیا ہے۔

فوق نے حکایات کے حوالے سے تین کتابیں لکھی ہیں، اور تینوں بچوں اور طالب علموں کے لیے ہیں۔

"حکایاتِ کشمیر"

"سبق آموز کہانیاں"

"دبستان اخلاق"

"حکایات کشمیر" میں مختلف تاریخی واقعات کو حکایتوں کے انداز میں لکھا گیا ہے۔

یہ کتاب مختلف وقتوں میں کشمیر کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ اس کتاب کے اب تک متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جو اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ "سبق آموز کہانیاں" کی نوعیت بھی تاریخی ہے۔ البتہ اس میں جو کہانیاں شامل کی گئی ہیں، ان کا تعلق تاریخ کشمیر سے نہیں۔ صرف ایک کہانی "کشمیر کا ایک رعایا پرور راجہ" ملتی ہے۔ اس کتاب میں تاریخ عالم سے منتخب واقعات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ "دبستانِ اخلاق" تیسری جماعت کے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں بیشتر واقعات جو حکمت و ہدایت کا سرچشمہ ہوتے ہیں، عام فہم انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ فوق کی ایک کتاب "چودہ حکایتیں" (غیر مطبوعہ) کا نام ان کی فہرست کتب میں ملتا ہے۔ فوق کی کئی دوسری غیر مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ راقم نے کیا ہے۔ مگر فوق کی یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔

فوق کی تاریخی، سوانحی اور دیگر متفرق کتابیں زبان و بیان اور انداز و اسلوب کے اعتبار سے اس قدر سادہ اور عام فہم ہیں کہ بچے بھی مطالعے کے دوران کسی طرح کی مشکل محسوس نہیں کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو ترتیب دے کر اپنی بات کو آگے بڑھانے کا فن فوق کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ یوں تو ان کی سب کتابوں میں واقعات کو بنیاد بنایا گیا ہے، مگر ان کی کتابیں "تاریخ حریت اسلام"، "تاریخ کا روشن پہلو" اور "وجدانی نشتر"، "دیوان حافظ کی تاریخی فالیں" اور "زنانہ حاضر جوابیاں" دو ایسی کتابیں ہیں جن میں فوق نے حکایات والے اسلوب کی بہت حد تک پابندی کی ہے۔ یہ واقعات بھی تاریخی ہیں۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی حکایتیں لگتی ہیں۔ اس

تجزیے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حکایت نگاری کا انداز فوق کی ادبی شخصیت کی مستقل خصوصیت ہے۔

فوق کی حکایتوں کے مطالعے کے دوران حکایات سعدی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ گلستان سعدی ایسا مجموعہ ہے جو ایک بہتر زندگی کا وجدان دل میں بیدار کرتا ہے۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں زبان شعر میں حکایات تخلیق کی ہیں۔ مثنوی معنوی کی حیثیت ذرا مختلف ہے کہ اس میں معرفت و حقیقت کا بیان بچوں اور عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے۔ "کلام فوق" میں کچھ منظوم حکایات ملتی ہیں۔ مگر ان میں گہرائی اور وسعت نہیں ہے۔ حکایات کشمیر کی طرح آر۔سی۔ٹمپل نامی ایک انگریز نے اُردو میں ایک کتاب "حکایات پنجاب" مرتب کی ہے۔ اس میں شامل بیشتر حکایتوں کی نوعیت لوک کہانیوں کی ہے۔ کچھ حکایات راجوں رانیوں کے حوالے سے ہیں۔ مگر ان کی نوعیت تاریخی سے زیادہ تخلیقی ہے۔ اس کتاب میں شامل دیباچہ بہت فکر انگیز اور دلچسپ ہے۔ اور حکایتوں کی ایک نئی معنویت کو اجاگر کرتا ہے ٹمپل صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"میں نے کام کا آغاز اس وقت کیا جب میرے ہاں بچے پیدا ہونے شروع ہوئے تھے۔ انہی کی طرح شروع میں یہ کتاب میری رفیق رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ملازمت کے حالات نے پہلے کئی کئی وقفوں کے لیے ان دونوں سے جدا رہنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ میں بالآخر مجبور ہو گیا کہ اپنے بچوں کی طرح ان حکایات کو دنیا کے سامنے اس وقت پیش کروں جب مجھے ان کے بارے میں اس حد تک ذاتی علم اور یادداشت حاصل ہو جس کی خواہش ہر باپ کو اپنے بچوں کے بارے میں ہوتی ہے۔"[20] (ترجمہ میاں عبدالرشید)

"حکایات کشمیر" کے متعلق بھی بالخصوص یہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وادیٔ کشمیر

فوق کے دِل میں واقع تھی۔ اور کشمیر کے حالات اور تاریخی واقعات ان کے لہو میں گھل گئے تھے۔ اس طرح لگتا ہے جیسے یہ حکایات انھوں نے اپنے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔

فوق کی حکایات کا اسلوب سادہ اور دِل نشین ہے۔ زبان صاف اور رواں ہے۔ ان کی تمام حکایتوں میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں ملتا جو مشکل ہو اور جس کے معانی جاننے کے لیے لُغت کی ضرورت پڑے بیان واقعات میں توجہ قائم رکھنے کے لیے دلآویز انداز اختیار کیا گیا ہے۔ پند و نصائح کو مؤثر بنانے کے لیے فوق نے اپنی حکایات کو ممکن حد تک بچوں کے لیے پُرکشش بنانے کی کوشش کی ہے۔ فوق نے یہ کہانیاں اخلاقی نقطۂ نظر سے تحریر کی ہیں۔ ان کے ذریعے وہ بچوں میں اعلیٰ صفات اور ایک اچھی زندگی کا ذوق و شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حکایت نگاری کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"اُردو میں مختصر اخلاقی کہانیوں کی تمام اقسام کو حکایات کہتے ہیں"۔[۲۱]

ڈاکٹر صاحب کی اس بات کی روشنی میں فوق ایک مسلمہ حیثیت کے حکایت نگار بن جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے فوق کی کتابوں کے نام "سبق آموز کہانیاں" اور "دبستان اخلاق" بھی برمحل ہیں۔

فوق کے ہاں بچوں اور طالب علموں کی دلچسپی کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہنے میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ فوق کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں بڑوں کے لیے بھی فکر انگیز ہو سکتی ہیں۔ ایک بات کا انھوں نے خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ کہ واقعات کو اس طرح حکایات میں سمویا جاتے جس طرح کہ وہ پیش آئے تھے۔ حکایت نگاری کرتے ہوئے انھوں نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔

"حکایات کشمیر"

۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام پہلی بار ۱۹۲۸ء

میں شائع ہوئی۔ ظفر برادرس والوں کی شائع کردہ اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۴۱ء) بھی راقم نے دیکھا ہے۔ راقم نے اس کتاب کے ایک ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۸۲ء) کا مطالعہ بھی کیا ہے جو شاہین بکسٹال اینڈ پبلشرز سرینگر کشمیر کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب مسلسل شائع ہو رہی ہے۔

اس کتاب میں ۲۳ حکایات ہیں۔ جو کشمیر کے راجوں مہاراجوں اور مسلمان بادشاہوں سے متعلق ہیں۔ ایسے تاریخی واقعات منتخب کیے گئے ہیں۔ جس میں عام لوگوں کی دلچسپی کا سامان ہو۔ اس میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق موجود ہو۔ کتاب کے آغاز میں "کشمیر جنت نظیر" کے نام سے ایک مختصر دیباچہ لکھا گیا ہے۔ جس میں کشمیر کا حسن، اس کا حدود اربعہ اور مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ان حکایات کے ذریعے انھوں نے کشمیر کے ساتھ اپنی وابستگیوں کو دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کافی حد تک کشمیر کی تاریخ ہے جسے ذرا مختلف انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب میں مندرجہ ذیل حکمرانوں کی حکایات پیش کی گئی ہیں۔

(۱) راجہ ہرن دیو۔ (۲) راجہ سُندر سین۔
(۳) راجہ جلوک۔ (۴) راجہ تو بخین۔
(۵) راجہ سندھی متی۔ (۶) راجہ میگ واہن۔
(۷) راجہ ماتر گپت۔ (۸) پر درسن۔
(۹) راجہ چندراپیڈ۔ (۱۰) راجہ للتا دتیہ۔
(۱۱) راجہ جیا پیڈا اور اس کا جانثار وزیر دیو شرما۔ (۱۲) راجہ اونتی ورمن اور وفادار وزیر شدر ورمن۔ (۱۳) راجہ اونتی ورمن اور ایک کمہار کا عقلمند بیٹا۔ (۱۴) رانی سوگندھا۔
(۱۵) راجہ یشکر (۱۶) راجہ اوپل (۱۷) راجہ عجب دیو۔

(۱۸) راجہ رنجیت دیو۔ (۱۹) کرنل میاں سنگھ کمیدان۔

(۲۰) مہاراجہ رنبیر سنگھ (۲۱) راجہ دھیان سنگھ۔

(۲۲) ہر دلعزیز سُلطان زین العابدین۔ (۲۳) عیاش بادشاہ یوسف خانچک۔

ان حکمرانوں کی حکایات میں کشمیر کی ایک مختلف مگر واضح تصویر نظر آتی ہے۔ ان تاریخی حکایتوں کے ذریعے بعض حیات آموز نتائج کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔ اور تعمیر و اصلاح کا پہلو ان میں سے نکالا گیا ہے۔ یہ حکایات اعلیٰ اخلاق، بہادری، جاں نثاری، وفاداری، علم دوستی اور غریب پروری کے جذبات سے بھرپور ہیں۔ کچھ لوگوں کے حالات سے عبرت کا نقش بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ واقعات زیادہ ہیں جن سے مثبت کردار و سیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ فوق خود محب الوطن تھے۔ اور حب الوطنی کے اوصاف دلوں میں بیدار کرنے کے متمنی تھے۔ راجہ ماتر گپت اور ایک فوجی سالار پرورسن کی حکایت میں فوق لکھتے ہیں۔

" پرورسن نے پنجاب کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس کے صلاح کاروں نے اس کو مشورہ دیا کہ اپنے آبائی ملک کشمیر پر حملہ کیا جائے۔ اس نے جواب دیا کہ دو باتیں ہیں جو مجھے اپنے آبائی ملک پر حملہ کرنے سے روک رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماتر گپت ایک شاعر ہے۔ اس پر حملہ کرنا ایک ایسے شخص کی شان سے بعید ہے۔ جس کی رگوں میں نسلاً بعد نسلاً بادشاہی خون حرکت کر رہا ہو۔ دوسرا یہ کہ کشمیر میرا وطن ہے۔ میرا ملک ہے۔ اگر میں نے وہاں حملہ کیا۔ تو میرے اہل وطن ہلاک ہوں گے۔ ان کی فصلیں تباہ ہوں گی۔ وہ فاقہ کشی کا شکار ہوں گے اور کئی لوگ بے موت مرجائیں گے"۔ (صفحہ : ۳۹)

فوق نے راجاؤں کی حکایات لکھتے ہوئے ان کے حالاتِ زندگی، ان کے کارنامے اور دوسری تفصیلات بھی تحریر کی ہیں تاکہ قارئین کو متعلقہ راجہ کے

بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ فوق راجہ چندر پیڈ کی حکایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"راجہ چندر پیڈ، راجہ پرتاپ ادتیہ ثانی کے بعد آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں تخت کشمیر پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے جدید اور مفید قوانین بنائے۔ وہ علم اور بہادری کی تصویر تھا۔ اس کا خزانہ رعایا کے لیے وقف تھا۔ کوئی شک نہیں کہ وہ خوش قسمت راجہ تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا تھا۔ جو رعایا کی تکلیف کا باعث ہو وہ اگرچہ ہر وقت قابلِ تعریف کام کرتا رہتا تھا۔ تاہم جب کوئی اس کی تعریف کرتا۔ تو وہ ازراہِ انکسار و شرافت سر جھکا لیتا تھا۔ وہ اپنے وزیروں اور امیروں سے مشورہ لینے کا محتاج نہ تھا۔ بلکہ خود انھیں نیک صلاح دیتا تھا۔ اس نیک راجہ نے اپنی تمام ہمت اور کوشش بدرسوم کے مٹانے اور قیام امن و انصاف میں صرف کر دی تھی۔" (صفحہ: ۴۲)

"حکایاتِ کشمیر" کے بارے میں صرف ایک مضمون ملتا ہے جو کلیم اختر نے لکھا ہے۔ کلیم اختر کے بقول "حکایاتِ کشمیر" میں ایک تسلسل ہے۔ جو ایسی کہانیوں سے قائم ہوا ہے۔ جو پڑھنے والے کے دل میں نیک جذبات اور ولولہ انگیز خیالات پیدا کرتی ہیں۔ انھوں نے اسے کہانی کا شریفانہ اسلوب کہا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی نرمی کو اپنی تحریر میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ کلیم اختر لکھتے ہیں:

"فوق کا مقصد یہ تھا کہ انسانی ذہنوں کو ایسے طریقے سے جھنجھوڑا جائے کہ وہ یہ محسوس نہ کرے کہ اس پر کوئی بوجھ ڈالا جا رہا ہے۔ کشمیری قوم جو صدیوں سے مظالم سہتے سہتے ایذا پرست ہو گئی تھی، فوق مرحوم نے اسے آرام سے سکون اور بڑے اطمینان سے بیدار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور خفتہ بخت انسانوں کو چیخ پکار کر نہیں جگایا۔ بلکہ ان کے کانوں میں لوری کے نغمے ڈالے۔ ان کو کہانیاں سنائیں۔" [۲۲]

"سبق آموز کہانیاں"

۱۱۲ صفحات کی یہ کتاب ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام پہلی بار ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ۳۶ کہانیاں شامل ہیں جو دنیا بھر کی تاریخ سے لیے گئے واقعات پر مشتمل ہیں۔ مختلف قوموں کے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنھیں پڑھ کر بچوں میں اعلیٰ صفات کے جوہر پیدا ہو سکتے ہیں۔ فوق نے ہر کہانی کے بعد باقاعدہ انجام یا نتیجہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں سے نصیحت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ اس سے واقعے کے بیان کی غرض و غایت اور مقصد بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ یوں تو فوق نے کہانیوں کے جو عنوانات قائم کیے ہیں۔ ان سے بھی نفسِ مضمون کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

یہاں چند ایک کہانیوں کے عنوانات پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) مہمان نواز کی شرافت (۲) بخل کا انجام۔

(۳) ملّاح کی دانش مندی۔ (۴) ایک غریب لوہار کی نورانی ایجاد۔

(۵) وطن کی محبت۔ (۶) مؤدبانہ گفتگو کا آزادانہ طریقہ۔

(۷) مُنہ دیکھے کی عبادت وغیرہ۔ "مردانہ استقلال" نام کی ایک کہانی میں فوق لکھتے ہیں۔

"ابیسیا ریلوے لائن سے ایک اسپیشل ٹرین گزرنے والی تھی۔ کانٹے والے کا نام یونینگ تھا۔ جب ٹرین کا انجن کانٹے سے گزرنے لگا۔ تو کانٹے کے سوراخ سے ایک بڑا بھاری بھُورا سانپ نکل کر کانٹے کے ڈنڈے پر چڑھ گیا۔ اور کانٹے والے کے ہاتھ سے ہوتا ہوا اس کے سر اور پشت سے گزر کر زمین پر اُتر گیا۔ مگر یونینگ کانٹے کے ڈنڈے کو پکڑے ہی رہا۔ اور ٹرین گزر گئی۔ جب اس نے کانٹا چھوڑ کر دیکھا تو سانپ کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ لوگوں نے پُوچھا کہ سانپ نے کاٹا تو نہیں۔ تو

یوئینگ مسکرایا۔ مجمع سے ایک آدمی نے کہا۔

اور وہ جو کاٹ لیتا تو بچہ سیدھا ہی سدھار جاتے۔

یوئینگ نے جواب دیا۔

اگر میں ذرا بھی ہلتا تو وہ مجھے کاٹ لیتا۔ اور اگر میں کانٹا چھوڑ دیتا تو اسپیشل ٹرین تباہ ہو جاتی اور تمام مسافر ہلاک ہو جاتے۔

جب لوگوں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سُنے۔ تو اس کی بہادری کی بہت تعریف کی۔ اس کی ترقی بھی ہو گئی۔

نتیجہ۔ کسی سے لڑائی لڑ کر اسے پچھاڑ دینا مردانگی اور بہادری نہیں۔ بلکہ بہادری مردانہ استقلال کو کہتے ہیں اور مردانہ استقلال کی مثال کانٹے والے کی سچّی کہانی ہے۔

"مصیبت کے وقت ہمیشہ مستقل مزاج رہو۔ مصیبت کبھی اثر نہ کرے گی۔"

(صفحہ : ۶۲)

ایک پُوری کہانی یہاں نقل کر دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوق نے کہانیوں میں خاص طور سے اختصار سے کام لیا ہے۔ کہانی طویل ہو جائے تو وہ بچوں کے ذہن پر اپنا اثر پُوری طرح قائم نہیں رکھ سکتی۔ یہ کہانیاں اتنی مختصر ہیں کہ بچے بڑی آسانی سے انھیں زبانی یاد کر سکتے ہیں۔ زبان کی سادگی اور بیان کی سلاست کے اعتبار سے ان کہانیوں میں یاد رہ جانے والی خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ پُوری کتاب میں ایک بھی مشکل لفظ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا ایک مشکل فن ہے۔ بڑی عمر کے آدمی کے لیے بچوں کی فکری سطح اور دلچسپی کے معیار تک اپنے آپ کو لے آنا آسان کام نہیں۔ فوق کی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں دُنیا بھر کے لوگوں کے واقعات شامل ہیں۔ اس طرح یہ ایک متنوع نوعیت کی عام دلچسپی کی کتاب بن

گئی ہے۔ پھر یہ کہ اس کتاب کا اسلوب اپنے اندر ایک دلکشی رکھتا ہے۔ اس میں بچوں اور بڑوں کے دِل میں یکساں نوعیت کا کیف و انبساط پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔

"دبستانِ اخلاق"

یہ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۵ء میں مولوی فیروز سنز اینڈ پبلیشرز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ کتاب کے سرورق پر درج ہے کہ یہ کتاب تیسری جماعت کے طلبہ و طالبات کے لیے لکھی گئی ہے۔ "دبستانِ اخلاق" میں ۵۹ چھوٹی چھوٹی کہانیاں شامل ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

مناجات، چار سال کا بُوڑھا، سچی خیرات کا پھل، مَیں جھُوٹ نہ بولوں گا۔ لالچ کی سزا، دولت اور علم، علم کی طاقت، حُسن پرست، جیسا کروگے ویسا بھروگے، گفتگو کا سلیقہ، نیّت کا پھل وغیرہ۔

"دبستان اخلاق" میں شامل کہانیوں کا انداز و اسلوب اور زبان و بیان "حکایاتِ کشمیر" اور "سبق آموز کہانیاں" سے ملتا جلتا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی کڑی ہے جس کے تحت دوسری دو کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ زندگی کی روزمرّہ صورتحال میں پیش آنے والے واقعات میں دانائی اور عبرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب چونکہ بہت ابتدائی جماعت میں پڑھائی جاتی تھی، اس لیے اس میں بچّوں کی عام نفسیات اور دلچسپیوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ البتّہ اس کے مطالعے کے دوران لُطف میں کہیں کمی نہیں آنے دی گئی۔

"ڈرامہ"

اس سے پہلے یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ فوق کے ناولوں میں ڈرامے کی کیفیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ فوق جانتے تھے کہ ڈرامے کے اثرات لوگوں کے جذبات و احساسات پر زیادہ ہوتے ہیں۔ فوق کے زمانے میں ڈرامے کا بڑا چرچا تھا۔ آغا حشر سے فوق کی ملاقات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ فوق اپنے ارد گرد کے ماحول میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ خاص طور سے کشمیر میں زیادہ انقلاب لانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ محمد حسن عسکری اپنے مضمون "ہمارے ہاں ڈرامہ کیوں نہیں" میں لکھتے ہیں۔

"ڈرامہ تو ہے ہی تبدیلی کا نام۔ جو لوگ تبدیلی کے خواب نہ دیکھ سکیں۔ وہ ڈرامہ کیسے لکھ سکتے ہیں۔"[۲۳]

"زمیندار کی سرگزشت" (غیر مطبوعہ)

یہ ڈرامہ ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا۔ راقم کو یہ مسودہ کتابی انداز میں مرتب کیا ہوا ملا ہے۔ جو بوجوہ شائع نہ ہو سکا۔

اس ڈرامے میں ایک زمیندار خاندان شادی و غمی کی بری رسموں اور دکھاوے کی فضول خرچیوں کے خطرناک جال میں پھنس کر تباہی کے دھانے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد تعلیم بالغاں کی برکت سے دوبارہ عروج حاصل کرتا ہے۔ یہ ڈرامہ دیہی زندگی کی فلاح و بہبود کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ڈرامے میں دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ایک کہانی پنچایت کے ایک اکٹھ سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں حسن ڈار اور یوسف بٹ دو کرداروں کا جھگڑا

زیرِ غور ہے۔ دونوں کے درمیان ایک بیل کی ملکیت کا مقدمہ چل رہا ہے۔ مقدمے کا فیصلہ ہونے پر حسن ڈار اپنے مال کے حصّے کی ادائیگی معاف کر دیتا ہے۔ حسن ڈار اپنی بیوی کے مشوروں پر سوچے سمجھے بغیر عمل کرتا ہے۔ جھوٹی نیک نامی کی خاطر وہ طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی بہت دھوم دھام سے کرتا ہے۔ اس شادی پر خرچ ہونے والا بہت سا روپیہ ادھار لیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بعد میں اسے اپنی زمینوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اور بڑی ذلت و خواری اٹھانی پڑتی ہے۔ وہ مجبوراً زمینداری چھوڑ کر مزدوری کرنے لگتا ہے۔ اور کشمیر سے پنجاب آجاتا ہے۔ جہاں وہ مزدوری کے بعد ٹھیکیداری کا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ اِدھر اُدھر سے کمائی کر کے اپنی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری کہانی دیہات کی ترقی اور اصلاح کے حوالے سے ڈرامے میں ڈالی گئی ہے۔ یہاں پنچایت کے علاوہ دیہات سدھار کے اجلاس کی کارروائی کی روداد پیش کی جاتی ہے۔ جس میں انسپکٹر صاحب گاؤں والوں کو مُفید مشورے دیتے ہیں۔ ایک جلسے میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ اگر گاؤں والے اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ گاؤں سے باہر گڑھے کھود کر دبا دیا کریں تو ایک تو ان کا گاؤں بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ اور اس کے علاوہ ان کے کھیتوں کے لیے کھاد بھی تیار ہو جائے گی۔ جس سے ان کی فصل اچھی ہو گی۔ پھر تعلیم بالغاں کے لیے کمیٹیاں بنتی ہیں۔ تاکہ لوگ اپنے طور پر اس قابل ہو سکیں۔ جدید دَور کے تقاضوں کو سمجھ سکیں۔ پھر یہ دونوں کہانیاں ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ حسن ڈار دیہات میں گروی رکھی ہوئی اپنی تمام زمینیں واپس لے لیتا ہے اور دیہات کی ترقی کی کوششوں میں شریک ہوتا ہے۔ گاؤں میں جگہ جگہ پنچایت کا نظام تعلیم بالغاں کی برکت سے ایک نئی کامیابی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے اثرات

اور ثمرات پُورے دیہات میں ہر کہیں لوگوں تک پہنچنے شروع ہو جاتے ہیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کی کشمیری دیہاتی زندگی اس ڈرامے میں نظر آتی ہے۔ اس زمانے کے باشندوں کے سماجی مسائل اور معاشرتی صورتِ حال کو دیہی زندگی کے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کشمیری دیہات پنجاب یا کسی بھی علاقے کی دیہاتی زندگی سے زیادہ مختلف نہیں۔ اس طرح یہ ڈرامہ ہمارے ملک کی مخصوص دیہاتی پس منظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ فوق کو اس ماحول سے گہری دلچسپی اور وابستگی تھی۔ انھوں نے ان لوگوں کے معاملات و مسائل کو ایک خاص جذبے سے دیکھا ہے۔ اس ڈرامے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دیہاتی عوام کے اندر سماجی اور معاشرتی اقدار کا شعور پیدا کیا جائے۔ آج بھی اس ڈرامے کو موجودہ دیہاتی زندگی کے مسائل کے مسائل کے پس منظر میں دیکھیں تو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی یہ تحریر اسی طرح مؤثر اور ضرورت کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ آج بھی ہمارے دیہاتوں میں وہ مسائل پُوری شدت سے موجود ہیں۔ جن کی بنیاد پر یہ ڈرامہ لکھا گیا ہے۔ دیہاتوں میں تعلیمی سہولتیں نہ ہونے کے باعث جہالت کا اندھیرا چھایا ہُوا ہے۔ یہ مسئلہ تمام مسائل کی جڑ ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے تعلیمِ بالغاں کے موضوع پر لوگوں کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گندگی ہٹانے اور علاج معالجے کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی صحت پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ آپس کے معمولی جھگڑے بعض اوقات قتل و غارت تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور لوگ ناحق اپنا روپیہ پیسہ اور قیمتی جانیں ضائع کرتے رہتے ہیں۔ غلط رسوم و رواج اور شادی بیاہ پر غیر ضروری اخراجات سے لوگ مقروض اور پھر قلاش ہو جاتے ہیں۔ یہ ڈرامہ مقصدی اسلوب میں مندرجہ بالا مسائل کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ڈرامے میں ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

ڈرامے کو سیدھے سادے طریقے سے مکالموں کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے۔اس کی تکنیک بالکل سادہ ہے۔ ہر منظر کسی نہ کسی مسئلے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہر منظر کے بعد کسی حد تک جگہ اور کردار بدل جاتے ہیں۔ مسئلے کی نشاندہی کے بعد اس کی اصلاح کسی ایسے کردار سے کرائی جاتی ہے۔ جو باشعور، مخلص اور نیک ہو۔ نذیر احمد کے کرداروں کی طرح فوق کے بھی پسندیدہ کردار چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے پردے میں خود فوق بولتے ہیں۔ حتیٰ کہ اصلاح کے جوش میں کئی کردار لمبی لمبی تقریریں بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ اس ڈرامے کا مقصد تربیت ہے۔ اس لیے بات کو ادھورا نہیں چھوڑا گیا۔ تمام ممکنہ پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

ڈرامے کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس طرح دس منظر بنائے گئے ہیں۔ پنچایت کی برکت، سود کی لعنت، تعلیم بالغاں، دیہات سدھار، موسمی بخار اور صحت، فضول رسومات، انجمن ہائے امداد باہمی وغیرہ چند ایک عنوانات ہیں۔ جن کو مختلف منظروں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ کردار سادہ اور دیکھے بھالے ہیں۔ کردار اتنے متحرک نہیں کیوں کہ ان پر مقصدیت اور خیالات کا بوجھ ہے۔ وہ تو مقصد بیان کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ البتہ دیہات کی عملی زندگی کے حالات جیتے جاگتے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ دیہاتی زندگی ہمارے فکشن کا عمومی طور پر موضوع رہی ہے۔ جو واقعات اس ڈرامے میں پیش کیے گئے ہیں۔ وہ سبق آموز ہیں۔ بری رسموں کا انجام برا ہوتا ہے۔ ڈرامے میں مختلف اصلاحی انجمنوں کے نمائندے ہمیں کوئی نہ کوئی درس دیتے نظر آتے ہیں۔ فوق کی تحریروں کو فلاحی ادب کے مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے۔ ان کے ڈرامے "زمیندار کی سرگزشت" کی زبان پختہ اور مطلب کی وضاحت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر ممکن طریقے سے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی

ہے۔ یہ ڈرامہ ریڈیو پر بھی نشر ہو سکتا ہے۔ اس کی تکنیک ریڈیو ڈرامے سے مطابقت رکھتی ہے۔ چالیس صفحات پر مشتمل یہ ایک مختصر ڈرامہ ہے۔ ہر باب یا منظر جامعیت اور اختصار کا ایک نمونہ ہے۔ باب دوم کا عنوان "دیہات سدھار کا ایک حصّہ" ہے۔ اس کے آغاز میں فوق لکھتے ہیں۔

"ایک عظیم الشان چنار کے درخت کے نیچے چار پانچ سو آدمیوں کا مجمع ہے۔ یہ لوگ تین چار دیہاتوں سے بلوائے گئے ہیں۔ اصلاح دیہات و محکمہ پنچایت کے انسپکٹر اور محکمہ تعلیم کے سکول ماسٹر محکمہ مال کے پٹواری، ذیلدار، نمبردار بھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے انسپکٹر صاحب دیہات سدھار کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس طرح بات شروع کی بھائیو! میری بات غور سے سنو۔ میں تم سے ایک پہیلی پوچھتا ہوں کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ ایسی کیا چیز ہے۔ جو اچھی بھی ہے اور بُری بھی ہے۔ اس سے لہر بہر بھی ہے اور وہ زہر و قہر بھی ہے۔ وہ کھیت میں ہو تو سونا پیدا کرتی ہے۔ گاؤں میں ہو تو لوگوں کے لیے ہلاکت کا باعث ہے۔ کھیت میں رہے تو پیداوار بڑھاتی ہے گھروں میں یا گھروں کے نزدیک رہے تو بیماری پیدا کر کے عمر گھٹاتی ہے۔ اس کے باریک ذرات ہوا کو زہریلا بنا دیتے ہیں۔ اور طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔" ایک نوجوان "میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ شاید کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کی بات کر رہے ہیں۔ جن کو کھیت میں ڈالیں تو عمدہ کھاد کا کام دیتے ہیں۔ اور اگر ان کی حفاظت نہ کی جائے تو وہ بیماریوں کا گھر ہیں۔

انسپکٹر۔ شاباش میرے نوجوان دوست نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ گاؤں کے اندر کوڑا کرکٹ ڈالنا اور گلی کوچوں میں غلاظت کے ڈھیر لگانا گویا بیماریوں کو خود بلانا ہے۔ ان غلیظ ذرّوں کا پانی میں مل جانا بھی غضب

ڈھاتا ہے۔ جو ہڑوں اور نالابوں سے یہ پانی جب مویشی پیتے ہیں۔ تو وہ بھی وباؤں کا شکار ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ مویشی ہماری کھیتی باڑی کی مشین ہیں۔ پس گاؤں میں کوڑا کرکٹ اِدھر اُدھر پھیلنے نہ دو۔ آبادی سے باہر گڑھوں کے اندر ڈالو۔ اسے فوراً خشک مٹی سے ڈھک دو۔ اس طرح کچھ دِنوں کے بعد یہ کوڑا کرکٹ عمدہ کھاد بن جائے گی۔ یہ کھاد کھیت میں ڈالی جاتے گی تو سونا پیدا کرے گی۔ آدمی اور مویشی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔ انسپکٹر صاحب کے بعد سکول ماسٹر نے حصُولِ علم کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی۔ خصُوصاً تعلیم بالغاں کی اہمیت پر بڑا زور دیا۔"

(صفحہ: ۵،۶)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے فوق دلچسپ اور عام فہم انداز اختیار کرتے ہیں۔ اَن پڑھ لوگوں میں نئی روشنی کے آثار پیدا کرنے کے لیے فوق آہستگی اور مستقل مزاجی کے رویے کو زیادہ کارآمد خیال کرتے ہیں۔ ڈرامے کا نام "زمیندار کی سرگزشت" پہلے سے موجود "زمیندار کا عروج و زوال" کے الفاظ کاٹ کر لکھا گیا ہے۔ فوق زمیندار کو زوال سے عروج کی طرف لے جانے کی کوشش عمر بھر کرتے رہے۔

چوتھا باب

حوالہ جات

۱۔ ہفت روزہ "چٹان" لاہور۔ ۳۔ اگست ۱۹۸۱ء۔ صفحہ : ۳۷

۲۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، "ناول نگاری"، لاہور : مکتبہ میری لائبریری۔
طبع اوّل ۱۹۶۶ء۔ صفحہ : ۵۲

۳۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، "شرر کے تاریخی ناول"، لاہور : مکتبہ خیابانِ ادب۔
طبع اوّل ۔ ۱۹۷۸ء۔ صفحہ : ۸، ۷، ۵، ۳۔

۴۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۔ "اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ"۔ لاہور: سندھ ساگر اکادمی۔
مطبوعہ مئی ۱۹۶۸ء۔ صفحہ : ۵۳۔

۵۔ "ناول نگاری" طبع اوّل۔ صفحہ : ۷۶۔

۶۔ "اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ"، صفحہ : ۲۲۱، ۲۲۰۔

۷۔ صلاح الدین احمد "صریرِ خامہ"۔ جلد دوم۔ لاہور : المقبول پبلیکیشنز۔
طبع اوّل۔ ۱۹۶۹ء، صفحہ : ۱۲-۱۱۔

۸ھ سیّد وقار عظیم۔ "فن اور فنکار"۔ لاہور: اُردو مرکز۔
طبع اوّل۔ ۱۹۶۶ء۔ صفحہ: ۱۴-۱۳-

۹ھ ہفت روز چٹان، لاہور: ۳۔ اگست ۱۹۸۱ء۔ صفحہ: ۳۷-

۱۰ھ سرگزشت فوق۔ صفحہ: ۱۱۶، ۱۳۸-

۱۱ھ "اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ"۔ صفحہ: ۲۱۵-

۱۲ھ ہفت روزہ "چٹان"، لاہور۔ صفحہ: ۳۸-

۱۳ھ امتیاز علی تاج۔ "انارکلی"۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب۔
طبع نہم ۱۹۶۳ء۔ صفحہ: ۵-

۱۴ھ "انارکلی" (ڈرامہ)۔ طبع نہم۔ صفحہ: ۶-

۱۵ھ "سرگزشت فوق"، صفحہ: ۱۴۵-

۱۶ھ "مآثر لاہور"۔ مطبوعہ "نقوش" لاہور نمبر۔ صفحہ: ۲۶۹، ۲۶۵-

۱۷ھ علم الدین سالک۔ "نگارشات"۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،
طبع اوّل، ۱۹۷۵ء۔ صفحہ: ۲۲-

۱۸ھ "نگارشات"۔ طبع اوّل۔ صفحہ: ۲۴-

۱۹ھ "اکبر"، صفحہ: ۱۷۷-

۲۰ھ آر۔ سی۔ ٹمپل "حکایات پنجاب" لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اوّل ۱۹۶۲ء

۲۱ھ ڈاکٹر گیان چند "اُردو کی نثری داستانیں"، کراچی۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان،
طبع اوّل۔ صفحہ: ۵۰-

۲۲ھ ہفت روزہ "استقلال" لاہور: ۹۔ فروری ۱۹۸۶ء-

۲۳ھ محمد حسن عسکری، "ستارہ یا بادبان" کراچی: مکتبہ سات رنگ،
طبع اوّل، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۲۵-

کشمیری صحافت میں فوق کی خدمات

۱۵۶۳۷۰

سید وقار عظیم ۔ "فن اور فنکار" ۔ لاہور ، اردو مرکز ۔

طبع اول ، ۱۹۶۶ء ۔ صفحہ : [illegible]

[illegible] چٹان ، لاہور : ۳ اگست ۱۹۸۱ء ۔ صفحہ : ۲۷ ۔

باب ۵

کشمیری صحافت میں فوق کی خدمات

منشی محمد الدین فوق اپنے زمانے کے ایک معروف اور ممتاز صحافی تھے۔ ہندوستان میں آغاز صحافت کے وقت ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی صحافت سے منسلک تھے۔ اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر، مولانا ظفر علی خان اور کئی دوسرے نامور لوگوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ درحقیقت ادب و صحافت کے سلسلے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ فوق صاحب نے مختلف اوقات میں کئی رسالے جاری کیے اور انھیں کامیابی سے چلایا۔ جس میں "پنجۂ فولاد"، "کشمیری میگزین"، "اخبار کشمیری"، "کشمیر جدید"، "طریقت" اور "نظام" شامل ہیں۔ ان کے علاوہ "پیسہ اخبار" اور کئی دوسرے اخباروں میں بھی فوق صاحب نے کام کیا۔ جس کا مختصر تذکرہ پہلے باب میں کر دیا گیا ہے۔ تاریخ صحافت پنجاب کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں فوق کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور ان کی خدمات کا اعتراف نہ کیا گیا ہو ان کے مرتّب کردہ رسالوں کی تعریف داغ اور اقبال جیسے عظیم شاعروں نے

کی ہے۔ فوق صاحب نے ذرائع اور وسائل کی کمی کے باوجود بہت ہمت و استقلال سے باقاعدہ صحافت کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ان کی صحافیانہ سرگرمیوں کا مرکز بھی وادیٔ کشمیر تھی۔ مگر لاہور سے شائع ہونے والے ان رسالوں میں پنجاب اور پورے ہندوستان کے حالات کی ایک تصویر بھی نظر آتی ہے۔

مشہور ادیب اور ڈرامہ نگار برنارڈ شا کے خیال میں اعلیٰ ادب اور بلند ادبی شاہکار درحقیقت صحافت ہی ہے۔ ادب و صحافت لازم و ملزوم ہیں۔ صحافت کا کام اکثر ملکوں میں ادیبوں نے سنبھالا ہوا ہے۔ کئی سیاسی لیڈر بھی صحافی ہو گزرے ہیں۔ مشہور امریکی مصنف اور سفیر بنجامین فرینکلن مارک ٹوئین امریکی صدر روزویلٹ۔ ناول نگار چارلس ڈکنز، وزیر اعظم انگلستان ولیم گلیڈسٹون اور چرچل صحافی تھے۔ سر سید احمد خان، حسرت موہانی اور منشی محمدالدین فوق نے باقاعدہ صحافت کی۔ مولانا الطاف حسین حالی صحافی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بس جس طرح آزادی، انصاف اور دیانت اس کی ذات میں ہونی ضروری ہے۔ اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے انداز بیان اور طرزِ تحریر میں ایک قوت مقناطیسی کا ہونا ضروری ہے۔ جس سے وہ پبلک کے دلوں کو فتح کر سکے۔"[1]

برِصغیر میں صحافت کا آغاز انگریزی صحافت سے ہوا۔ اس کے ساتھ فارسی اخبارات کا اجرا بھی ہوا۔ اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ۱۸۲۲ء میں "جام جہاں نما" کی شکل میں کلکتہ سے ہوا۔[2]

تاریخِ صحافت کی تفصیل متعلقہ کتابوں میں موجود ہے۔ سر سید نے صحافت کو جنم دیا۔ اس دور میں دو اخبارات نے شہرت حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں ہفت روزہ "اخبارِ عام" لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے آخری دور میں منشی محمدالدین فوق کی

تحریریں بھی شائع ہوئیں۔ ۱۸۷۳ء میں لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں منشی محمد الدین فوق بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے۔ ان اخبارات نے نہ صرف انیسویں صدی کے ربع آخر کو متاثر کیا۔ بلکہ بیسویں صدی کے آغاز تک بھرپور مقبولیت حاصل کی اور ایک معیاری صحافت کا نمونہ پیش کیا۔

برصغیر کے مشہور اخبار "اخبار عام" کے مالک و مدیر کشمیر کے ایک ادیب و مؤرخ پنڈت مکند رام گرٹو تھے۔ "اخبار عام" کو برصغیر پاک و ہند کی صحافتی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس اخبار کا مقصد بالعموم ہندوستان اور بالخصوص کشمیر کے لوگوں کی حالت زار کو سامنے لانا تھا۔ اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پنڈت گرٹو کے صاحبزادے گوپی ناتھ نے اسے روزانہ اخبار بنا دیا۔

ڈوگرہ حکمرانوں نے ایک سو چھ سال تک کشمیر پر ظلم وستم کا بازار گرم کیے رکھا۔ کشمیر کے تمام عوام اور بالخصوص مسلمان ان کے جبر و استبداد کا نشانہ بنے۔ اس کے فطری نتیجے میں لوگ اپنی ذات میں گھٹ کر رہ گئے۔ یوں تو پورا ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر اہل کشمیر کچھ زیادہ ہی مصیبتوں کا شکار ہوتے۔ انھیں احساس کمتری کا شکار کر دیا گیا۔ وہ انسانیت کے زمرے سے بھی نکل گئے۔ ان کا اپنا وطن ان کے لیے جہنم بن گیا۔ کئی لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر ہجرت پر مجبور ہوئے۔ وطن سے دوران میں جوش اور جدوجہد کی تحریک پیدا ہوئی۔ اور وہ اپنی صلاحیتوں کو منوانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک وسیع تر اتحاد کی صورت پیدا ہوئی۔ علامہ اقبال کے یہ اشعار اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے:

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور

ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

جن لوگوں نے کشمیر سے ترکِ وطن کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے اخبارات جاری کر کے اپنے احتجاج کا اظہار کیا۔ کشمیر سے باہر کشمیری پنڈتوں نے ہندوستانی حکومت کو کشمیر کی حالتِ زار سے آگاہ کرنے کے لیے ۱۸۸۰ء میں لاہور سے "مراسلۂ کشمیر" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ جو ۱۸۹۰ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ اصل میں کشمیریوں کی طرف سے پہلا مراسلہ تھا۔ اس کے بعد یہ "اخباری مراسلت" یعنی صحافت کا سلسلہ نہ رُک سکا۔

ایک ریاستی وکیل پنڈت ہرگوپال خستہ نے ۱۸۸۲ء میں "خیر خواہ کشمیر" نکالا۔ اس اخبار کی افادیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس اخبار کو اہلِ لاہور اور اہلِ پنجاب نے بھی بہت پسند کیا۔ اس کے بعد "کشمیر درپن"، "کشمیر پرکاش"، "صبحِ کشمیر" اور "بہارِ کشمیر" کے ناموں سے پرچے نکلے۔ جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے کشمیر کے معاملات کی طرف توجہ کی۔ لیکن انگریزوں کی طرف سے سکھوں کو کشمیر کی فروخت کے واقعے کے بعد مؤثر کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ متعصب ہندو صحافیوں نے بھی مہاراجہ کشمیر کا ساتھ دیا۔ اس کے باوجود کشمیری صحافت نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

پنجاب اور لاہور میں کشمیر کے مسلمان صحافیوں کی خدمات بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں مولانا تاج الدین تاج نے "گلشن کشمیر" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔ منشی محمد الدین فوق نے بھی ۱۹۰۱ء میں "پنجۂ فولاد" جاری کیا۔ فوق صاحب نے اس کے علاوہ مختلف اوقات میں "کشمیری میگزین"، "اخبارِ کشمیری" اور "کشمیر جدید" کے نام سے رسالے نکالے۔ جس کی وجہ سے وادی

میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس دوران کشمیر گزٹ، کشمیری مخزن نکلے۔ فوق صاحب ان کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔

اس دوران ہندوستان کے "زمیندار"، "انقلاب"، "سیاست" اور دوسرے اخبارات میں کشمیر کا بہت چرچا ہوا۔ ہر طرف ایک صدائے احتجاج گونجتی چلی گئی۔ ایسے پرچوں کا داخلہ کشمیر میں بند کر دیا جاتا تھا۔ مگر حق کی آواز کب رکتی ہے۔ اسی بندش کے باوجود عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے "کشمیری مسلمان"، "مظلوم کشمیری" اور "مکتوب کشمیر" شائع کرنے شروع کر دیے۔

ایک مدت تک کشمیر کے لیے باہر سے واویلا کیا جاتا رہا۔ اس دوران ایک باہمت ہندو نوجوان ملک راج صراف بار بار درخواست مسترد ہونے کے باوجود ۱۹۲۴ء میں کچھ شرائط پر اخبار کا ڈیکلریشن لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے پریم پرنٹنگ پریس لگایا۔ اور "رنبیر" کے نام سے پرچہ شائع کیا۔[۴۵]

۱۹۳۲ء تک ریاست کے ہر حصے سے اخبارات شائع ہونا شروع ہو گئے۔ ان میں وتستہ، صداقت، ہمدرد، خدمت، مارتنڈ، اصلاح، حقیقت، اسلام، البرق، ہدایت، کیسری، رہبر، کشمیر ٹائمز، نیو کشمیر، نویگ، پیغام، کشمیر گارڈین، وکیل، کشمیر کرانیکل، حریت، نور، لالہ رخ، پاسبان، نوجوان، جمہور، امر، ترجمان کشمیر، جاوید، انند، چاندہ، دیس سیوک، سدرشن، کرن، افق، خورشید، انکشاف، وطن، صادق، آفتاب، حمایت، دیہاتی، پریم کسان، قابل ذکر ہیں۔

کشمیر میں جن صحافیوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں ان میں مولانا تاج الدین، مولانا صدر الدین اور منشی محمد الدین فوق بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

وہ بزرگ جن کا کشمیر کے علاقے سے تعلق نہ تھا مگر کشمیر کی صحافتی تحریک میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان میں مولانا ظفر علی خان، پروفیسر علم الدین سالک

اور مولانا عبداللہ قریشی قابلِ ذکر شخصیات ہیں۔ پروفیسر سالک اور عبداللہ قریشی کی خدمات کے پیشِ نظر انھیں اعزازی کشمیری کا لقب عطا کیا گیا۔ پروفیسر سالک مرحوم اور عبداللہ قریشی، منشی محمّد الدین فوق کے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔

"منشی محمّد الدین فوق بطور صحافی"

لاہور کے موری دروازے کے باہر انارکلی میں ایچی سن مڈل سکول تھا۔ فوق صاحب وہاں داخل ہوئے۔ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر "پیسہ اخبار" کے چھوٹے بھائی منشی عبدالکریم بھی اس سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کی وجہ سے "پیسہ اخبار" میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان دِنوں "پیسہ اخبار" کا دفتر موری دروازہ کے باہر تھا۔ سکول کے بعد کا اکثر وقت وہاں صرف ہوتا۔ فوق صاحب کی طبیعت میں شعر و ادب کا ذوق تھا۔ اخبار بینی کا چسکا بھی پڑ گیا۔ سیالکوٹ میں پٹوار کی تربیت کے بعد بیزار ہو کر فوق صاحب لاہور میں بے روزگار تھے۔ اور کسی ایسی ملازمت کی تلاش میں تھے جو ان کے ذوق اور مزاج کے مطابق ہو۔ آخر کار ۱۸۹۷ء میں "پیسہ اخبار" میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ نو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ فوق صاحب نے "اخبار نویسوں کے حالات" میں یہ حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

فوق صاحب چار سال پیسہ اخبار کے دفتر میں میر جالب دہلوی، منور خاں ساغر اکبر آبادی، عبدالرؤوف رافت بھوپالی اور لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی جیسے صحافیوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر فنِ اخبار نویسی کے رموز و نکات سیکھتے رہے۔

”پنجۂ فولاد“

اکتوبر ۱۹۰۱ء میں فوق صاحب نے ”پیسہ اخبار“ کی ملازمت چھوڑ دی اور نومبر ۱۹۰۱ء میں اپنا اخبار جاری کر دیا۔ اس اخبار کا نام ”پنجۂ فولاد“ تھا۔ پہلے ہی پرچے کے آزادانہ لب و لہجے پر تمام اخبار نویس دنگ رہ گئے۔ افتتاحیہ کا عنوان بڑا چونکا دینے والا تھا۔ ”خدا کے گھر پر سرکار کا قبضہ“ قصہ یہ تھا لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب شاہجہانی دور کی ایک خوبصورت مسجد ہے، جسے دائی رنگا کی مسجد کہتے ہیں۔ اس پر ریلوے والوں نے قبضہ کر کے ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ عام لوگ اسے ٹی۔ ایس کا دفتر کہتے تھے۔ فوق صاحب نے مسجد کی تاریخی حیثیت بتا کر پُر زور مطالبہ کیا کہ اسے انگریز کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ عنوان کے نیچے یہ شعر تھے:

یہ ظُلم اے چرخ دِل جلوں پر
کبھی تو خوفِ خُدا کیا کر
شبیہہ کعبہ جہاں کبھی تھی
بنا وہ ٹی ایس کا آج دفتر

جب وہ پرچہ دوسرے اخباروں کے دفتر میں پہنچا تو وہ بھی ہمنوا ہو گئے انھوں نے بھی آواز بلند کی اور اس تواتر سے لکھا کہ پبلک مطالبہ سے متاثر ہو کر لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں مسجد واگزار کر دی۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور اس پر محکمہ آثار قدیمہ کا بورڈ لگا ہُوا ہے۔ ؎

یہ فوق صاحب کا پہلا قدم اور پہلی فتح تھی۔ اس کے بعد اخبار کی اشاعت بڑھتی ہی گئی۔ فصیح الملک میرزا داغ دہلوی جو شاعری میں فوق کے استاد تھے۔

پرچے کی شان دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی پسندیدگی کے اظہار میں مندرجہ ذیل شعر کہتے :

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری — خریدارو نیا اخبار دیکھو
جناب فوق کی گلکاریوں سے — بنا اخبار یہ گلزار دیکھو
نئی خبریں بہت سچی ملیں گی — جو ہو کر طالب دیدار دیکھو
نظر چڑھ جائے گر اہلِ نظر کی — پھر اس کی گرمیٔ بازار دیکھو
یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو — نہ ہوگا اس سے دل بیزار دیکھو
اٹھاؤ رکھ کے سو سو بار اس کو — اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سُنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ
یہ لو اخبار جوہر دار دیکھو[۶]

یہ قطعہ تاریخ بھیجتے وقت حضرت داغ نے لکھا :

"محمد الدین فوق سلمہ اللہ تعالیٰ"
اخبار "پنجۂ فولاد" ملا۔ آپ کی فرمائش کے مطابق تاریخ کہہ کر بھیجتا ہوں۔ نہیں معلوم کس مناسبت سے اخبار کا نام آپ نے "پنجۂ فولاد" رکھا ہے۔ گزشتہ محرم میں مجھے سلام کرنے کے لیے ایک طوائف آئی تھی۔ نام پوچھا۔ تو بولی۔ مجھے "فولاد جان" کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا تم میں کیا کیا جوہر ہیں؟ اس نے مرثیہ کے چند بند سنائے۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ "پنجۂ فولاد" فولاد جان کا نہ ہے۔ فقط۔

فصیح الملک داغ دہلوی۔ ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء"[۷]

دوسرے استادوں اور شاعروں نے بھی پرچے کی تعریف کی۔ حضرت احسان

شاہجہانپوری نے لکھا:

ذوق کی مضمون نگاری میں کشش ہے حسن کی
خود خدا ہونے کو آتی ہے خبر اخبار پہ
میں نے یہ احسان لکھا مصرع تاریخ سال
ذوق ہوا اس پرچہ فرقی کو ہر اخبار پہ

مولانا احسن مارہروی نے پرچے کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

کاغذ اچھا ہے چھپائی خوب ہے عمدہ ہے خط
اور پھر اک بات یہ بھی قابل اظہار ہے
جو خبر ہے درج اس میں وہ نہایت معتبر
اور جو مضمون ہے وہ بھی بہت باکار ہے
عنقریب امید ہے ہو جائے گا یہ ہفتہ وار
کیونکہ خود اس کا ایڈیٹر مرد واقف کار ہے
ہے مناسب نام سے احسن کے یہ تاریخ بھی
"پنجہ فولاد" نامی پائیدار اخبار ہے

احسن مارہروی نے جو امید ظاہر کی تھی وہ پوری ہوئی اور جنوری ۱۹۰۲ء سے یہ اخبار ہفتہ وار چھپنے لگا۔ پہلے یہ اخبار لالہ دینا ناتھ کے پریس میں چھپتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں ذوق صاحب نے اپنا پریس لگا لیا۔ اور اب پرچے کی اشاعت سات سو تک پہنچ گئی۔ پہلا پرچہ پچیس کی تعداد میں چھپا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اشاعت بارہ سو تک پہنچ گئی جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی ؏ اخبار کی پالیسی متوازن تھی۔ ہر مذہب اور ہر خیال کے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ راجے مہاراجے بھی اسے خریدتے تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ بھی اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ

ہندو، سکھ اور عیسائی بھی اس کے قدردان تھے۔ مولانا عبداللہ قریشی اس اخبار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پنجہ فولاد کا اٹھان حسینوں کی نوخیز جوانی کی طرح دلکش تھا۔ مضامین میں شباب کی شوخی رقص کرتی تھی۔ خبروں کے انتخاب میں عام دلچسپی اور افادیت کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے نوٹ بے حد مفید اور کارآمد ہوتے تھے۔ بعض عنوان مستقل تھے۔ مثلاً بزم فوق، مذاق سخن، علمی نظارہ، ضامن صحت، لطائف، مراسلات، مشاہیر ہند اور دنیا بھر کی خبریں وغیرہ۔ ہر کالم منہ سے بولتا تھا کہ مجھے دست فوق سے لکھے جانے کا شرف حاصل ہے۔ طبیعت میں شاعری کا جوش موجزن تھا۔ ایک ایک سطر بہار کی پیامی بن کر رنگین و شاداب پھول بساتی تھی۔ خبروں کے عنوان عام طور پر مصرع ہوتے تھے، جو نہایت موزونی سے تجویز کیے جاتے تھے۔ نمونے کے طور پر چند ایک یہ ہیں۔

(۱) جو کام ہوا تجھ سے وہ رستم سے نہ ہوگا
(۲) حضرت دل اے ظفر اچھا ہوا پکڑے گئے
(۳) خالی نہ کبھی جائے گی فریاد ہماری
(۴) بارہا چھوٹے قفس سے بارہا پکڑے گئے
(۵) مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
(۶) مژدہ باد اے مرگ عیسےٰ آپ ہی بیمار تھے
(۷) لگے نہ پاؤں کو ٹھوکر ذرا سنبھل کے چلو
(۸) وہ ہوگا لکھ چکا جو کاتب تقدیر پہلے سے
(۹) ابر رحمت کا کوئی چھینٹا برس جائے کبھی

(۱۰) کوئی تو سُنے گا دِل ناشاد ہماری

(۱۱) قاصد آ کے بتا جاتے ہیں جھوٹی باتیں

(۱۲) جو بات کی خُدا کی قسم لاجواب کی

(۱۳) مارا ہُوا تمھارا جلایا نہ جائے گا

(۱۴) اے حضرت دِل لیجیے اِک تازہ خبر اور

(۱۵) فقیر لوگ امیرانہ ٹھاٹھ رکھتے ہیں

(۱۶) شمع سے بادِ صبا گُل سے خزاں دور رہے

(۱۷) جلد اے خضرِ غریباں رہنمائی کیجیے

(۱۸) رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

(۱۹) دوستی کا ہو زمانے میں بھروسہ کس پر

(۲۰) یاقوت تراشا گیا ہیرے کی کنی سے

(۲۱) اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

(۲۲) کِس کے آگے دِلِ پُر درد کا دکھڑا کہیے

(۲۳) عِشق ازیں بسیار کردست وکند

(۲۴) نمازیں پڑھتی ہیں حوریں ہمیشہ تیرے دامن پر

(۲۵) خدا نخواستہ آپس میں کیوں ملال کریں

(۲۶) خاک پر لوٹتے ہیں یار کے گیسو بڑھ کر

(۲۷) زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

(۲۸) خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مضمون کے خاتمے پر بھی کوئی نہ کوئی باموقع شعر ضرور ہوتا تھا جو اثر کیے بغیر نہ رہتا تھا، اس طرح ہر خبر میں خود بخود شعریت پیدا ہو جاتی

تھی ..... بزمِ فوق کے کالم میں خریداروں کے بعض استفسارات اور ان کے جواب ہوتے تھے۔ مگر اس کالم کا یہ شعر آج تک کئی دوستوں کو زبانی یاد ہے:

کس طرح کے لوگ ہیں کیا بات ہے؟
فوق کی محفل تو دیکھا چاہیے [۹]

علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی اس رسالے کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں:-

"پنجۂ فولاد" اک اخبار ہے — جس سے سارا ہند واقف کار ہے
دفتر اخبار ہے لاہور میں — جس کا کوچہ کوچۂ کوئے یار ہے
ہے روش اس کی پسند خاص و عام — واہ وا کیا معتدل اخبار ہے
غیر سے نفرت نہ اپنوں سے بگاڑ — اپنے بیگانے کا ہر دم یار ہے
سطر سطر اس کی مفید ملک و قوم — کوئی کہہ دے یہ خبر بے کار ہے
دید کے قابل نہ ہو کیوں بزمِ فوق — شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے
ضامن صحت کا ایماء ہے عمل — وہ ضمانت کے لیے تیار ہے
ہے تجارت کا بھی کالم کیا مفید — یوسف معنی کا یہ بازار ہے
وہ لطائف ہیں کہ پڑھتے ہی جنھیں — لوٹنے کو دل کبوتر وار ہے
سیٹلمنٹ آفس کا بھی ہے بندوبست — شاہد ان دعووں کا خود اخبار ہے
ہے مدلل رائے اس اخبار کی — ہے وہ کافر جن کو کچھ انکار ہے
رائے زن اس سے نہیں بڑھ کر کوئی — منصفوں کو اس کا آپ اقرار ہے
جتنے ہیں ہمعصر دیکھیں غور سے — فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے
تین رائج سکے قیمت سال کی — اس سے سستا اور کون اخبار ہے

اور پھر انعام میں ناول ہیں مُفت — واہ کیا سودا ہے کیا بیوپار ہے

آٹھویں دن حاضری لے لیجیے — تابع فرمان خدمت گار ہے

سیر اس گلشن کی کر کے دیکھیے — ایک گلشن رشک صد گلزار ہے

رنگ، آزادی ہے ہر مضمون میں — سرو ہو کر بھی یہ میوہ دار ہے

کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر — بات یہ بھی قابل اظہار ہے

لیجیے مجھ سے جواب مختصر — یہ معمہ کچھ نہیں دشوار ہے

نام ہے اس کا محمد دین فوق — عُمر چھوٹی ہے مگر ہوشیار ہے

شوق ہے مضمون نگاری کا اسے — طبع گویا ابر گوہر بار ہے

گشت کے عالم میں دیکھا تھا اسے

آدمی ہشیار واقف کار ہے[لہ]

چھ سال یہ اخبار کامیابی سے نکلتا رہا۔ آخر ستمبر ۱۹۰۶ء کے وسط میں یک لخت بند ہو گیا۔ اس ضمن میں فوق صاحب خود تحریر کرتے ہیں :

"ایک شخص جو بڑا چالاک اور گرگ باراں دیدہ تھا، چند دنوں کی آمد و رفت کے بعد میرا ہمدرد بن گیا۔ وہ ہر سیر و سیاحت اور سفر و حضر میں میرے ساتھ ہوتا تھا۔ اور ایک معمولی سا ہرائے نام پندرہ روزہ اخبار نکال کر بہت فائدے میں رہتا تھا۔ میں نے اس کی ریش سفید پہ اعتبار کیا اور یہ نہ سمجھا کہ یہ محض ظلمت، فریب سے بھری ہوئی ہے۔ میں اس کے چہرے کو صبح صادق سمجھتا رہا حالانکہ وہ محض مکر چاندنی کا مظہر تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اخبار پر ٹکٹیں لگانے کا کام اس کے سپرد کیا اور پھر اخبار شماری بھی اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دی۔ حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ ٹکٹیں وہ لگاتا اور اخبار کو گننے والا کوئی اور ہوتا جو دیکھتا کہ اس نے

جتنی ٹکٹیں لی تھیں اتنی لگائی بھی ہیں یا نہیں۔ اس طریق سے وہ سفید ریش بزرگ سال بھر تک بیس روپے ماہوار کے ٹکٹ ہضم کرتا رہا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اخبار کی جان کے لالے پڑ گئے۔ خریدار ناراض ہو گئے۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اگست ۱۹۰٦ء میں مطبع پنجہ فولاد اور اخبار "پنجہ فولاد" دونوں بند کر دیے۔ اسی زمانے کا ایک شعر ہے:

اخبار بند ہونے سے کہتے ہیں نازنین
اے فوق اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا[1]

یہ شعر بھی انہی حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اے فوق! جو یُوں خوف رہا مالی و جانی
پھر کا ہے کو جاری کوئی اخبار کرے گا[2]

اپنے اخبار کے لیے کام کرنے کے علاوہ فوق صاحب اخبار "بھارت سیوک" جالندھر کی نامہ نگاری بھی کرتے تھے، "اخبار عام" اور اخبار "خالصہ بہادر" کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے اور مندرجہ ذیل اخبار مرتب بھی کرتے تھے۔ جن کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

۱۔ "کوہِ نور" جو پنجاب کا پہلا اخبار تھا، ۱۸۵۰ء میں لالہ ہر سکھ رائے نے جاری کیا تھا اور ان کی وفات کے بعد ۱۹۰۴ء تک جاری رہا تھا۔ اس کے آخری ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔

۲۔ "آفتاب پنجاب" جو ۱۹۰٦ء میں بند ہو گیا۔

۳۔ "گلزار ہند" یہ اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا تھا۔

۴۔ "بہاول گزٹ" جو مفتی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا تھا۔

۵۔ "اُردو اخبار" یہ لالہ منشی رام اگروال نے ۱۹۰۴ء میں جاری کیا تھا اور اس کی ادارت فوق صاحب کے سپرد کی تھی

۶۔ ۱۹۰۱ء میں میاں جان محمد گنجے نے "کشمیری گزٹ" جاری کیا۔ اسے تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی کی حیثیت سے مرتب کرتے رہے۔ اس کے ستمبر ۱۹۰۱ء کے پرچے میں علامہ اقبال کا کلام بھی شائع ہوا تھا۔

۷۔ "کشمیری مخزن" جس کے ایڈیٹر خواجہ کمال الدین اور اسسٹنٹ ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ذوق و شوق کی تکمیل و تسکین کے لیے کس قدر محنت سے کام لیتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل تھی۔

"کشمیری میگزین"

"کشمیری مخزن" اور "کشمیر گزٹ" نے کشمیر کے معاملات میں اپنی دلچسپی پیدا کر دی کہ پنجۂ فولاد کے بند ہوتے ہی فوق صاحب نے جنوری ۱۹۰۶ء میں "کشمیری میگزین" جاری کر دیا۔ یہ غالباً پنجاب کا سب سے پہلا رسالہ ہے جس نے ہاف ٹون بلاک کی تصاویر چھاپنے کے علاوہ خاص نمبر نکالنے کی روایت ڈالی۔ اس کا ایڈیٹر نمبر مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

"اس کا رنگ ڈھنگ "تہذیب الاخلاق" سے ملتا جلتا تھا۔"[۱۳] یہ بات کشمیری میگزین کی ہمہ گیر افادیت اور اہمیت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے جموں کے بزرگ صحافی ملک راج صراف ایڈیٹر ہفتہ وار "رنبیر" لکھتے ہیں :

"مجھے اپنے بزرگ رفیق محمد الدین فوق کو نزدیک سے دیکھنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ آپ ایک عظیم مؤرخ، بلند پایہ ادیب، قابل شاعر، ممتاز صحافی، سچے محب وطن اور سب سے بڑھ کر شرافت اور انسانیت کا مجسمہ تھے۔ فوق صاحب اپنی دیگر ادبی سرگرمیوں اور گوناگوں مصروفیتوں کے علاوہ لاہور سے "کشمیری میگزین"

کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا کرتے تھے، جو جموں و کشمیر کے کاز کا سرگرم حامی تھا۔ اخبار کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا:

"مل کے دُنیا میں رہو مثل حروف کشمیر"

ان الفاظ ہی سے بخوبی ظاہر ہے کہ فوق صاحب باہمی اتفاق و اتحاد کے لیے اپنے دل میں کتنی تڑپ رکھتے تھے۔

خود میں نے صحافت کا آغاز "کشمیری میگزین" سے ہی کیا تھا۔ میرا سب سے پہلا معمولی سا مضمون جس کا عنوان غالباً ریاستی باشندگان کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ تھا، آج (۱۹۷۸ء) سے باسٹھ سال قبل یعنی ۱۹۱۶ء میں "کشمیری میگزین" ہی میں چھپا تھا۔

جب بھی مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوتا، فوق صاحب سے ملاقات کا شرف میرے پروگرام کا ایک اہم آئیٹم ہوتا۔ میں ان کی صحبت میں لگاتار کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر ریاست جموں و کشمیر کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتا اور ان کے تجربے اور قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتا۔ جب کبھی فوق صاحب جموں یا سرینگر میں تشریف فرما ہوتے، مجھ ناچیز سے ملنے کا ضرور وقت نکالتے۔

جب میں نے جون ۱۹۲۴ء میں ریاست کا اوّلین اخبار "رنبیر" جموں سے جاری کیا، تو فوق صاحب نے اس کا دل کھول کر خیر مقدم کیا۔ جب میں نے "رنبیر" کا ایک خصوصی نمبر نکالا، جو ریاست سے متعلق مختلف معلومات پر مبنی تھا، تو آپ نے اس کی بڑی سراہنا کی اور اپنے مخصوص انداز میں یوں تبصرہ فرمایا:

"ریاست جموں و کشمیر سے اس قدر جواہرات کا فراہم کرنا ملک راج صراف کا ہی کام تھا۔"[۱۴]

خود فوق صاحب نے اس رسالے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

"اس دور افتادہ ملک میں اشاعت، تعلیم، قومی بیداری، حفاظت حقوق، تمدنی ترقی اور ان تکالیف کے رفع کرنے کے اسباب مہیا کرنا، جو کشمیری مسلمانان پنجاب کو کسی نہ کسی وجہ سے حصول اراضی اور فوج میں بھرتی کے متعلق پیش آرہے ہیں۔"[۱۵]

چھ سال کے بعد یہ ماہنامہ ہفتہ وار کر دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء کے بعد سے ۱۹۳۴ء تک یہ ہفتہ وار اخبار کی صورت میں اپنی مؤثر تحریروں سے علم و عمل کا نور پھیلاتا رہا۔

فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے کچھ لوگوں نے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کا نام "انجمن کشمیری مسلمانان" تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ اصلاح رسوم شادی و غمی۔

۲۔ کشمیری مسلمانوں میں تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کو رواج دینا

۳۔ قوم میں اتحاد و اتفاق بڑھانا۔

اقبال اور فوق دونوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کی کچھ عرصہ بعد اقبال اس کے سیکرٹری اور فوق اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ دونوں نے اس کے لیے بڑا کام کیا۔ فوق صاحب کی تحریروں سے اس کے اتنے دور رس اثرات مرتب ہوئے کہ عزت مآب نواب بہادر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی ایس آئی نواب آف ڈھاکہ جو کشمیر کے رہنے والے تھے ۱۹۰۸ء میں اپنی برادری کی اس انجمن کے مربی بننے پر راضی ہو گئے۔ ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر میں تشریف لائے تو اس انجمن نے انھیں سپاسنامہ پیش کیا جو اقبال نے فارسی میں پڑھا۔ نواب صاحب

نے اس سپاسنامے کا جواب انگریزی میں دیا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

"صاحبو! نہیں نہیں بھائیو! میں آپ کے سپاسنامے اور ملاقات سے بہت خوش ہُوا ہُوں۔ میں اس وقت اپنے بھائیوں کے درمیان ہُوں اور ان کی ہر خدمت کے لیے جو مجھ سے ممکن ہے حاضر اور تیار ہوں۔ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں آپ کی قومی انجمن کا چیئرمین (مربی) بنوں۔ میں ہر چند اس قابل نہیں لیکن آپ کی خوشی کو مدِ نظر رکھ کر آپ کی خواہش منظور کرتا ہُوں اور خوش ہُوں کہ میری قوم وطن کی وفادار اور جان نثار ہے۔"[۱۶]

ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ صدارت میں نواب صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہُوئے فرمایا:

"اگرچہ میری حالت صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں اتنی دُور کا سفر اختیار کروں اور اس شاندار مجمع میں شریک ہوں مگر آپ حضرات کے اخلاص نے مجھے مجبور کیا اور ڈھاکے سے یہاں تک کھینچ لیا۔ ڈھاکہ امرتسر سے سینکڑوں منزل پر واقع ہے مگر میں یقین کرتا ہُوں اور یقین کرنے کے کافی وجوہ میرے پاس موجود ہیں کہ میں اپنے وطن میں ہُوں۔ میرا خیال ہے کہ امرتسر کی آبادی پنجاب میں بہ لحاظ کشمیری آبادی کے بہت زیادہ ہے اور اپنے خواص اور پیداوار اور ذرائع کے اعتبار سے ثانی سرینگر ہے اور شاید آپ حضرات واقف ہوں گے کہ میں کشمیر الاصل ہُوں۔ اس حیثیت سے اپنے موجودہ وطن سے جس قدر آگے بڑھوں گا اصلی وطن یعنی کشمیر مجھ سے قریب تر ہوتا جائے گا۔"[۱۷]

اس سے پہلے کشمیریوں کی فوج میں بھرتی ممنوع تھی شاید انھیں اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اقبال اور فوق کی تحریک سے نواب صاحب نے ۵ر فروری ۱۹۰۹ء کو وائسریگل کونسل کے اجلاس میں حکومت ہند سے یہ سوال پوچھا کہ کشمیری فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہو سکتے؟ اگر ہو سکتے ہیں تو آج کل کتنے کشمیری سرکاری فوج میں ہیں۔ امرتسر یا سرحد کشمیر پر جو کشمیری آباد ہیں کیا وہ پنجاب کے قانون انتقال اراضی کی تعریف میں شامل ہیں؟

اس سوال کے جواب میں لارڈ کچنر نے حکومت ہند کی طرف سے کہا کہ کشمیری قوم کے فوج میں بھرتی ہونے پر کوئی روک ٹوک نہیں مگر رجمنٹوں میں چونکہ ان کی کلاس کمپوزیشن نہیں یعنی کوئی کمپنی پلٹن میں یا کوئی ٹروپ رسالہ میں کشمیریوں کے لیے مخصوص نہیں۔ اس لیے ہندوستانی فوج میں کوئی کشمیری بھرتی نہیں ہوتا۔

اسی طرح مسٹر ملر نے حکومت کی طرف سے جواب دیا کہ جو کشمیری امرتسر اور حدود کشمیر میں رہتے ہیں، پنجاب کے قانون انتقال اراضی کی رو سے ان پر کچھ خراب اثر نہیں پڑا۔ پنجاب میں کاشت کی رقوم مشتہر ہونے کے لیے کشمیریوں کو حکومت پنجاب سے درخواست کرنی چاہیے۔ پنجاب گورنمنٹ کو حکومت ہند سے دریافت کیے بغیر ہر قوم کو کاشت کار مشتہر کر دینے کا اختیار ہے۔"[۱۸]

اس انداز کی کئی تحریریں کشمیری میگزین میں نظر آتی ہیں جن میں فوجی بھرتی اور حصول اراضی کی ضرورت اور اہمیت عوام اور حکام دونوں پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک مراسلے میں تعلیم کی اہمیت پر اس طرح زور دیا گیا ہے:

"دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب، شائستہ اور

ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ سب علم کے زینے ہی سے آسمان عروج وکمال پر پہنچی ہیں۔ آپ کو یاد رہے کہ آپ میں بھی وہ سچے موتی اور جواہر موجود ہیں جن کی چمک دمک سے دنیا حیران اور خیرہ ہوسکتی ہے، لیکن صرف جلا کی ضرورت ہے اور جلا تعلیم کے ذریعے ہی سے ہوسکتی ہے۔"[۱۹]

ان دنوں کشمیر میں اخبار بینی کا رجحان بالکل ناپید تھا۔ ۱۹۱۲ء میں فوق صاحب نے "کشمیری میگزین" کے بیس پرچے مختلف پیرزادگان کے نام ارسال کیے تاکہ ان میں اخبار پڑھنے کا شوق پیدا ہو اور انھیں معلوم ہو کہ زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور کشمیری ترقی کی دوڑ میں کتنے پیچھے ہیں۔ یہ پرچہ ایک سال تک ان کو مفت بھیجا جاتا رہا۔ اس کی کوئی قیمت وصول نہیں کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ فوق صاحب نے یہی اس کا معاوضہ سمجھا۔ مگر ان بیس پرچوں میں سے اٹھارہ واپس آگئے۔ یہ حالات دیکھ کر فوق صاحب بہت بددل ہوئے مگر مایوس نہیں ہوئے۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو آپ نے اپنے دکھ کا اظہار ان اشعار کے ذریعے کیا:

دل توڑ کے بیٹھے ہو یہ اچھا نہیں کرتے
ہمت کے دھنی جو ہیں وہ ایسا نہیں کرتے

ہمت سے ہی مٹھی میں ہے بجلی کی چمک بھی
جو کرنے پہ آجائیں وہ کیا کیا نہیں کرتے

مایوس ہوتے جاتے ہو اللہ کے گھر سے
قرآن کو شاید کبھی دیکھا نہیں کرتے

ہر قوم پہ آتی ہیں مصیبت کی گھٹائیں
گھبرا کے مگر یوں کبھی رویا نہیں کرتے

منہ پھیرتے ہیں سیل حوادث کا وہی لوگ
جو پاؤں کبھی توڑ کے بیٹھا نہیں کرتے

تعلیم اگر عام ہو بیگار کہاں ہو
افسوس تم اس نکتے کو سوچا نہیں کرتے

تعلیم ہی اِک چلتا ہُوا جادو ہے ایسا
جس جادو پہ عامل کبھی ٹونا نہیں کرتے

اِک ہم کہ پریشاں ہی رہے غم میں تمہارے
اِک تُم کہ ہماری کبھی پروا نہیں کرتے

ہر ماہ تمھیں بھیجتے ہیں چھاپ کے ہم خط
پڑھنا تو کجا تم اسے دیکھا نہیں کرتے

لکھتے نہیں اس میں گُل و بُلبل کی حکایت
افسانۂ ہمساں بھی لکھا نہیں کرتے

یہ خط نہیں کچھ اپنی نمائش کا ذریعہ
اس خط میں کبھی بخت کا شکوہ نہیں کرتے

اس خط میں نہیں ہوتی ہے واعظ کی خدمت
اس خط میں کبھی شیخ کو رسوا نہیں کرتے

یہ خط ہے رعایا کا بھی راعی کا بھی خادم
کیا ان کو خبر جو اسے دیکھا نہیں کرتے

یہ خط ہے تمھاری ہی شکایات کا رونا
ہم اپنا تو رونا کبھی رویا نہیں کرتے

اس خط نے بہت نیند کے ماتوں کو جگایا
اس طرح کہ اب راتوں کو سویا نہیں کرتے
کشمیر کو گرمایا ہے اس خط کی تپش نے
اس دور میں کیا مُردے کو زندہ نہیں کرتے
کشمیر کی رفتار و ترقی نہ ہو کیوں سست
بیمار جو ہوتے ہیں وہ دوڑا نہیں کرتے
گھر بیٹھے ہی منزل پہ پہنچ جائیں گے کیونکر
باہر جو قدم گھر سے نکالا نہیں کرتے[۱۵]

اس قسم کے مشکل حالات میں ایسی پتھر دِل قوم سے پالا پڑا تھا۔ مگر فوق صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے اخبار کشمیری کانفرنس اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے میموریل کے ذریعے پیرزادوں کو تعلیم حاصل کر کے عربی مکتبوں کے مدرس بننے کی تحریک جاری رکھی۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق جب تک یہ حضرات تیار نہ ہوئے عام لوگوں میں تعلیم کا میلان پیدا نہیں ہوگا۔ آخر ان کی کوشش رنگ لائی اور محکمہ تعلیم نے سرکاری مدرسوں میں ہندی کے استادوں کے ساتھ عربی استادوں کی تقرری منظور کر لی۔ پیرزادوں نے علم حاصل کرنا شروع کر دیا اور پڑھ لکھ کر کشمیر میں تعلیم پھیلانی شروع کر دی۔[۱۶]

ڈوگرہ راج میں مہاراجہ ہری سنگھ سے پہلے کشمیر میں بیگار کا عام رواج تھا اور اسے کار سرکار کہتے تھے۔ سرکاری ضروریات کے لیے لوگوں سے سارا سارا دن زبردستی کام لیا جاتا تھا اور ان کو کوئی مزدوری بھی نہیں دی جاتی تھی۔ ایک آدمی کے کام کے لیے دس دس آدمی بلا لیے جاتے تھے۔ کچھ کو تو باقاعدہ نوکر کے طور پر رکھ لیا جاتا تھا۔ اخبار کشمیری نے بیگار کے خلاف آواز اٹھائی اور متواتر کئی سال تک لکھا۔

کشمیری عوام کے ساتھ کشمیر کا حکمران طبقہ کیسا بہیمانہ سلوک کرتا تھا اور بیگار کی مصیبت میں ان کو کس بری طرح پھانسا جاتا تھا، اس کا ذکر ایک کانفرنس میں ہوا جس کی روئداد نومبر ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں چھپی:

"ہر چند کشمیر کے کسی دفتر اور محکمہ میں مسلمانوں کی بہت ہی کم بلکہ بالکل صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن دربار کشمیر نے ایک محکمہ ایسا جاری کیا ہوا ہے، جہاں صرف مسلمانوں ہی کو بھرتی ہونے کی اجازت ہے بلکہ یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ اس محکمہ میں سوائے مسلمانوں کے کسی غیر قوم ہندو یا سکھ کو بھرتی کرنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ یہ محکمہ کون سا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ صاحبان! اس کا نام بیگار کا محکمہ ہے۔ اس مرتبہ مہاراجہ کپورتھلہ بھی کشمیر میں رونق افروز تھے۔ ان کے شکار کے لیے جہاں اور انتظامات کیے گئے تھے وہاں بارہ سو بیگاری بھی زبردستی پکڑ کر (قید بے زنجیر میں) رکھے گئے تھے۔ بیگار کی مزدوری صرف ۴ پیسہ یومیہ ہے۔ لیکن ان بے چاروں کو دس دس دن گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ اتنے دنوں کا سامان خوراک ہمراہ لے آتے ہیں۔ اپنے سامان کے ساتھ بیگار کا بوجھ الگ ہوتا ہے۔

مہاراجہ صاحب کے پروگرام میں تبدیلی ہو جانے سے پانچ چھ دن کا وقفہ پڑ گیا لیکن بیگاری بے چارے وہاں ہی رکھے گئے اور وہ اپنی گرہ سے کھاتے پیتے رہے۔ پیچھے خواہ ان کی فصلیں تباہ ہو جائیں یا کوئی رشتہ دار مر جائے یا کوئی بیمار ہو مطلق پرواہ نہیں کی جاتی۔" [۲۲]

فوق صاحب بیگار کے اس بہیمانہ رواج کے خلاف برابر لکھتے رہے۔ یہاں تک کہ حکومت کشمیر اس قانون کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے بعد سرکاری کاموں

کے بدلے قلیوں کو مزدوری ملنے لگی۔ فوق صاحب کے کلام میں اس قسم کے اشعار بے وجہ نہیں:

خاک پاک خطۂ کشمیر ہے جنت مگر
قہر دوزخ کا نمونہ ہے وہاں بیگار بھی
خلد ہے کشمیر تو اس میں عذاب نار کیوں
کیا ہوا کرتا ہے جنت میں کہیں آزار بھی
ایک تو بیگار لیں پھر اس پہ مزدوری نہ دیں
مارتے ہیں آہ ظالم تیر بھی تلوار بھی
بیگار کا جو ڈر ہے وہ موت سے سوا ہے
ظالم نے کر دیا ہے جینا حرام اپنا

پنجاب کے زمیندار کو آپریٹو سوسائٹیوں، زمیندارہ بنکوں اور قانون انتقال اراضی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے مگر کشمیر میں ۱۹۱۲ء سے پہلے کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ فوق صاحب کے دوست خان بہادر مقبول حسین سی۔ آئی۔ ای اس زمانے میں ... ہال اور چودھری خوشی محمد ناظر گورنر صوبۂ کشمیر تھے۔ انھوں نے ان دونوں کی خدمت میں حاضر ہو کر زمینداران ریاست کی زبوں حالی کا ذکر کیا اور پھر پنجاب کی طرح ریاست میں امداد باہمی کی انجمنوں کے اجراء اور قانون انتقال اراضی کے نفاذ کا مطالبہ پیش کیا۔ دونوں نے فرمایا کہ آپ پبلک آواز اور لوگوں میں خواہش پیدا کریں تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو کہ لوگ واقعی چاہتے ہیں۔ پھر ہم غور کریں گے[۲۴]۔

فوق صاحب نے "اخبار کشمیری" کے ذریعے اس ضرورت کی طرف حکومت کی توجہ دلائی اور کئی سال تک مسلسل اس سلسلے میں لکھا اور دوسروں سے لکھوایا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ریاست کی چار تحصیلوں کوٹلی، بھمبر، میرپور اور رنبیر سنگھ پورہ میں

آزمائشی طور پر محکمہ امداد باہمی قائم کر دیا گیا اور قانون انتقال اراضی بھی رائج کر دیا گیا۔ بعد میں تمام صوبہ جموں میں مستقل کر دیا گیا۔ فوق صاحب کا یہ شعر آپ کی اسی زمانے کی تمناؤں کا مظہر ہے:

پنجاب جس کے نور سے فوراً چمک اُٹھا
یارب وہ روشنی کبھی کشمیر میں بھی ہو

مہاجنوں اور سُود خواروں نے اس قانون کے خلاف بہت ہاتھ پیر مارے مگر جب کوئی شنوائی نہ ہوئی اور یہ امتحانی تجربہ مفید ثابت ہُوا تو حکومت نے کچھ عرصہ کے بعد اسے ریاست کے دونوں صوبوں جمّوں اور کشمیر میں مستقل طور پر منظور کر لیا۔ اس کامیابی پر فوق صاحب کو ہر طرف سے مبارکبادیں ملنے لگیں۔

"صوبہ جمّوں کی چار تحصیلوں میں خان بہادر شیخ مقبول حسین بی۔ اے بیرسٹرایٹ لاء ریونیو منسٹر کی تحریک سے مہاراجہ کشمیر نے قانون انتقال اراضی کا اجراء منظور کر لیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ قانون رفتہ رفتہ ساری ریاست میں جاری ہو جائے گا تاکہ زمینداروں کو شقی القلب ساہوکاروں کے سُود در سُود کے چکر سے نجات مِل جائے۔ بے شک اس بارے میں ہم عصر "کشمیری" کی کوششیں بھی قابل مشکوری ہیں۔" [۲۴]

"مہاراجہ صاحب کشمیر نے قانون انتقال اراضی کو فی الحال صوبہ جمّوں کی چار تحصیلوں میں منظور کر کے جہاں اپنی رعیت پروری کا ثبوت دیا ہے، وہاں ہم اپنے معزز ہم عصر "کشمیری" کو بھی مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں جو قریباً ڈیڑھ سال سے اس قانون کی ضرورت کی طرف حکومت کشمیر کو پُرزور الفاظ میں توجہ دلا رہا ہے۔" [۲۵]

شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں کشمیر کی جامع مسجد کو مرمت کی ضرورت تھی۔ اس

کے لیے بادشاہ نے حکم دیا۔ نورجہاں بھی بادشاہ کے ساتھ تھی۔ اس نے دریائے جہلم کے کنارے ایک نئی سنگین مسجد بنوانی شروع کر دی۔ یہ مسجد اپنی ساخت کے لحاظ سے پتھر مسجد کہلائی۔ حکومتوں کی تبدیلی کا اثر اس مسجد پر بھی پڑتا رہا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں یہ مسجد ڈوگروں کے قبضے میں تھی اس میں شالی وغیرہ کی جاتی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں بھی اس کا یہی حال رہا۔ مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر یہ بے آباد ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء میں سنا گیا کہ یہاں پولیس تھانہ قائم کیا جا رہا ہے۔ جب اس کی دیواریں گرائی جانے لگیں اور صحن میں بھی کچھ تبدیلیاں عمل میں آئیں، تو مسلمانوں کی آنکھ کھلی۔ وہ بلبلا اٹھے اور ناراضی کا اظہار کرنے لگے۔ مگر ان کے پاس "اخبار کشمیری" کے سوا احتجاج کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا۔ فوق صاحب ان دنوں کشمیری کانفرنس کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار اور دیگر اخباروں کے ذریعے حکومت کشمیر اور حکومت ہند کی توجہ اس طرف دلائی۔ اور کانفرنس کی طرف سے مہاراجہ کشمیر، وائسرائے ہند اور کشمیر ریذیڈنٹ کو اس کی روک تھام کے لیے تار بھجوائے اور خود کشمیر جا کر دیوان بشن داس ہوم منسٹر سے دو دن تک زبردست بحث کی اور اس تاریخی مسجد کی اہمیت ان پر واضح کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھانے کی تعمیر کا سلسلہ رک گیا اور مسجد پر محکمہ آثارِ قدیمہ کا بورڈ لگ گیا۔ مسجد پھر بھی غیر آباد رہی۔ وہاں گدھے لوٹتے تھے اور دھوبی کپڑے سکھاتے تھے۔ جب تحریک کشمیر شروع ہوئی اور گلانسی کمیشن بیٹھا تو لوگوں کے مطالبے کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس مسجد کو واگذار کر دیا گیا اور یہ مسجد شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ کی جماعت کو واپس کر دی گئی۔[۲۶]

۱۹۱۳ء میں راجہ بلدیو سنگھ پونچھ کے حکمران تھے۔ ان کے وزیر پنڈت جوشی تھے جو الموڑہ یوپی کے رہنے والے تھے۔ ایک نوجوان بدری ناتھ ان دنوں داروغہ جیل تھا۔ وہ بڑا متعصب ہندو تھا اور اس پر ہمیشہ مذہبی جنون سوار رہتا تھا۔ ایک

دفعہ اس نے ایک مسلمان قیدی کو تنگ کرتے ہوئے قرآن مجید کی بھی بے حرمتی کر ڈالی۔ اس پر مسلمان قیدی جوش میں آ گئے۔ اور انھوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ یہ شکایت پنڈت جوشی تک بھی پہنچی مگر اس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ آخر مسلمان قیدیوں کی چیخ پکار جیل کی دیواروں کو پھاند کر باہر نکل آئی۔ اور اس کے شعلے پونچھ اور اس کے گرد و نواح میں پھیل گئے۔ پنڈت جوشی نے اصل مجرم کو سزا دینے اور مسلمانوں کا جوش ہلکا کرنے کی بجائے الٹا مسلمانوں پر شورش اور بغاوت کے الزامات عائد کر کے پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ لیکن اس پر بھی یہ آگ فرو نہ ہوئی۔ مسلمانوں کا جوش بڑھتا گیا۔ آخر حکومت نے بدری ناتھ کو کھلم کھلا قرآن مجید کی توہین کرنے کے الزام میں ریاست بدر کر دیا اور اس کے ساتھ دو مسلمانوں کو جلا وطن کر دیا۔ جن مسلمانوں کو جلا وطنی کی یہ سزا دی گئی تھی، ان میں ایک تو معزز ٹھیکیدار تھا اور دوسرا خواجہ حبیب جو رئیس شہر تھا۔ مسلمان اس حکم پر اور بھی برافروختہ ہوئے۔ وہ سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر خواجہ حبیب کے ساتھ خود بھی وطن چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ یہ قافلہ بارہ مولا تک گیا اور وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ یہ خبر کوئی ایسی نہ تھی کہ اس کا نوٹس نہ لیا جاتا۔ "اخبار کشمیری" نے اسے خوب ہوا دی اور دور دور تک پہنچا دیا۔ فوق صاحب نے اس آواز کو راجہ بلدیو سنگھ تک بھی پہنچایا۔ انھوں نے اپنے ذاتی تدبر سے کام لے کر مسلمانوں کی دادرسی کی۔ مہاجرین کو بھی واپس بلایا اور پنڈت جوشی نے ایجی ٹیشن کے دوران میں جن بے گناہوں کو شورش اور بغاوت کے الزام میں قید کر رکھا تھا، ان کی بھی رہائی کے احکام جاری کیے۔ تمام جلاوطن پونچھ میں واپس آ گئے۔ بظاہر امن و سکون ہو گیا۔ مگر پنڈت جوشی "اخبار کشمیری" کا منہ بند کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ کیونکہ کشمیریوں کا یہی ایک اخبار تھا جس کی آواز دور دور تک پہنچتی تھی اور اثر کرتی تھی۔

ماسٹر صادق علی خاں ان دنوں پونچھ اسلامیہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ

ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے مضامین نظم و نثر" اخبار کشمیری" اور لاہور کے رسالہ "مخزن" میں اکثر شائع ہوتے تھے۔ پنڈت جوشی نے ان کو مجبور کیا کہ فوق صاحب کو خط لکھ کر انھیں تحریک کی حمایت کرنے سے روکیں۔ جب اس خط و کتابت کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ ماسٹر صادق علی خاں کو ساتھ لے کر لاہور پہنچے۔ خود تو پونچھ ہاؤس میں ٹھہرے مگر ماسٹر صاحب کو فوق صاحب کے پاس روانہ کیا کہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دیں کہ وزیر صاحب پونچھ ہاؤس میں آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ مگر فوق صاحب کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے۔ انھیں اخبار کی طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے وزیر صاحب کو ملنے سے انکار کر دیا۔ اس سبکی کو دور کرنے کے لیے پنڈت جوشی نے فوق صاحب اور ان کے" اخبار کشمیری" پر مقدمہ چلانے کے لیے ریذیڈنسی کشمیر سے اجازت طلب کی۔ مقدمہ تو وہ ریذیڈنسی کی اجازت کے بغیر بھی دائر کر سکتے تھے مگر اس میں مصلحت یہ تھی کہ مقدمے کے اخراجات حکومت برداشت کرے۔ ریذیڈنسی نے اخبار کی فائل طلب کی اور دیکھنے کے بعد جواب میں لکھ دیا کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وزیر صاحب اگر ذاتی طور پر مقدمہ چلانا چاہیں تو چلائیں۔ حکومت کو اس میں ملوث ہونے کی ضرورت نہیں۔[۲۷] اس کے بعد وزیر صاحب اپنا سا منہ لے کے رہ گئے اور جن جن لوگوں کو فائدہ پہنچا تھا وہ اخبار کی اہمیت کے قائل ہو گئے۔

۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء سے پیشتر کشمیر کے کسی مسلمان کو ریاست کی طرف سے میڈیکل یا انجینئرنگ وظائف نہیں ملتے تھے۔ فوق صاحب نے" اخبار کشمیری" میں اعداد و شمار دے کر ثابت کیا کہ مسلمانوں کو ان وظائف سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ انھوں نے دیوان بشن داس ہوم منسٹر سے مل کر انھیں قائل کیا کہ مسلمان ہر طرح ان کے اہل ہیں انھیں بھی وظائف ملنے چاہییں۔ چنانچہ اس کے بعد مسلمانوں کو بھی میڈیکل اور انجینئرنگ وظائف ملنے لگے۔ ڈاکٹر ڈھینگرا ان دنوں چیف میڈیکل افسر تھے۔ ان کی بے ضابطگیوں

اور فرعون مزاجیوں کے خلاف بھی چھ ماہ تک مسلسل "اخبار کشمیری" میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ چونکہ تمام شکایتیں درست ہوتی تھیں، اور کوئی ان کی تردید نہیں کر سکتا تھا اس لیے حکومت کو ان کا ازالہ کیے بغیر نہ بنتی تھی، جب حکومت کو "اخبار کشمیری" کی تحریروں کے مبنی بر حق ہونے کا یقین آگیا تو ڈاکٹر ڈھینگرا کو ان کے عہدے سے ہٹا کر ریاست سے رخصت کر دیا گیا۔ یہ "اخبار کشمیری" کی بہت بڑی جیت تھی۔

کشمیر میں زبان اُردو کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی "اخبار کشمیری" نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ یہ جس زمانے میں جاری ہوا تھا، اس کے دفتر میں جتنے خط آتے تھے ان میں سے آدھے خط عربی یا فارسی میں ہوتے تھے۔

قدیم کشمیری اُردو کا ایک خط بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے :

سرینگر کشمیر

۱۷ر جون ۱۹۱۴ء

مکرمی۔ تسلیم

جناب کا نوازش نامہ ملا۔ جواباً قلمی خدمت ہے کہ مخالفاں نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ مخالفت کی نہیں چھوڑی تھی۔ الا خداوند کریم کے عنایت سے ان کا منہ کالا ہو گیا ہے۔ ذیل کی پرچے خصوصیت سے ایک بڑی مخالف نے رئیس کے پاس لا کر اس کو برافروختہ کر ڈالا تھا۔ ۱۴، ۲۱، ۱۸ر مئی۔ آخر جب قومی بہی خواہاں کو خبر ہو گئی، انھوں نے خاص طور پر مجھ کو بلا کر وہ پرچے مجھ سے طلب کی۔ ان میں سے اچھی طرح سے چھان بین ہوا۔ جب کہ ان میں کوئی مضمون خلاف نہ پایا، تو وہی پرچے ٹوپی والا کے پاس لے گئے۔

(خواجہ غلام محی الدین)

ڈاکٹر روشن آرا راؤ اپنے تحقیقی مقالہ "ادبیات اُردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار"

میں لکھتی ہیں :

"یہ وہ زمانہ تھا کہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک بھی گریجوایٹ مسلمان نہیں تھا۔ بلکہ تعلیم صرف پنڈتوں تک محدود تھی۔ مسلمان رعایا کو ہر طرح ذلیل و خوار کیا جا رہا تھا۔ خصوصاً پنجاب کی کوہستانی ریاستوں میں رعایا بہت پریشان تھی۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے اور سیاسی سطح پر انھیں پنڈت کے مقابلے میں لانے کے لیے اپنے رسالوں کے ذریعے فوق صاحب کی خدمات بہت اہم تھیں۔ علم و ادب کی ترویج کے ساتھ معاشرتی اور سماجی خدمات بھی انجام دیں۔ ادب کی وسعت اور ترقی کے لیے بھی ان رسالوں کا دامن بہت وسیع رہا۔"[۲۸]

تیس سال کی لگاتار کوششوں کے بعد اردو زبان نے کشمیر میں یہاں تک ترقی کی کہ اب خال خال کوئی خط فارسی یا عربی میں آتا ہے۔ کشمیر واحد خطہ ہے جس کی قومی زبان اُردو ہے۔ ہندوستان نے اپنے مقبوضات میں ہندی زبان لازمی کر دی ہے۔ مگر مقبوضہ کشمیر میں لازمی زبان اُردو ہے اور اُردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ اس سلسلے میں "اخبار کشمیری" کی تحریروں اور فوق صاحب کی دیگر مطبوعات کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فوق صاحب کی اپنی زبان بڑی سلیس رواں اور شستہ ہوتی تھی، ادائے بیان میں متانت اور بے ساختہ پن بھی ان کی طرز تحریر کی چند نمایاں خصوصیات تھیں۔ مدیر "الناظر" لکھنؤ جب دس بارہ سال کے بعد جون ۱۹۳۵ء میں دوبارہ لاہور آئے تو انھوں نے پنجاب میں اُردو کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک پرچے میں لکھا :

"اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین فوق اور میر غلام بھیک صاحب نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی شاعر ایسا نہ تھا جس کا کلام

زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جس کی انشا صحیح اُردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اس وقت اہلِ پنجاب میں شمار نہیں کیے جاتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے اہلِ قلم ایسے پیدا کر دیے ہیں جن کی نظم و نثر اہلِ زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زبان دانوں کے معیار پر ضرور پوری اترتی ہے اور آثار ظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے احباب کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔"[۲۹]

لاہور کی "انجمن کشمیری مسلمان" اور بعد میں "آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس" اور بیرونجات کی بہت سی کشمیری انجمنوں کا قیام فوق صاحب کی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ بابو غلام حسین صاحب رئیس و میونسپل کمشنر وزیر آباد اپنے ایک خطبہ استقبالیہ میں جو انھوں نے ۱۹۲۶ء کی "مسلم کشمیری کانفرنس" کے اجلاس گوجرانوالہ کے صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے لکھا اور جسے شیخ دین محمد نے پڑھ کر سنایا،

"اس کانفرنس کی بنیاد جس شخص نے رکھی، ان کا نام منشی محمد الدین صاحب فوق ہے۔ ان کے دل میں سچا درد قوم ہے اور وہ ہمیشہ سے قوم کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے "اخبار کشمیری" کو محض قومی مفاد کے لیے مخصوص کر دیا ہوا ہے اور یہ انھی کی جدّوجہد کا ثمرہ ہے کہ آپ اپنی دقتوں اور اپنے بھائیوں کے حقوق کا احساس کرتے ہیں۔ یہ انھی کی کوششوں کا حاصل ہے کہ آپ اس وقت یہاں اجتماع عظیم کیے بیٹھے ہیں۔ مَیں ان کی اس خدمت کا معترف ہوں اور اپنی طرف سے اور اپنے بھائیوں کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان کی بے لَوث خدمات کا احسان کسی طرح فراموش نہیں ہو سکتا۔"[۳۰]

سرینگر (کشمیر) کی انجمن نصرت اسلام، ہمدردِ اسلام اور اسلامیہ ہائی سکول کو بھی "اخبار کشمیری" کے ذریعے بڑا فائدہ پہنچا۔ مسلمانانِ کشمیر سے مسلم اخبارات اور مسلمانانِ پاک و ہند کو جو ہمدردی تھی وہ اسی اخبار کی پیدا کردہ تھی۔ کشمیر سے باہر کے کشمیریوں کو ایک لڑی میں پرونے کا کام بھی اسی اخبار کی آواز نے کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء کی "مسلم کشمیری کانفرنس" کے اجلاس راولپنڈی میں شیخ خان محمد صاحب نے فرمایا:

"ہمارا قومی اخبار (کشمیری) ۱۹۰۶ء سے جاری ہے۔ اس کو بارہ سال کا عرصہ ہو گیا۔ کانفرنس اسی اخبار کی پیدا کردہ ہے اور حقیقتاً وہ اس کی دائی (دایہ) ہے۔ اسی اخبار نے ہمیں کشمیریت کی طاقت بتائی اور ڈھاکہ، پشاور اور لکھنؤ کے قابل کشمیریوں سے ہمارا تعارف کرایا۔ سوائے معدودے چند کے ہماری کسی سے واقفیت نہ تھی۔"[۴۱]

"جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" علی گڑھ کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہوا (۱۹۱۲ء) تو نواب بہادر خواجہ سر سلیم اللہ مرحوم نواب ڈھاکہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"امرتسر وہ مقام ہے جہاں مجھے اپنے آبا و اجداد کے وطن قدیم کشمیر کی خوشبو آتی ہے۔"[۴۲]

اور دوسرے دن جب کشمیری کانفرنس کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے منشی محمد الدین فوق کا نام سنتے ہی فرمایا:

"ہمیں کشمیر کے نزدیک تر لانے والے آپ ہیں۔ آپ ہی نے ہمیں نئے سرے سے کشمیری بنایا اور مسلمانانِ کشمیر کے حالات سے آگاہ کیا ہے۔"

عزت مآب جسٹس سر میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم اور سر میاں محمد شفیع مرحوم جیسے مقتدر اصحاب جب کبھی کشمیر جاتے تھے،

نو "اخبار کشمیری" کی ہر دلعزیزی اور اس کی آواز کی تاثیر دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور فوق صاحب کو اپنے مفید مشوروں سے ہمیشہ مستفید فرمایا کرتے تھے۔

میاں محمد شفیع، بیرسٹرایٹ لاء لاہور، جو بعد میں خان بہادر اور سر کے خطابات پا کر وائسریگل کونسل کے رکن بھی رہے اور پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ اپنے ۳۰ر نومبر ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں فوق صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

مکرمی فوق صاحب۔

السلام علیکم!

نوازش نامہ مورخہ ۲۲، ماہ حال کا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ میں نے جو کچھ مسلمانان کشمیر کے لیے کیا ہے اور کر رہا ہوں، وہ محض میرا فرض ہے۔ میں اس کے لیے اپنے آپ کو کسی شکریے کا مستحق نہیں پاتا۔ (اخبار) "کشمیری" کا مضمون میں نے نہایت شوق سے پڑھا ہے۔ یہ اخبار باشندگان کشمیر اور بالخصوص مسلمانان کشمیر کے لیے بے حد مفید ہے۔

نیازمند

۳۰ر نومبر ۱۹۱۹ء محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء لاہور

اکتوبر ۱۹۱۶ء میں جب "مسلم کشمیری کانفرنس" کا سالانہ اجلاس جہلم میں زیر صدارت خان بہادر خواجہ اللہ بخش خاں مرحوم اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ منعقد ہوا تو منشی عطا محمد بی اے ایل ایل بی پلیڈر و پبلک پراسیکیوٹر گجرات نے "اخبار کشمیری" کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ قوم اس اخبار کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس کے لیے دس ہزار روپیہ کا مستقل سرمایہ جمع کرے۔ آپ نے یہ تحریک پیش کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی:

"کشمیری کانفرنس کا بانی کئی حضرات کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اصل یہ

ہے کہ اس کا بانی "کشمیری میگزین" ہے، جس نے قومی آواز کو دُور دُور تک پہنچایا، سوتے ہوؤں کو جگایا اور جو جاگتے تھے ان کو قومی ضروریات اور قومی جذبات سے آگاہ کیا۔ قوم کی پستی کے اسباب دُور کرنے کی تدابیر اسی اخبار نے بتائیں۔ کشمیر کے حکام آج سے کچھ عرصہ پیشتر رعایا کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے۔ اس اخبار نے ان کی توجہ اس طرف منعطف کی...... مُسلمانانِ کشمیر کی خدمت ہمارے اس قومی اخبار نے کی ہے اس سے بہت اچھے اور ہمت افزا نتائج نکلے ہیں۔ ان لوگوں کو اخبارات اور زمانہ کی رفتار سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ مگر اس میگزین نے ان کے دِلوں میں بھی اخبارات کی وقعت قائم کر دی ہے۔"[۳۳]

شیخ حسام الدین جنرل سیکرٹری "انجمن کشمیری مسلمانان" امرتسر نے اس تحریک کی حمایت کی اور خواجہ عبدالصمد ککڑو رئیس بارہ مولا کشمیر نے تائید مزید کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ کا اضافہ کیا:

"یہ اخبار نہ صرف سلطنت کے لیے مُفید ہے بلکہ رعایائے کشمیر کا حقیقی لیڈر اور رہبر بھی ہے۔ اس اخبار کے ذریعے جس قدر فوائد رعایائے کشمیر اور بالخصوص زمینداران کشمیر کو پہنچ رہے ہیں افسوس کہ اس کا احساس یہاں کے لوگوں کو نہیں رہا۔ کشمیر کے لوگوں کو بیدار کرنے، مطالبہ حقوق اور شکایات کے لیے لَب کشائی کرنے اور ان کو ہوا کا رُخ بتانے کی ودیعت کا سہرا اسی اخبار کے سر ہے، جس کے ایڈیٹر منشی محمد الدین صاحب فوق ہیں اور جن کے نام سے کشمیر کا بچہ بچہ واقف ہے۔"

خواجہ عبدالصمد ککڑو نے اس اخبار کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر اپنی اور اپنے احباب کی طرف سے ایک سو روپیہ کی رقم پیش کی کچھ رقمیں بعد میں وصول

ہوئیں۔لیکن افسوس کہ قوم کی بے حسی اور بے مائیگی سے دس ہزار روپیہ کا سرمایہ جمع نہ ہوسکا اور ۱۹۳۴ء تک پُورے اٹھائیس برس تک یہ اخبار فوق صاحب کی تن تنہا جانفشانیوں سے چلتا رہا۔جب کشمیر کے لوگ جاگ اٹھے تو انھیں اصلاحات مل گئیں اور کشمیر میں اخبار جاری کرنے کی اجازت مل گئی اخبار نکلنے شروع ہو گئے۔ تو اخبار کشمیری بند ہو گیا۔اس طرح ان کا یہ خیال بھی درست ثابت ہُوا۔

پھونکتا رہتا ہُوں اس محفل میں بیداری کا صُور
ایک دِن میری نوا ہوگی اثر پیرا ! ضرور
خود بخود خامش دِل نالہ سرا ہو جائے گا
جب وطن میرا سکوں سے آشنا ہو جائے گا

"اخبار کشمیری" کی حکمت عملی ہمیشہ متوازن رہی۔تعمیری کاموں کی طرف توجہ دی گئی۔مذہب و عقائد کے حوالے سے کسی گروہ کو تنقید کا نشانہ نہ بنایا۔عمر بھر فلاح و بہبُود کے کاموں سے سروکار رکھا یہ اخبار معاشرے میں تعلیم کو عام کرنے اور قوم میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک مؤثر ادارے کی حیثیت سے کام کرتا رہا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں عام لوگ ترقی کریں۔ان میں اعلیٰ ظرفی پیدا ہو۔یہ توقعات فوق کی زندگی ہی میں پُوری ہوگئیں، فوق صاحب کے بڑھاپے، بیماری کے علاوہ دوسری مصروفیات کی وجہ سے یہ اخبار بھی ان کی زندگی ہی میں بند ہو گیا۔

پروفیسر مسکین حجازی صدر شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی اپنے تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی میں لکھتے ہیں:

"اس جریدے نے علم و ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور سماجی خدمت کے میدان میں نمایاں کام کیا۔"[۱۴۷]

رسالہ "طریقت" کا اجراء

اگست ۱۹۱۴ء میں علامہ اقبال کے مشورے سے فوق صاحب نے ایک ماہنامہ "طریقت" جاری کیا۔ مقصد فرقہ صوفیاء کی اصلاح اور تصوف کی خدمت تھا۔ پہلا پرچہ اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں حضرت احسان شاہجہان پوری، حضرت اکبر الہ آبادی، خواجہ حسن نظامی دہلوی، خان احمد حسین خاں (مدیر شباب اردو لاہور)، مہاراجہ سرکشن پرشاد، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی جیسے نامور مشہور ادیبوں کی تحریروں کے علاوہ ایک دلچسپ انٹرویو بھی تھا، جو علامہ اقبال کے ساتھ فوق نے کیا تھا۔ فوق صاحب نے اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ انھوں نے پرچے کی اشاعت سے پہلے علامہ صاحب کے پاس حاضر ہو کر اہل تصوف کے کچھ معاملات کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کیے تھے، اقبال کے ارشادات لکھ لیے تھے اور اقبال کی اجازت کے بعد رسالہ میں شائع کر دیے تھے۔ اقبال نے اپنے جوابات میں بڑی معرفت کی باتیں کیں۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنے مضمون "اقبال اور مسلک تصوف" (یہ ان کی کتاب کا نام بھی ہے) میں اس انٹرویو کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے فوق کے سوالوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ان کی علمی بصیرت کو سراہا ہے۔ ان کے ہر سوال اور علامہ کے جواب کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میں سمجھتا ہوں اس مکالمہ یا سوال و جواب سے تصوف اور صوفیہ کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار و خیالات اور ان کی رائے کا کسی قدر مکمل اندازہ ہو جاتا ہے۔" [۳۵]

رسالہ "طریقت" کا علمی اور ادبی مقام بہت اہم تھا۔ ہر جگہ اسے ہاتھوں ہاتھ

لیا جاتا تھا۔ صوفیا کے حلقوں میں یہ بہت مقبول تھا۔ علی پور شریف، آلو مہار شریف، اعوان شریف، جلال پور شریف، چشتیاں، تونسہ شریف اور کئی دوسری درگاہوں میں اسے خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ عام لوگوں کے علاوہ ہندو بھی اچھی خاصی تعداد میں اس کا مطالعہ کرتے تھے چار پانچ سال تک یہ رسالہ بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ اور اس کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی جو ایک عظیم کامیابی تھی۔ فوق صاحب صوفیاء کی مجلسوں میں بلائے جانے لگے۔ فوق صاحب کی ان خدمات کا اعتراف اس طرح کیا گیا ہے۔

"ڈیئر فوق !

اب تو آپ "پیر طریقت" بھی بن گئے۔ خدا کرے جلد حافظ پیر جماعت علی شاہ صاحب (علی پور) کی طرح آپ کے ورود سے کشمیر کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں۔

والسّلام

آپ کا خادم

محمّد اقبال

۲۳۔ جولائی ۱۹۱۵ء ؎۳۶

عبداللہ قریشی لکھتے ہیں :

"خواجہ حسن نظامی دہلوی ہر سال بعض آدمیوں کو کسی علمی کارگزاری، انسانی خدمت یا خلوص قلب کے صلے میں خطابات دیا کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۵ء (۱۳۳۳ھ) کے "طریقت" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال انھوں نے علامہ اقبال کو "سر الوصال" کا اور منشی محمّد الدین فوق کو "وحدتی" کا خطاب عطا کیا۔ یہ انہی خدمات کے اعتراف میں تھا جو

وہ "طریقت" کے ذریعے اسلام، تصوف اور صوفیوں کی کر رہے تھے"۔[۳۷]

انہی دنوں علامہ اقبال کی پہلی فارسی مثنوی اسرار خودی شائع ہوئی جس میں خودی کے فلسفے کی قدرتوں کی بدولت علمی حلقوں میں بہت چرچا ہوا۔ اقبال نے تصوف کے عجمی تصور کو اپنے مخصوص شاعرانہ دبدبے سے ہدفِ تنقید بنایا اور مسلمانوں کو بے عملی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے پر زور دیا۔ اس پر صوفیاء کا ایک گروہ سخت برافروختہ ہوا اور اقبال کی مخالفت کرنے لگا۔ اقبال نے اپنے مؤقف کی وضاحت میں کئی مضامین لکھے جو اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع ہوئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء کے اخبار "وکیل" میں اقبال کا جو مضمون "اسرار خودی اور تصوف" کے عنوان سے شائع ہوا، اس کا ایک حصہ فوق صاحب کے انٹرویو کے حوالے سے تھا، اس لیے ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

"میرے دوست منشی محمد الدین فوق ایڈیٹر "اخبار کشمیری" اور "طریقت" نے مجھ سے سوال کیا کہ تم نے حافظ پر کیوں اعتراض کیا ہے؟ وہ رسالہ طریقت کے ایڈیٹر ہیں، اس حیثیت سے ان کو تصوف میں دلچسپی ہے۔ اس وقت فرصت کم تھی اور چونکہ مضمون طویل تھا، میں نے ان کو کوئی جواب نہ دیا، عام مسائل تصوف پر گفتگو کرتا رہا۔ بعد میں انھوں نے اپنی تصنیف "وجدانی نشتر" نام میرے دیکھنے کے لیے ارسال فرمائی تو معلوم ہوا کہ ان کے سوال کا جواب ان کی تصنیف میں موجود ہے۔ صفحہ ۹۴ پر مصنف لکھتے ہیں ــــ "اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے، جو بڑا متشدد بادشاہ تھا، ایک مرتبہ حکم دیا کہ اتنی مدت کے اندر جتنی طوائفیں ہیں، سب نکاح کرلیں، ورنہ کشتی میں بھر کر سب کو دریا برد کر دوں گا۔ سینکڑوں نکاح ہو گئے مگر پھر بھی ایک بڑی تعداد رہ گئی۔ چنانچہ ان کے ڈبونے کے لیے کشتیاں

تیار ہوئیں اور صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ یہ زمانہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تھا۔ ایک حسین نوجوان طوائف روزمرہ آپ کے سلام کو آیا کرتی تھی۔ آپ ورد و وظائف سے فارغ ہوئے، وہ طوائف سامنے آکر دست بستہ کھڑی ہو جاتی۔ جب آپ نظر اُٹھاتے وہ سلام کر کے چلی جاتی۔ آج جو وہ آئی تو بعد سلام عرض رساں ہوئی کہ آج خادمہ کا آخری سلام قبول ہو۔ آپ نے حقیقت دریافت فرمائی۔ جب تمام کیفیت بیان کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ شیرازی کا یہ شعر:

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تم سب یاد کر لو اور کل جب تمہیں دریا کی طرف لے چلیں تو بآواز بلند اس شعر کو پڑھتی جاؤ۔ ان سب طوائفوں نے اس شعر کو یاد کر لیا جب روانہ ہوئیں، تو یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے درد انگیز لہجے میں اس شعر کو پڑھنا شروع کیا، جس نے یہ شعر سُنا دل تھام کر رہ گیا۔ جب بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ حکم دیا سب کو چھوڑ دو۔"

منشی محمد الدین فوق کو معلوم ہو کہ جو ان کے نزدیک حافظ کا حسن ہے، وہی میرے نقطہ نظر سے قبح ہے اور وہ یہ کہ مسئلہ تقدیر کی ایک غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو جو آئین حقہ شرعیہ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا، قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانین اسلامیہ

کی تعمیل کرانے کی ہمت نہ رہی۔ اور اگر عالمگیر، دارا کے معاملے میں بھی "بادشمناں مدارا" پر عمل کرتا تو ہندوستان میں شریعت اسلامیہ کی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی۔

مجھے اُمید ہے کہ اس تحریر سے آپ ناظرین کو میرا نقطۂ نظر سمجھنے میں مدد ملے گی اور وہ اسی اعتبار سے اسلامی ادبیات کا مطالعہ کرکے اپنے نتائج خود پیدا کریں گے۔" [۳۸]

اقبال کے نہایت قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اہل طریقت فوق صاحب سے بھی بدگماں ہوگئے اور انھوں نے رسالے میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ خریدار کم ہوگئے تو پرچے کی جان پر بن آئی۔ اور یہ رسالہ ترقی کی منزلیں طے کرنے کے بعد بالآخر بند ہوگیا۔ اس کی بندش سے اقبال بہت افسردہ ہوئے۔

رسالہ "نظام"

اس کے فوراً بعد فوق صاحب نے اسی طرز کا ایک اور رسالہ جاری کر دیا۔ اس کا نام "نظام" تھا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں اس کے پہلے پرچے میں اقبال کی ایک نظم "مکافات عمل" شائع ہوئی۔

ہر عمل کے لیے ہے ردِ عمل — دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شبر سے آسمان لیتا ہے — انتقام غزالی و اشتر و میش
سرگزشت جہاں کا سر خفی — کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش

شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بہ روغن خویش [۳۹]

یہ اشعار علامہ اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

فوق صاحب نے رسالہ "نظام" پہلے رسالہ "طریقت" کے انداز پر چلانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوسکی اور یہ رسالہ چند ہی ماہ بعد بند ہوگیا۔

اخبار "کشمیر جدید"

۱۹۰۶ء میں جب فوق صاحب نے "کشمیری میگزین" جاری کیا تھا تو ان کا ارادہ تھا کہ اسے سرینگر کشمیر سے شائع کیا جائے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے اجازت بھی طلب کی۔ آپ نے ۱۱ر جولائی ۱۹۰۷ء کو اپنی درخواست میں لکھا:

"اس سوشل اور قومی رسالہ کو پولیٹیکل اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اس کے متعلق کبھی ایک حرف بھی نہ لکھا جائے گا۔" [۱۳۹]

مگر اس کے باوجود مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے یہ درخواست نامنظور کر دی اور لکھا:

"میں موجودہ وقت میں اس اخبار کو کشمیر سے شائع کرنے کی اجازت دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ دریں اثنا ہائی کورٹ کے جج کو خفیہ ہدایت دی جائے کہ وہ ریاست میں چھاپہ خانہ لگانے اور اخبار جاری کرنے کے متعلق ایک قانون کا مسودہ وضع کرے جس میں تمام ایسی پابندیاں لگائی جائیں اور پیش بندیاں کی جائیں کہ آزادی تحریر کے ناجائز استعمال کا احتمال نہ رہے ——

مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۰۷ء" [۱۴۰]

جب فوق صاحب کشمیری میگزین کو ماہوار سے ہفتہ وار کرنے لگے تو اس وقت بھی انھوں نے حکومت کشمیر سے اسے سرینگر سے جاری کرنے کی اجازت چاہی مگر اب کے بھی ان کی درخواست کا وہی حشر ہوا بلکہ کہا گیا کہ حکومت کشمیر اخبار کا نام بھی

سننا نہیں چاہتی۔ جب گلانسی کمیشن کی سفارشات کے مطابق والیٔ کشمیر نے ریاست میں تحریر و تقریر کی آزادی دے کر ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور ۱۹۳۳ء میں انھوں نے اپنا آخری ہفتہ وار اخبار "کشمیر جدید" سرینگر (کشمیر) سے شائع کرنا شروع کیا۔ مگر اس اخبار میں وہ باقاعدگی پیدا نہ ہو سکی جو "اخبار کشمیری" میں ہوا کرتی تھی۔ چونکہ فوق صاحب سردیوں میں لاہور آجاتے تھے، اس لیے اتنا عرصہ اخبار "کشمیر جدید" بند رہتا تھا مگر میوں میں جب وہ سرینگر پہنچ جاتے تو اخبار کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ ہر پرچہ فوق صاحب بڑی محنت سے خود مرتب کرتے۔

ان کے دوست پروفیسر محمد علم الدین سالک اور مولانا محمد عبداللہ قریشی کشمیر آجاتے تو وہ بھی تھوڑی بہت مدد کر دیتے۔ اس طرح کچھ دن رونق رہتی۔

۱۹۳۴ء میں جب ریاست میں پہلی بار مجلس آئین ساز بنائی گئی تو اس وقت اس کا نام لیجسلیٹو اسمبلی مشتہر کیا گیا مگر چند ہی دن بعد اس کا نام تبدیل کر کے "پرجا سبھا" رکھ دیا گیا۔ فوق صاحب ۷۔ نومبر ۱۹۳۴ء کے "کشمیر جدید" میں پرجا سبھا کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک دلچسپ مضمون میں لکھتے ہیں۔ موجودہ زمانے کی اسمبلیوں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں۔

"پرجا سبھا کیا ہے؟"

سرکاری نقطۂ خیال سے:

نعمت خداوندی۔ عطیہ سرکار والا مدار رعایا تے ریاست کے جذبات کا احساس۔ عوام کی سیاسی خواہشات کی تکمیل۔ جائز مطالبات کا احترام۔ حصول جمہوریت کی منزل اول۔

پبلک نقطۂ خیال سے:

ست بچنیوں اور جی حضوریوں کا پولیٹکل مندر۔ مفیدِ ملک قراردادوں کی مخالفت کر کے اظہارِ وفاداری کا ذریعہ۔ خطابات کی تمناؤں کا مخزن، ووٹنگ مشین۔ ہاں میں، ہاں ملانے اور آمنّا وصدقنا کہنے والوں کی سیاسی قیام گاہ۔ لوگوں میں عزت افزائی کا آلہ۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ملازم کرانے کا ڈپلومہ۔ سیاسی چال گھر۔ پولیٹکل قلابازیوں کا اکھاڑہ پنچوں کا کہنا سر ماتھے پر لیکن پرنالہ وہیں رکھنا۔ رعایا کی طفل تسلی۔ شورش پسندوں اور احراریوں کی اشک شوئی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی جدوجہد کا قابلِ فخر نتیجہ۔ حکومت کے عیوب ونقائص کا آئینہ۔ فوج اور پولیس اور صرف کار کے اخراجات کی پردہ پوشی۔ سرکاری وغیر سرکاری ممبروں کے بخارات نکالنے کا سنگم۔ قوم پرستوں، فرقہ پرستوں اور سرکار پرستوں کی جائے اتصال۔ فرقہ وارانہ تنازعات اور مطالبات کی جائے پیدائش۔ وزرائے ریاست کی قوت بیانیہ اور انتظامی قابلیتوں اور رعایا نوازیوں کی کسوٹی۔ شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی اُمیدوں کی آخری خواب گاہ۔ دو مرغ جنگ کنند فائدہ شیر کشمیر۔ رعایا کی وہ مجلس جس کے نام کے ساتھ مفوضہ کام ظاہر نہیں۔ مجلس قانون ساز کا ادھورا نام۔" ؎۴۲

چونکہ یہ سبھا نئی نئی بنی تھی اور اس کے تمام ممبر پہلی مرتبہ منتخب ہو کر آئے تھے اور وہ قانون سازی کے کاموں کا تجربہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان سے کئی قسم کی بدحواسیاں اور مضحکہ خیزیاں سرزد ہوئیں۔ فوق صاحب نے ان میں سے بعض کی شخصیتوں کو سامنے رکھ کر ایسے مضامین لکھے کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔

اخبار "کشمیر جدید" کے اجرا پر مولوی مُفتی قوام الدین مفتی اعظم کشمیر اور مولانا سیماب اکبر آبادی نے خیر مقدم کے طور پر چند اشعار لکھے تھے۔ مفتی صاحب کی نظم تو فارسی

میں تھی لیکن مولانا سیماب کے اشعار یہ ہیں :

ہو مبارک تجھ کو اے کشمیر یہ دورِ جدید
پھر ترے ذروں سے ہے فردوس تازہ کی کشید
پھر شرابِ تیز لے کر ساقیٔ نو آ گیا
پھر فضا میں گونج اٹھا نعرہ ھل من مزید
آ گئے پھر گوہرِ معنی لٹانے کے لیے
فوق کشمیری حریمِ ذوق کی لے کر کلید
خدمت کشمیر کی ہو جس نے اٹھائیس سال
جس کی رگ رگ میں نہاں ہو قوم کا دردِ شدید
ہر صدا پر اس کی تجھ کو رقص کرنا چاہیے
دل بڑھانا چاہیئے اس کا علیٰ قدرِ اُمید
باغ افسردہ کرے احساس قدر باغباں
پھوٹ نکلے گی کہیں سے پھر بہارِ ناپدید
مژدہ باد اے بادہ نوشاں بارک اللہ الحمید
موسمِ گل با مئے و پیمانہ و ساقی رسید

یہ اخبار آزاد خیال تھا۔ اس کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے یہ تین چار سال اپنی بہار دکھا کر خود بخود ختم ہو گیا۔ مستقل خریدار تو ویسے ہی کم تھے۔ پھر فوق صاحب سردیوں میں لاہور آ جاتے تھے۔ اس کا اثر بھی پڑتا تھا، اس کو مزید ناکام بنانے میں مقامی اخباروں کے مالکوں کا بھی ہاتھ تھا۔ جنھوں نے ہاکروں کو یہ اخبار بیچنے سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے فوق صاحب نے اسے بند ہی کر دیا۔

بیسویں صدی کے نصف تک اُردو اخبار نویسی کا جو منظر نامہ بنتا ہے۔ اس میں

فوق صاحب کا کام بہت اہم، مؤثر اور مفید ہے۔ انھوں نے اگرچہ زیادہ زور کشمیر کے معاملات و مسائل پر دیا۔ لیکن اس کے اثرات برصغیر کی صحافت کی مجموعی صورتحال پر ظاہر ہوئے۔ اُنھوں نے مسلسل محنت کے بعد جو کامیابیاں حاصل کیں۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ کسی ایک علاقے کی نمائندگی کرتے ہوئے بھی کوئی آدمی قومی سطح کا اخبار نویس بن سکتا ہے۔ فوق صاحب اخبار نویسی کی فطری صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جسے ان کے ذوق و شوق نے چار چاند لگا دیے۔ ایک ممتاز صحافی اور ادیب سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

"فوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندئ وضع کا پایہ اتنا بلند تھا۔ کہ اگر وہ کشمیر سے نکل کر اپنے محدود دائرہ عمل کو وسعت دیتے تو ہندوستان کے بہترین اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں وطنی تاریخ کی تدوین کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا۔ کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا نعم البدل دستیاب ہونا مشکل ہے۔" [۴۴]

سید قاسم محمود کی اس رائے میں صداقت ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں اس وقت کے کشمیر کے سماجی حالات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ فوق نے ایک خطے کے حوالے سے صحافت کی مگر قومی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ فوق صاحب نے کشمیر کے تعارف کے لیے اور اس کی آزادی کے لیے جو کام کیا ہے۔ وہ ایک ایسے بلند پایہ انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ کہ تاریخ صحافت میں انھیں نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ ان کے لیے شاعر مشرق علامہ اقبال کا اعتراف کوئی کم بڑی دلیل نہیں۔ خود سید قاسم محمود نے بھی یہ اعتراف کیا ہے:

وہ لکھتے ہیں۔

"منشی صاحب ایک نامور صحافی، ادیب، مؤرخ اور شاعر ہونے کی حیثیت

سے اپنے پیچھے اتنے کارنامے چھوڑ گئے ہیں کہ دُنیا انھیں بھلا نہیں سکتی۔ ان کی تصانیف ہمارے اَدب کا قیمتی سرمایہ ہیں"۔[۴۵]

تحریک حریت کشمیر میں اُردو صحافت کے کردار کے ضمن میں فوق کی خدمات کا اعتراف شیخ محمد عبداللہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے اپنی آواز بلند کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس آواز کی نشر و اشاعت کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں۔ لیکن اس زمانے میں تحریر و تقریر کی آزادی ایک خیالی چیز کے برابر تھی۔ ریاست کے مُسلمانوں کا کوئی اخبار شائع نہ ہوتا تھا۔ لاہور سے کچھ ایسے اخبارات بھی شائع ہوتے تھے جن کے مدیر مسلمان تھے لیکن اگر وہ کشمیر کے بارے میں ذرا سا مُنہ کھولتے تو ان کا ریاست میں داخلہ بند کر دیا جاتا۔ ایک کشمیری نژاد بزرگ محمّدالدین فوق جنھوں نے بعد میں کشمیر کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھ کر خاصا نام کمایا۔ ہفتہ وار اخبار لاہور سے نکالا کرتے تھے۔ جو کشمیری مُسلمانوں کا ترجمان بن گیا"[۴۶]

حوالہ جات (پانچواں باب)

۵ فوق، مآثر لاہور۔ بحوالہ "نقوش" لاہور نمبر، ص: ۵۶۲۔

۶ "شاعر کشمیر"، ص: ۹۔ "تاریخ اقوام کشمیر" جلد سوم، ص: ۲۶۵۔

۷ سید رفیق مارہروی، "زبان داغ"، لکھنؤ: لانوش بک ڈپو، طبع اول ۱۹۵۵ء، ص: ۲۳۶۔

۸ امداد صابری، "تاریخ صحافت اردو"، جلد چہارم، ۱۹۷۰ء، دہلی: جمال پریس، ص: ۱۵۳۔

۹ محمد عبداللہ قریشی: "پنجہ فولاد اور اقبال" مجلہ "اقبال" اپریل ۱۹۸۲ء، ص: ۴

"تاریخ اقوام کشمیر" جلد سوم، لاہور: ظفر برادرس، ۱۹۴۶ء ص: ۲۶۶۔

۱۰۔ "باقیات اقبال"، صفحات: ۹۴-۹۶۔

۱۱۔ "سرگزشت فوق" (قلمی) ص: ۳۱۔

۱۲۔ "اخبار نویسوں کے حالات"، ص: ۵۵۔

۱۳۔ عبدالسلام خورشید، "صحافت پاک و ہند میں" لاہور: مکتبہ کارواں،
طبع دوم، ۱۹۶۷ء، ص: ۵۰۳۔

۱۴۔ "شیرازہ" سرینگر (کشمیر) فوق نمبر، صفحات ۱۲-۱۳۔

۱۵۔ "تاریخ صحافت اُردو"، جلد چہارم، ص: ۵۵۴۔

۱۶۔ "کشمیری میگزین" لاہور۔ جنوری ۱۹۰۹ء۔

۱۷۔ رپورٹ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۸ء۔

۱۸۔ "کشمیری میگزین"، مارچ ۱۹۰۹ء

۱۹۔ "کشمیری میگزین"، جون ۱۹۰۹ء

۲۰۔ "کلام فوق"، طبع دوم، ص: ۱۶۳-۱۶۴۔

۲۱۔ مجلہ "اقبال"، ماہ اپریل ۱۹۸۳ء، ص: ۳۹۔

۲۲۔ "تاریخ صحافت اُردو"، جلد چہارم۔ صفحات ۵۵۵، ۵۵۶۔

۲۳۔ "سرگزشت فوق"، ص: ۶۴۔

۲۴۔ اخبار "مساوات"، الہ آباد: ۲۴ جون ۱۹۱۵ء۔

۲۵۔ "الفضل" قادیان، ۲۹۔ جون ۱۹۱۵ء۔

۲۶۔ "سرگزشت فوق"، ص: ۷۶۔

۲۷۔ "سرگزشت فوق"، ص: ۵۵۔

۲۸۔ ڈاکٹر روشن آراء راؤ، ادبیات اُردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار"،

تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی، پنجاب یونیورسٹی (۲۵ جولائی ۱۹۷۵ء) ص: ۱۷۱۔

۲۹۔ ماخوذ از "نیرنگ خیال" لاہور ماہ اگست، ۱۹۳۵ء۔

۳۰۔ خطبۂ استقبالیہ "مسلم کشمیری کانفرنس" گوجرانوالہ۔ ۱۹۲۶ء۔

۳۱۔ روئداد "مسلم کشمیری کانفرنس"۔ ۱۹۱۸ء۔

۳۲۔ روئداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ امرتسر، ۱۹۰۸ء۔

۳۳۔ روئداد مسلم کشمیری کانفرنس منعقدہ جہلم، اکتوبر۔ ۱۹۱۶ء۔

۳۴۔ پنجاب میں اردو اخبار نویسی"۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور: صفحہ: ۳۰۳۔

۳۵۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: "اقبال اور مسلک تصوف"۔ لاہور: اقبال اکادمی، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء۔ ص: ۳۱۸۔

۳۶۔ "نقوش"، لاہور، مکاتیب نمبر جلد اوّل۔ ص: ۲۹۴۔

۳۷۔ "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"۔ ص: ۲۹۳۔

۳۸۔ اخبار "وکیل" امرتسر، ۱۵؍ جنوری ۱۹۱۶ء

۳۹۔ "باقیات اقبال"، ص: ۲۲۰۔

۴۰۔ محکمہ آرکیوز کے فائل نمبر ۵۔ پی / ۱۹۰۴۔۱۱ میں موجود ہے۔ بحوالہ "شیرازہ" سرینگر فوق نمبر، ص: ۲۴۔

۴۱۔ "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، ص: ۳۰۲۔

۴۲۔ "شیرازہ"، سرینگر (فوق نمبر) ص: ۳۴۔۳۵۔

۴۳۔ بیاض مولانا عبداللہ قریشی۔

۴۴۔ "اسلامی انسائیکلو پیڈیا"، ص: ۱۲۰۴۔

۴۵۔ "اسلامی انسائیکلو پیڈیا"، طبع اوّل، ص: ۱۲۰۴۔

۴۶۔ "آتش چنار"، طبع اوّل، صفحہ: ۵۵۔

فوق اور تحریکِ حُرّیتِ کشمیر

باب ۶

فوق اور تحریکِ حریتِ کشمیر

کشمیر میں انگریزوں کے باجگزار راجوں کے خلاف مسلمان آزادی کے لیے تڑپتے رہے۔ یہ برصغیر میں مسلمانوں کی آزادی کے پہلے نشانات میں سے ایک ہے۔ تحریک حریتِ کشمیر ایک طرح سے تحریکِ پاکستان کا دیباچہ ہے۔ تحریکِ حریتِ کشمیر ابھی جاری ہے تحریک پاکستان بھی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ پاکستان کشمیر کے بغیر نامکمل ہے۔

منشی محمد الدین فوق کو اپنے کشمیری ہونے پر ناز تھا۔ ان سے قبل کشمیری اپنے آپ کو کشمیری کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ فوق صاحب نے کشمیری کے لفظ کو اتنی عزت دی کہ اب ان کی تقلید میں ہر کشمیری اپنے نام کے ساتھ "کاشمیری" لکھنا باعث عزت سمجھتا ہے۔ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈھاکہ سے لکھتے ہیں:

"حضرت فوق! دعویداران جذبات کشمیریت شاید بہت ہیں مگر آپ نے سارے ہندوستان کو کشمیر کی طرف متوجہ کر کے کشمیر کی خدمت کی ہے کہ جب تک کشمیریوں میں احساس امتنان ہے وہ اس کو فراموش نہیں کریں گے۔ آپ نے اردو زبان میں کشمیر کے متعلق اتنا کثیر لٹریچر جمع کر دیا ہے اور مشاہیر کشمیر کو اس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا ہے کہ انتظ

کشمیری کل کی بات ہے لوگوں کی نظروں میں بُرا لفظ تھا اور خود کشمیری کہلانے سے احتراز کرتے تھے اور آج فخر یہ کشمیری کہلاتے ہیں۔"[1]

فوق صاحب کے دادا حسن ڈار افغانوں کے ظلم سے تنگ آکر کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور سیالکوٹ کے ضلع میں آباد ہوئے مگر فوق صاحب ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو کشمیر کے عظیم ماضی کا وارث خیال کرنے لگے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ ان کے ایمان کی نشانی ہے، جس کا کچھ حصّہ قدرت نے حبِّ وطن میں ودیعت کر رکھا ہے۔ ان کے حقیقی چچا منشی غلام محمد خادم نے تو پنجاب کے علاوہ خانقاہ ڈوگراں میں کوٹ غلام محمد آباد کرنے کے بعد کشمیر کو ایک بار پھر اپنا مستقل وطن بنالیا۔ انھوں نے اپنے آبائی گاؤں ہردوشیوہ (علاقہ زنگیر) میں مزارعہ اراضی خرید کر بہت بڑا زمیندارہ قائم کیا اور اس کو اتنی ترقی دی کہ اپنے علاقے کے ذیلدار اور سفید پوش بنا دیے گئے۔ انھوں نے ایک بہت بڑا باغ بھی احداث کیا، جس میں اعلیٰ درجہ کے پھل دار درخت لگائے۔ ان کا بڑا صاحبزادہ عبداللہ ڈار اب تک وہیں ان کی جانشینی کا حق ادا کر رہا ہے۔[2]

فوق صاحب کے والد منشی لدھا خاں کی عمر کا بیشتر حصہ جموں اور پونچھ (کشمیر) کی ملازمت میں گزرا۔ خود فوق صاحب اور ان کے بڑے بھائی رحیم بخش شیدا نے بھی کشمیر میں زمین خرید کر وہاں مکان بنانے شروع کر دیے تھے مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اس طرح ان کا پورا خاندان تیسری ہی پشت میں جہاں سے آیا تھا پھر وہیں پہنچ گیا اور پہلے سے بہتر حالت میں مگر ایک بات ضرور ہوئی کہ فوق اور ان کے چچا منشی غلام محمد خادم اپنے اہل وطن کی پسماندگی اور خستہ حالی دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی خدمات کشمیر اور کشمیریوں کے لیے وقف کر دیں۔ مولانا سیماب اکبرآبادی نے فوق صاحب کے بارے میں بالکل درست فرمایا ہے:

والہانہ عشق ہے کشمیر سے
رُوح زخمی ہے وطن کے تیر سے [۲۸]

فوق صاحب اگر چاہتے اور یہ ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ حاکمان وقت سے مراعات حاصل کر کے اپنی جھولیاں سیم و زر سے بھر لیتے لیکن انھوں نے مظلوموں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور اپنے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے ذریعے، نیز انجمن کشمیری مسلماناں اور مسلم کشمیری کانفرنس کے ذریعے اہل خطہ کی بھرپور خدمت کی۔ انھوں نے جب کشمیر میں جا کر ہر جگہ ہندو گردی دیکھی اور:

ہر محکمے کو پایا مسلمان سے خالی
گو دیکھا مسلمان کو پنڈت سے زیادہ [۲۹]

انھوں نے کشمیریوں اور بالخصوص مسلمان کشمیریوں کی تعلیمی پستی، اخلاقی گراوٹ اور معاشی بدحالی دور کرنے کے لیے ہر میدان میں ان کی رہنمائی کی، ان کو ترقی کے لیے ابھارا اور دوسری قوموں کے دوش بدوش کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ مقتدر کشمیریوں نے فوق صاحب کی کوششوں کو سراہا۔ ان کی خدمات کی تعریف کی۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں "مجدد کشامرہ" کہا اور فرمایا کہ آپ کے قلم کے زور سے کشمیری باشندوں اور بالخصوص مسلمانوں میں روح بیداری پیدا ہو گئی تو یہی خدمت آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔[۳۰] فوق صاحب کو اس کا احساس تھا۔ وہ کہتے تھے:

پھونکتا رہتا ہوں اس محفل میں بیداری کا صور
ایک دن میری نوا ہو گی اثر پیرا ضرور
خود بخود خاموش دل نالہ سرا ہو جائے گا
جب وطن میرا سکوں سے آشنا ہو جائے گا

علامہ صاحب ۸۔ جون ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف آرٹیکل لکھ کر آپ نے مسلمانوں اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔"[۶]

مشہور عالم دین مولانا عبد الحق قاسمی نے علامہ صاحب کی تائید میں لکھتے ہیں:

"فوق مرحوم نے اپنے مشہور و مقبول اخباروں اور تصانیف کے ذریعے کشمیر اور کشمیریوں کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی بنا پر ان کو "محسن کشمیر" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ علامہ اقبال نے ان کو بار بار خراج تحسین ادا کیا ہے۔"[۷]

ایسے ہی خیالات کا اظہار ہفت روزہ "دلیل و نہار" میں محمد یونس قریشی نے کیا ہے:
جناب طالب ہاشمی کے نام سے تاریخی کتب لکھتے ہیں[۸]

فوق صاحب ان لوگوں میں ممتاز مقام کے مالک ہیں جنھوں نے کشمیر کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دکھ جھیلے، مصیبتیں برداشت کیں اور بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔ انھوں نے کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور جب تک اس کا ازالہ نہ ہو گیا چین سے نہ بیٹھے۔ فوق صاحب اہل کشمیر اور بالخصوص کشمیری مسلمانوں کی مظلومی کے بارے میں جو کچھ لکھتے تھے اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کے تقریباً ہر مسلم اخبار میں ان کی خبریں نقل ہوتی تھیں اور مسلمانوں کی بے کسی اور حکومت کشمیر کی بے حسی اور بے توجہی کا چرچا رہتا تھا۔ شروع شروع میں تو حکومت کشمیر ٹس سے مس نہ ہوتی تھی لیکن فوق صاحب کے عزم و استقلال کی بدولت ایک وقت آیا کہ جموں و کشمیر کے تمام وزراء اور دونوں صوبوں کے گورنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سرکاری طور پر ان کا اخبار خریدنے پر مجبور ہو گئے اور بعض شکایات پر توجہ دی جانے لگی۔ خود مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے نام بھی اخبار جاتا تھا۔ انھوں نے "نیوز پیپر ریڈر" کا ایک عہدہ بھی منظور کر رکھا تھا، جو اخبار و رسائل پڑھ کر ضروری

خبریں مہاراجہ کو سناتا تھا۔ اس طرح فوق صاحب نے پتھر کو جونک لگائی۔

فوق صاحب کے دل میں کشمیر کے لیے کتنی محبت تھی۔ وہ کشمیریوں کے مصائب کا حال سن کر کس طرح تڑپ اُٹھتے تھے اور ان کی روح کشمیر کو آزاد اور شاد و آباد دیکھنے کی کتنی متمنی اور کس قدر مضطرب اور بے چین رہا کرتی تھی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے لگایا جا سکتا ہے جو "ادبی دنیا" لاہور کے کشمیر نمبر میں شائع ہوئیں جو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

"اے وادئ کشمیر! اے خطۂ جنت نظیر! تو میری آنکھوں کا نور اور میرے دل کا سرور ہے۔ تیرا غم میرا غم اور تیری راحت میری عین تمنا ہے۔

تیرے باغوں کی بہار اور سر بفلک پہاڑوں کے سبزہ زار، تیرے چشموں کی روانی اور تیرے مرغزاروں کی شادابی نے ایشیا، یورپ اور امریکہ تک کو اپنا اسیر بنا لیا ہے۔ اے کاش ان فارغ البال اور آرام طلب سیاحوں کو تیرے غریب باشندوں کی حالت پر بھی ترس آتا۔

اب زمانہ بیداری کا ہے۔ سوئے ہوئے جاگ اُٹھے ہیں اور دوڑے ہوئے منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کوئی شخص اور کوئی طاقت تمھیں تاریکی و جہالت اور ہمیشہ کی غفلت میں نہیں رکھ سکتی۔ خدا وہ خدا جو تمام ترقی یافتہ ممالک اور بیدار و زندہ قوموں کا خدا ہے! تمھارا حافظ و ناصر ہو۔

پس اے برادران وطن! اے بہی خواہان قوم! اے نوجوانان ملک۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا [۹]

فوق صاحب صرف گفتار کے غازی نہ تھے۔ بلکہ وہ بے زبان مظلوموں کی ترجمانی کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات کے تذکرے کے لیے ان

کی خود نوشت "سرگزشت فوق" سے لے کر کچھ واقعات بیان کیے جاتے ہیں -

"لنگیٹ اور بعد دواہ صوبہ کشمیر اور صوبہ جموں میں دو زرخیز علاقے ہیں - یہ دونو علاقے سر راجہ امر سنگھ کی جاگیر تھے - ۱۹۱۰ء میں ان کی وفات کے بعد یہ ان کے اکلوتے بیٹے راجہ ہری سنگھ کے حصے میں آ گئے - یہی راجہ ہری سنگھ بعد میں کشمیر کے فرمانروا قرار پائے - انھوں نے لنگیٹ کشمیر کے انتظام و انصرام کے لیے لالہ ہربنس لال بی - اے، ایل ایل بی کو مینجر مقرر کیا - وہ بڑا متعصب ہندو تھا - اس نے یہ دیکھ کر کہ اس جاگیر کی بیس بائیس ہزار کی آبادی سب کی سب مسلمان ہے - نمبردار بھی سب مسلمان ہیں - ایسا نہ ہو کہ یہ کسی وقت شورش برپا کر دیں اور اس کا تدارک دشوار ہو جائے، اس نے تجویز پیش کی کہ نمبردار یا تو پنڈت ہونے چاہئیں یا پنجابی ہندو یا سکھ - اس احمقانہ تجویز سے علاقے میں کھلبلی مچ گئی - خواجہ امیر الدین لگڑ و لنگیٹ کے تحصیلدار تھے اور لالہ شیو داس (جو بعد میں سیشن جج بھی رہے) راجہ ہری سنگھ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے - دونوں نے مینجر جاگیر کو اس حرکت سے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور لوگوں پر ظلم و تشدد ہونے لگا - ان کی چیخ و پکار پر فوق صاحب نے نہ صرف اس نارواحکم کے خلاف آواز بلند کی بلکہ زمینداروں پر جو ظلم اور تشدد ہو رہے تھے ان کو بھی رفتہ رفتہ عالم آشکارا کیا - لالہ شیو داس یہ تمام مضامین راجہ ہری سنگھ کو سنایا کرتے تھے - تحقیق کے بعد بات سچی ثابت ہوتی تھی، آخر مہاراجہ کو اپنے مینجر کی زیادتیوں کا یقین ہو گیا - اور اس نے اس احمقانہ حکم اور دیگر وجوہ کی بنا پر مینجر کو برطرف کر دیا - اس طرح لوگوں کی جان میں جان آئی۔"[۱۰]

کشمیر کے موسم سرما میں چونکہ برف باری کی وجہ سے کوئی فصل نہیں ہوتی، اس لیے ہزارہا زمیندار بے کار ہو جاتے ہیں اور محنت مزدوری کے لیے گرم علاقوں میں چلے جاتے ہیں - قیام پاکستان سے پہلے وہ پنجاب کا رخ کرتے تھے اور گروہ در گروہ

راولپنڈی، کیمبل پور، پشاور، جہلم، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لاہور، امرتسر اور شملہ تک پھیل جاتے تھے۔ قلیل اُجرت پر دن بھر بوجھ اُٹھاتے، لکڑیاں چیرتے اور رات کو تنگ و تاریک کوٹھریوں میں پڑے رہتے تھے۔ وہ آدھا پیٹ کھاتے اور میلے کچیلے چیتھڑوں سے اپنا بدن ڈھانپتے تھے۔ وہ اپنی ہستی کو گناہوں کی سزا اور اپنے وجود کو لعنت اور بلا سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے خون پسینے کی کمائی کا بیشتر حصہ ظالم سرمایہ داروں کے پاس چھوڑ کر واپس چلے جاتے تھے کہ زندگی رہی تو اگلے سال آکر وصول کرلیں گے۔ ان کی کوئی تنظیم تھی نہ کوئی پرسان حال: [ااد]

انہی دنوں پنجاب کے پہاڑی علاقوں ہوشیارپورا اور کانگڑہ وغیرہ سے ہندو مزدور بھی آجاتے تھے۔ وہ کشمیریوں جیسے طاقتور اور جفاکش تو نہ ہوتے تھے مگر کشمیریوں کے ان کی نسبت کم اُجرت پر کام کرنے کی وجہ سے ان کی دال نہ گلتی تھی۔ اس لیے وہ ان کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتے تھے اور چاہتے کہ کسی طرح ان کو زک پہنچائی جائے۔ مزدوروں کی ان بن سے متعصب ہندوؤں نے فائدہ اُٹھایا اور ہندو پہاڑیوں کو پٹی پڑھا کر ۱۹۲۸ء میں ایک سازش کے ماتحت یہ افواہ اڑا دی کہ کشمیر میں چونکہ کارخانے کھل گئے ہیں اس لیے مہاراجہ نے اعلان کردیا ہے کہ تمام کشمیری زمیندار پندرہ دن کے اندر اندر واپس آجائیں ورنہ ان کی جائیدادیں ضبط کرلی جائیں گی۔ لاہور سے کشمیری مزدور گروہ در گروہ واپس جانے لگے۔ منشی محمد الدین فوق نے جب یہ دیکھا تو انھیں بہت تشویش ہوئی۔ انھوں نے ایک طویل تار مہاراجہ سر ہری سنگھ کو جموں کے پتے پر بھیجا اور تمام حالات کی تفصیل بتا کر دریافت کیا کہ حکومت کے اعلان میں کہاں تک صداقت ہے۔ مہاراجہ بہادر کی طرف سے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر پی۔ کے۔ وائل نے تار ہی کے ذریعے فوراً جواب دیا کہ مہاراجہ نے اس قسم کا کوئی حکم نہیں دیا۔ بلکہ جن لوگوں نے یہ افواہ اڑائی ہے وہ مہاراجہ اور اُن کی رعایا کے دشمن ہیں۔ ان لوگوں کو سمجھا دیا

جائے کہ تشویش کی کوئی ضرورت نہیں۔

فوق صاحب یہ تار لے کر سید محسن شاہ ایڈووکیٹ، جنرل سیکرٹری "مسلم کشمیری کانفرنس" کے پاس گئے ان کے مشورے سے ایک پوسٹر چھاپا گیا جس میں مہاراجہ کے تار کا حوالہ دیا گیا۔ یہ پوسٹر جگہ جگہ چسپاں کیا گیا۔ دوسرے شہروں میں بھی بھجوایا گیا۔ اپنے "اخبار کشمیری" کے علاوہ دوسرے اخباروں میں بھی اس افواہ کی تردید کی تب جا کے یہ طوفان تھما۔ فوق صاحب ہی کا ایک شعر ہے۔

کون سی کی نہ دوا کون سی مانگی نہ دُعا
ہم نے کیا کیا نہ کیا تیرے سنبھلنے کے لیے

کشمیری مزدوروں کی یہ حالت دیکھ کر فوق صاحب کے دل میں خیال آیا کہ ایک کشمیر لیبر بورڈ قائم ہونا چاہیے جو کشمیری مزدوروں کے رہنے کے لیے کسی اچھی جگہ کا انتظام کرے۔ ان میں جو بیکار ہوں ان کے لیے کام تلاش کرے۔ جو لوگ ان غریب پردیسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے، ان کو ہمدردی کی طرف راغب کیا جائے۔ جو لوگ ان کا حق مارتے ہیں، ان سے حق رسی کرائی جائے۔ کوئی ایسا تعلیمی مرکز قائم کیا جائے جہاں یہ لوگ معمولی شُدھ بُدھ حاصل کر سکیں تاکہ اگر خط خود نہ لکھ سکیں تو کم از کم پڑھ تو سکیں۔[۱۲]

فوق صاحب نے اپنی یہ تجویز چند دوستوں کے سامنے رکھی جن میں کشمیری پنڈت بھی تھے اور کشمیری مسلمان بھی۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ میر محمد عبداللہ مالک (کریمی پریس)، پیر ولی اللہ مخدومی، خواجہ اللہ بخش گنائی، خواجہ غلام محمد لون، حاجی میر شمس الدین، پنڈت کشمپ بندھو اور چند دیگر دوستوں کی مدد سے اس لیبر بورڈ کا پہلا جلسہ میر محمد عبداللہ کے مکان پر ہوا جس میں تقریباً چھ سات سو مزدور مختلف محلوں کے شامل تھے۔ پنڈت پی این کول بیرسٹرایٹ لاء اس بورڈ کے

صدر اور خواجہ غلام محمد لون پروپاگنڈہ سیکرٹری قرار پائے۔ ہر پندرہویں دن لاہور کے کسی نہ کسی محلے میں اس کا جلسہ ہوتا تھا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے صاحبزادے پنڈت پیارے موہن دتاتریہ جو اخبار "ٹریبیون" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ وہ بھی ایک جلسہ کے صدر بنے۔ ڈاکٹر پنڈت پی۔ کے۔ کول جو آنکھوں کے امراض کے ماہر تھے، وہ بھی اس بورڈ کے معاون تھے۔ شیخ دین محمد نے بھی (جو بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج اور اس کے بعد صوبہ سندھ کے گورنر رہے) اس بورڈ کے ایک جلسہ کی صدارت کی۔

تین سال تک یہ بورڈ کام کرتا رہا۔ بہت سی تجویزیں جو فوق صاحب کے ذہن میں تھیں، وہ سب تو پوری نہ ہو سکیں البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس بورڈ کے اثر سے اڑھائی تین ہزار روپیہ جو سرمایہ داروں اور خائن امانت داروں نے دبا رکھا تھا، غریب مزدوروں کو واپس مل گیا اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنا روپیہ ڈاک خانوں میں جمع کرایا کریں۔ اس بورڈ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ایک جلسہ میں کشمیر کے سپوت اور ہندوؤں کے رہنما پنڈت موتی لعل نہرو بھی تشریف لائے۔ پنڈت پی۔ این کول بیرسٹر ایٹ لاء کے پریذیڈنشل ایڈریس نے ریاست کشمیر میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس میں حکومت کشمیر و جموں کو رعایا کے حقوق و مطالبات کی طرف پورے زور سے توجہ دلائی گئی تھی اور خصوصاً مظلوم زمینداران کشمیر کی ترجمانی کا حق ادا کیا گیا تھا، جن کو ریاست کا مالیہ ادا کرکے بڑے بڑے پیٹ والوں کی تنخواہیں پوری کرنے کے لیے وطن سے بے وطن ہو کر در در کے دھکے کھانے پڑتے تھے۔

اس ایڈریس میں ایک جگہ پریذیڈنٹ نے منشی محمد الدین فوق کی بے حد تعریف کی تھی۔

یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ اب ریاستی رعایا کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اور وہ اپنے

حقوق و مطالبات کے لیے خود جدوجہد کر رہی تھی۔ انہی دنوں کشمیری کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی تھا اس جلسہ میں کشمیر سی آئی ڈی کے حکیم حبیب اللہ انسپکٹر پولیس اور پنڈت شیام لال درباری سب انسپکٹر پولیس بھی شامل تھے۔ وہ فوق صاحب کے واقف تھے۔ انھوں نے کشمیر لیبر بورڈ اور کانفرنس کے اجلاس میں پاس ہونے والی قراردادوں کی نقول طلب کیں۔ جو دے دی گئیں، اس خیال سے کہ ان سے کانفرنس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن اسی سال مئی یا جون میں جب فوق صاحب کشمیر گئے تو یہ معلوم کر کے بے حد متعجب ہوئے کہ سی آئی ڈی نے آپ کے متعلق یہ رپورٹ کر رکھی ہے کہ کشمیر لیبر بورڈ اور کشمیری کانفرنس کے کرتا دھرتا منشی محمد الدین فوق ہی ہیں۔ انہی کے تار ہلانے سے کشمیری میں ہر قسم کی حرکت پیدا ہوئی ہے۔[۱۳]

سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے تو یہ بات مجبور ہو کر فوق صاحب کے خلاف لکھی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ منشی محمد الدین فوق ان لوگوں میں سرِ فہرست تھے جنھوں نے کشمیر کی تحریکِ آزادی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے کشمیریوں کے حقوق و مطالبات کے لیے اس وقت آواز بلند کی جب کشمیر کے کسی افسر کے غلط رویّے کے خلاف نکتہ چینی کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک بے باک اور نڈر صحافی کی طرح کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے ہر ظلم کے خلاف قلمی جہاد میں کود پڑتے تھے۔ انھوں نے زخم بھی کھائے، نقصان بھی اُٹھائے مگر اپنے عزم سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ نامساعد حالات کے سامنے بھی ہمیشہ سینہ سپر رہے اور مصائب و آلام سے کبھی مُنہ نہیں موڑا۔ وہ ہوا کا رُخ دیکھ کر طوفان کا اندازہ کر لیتے اور اس سے بچنے کی تدابیر سوچنے لگتے تھے۔

فوق صاحب کشمیر کو حسین دیکھنا چاہتے تھے اور ان کو کشمیریوں کی اصلاح معاشرت کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ جانتے تھے کہ "پھرن"، کشمیریوں کا خاص لباس اور کانگڑی قومی نشان ہے۔ ان کے بغیر کشمیری معاشرت مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ یہی چیزیں کشمیریوں

کی پہچان ہیں اور انھیں غیر کشمیریوں سے ممیز کرتی ہیں۔ لیکن کشمیریوں کی کاہلی، سستی اور پسماندگی کی تمام ذمہ داری بھی انھیں پر عاید ہوتی ہے۔ فوق صاحب نے اسی بنا پر کہا تھا :

تیغ جوہر دار برسوں تک رہی قومی نشاں
کانگڑی ہے یا پھرن بس اب نشان کاشمیر[۱۴]

فرن یا پھرن پیراہن کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی۔ یہ موٹے کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا لمبا سا کرتہ تھا جو گھٹنوں کے نیچے ایڑی تک آتا تھا۔ عورت مرد بھی لباس پہنتے ہیں اور ستر پوشی کے لیے پاجامے یا شلوار کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ فوق صاحب کی کوششوں سے شلوار کی طرف کچھ کچھ میلان ہو گیا۔

مٹی کے ایک پختہ ذرا عمیق پیالے کے گرد جنگلی درخت کی پتلی پتلی شاخوں کا جال (غلاف) بُن کر ایک طرف ہاتھ سے پکڑنے کے لیے اونچا دستہ لگا کر انگیٹھی سی بنالی جاتی تھی۔ اس کو کانگڑی کہتے تھے۔ پیالے میں کوئلے یا گرم راکھ ڈال کر اس سے آگ تاپنے کا کام لیا جاتا۔ اہلِ کشمیر نے کشمیری اور فارسی زبان میں اس کے اوصاف اس طرح بیان کیے ہیں :

اے کانگڑی اے کانگڑی قربان تو حور و پری
چوں در بغل تو آمدی درد دلِ من می بری
کانگڑی در بغل بگو چون است
لیلیٰ در کنار مجنون است

خوشی محمد ناظر نے بھی اس عنوان سے ایک طویل نظم لکھی ہے۔[۱۵]

کشمیری چلتے پھرتے بلکہ سوتے وقت بھی کانگڑی کو اپنے ساتھ رکھنے کے عادی تھے جس سے کئی بچوں کے جسم جل جاتے۔ کئی جانیں نذرِ آتش ہو جاتی تھیں۔ اعلیٰ درجے کی پوشاکیں

اور رفیع الشان عمارتیں اس کانگڑی نے خاک سیاہ کر دیں۔ فوق صاحب نے ۱۹۰۷ء میں "سفرنامہ کشمیر" اور ۱۹۱۷ء میں کتاب "رہنمائے کشمیر" شائع کی۔ اس میں وہ کانگڑی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نقصانات کے ساتھ اس امر سے بھی انکار نہیں کہ غرباء اور خصوصاً زمیندار لوگ، جن کے جسم پر ایک بوسیدہ پھرن یا پھٹی پرانی چادر (لوئی) کے سوا کچھ نہیں ہوتا، کشمیر کی سردی (کٹھ کشوہ) کے موسم میں اسی کانگڑی کے طفیل گرم رہتے اور سردی سے بچتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو اہلِ کشمیر کو اس دشمن جاں محبوبہ کے ہلاکت آفریں عشق سے بچنا چاہیے۔" [۵۱۶]

تہذیب و ثقافت میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ زمانہ نے سینکڑوں انقلاب دیکھے۔ ضروریاتِ زندگی میں اضافہ ہوا۔ ہزاروں نئی ایجادات عالمِ وجود میں آئیں۔ لوگوں کے طرزِ زیست اور لباس کی تراش خراش میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر کشمیر اس بات سے مستثنیٰ ہے۔ اہلِ کشمیر پر انقلابِ زمانہ نے زیادہ اثر نہیں کیا۔ ان کے سامنے قدیم رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھانا آسان کام نہ تھا۔ ان کی قدامت پرستی کے سامنے اصلاح کی کوئی تجویز کامیاب ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ فوق صاحب نے یہ محسوس کر کے کہ:

شامتِ اعمال کے پردے میں آئی کانگڑی

اور پھرن کا پیرہن پھوٹی ہوئی تقدیر ہے

بڑی جرأت سے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی شاعری کے ذریعے اور "اخبار کشمیری" کے ذریعے کئی سال تک اصلاحِ معاشرت کی کئی مفید تجاویز اہلِ خطہ کے سامنے پیش کیں اور آخر نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

اَللہ دے سمجھ تو پھرن کو اُتار دد
گھٹنوں کے بل جوانوں کو جس نے بٹھا دیا

ان کوششوں نے بڑا کام کیا۔ پتھروں میں نرمی پیدا ہوئی۔ نوجوانوں نے آپ کے پیغام کو دِل میں جگہ دی۔ آپ کے جذبات کی گرمی کو محسوس کیا اور آپ کی مفید تجاویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ سرینگر کے چند حساس نوجوانوں نے مل کر ایک جمعیت بنائی اور آئندہ کے لیے عہد کیا کہ پھرن قصابہ اور کانگڑی کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں گے اور گھر کے کسی فرد کو ان کے نزدیک نہ جانے دیں گے۔ فوق صاحب کی زندگی ہی میں اس پر عمل شروع ہوگیا تھا اور کشمیر کی حسین و جمیل آبادی خوش پوش نظر آنے لگی تھی۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز شیخ عبداللہ کے ابتدائی رفیقوں میں ایک کامیاب ادیب اور اخبار نویس تھے۔ انھوں نے مُسلم کشمیر کانفرنس کے وقت سے لے کر نیشنل کانفرنس کے ابتدائی عروج کے زمانے تک ادب اور صحافت کے ذریعے کشمیر کی علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی خدمت کی۔ انسائڈ کشمیر (اندرون کشمیر) ان کی اہم کتاب ہے۔ انھوں نے شیخ عبداللہ کی سوانح عمری بھی لکھی مگر شیخ صاحب کی وزارت عظمٰی ہی کے زمانے میں سیاسی وجوہ کی بنا پر ریاست بدر کر دیے گئے۔ جلا وطنی کے دِنوں میں دہلی میں بیٹھ کر تحریر و تصنیف کا کام کرتے رہے۔ آخر غریب الوطنی میں بمقام دہلی انتقال کیا۔

کشمیر کی بیداری اور جنگِ آزادی میں منشی محمدالدین فوق کی خدمات اور کشمیر سے ان کے بے پناہ جذبہ محبت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ۳۰ اگست ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں بزاز صاحب لکھتے ہیں : یہ خط فوق صاحب کے چچازاد بھائی منظور الحق ڈار صاحب کے نام ہے جو اخبار "جدید کشمیر" مظفر آباد آزاد کشمیر کے مدیر ہیں۔ فوق صاحب نے "کشمیر جدید" کے نام سے سرینگر سے ایک پرچہ خود ۱۹۳۳ء

میں جاری کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈار صاحب نے فوق صاحب کی یادگار کے طور پر "جدید کشمیر" جاری کیا۔

"منشی محمد الدین فوق کشمیر کے ان محبانِ وطن بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے وطن میں ایک وسیع دماغی، سیاسی اور مجلسی انقلاب پیدا کرنے کے لیے اَن تھک کام کیا ہے۔ جب ابھی کشمیر کے عوام خوابِ غفلت میں خرّاٹے لے رہے تھے اور تعلیم یافتہ دولت مند لوگ اپنے ذاتی اغراض حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے تو فوق صاحب شب و روز اپنے قلم سے انھیں جگانے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ نہیں تھا جب لیڈر بننا فیشن میں شامل ہو گیا تھا یا لیڈر بننے سے کوئی سیاسی یا اقتصادی فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ ان دنوں وطن کی آزادی کے لیے لڑنا یا پبلک کاز کی حمایت کرنا بہت مہنگا پڑتا تھا۔ لیکن فوق تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے آج جب میں ان کے مضامین یا کتابیں پڑھتا ہوں جو انھوں نے آج سے تیس چالیس سال قبل سپردِ قلم کی ہیں تو مجھے ان کی جرأت اور ہمت دیکھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی۔

فوق صاحب سنجیدہ مزاج انقلاب پسند اور مرنجان مرنج پالیسی کے بزرگ تھے۔ جب کشمیر میں ۱۹۳۱ء کا انقلاب آیا اور ریاستی سیاسیات میں انتہا پرستی کا زور ہو گیا تو نئے لیڈر اور کارکن ان کی متانت سے ناراض ہو گئے اور بجائے اس کے کہ انھیں انقلاب کے بانیوں میں سے تسلیم کیا جاتا، ان کی مخالفت کرنے لگے۔ لیکن فوق صاحب تعریف یا مذمت سے بالاتر رہ کر اپنے مشن میں اور اپنے اصولوں پر کاربند رہے۔ آج وہ کارکن اور

لیڈر یا تو معقولیت پرست بن چکے ہیں یا میدان سیاست سے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن فوق صاحب اور ان کے خیالات کی برابر اشاعت ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر میں ان کی زیادہ عزت ہوگی اور انھوں نے اپنی قلمی معاونت سے جو عظیم خدمت وطن کی انجام دی ہے۔ اس کو اسی احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا جس کی وہ مستحق ہیں۔

فوق صاحب کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند تھی وہ ان کی قوم پرستی ہے۔ وہ فرقہ پرستی کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ انھوں نے کشمیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ فرقہ پرستی کے جذبے سے پاک اور وطنیت کے جذبے سے بھرپور ہے۔ وہ ہندو کشمیر کو بھی اپنا سمجھتے تھے اور مُسلم کشمیر کو بھی۔ وہ کشمیر کی اس عظمت پر بھی ناز کرتے تھے جو ہندو حکومت کے دوران اس نے حاصل کی تھی اور اس شان پر بھی فخر کرتے تھے جو مُسلم حکومت میں اس کو نصیب ہوئی۔ آج کل کے ہندو اور مُسلم سیاست دانوں میں اس چیز کا فقدان ہے۔ اگر ہندو لیڈر ہے تو اس کے لیے مُسلم دَور کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اگر مُسلم کارکن ہے تو اس کے لیے ہندو دَور بے معنی ہے۔ دونوں نے تواریخ کشمیر کو مسخ کر دیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم فوق صاحب کے خیالات کو زیادہ سے زیادہ نشر کریں اور کشمیریوں کو کشمیری بنائیں تاکہ ہم آزادی وطن کے لیے متحد ہو کر لڑ سکیں۔" [۱۷]

کشمیریوں کے بارے میں یہ تاثر عام ہو گیا تھا کہ بے عمل ہیں۔ فوق صاحب نے اس تاثر کو بدلنے کے لیے کشمیریوں کے دلوں میں ایک آگ روشن کرنے کی کوشش کی۔

یہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ایک بہادر اور باوقار کشمیری کا تصور ظاہر ہُوا۔ اور ۱۹۳۱ء کو بارہ مولا میں یہ کشمیری تھے جنھوں نے سیدھی سینے پر گولیاں کھائیں۔ فوق صاحب کا ایک شعر ہے۔

کشمیر ہے اِک شیر مگر سویا ہُوا ہے
جاگے گا تو مشکل سے وہ جاتے گا سنبھالا

فوق اہل کشمیر میں غلام ہونے کا واہمہ زائل کیا۔ انھیں اپنے ہونے کا احساس دیا۔ فوق صاحب نے کشمیر کے ماضی ، مسلم کشمیر اور کشمیر کے عہدِ حاضر کو آپس میں مربُوط کیا۔ فوق پہلا شخص تھا جس نے اُردو نثر میں کشمیر پر کام کیا۔ انھوں نے کشمیر کا ذکر عام کیا کشمیر شناسی کا دروازہ سب کے لیے کھلوایا۔ مُسلم کشمیر اور مکمل کشمیر کو برٹش انڈیا کے نقشے میں اپنا مقام دلانے میں عمر بھر جدّ و جہد کی۔ کشمیر کی جنگِ آزادی میں فوق صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ چونکہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ علمی و عملی دونوں اعتبار سے کشمیر کے ساتھ اپنی شیفتگی کو ثابت کیا۔ بحیثیت صحافی کے انھوں نے ہر مشکل وقت پر اپنے رسالوں میں اہلِ کشمیر کے لیے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ اس کا تفصیلی ذکر ہم فوق کی صحافت والے باب میں کر چکے ہیں۔ جی ایم ڈی صوفی کی انگریزی کتاب "کشمیر" میں کشمیر کی فروخت کے واقع پر فوق صاحب کے ردِّ عمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ صُوفی صاحب لکھتے ہیں :

The late Munshi Mohammad-ud-Din Fauq in an artical under the caption "The auction of eleven lacs Kashmiries wonders why the transaction of the sale of Kashmiries should have been stuck at Amritsar, over three hundred miles

from Kashmir without the knowledge of the people of Kashmir, by a nation known for justice! Each Kashmiri was thus sold for Rs 7/- by a handful of British Officials to Gulab Sing!

A lady humorously remarks that this ridiculously lowsale of the Kashmiri is the reason for the cheap labour of the Kashmiri in and outside Kashmir! But the neady and imprudent agents of the East India company who sold and the rich and shrewd Dogra who purchased Kashmir, Fauq points out, did not perhaps realize:-

دہقاں و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

An thus the Kashmiri became

در دریا خود غریب افتادہ دست

اس کے بعد مُسلم کشمیر ڈوگرہ کشمیر کے نیچے دَب کر چھپ گیا۔ اس سے پہلے مغلوں کے کشمیر میں غریب نہ تھے مُسلمان غریب نہ تھے۔ اس وقت کشمیر کا حال خراب نہ تھا۔ کئی صنعتیں قائم ہو چکی تھیں۔ قالین شالیں بنانے کی اور پھولوں کی صنعت خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ساری ترقیوں پر ڈوگروں نے قبضہ کر لیا۔ اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔

رفتہ رفتہ ظلم نے غریبی کی شکل اختیار کرلی۔ غربت، ذلت، رسوائی کا دوسرا نام ہوگئی۔ کشمیری مسلمان تنگ آکر ہجرت کرنے لگے۔ فوق صاحب نے نہ صرف کشمیر میں حریت فکر کو عام کیا بلکہ انھوں نے مہاجر کشمیریوں میں وطن کی یاد کو سلگائے رکھا۔

اس عملی تحریک کے علاوہ تاریخ و سوانح کے ذریعے کشمیر کے تشخص کو بحال کیا۔ فوق صاحب نے بتایا کہ کشمیر کی چرواہیوں تک کا نام نورجہاں کیوں ہوتا ہے۔ یہ تاریخی یادداشتیں ذہنوں میں زندہ کیں۔ اور پامال ہوتے ہوئے مسلم کشمیر کے تہذیبی ورثے کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ فوق صاحب ایک درد مند مؤرخ کشمیر تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کتابیں تحریر کیں۔ جن کا تذکرہ ان کی تاریخ و تذکرہ نویسی کے باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ فوق صاحب نے تاریخ کشمیر لکھتے ہوئے اسے تحریک کشمیر بنا دیا۔ ان کی ایک کتاب کا نام "شباب کشمیر" ہے جو ان کے اندر تڑپتی آرزو کا عکس ہے۔ سردار علی اکبر اپنے مضمون "فوق مرحوم" میں لکھتے ہیں:

> "آپ نے کشمیر کے کھنڈرات سے سرگوشیاں کیں اور تواریخ کی کئی جلدیں مرتب کیں۔ صوفیائے کرام کے حالات زندگی قلم بند کیے۔ مشاہیر کے کارنامے لکھے۔ فوق صاحب کی "مشاہیر کشمیر" اور خواتین کشمیر اہم کتابیں ہیں۔ کشمیر کے ہر دلعزیز بادشاہ بڈشاہ کی عظمت سے عوام کو روشناس کرایا۔" [19]

فوق صاحب ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا محور بھی سرزمین کشمیر ہے۔ انھیں دوستوں، یاروں نے شاعر کشمیر کہا۔ وہ عمر بھر کشمیر کے نوحے پڑھتے رہے۔ میرے حصے میں نوحہ خوانی کشمیر ہی آئی۔ دلکش منظر نگاری کرتے ہوئے بھی ان کی اداسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کی اس انداز کی شاعری کا تذکرہ ان کی شاعری کے باب میں کیا جائے گا۔ یہاں ان کی ایک طویل نظم کے کچھ شعر اس کے پس منظر اور فوق صاحب کے نوٹ کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

فوق صاحب کی یہ نظم ستمبر ۱۹۲۳ء میں لکھی گئی تھی۔ جب کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کشمیریوں کی تحریکِ آزادی ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی۔ لیکن یہ نظم نہ صرف اس سے کچھ برس قبل لکھی گئی تھی۔ بلکہ سری نگر میں پڑھی بھی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۳۱ء سے قبل بھی کشمیری اپنے حقوق اور آزادی کے لیے فریاد کر رہے تھے۔

فوق صاحب نے اس سے پہلے ایک نوٹ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۴ ستمبر کو میں بارہ مولا پہنچا۔ وہاں دو دن ٹھہر کر پھر اوڑی واپس آیا۔ وہاں دو دن رہا۔ اوڑی سے اسلام آباد تک دو اڑھائی میل کا فاصلہ ہے۔ سڑک پر ٹہلتا اور چکر لگاتا رہا۔ اس نظم کے چند ابتدائی شعر اسی دوران لکھے گئے۔ پھر سوپور آیا۔ چند شعر وہاں لکھے۔ پھر کسم پور ناگراناڑ اور جاگیر راجپور کے قیام میں۔ ۱۲ ستمبر تک اس کو مکمل کیا۔ یہ نظم سری نگر میں کشمیر کے ایک معزز انسان (راجہ اکبر شاہ غشاوری مرحوم رئیس زینہ کدل سرینگر کی دعوت کے موقعہ پر سنائی گئی (یہ نظم پچیس شعروں پر مشتمل ہے)۔

گر زبانِ فوق سے ہو کچھ بیانِ کاشمیر
ہے یقین بے چین کر دے داستانِ کاشمیر

اے خدائے لم یزل سن لے فغانِ کاشمیر
تیرے ہی بندے ہیں آخر بندگانِ کاشمیر

خون کثرت دیکھنا ہو تیغ قلت سے اگر
دیکھئے آ کر کبھی محشر ستانِ کاشمیر

تیرے مظلوموں کی آہوں کے دھوئیں سے بن گیا
آسماں اک اور زیرِ آسمانِ کاشمیر

دورِ حاضر نے کیے بیدار سب سوئے ہوئے
کب اٹھیں گے یا الٰہی خفتگانِ کاشمیر

مٹ گیا احساس حیرت ، اُڑ گئی رُوحِ عمل
ہیں غلامان غلام آزادگانِ کاشمیر
اب کہاں موج ہوائے دلکشا و جاں فزا
اب کہاں وہ آب و رنگ گلستانِ کاشمیر
چین لینے ہی نہیں دیتی کبھی کشمیر میں
قہر آلودہ نگاہ "پاسبانِ" کاشمیر[۲۰]

اس وقت جب مُردہ دلوں میں راکھ اڑ رہی تھی۔ فوق صاحب نے اسے ایک آتش فشاں بنانے کا خواب دیکھا۔ فوق صاحب کی یہ شاعری کہیں بھی حریت فکر کی تحریکوں کے تحت ہونے والی شاعری سے کم نہیں۔ وہ ایک سچے ریفارمر تھے اور اپنی ہر صلاحیت کو پُورے خلوص کے ساتھ قومی خدمت کے لیے استعمال کرتے تھے وہ نہ صرف کشمیر کی آزادی کے سپاہی تھے۔ انھوں نے مُسلم کشمیر کے احیا کے لیے اپنے قلم سے عَلَم کا کام لیا۔ اور محمد علی جناح کی فراست پر اعتماد کا اظہار کیا جب ابھی وہ قائدِ اعظم نہیں تھے۔ کلیم اختر لکھتے ہیں :

"جب مُسلم لیگ کی احیا ہو گئی تو محمد علی جناح نے اس کی تنظیم نو کا بیڑا اُٹھایا اور پُورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اسی سلسلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ ۲۴ - ۲۵ مئی ۱۹۲۴ء کو لاہور میں منعقد ہُوا۔ قیام لاہور میں انھوں نے دو لیکچر دیے۔ ایک بریڈلا ہال میں اور دوسرا اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں۔ اس جلسے میں فوق صاحب نے ۲۵ مئی کو ساڑھے سات بجے صبح قائداعظم جب ہال میں داخل ہُوئے تو فی البدیہہ یہ شعر کہا جسے مولانا سید حبیب ایڈیٹر "سیاست" نے بآوازِ بلند پڑھا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ شعر یہ تھا۔

آتی نہیں نظر ہیں کوئی صورتِ فلاح
شاید بتائیں راہ محمد علی جناح [۲۱]

یہ شعر "کلام فوق" طبع دوم صفحہ نمبر ۲۰۴ پر موجود ہے۔

اس واقعے کو میر عبدالعزیز ایڈیٹر ہفت روزہ "انصاف" نے بھی بالکل اسی طرح بیان کیا ہے [۲۲]

فوق صاحب کشمیر کی مکمل آزادی کے قائل تھے۔ ورنہ برصغیر کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے اور بہت سے لیڈروں نے بھی کوششیں کیں۔ اور سینکڑوں ادیبوں، شاعروں نے اپنے انداز سے اپنا کردار ادا کیا۔ جہاں تک تاریخ حریت کشمیر کا تعلق ہے۔ تو وہ اب تک جاری ہے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی فوق کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اس وقت اہل کشمیر پر جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی۔ جب حریت کشمیر کی کوئی باقاعدہ تحریک کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ اس جذبے کو زبان عطا کرنے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پروفیسر علم الدین سالک لکھتے ہیں:

"فوق صاحب نے مستقل طور پر مسلمانان کشمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے اہل عالم کو ان کی مظلومی سے روشناس کرایا۔ آپ نے نہ صرف اہالیان کشمیر کی مظلومی کا رونا رویا بلکہ اسلاف کے شاندار کارناموں کے ذریعے انھیں غیرت دلائی کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلیں۔ اور اس طرح دینی اور دنیوی فلاح حاصل کریں۔ اس لحاظ سے فوق کشمیر کے مولانا حالی ہیں۔ اگر مسدس حالی نے مسلمانان ہند کو خواب غفلت سے چونکایا تو کلام فوق نے اہالیان کشمیر کے اندر ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی مثال بہت کم شاعر اور بہت کم ایڈیٹر پیش کر سکتے ہیں" [۲۳]

موتی لال ساقی اپنے مضمون "تحریک حریت کشمیر" میں لکھتے ہیں:

"تحریکِ آزادیٔ کشمیر" میں فوق صاحب کے ارباب خانہ بھی ان کے ساتھ رہے اور اذیتوں کا سامنا کیا، چنانچہ آپ وارد کشمیر ہوتے تو آپ کے پیچھے ایک جاسوس سلئے کی طرح لگا رہتا۔ انھوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کا بیڑا جوانی میں اٹھایا تھا اور تادم حیات اس کو تیز تر کرنے میں لگے رہے۔"[۱۲]

۱۹۷۸ء میں جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر نے عظیم مؤرخ اور صحافی مرحوم محمد الدین فوق کی حیات اور کارناموں سے متعلق ایک سیمینار منعقد کیا اور شیخ محمد عبداللہ وزیرِ اعلیٰ جموں وکشمیر سے پیغام کی درخواست کی۔ شیخ صاحب نے سیمینار کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس کی۔ وہ کہتے ہیں۔

"محمد الدین فوق کا شمار ان ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے کشمیریوں کے عظیم تاریخی اور ثقافتی ورثے کی شیرازہ بندی کرکے ان میں قومی غیرت اور وقار کا ایک نیا احساس پیدا کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے انتہائی دردمندی کے ساتھ ہماری جنگِ آزادی میں اپنی بہترین خدمات پیش کیں اور اپنے ہر عمل کو کشمیری عوام کی آزادی اور خود مختاری کے لیے وقف کردیا۔ یہ کام بڑی جرأت اور جواں مردی کا تھا۔ یہ اپنے قلم کو خونِ دل میں ڈبو لینے کا مرحلہ تھا۔ آج جب ہم ان سبھی شخصیتوں کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے حق کے پرچم کو بلند رکھا۔ اور یوں کشمیری قوم کو جہدِ آزادی کے لیے ایک نیا شعور اور قوت عطا کی۔

محمد الدین فوق مؤرخ، ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نڈر صحافی بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنی خداداد تخلیقی قابلیت سے صحافت کو تعمیری اور اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ کردیا۔ پنجہ فولاد، "کشمیری میگزین"، "کشمیری اخبار" اور "بیسہ اخبار"

کے کالم آج بھی فوق کی حب الوطنی کے شاہد ہیں۔ آپ انجمن مسلمانان کشمیریاں (انجمن کشمیری مسلمانان) لاہور کے سرگرم رکن اور نائب معتمد اور حضرت علامہ اقبال کے خاص حلقہ احباب میں بھی شامل تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر سے بے پناہ محبت ہی وہ قدر مشترک تھی جو ان دو عظیم شخصیتوں کے باہمی ربط اور یگانگت کا باعث تھی۔

آج جب کہ ہم آزادی کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان عظیم شخصیتوں کو شاندار طریقے سے خراج عقیدت پیش کرتے رہیں، جنھوں نے ہماری آزادی کے حصول کے لیے بے پناہ لگن اور عزم سے کام کیا۔ اس طرح کلچرل اکادمی کی موجودہ کوششیں قابل تحسین ہیں، لیکن یہ عمل مسلسل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے ہماری نئی نسل نہ صرف اپنے ماضی سے واقف ہو سکے گی بلکہ ان کارناموں کی روشنی میں اپنا آئندہ لائحہ عمل بھی مرتب کر سکے گی، جو محمد الدین فوق اور ان کی دوسری ہم عصر شخصیتوں کی حیات سے وابستہ ہیں۔"[۲۵]

تاریخ حریت کشمیر میں فوق صاحب کا نام ناقابل فراموش حیثیت رکھتا ہے۔ کشمیر شناسی میں دلچسپی رکھنے والے اور کشمیر دوستی کا درد رکھنے والے لوگ ان کے لیے ہمیشہ احسان مندی کے جذبات اپنے دل میں محسوس کریں گے۔ حبیب خان کاشمیری اپنے مضمون "کشمیر میں سیاسی انقلاب" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"فوق صاحب کا قلم کشمیری مسلمانوں کے لیے حق و انصاف کا علم تھا۔ ان کی جد و جہد سے کشمیر میں سیاسی، سماجی، دینی اور تہذیبی انقلاب رونما ہوا۔ اور کشمیر میں اس مقصد کے لیے انجمنیں قائم ہونے لگیں۔"[۲۶]

عبدالمجید سالک اپنی خود نوشت میں فوق صاحب کی تاریخ و صحافت میں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"منشی صاحب نہایت محنتی محقق اور مؤرخ تھے۔ انھوں نے کشمیر کے

متعلق متعدد بیش بہا کتابیں لکھیں اور اپنی پوری زندگی کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت میں بسر کی۔" [۲۷]

عزیز کاشمیری فوق صاحب کی مختلف کتابوں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔

"بہت ساری خاص اور عظیم ہستیوں کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ ان میں سے ایک محمّد الدّین فوق تھے جو مرتے دم تک کشمیر کے لوگوں کی بیداری، آزادی اور فلاح و بہتری کے لیے کوشاں رہے۔" [۲۸]

ایک معروف شاعر جعفر طاہر لکھتے ہیں:

"ادبی کام کے علاوہ کشمیری مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کی پریشانیاں دُور کرنے کے سلسلے میں منشی صاحب نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ اپنی تصانیف کے ذریعے بھُولے ہوئے فسانے نوجوانوں کو سُنائے۔ کشمیریوں کو اپنے شاندار کارناموں سے روشناس کرایا اور کشمیر کا نام ساری دُنیا میں روشن کیا۔" [۲۹]

کشمیر اور آزاد کشمیر میں فوق صاحب کی برسی کے موقع پر بہت جوش و خروش دیکھنے میں آتا ہے۔ لوگ ان کی یاد منانے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔

"آج مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۵۴ء ٹھیک سات بجے شام جموں و کشمیر مُسلم کانفرنس کے ارکان اور معزز مہاجرین کشمیر کی ایک میٹنگ زیرِ صدارت پروفیسر میر عبدالعزیز "یومِ فوق" کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔ مقررین نے اپنی تقاریر میں مادرِ کشمیر کے نامور فرزند شاعر و ادیب مؤرّخ اور صحافی جناب فوق صاحب کی علمی قومی سیاسی اور دیگر خدمات کو سراہا جو اُنھوں

نے قوم اور ملک کی سربلندی کی خاطر اس وقت سرانجام دیں جب کشمیری آہنی پردوں کے پیچھے محصور تھے۔ فوق صاحب کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا "۔ ۳۰ے

اہلِ کشمیر فوق صاحب کی ضرورت جتنی آج محسوس کر رہے ہیں۔ پہلے کبھی نہ تھی۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں وہ فوق صاحب کا انتظار کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ جب کسی قوم کے صاحبانِ درد کسی ادیب اور لیڈر کے لیے نظمیں کہنا شروع کر دیں۔ تو اس کی عقیدت و احسان مندی پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ فوق صاحب کے انتقال پر جس کثیر تعداد میں اور جتنی شدت احساس کے ساتھ قطعات موت لکھے گئے۔ وہ ان کی وفات کے بعد ناقابل تلافی نقصان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ قطعات فوق صاحب کے سوانح حیات والے باب میں درج کر دیے گئے ہیں۔ ان کی زندگی میں بھی داغ اور اقبال جیسے شعراء نے ان کی شان میں نظمیں کہیں۔ یہ نظمیں فوق صاحب کی صحافیانہ خدمات والے باب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یو پی کے نوجوان خوش گلو شاعر ساغر نظامی سیمابی علیگ نے ایک طویل نظم "کشمیر کا مستقبل" کے عنوان سے کشمیری کانفرنس منعقدہ گوجرانوالہ میں پڑھی تھی۔ اس میں کشمیری شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہی کشمیر پھر مرکز بنے گا باکمالی کا
ملے گا گوشے گوشے میں نشاں رنگین جمالی کا
قدیم و حیرتی فانی غنی فہمی و استغنا
سنائیں گے قصیدہ اپنی اپنی بے مثالی کا
نہیں فہمی و استغنا تو میر و فوق باقی ہیں
بلند از بام ہو گا چہچہا تیری مقالی کا

صریرِ خامۂ اقبال کی گل بانگ باقی ہے
حیات افروز ہے جھونکا ابھی بادِ شمالی کا

ایک طویل نظم سید احمد حسین شوق گیلانی لاہوری نے بخارا سے لکھی تھی۔ اس کا ایک شعر اس طرح ہے۔

فوق بھی ہیں نظم کو تیری جگانے کے لیے
انجمن قائم ہوئی تجھ کو بڑھانے کے لیے[۳۱]

جہلم کے بزرگ فارسی شاعر ملک محمد صاحب ٹھیکیدار مرحوم نے کشمیری کانفرنس کے اجلاس ہفتم منعقدہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو جہلم میں ایک نظم پڑھی تھی۔ جس کے تین شعر یہ ہیں۔

مصلح قوم و حامیٔ تہذیب
فوق مردِ جوانِ کشمیر است
آں صریرِ قلم و صدائے بلند
از پئے خفتگانِ کشمیر است
کرد بیدار او قوم را یکسر
فوق رُوحِ روانِ کشمیر است

مفتی ضیاء الدین ضیاء آف پونچھ (کشمیر) نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں ایک شعر یہ ہے۔

فوق کشمیری ہمہ ایں داستانِ پاکستاں
او رقم آوردہ کاں تاریخ دانِ کاشمیر[۳۲]

"آوازِ حق" راولپنڈی کے مدیر میر عبد العزیز کی نظم آج کے کشمیر کی صورتحال کے تناظر میں فوق صاحب کی عظمتوں کا بہترین اعتراف پیش کرتی ہے۔

اے دبیرِ ملک و ملت اے مدیرِ نامدار
تو تھا میدانِ صحافت کا معزز شہسوار

اے مؤرّخ کاشمر کے اے محمّد دین فوق
تیری ہستی قوم کو تھی باعثِ صد افتخار

آج پھر کشمیر پر چھائے ہیں بادل یاس کے
اور یہ جنت بنی ہے ایک قیدِ تنگ و تار

دیو استبداد نے ہے آ دبوچا قوم کو
زنگ آلودہ مگر ہے اپنی تیغ آب دار

تیرے ہموطنوں کا سارا لُٹ گیا دِل کا سکوں
جب سے ہے کشمیر پر قابض عدوئے بدشعار

قوت عزم و عمل مفقود ہے اس قوم سے
اور سب خرد و کلاں ہیں آج محو انتشار

بے وطن کشمیر میں کشمیر کے مفلس ہیں آج
دوسری جگہوں سے آ قابض ہوئے سرمایہ دار

ملک جن کا ہے اُنھیں تو پُوچھتا کوئی نہیں
تلخ ہیں کشمیریوں کے آج پھر لیل و نہار

جن کا چرچا سامنے دُنیا کے تُو نے کر دیا
آج کل وہ باغ و بستاں ہو رہے ہیں سوگوار

تجھ کو اے مدحت سرائے گلستانِ کاشمیر
یاد کرتے ہیں وطن کے مرغزار و جوئبار

عظمتِ ماضی کی تو نے یاد اس کو وہ دلائی
قوم مستقبل کی جانب چل پڑی دیوانہ وار
آگ جو سینوں میں ہے بھڑکے گی پھر وہ ایک دن
پیدا ہو جائے گی خاکستر میں تاثیرِ شرار
ہو گا تجھ جیسے بزرگوں کی دعاؤں کا اثر
عظمتِ کشمیر پھر ہو کر رہے گی آشکار
پھوٹنے کو آج وہ چشمے ہیں پھر کشمیر کے
جن کی خاطر تیرا دل تھا مدتوں تک بے قرار
رشکِ جنت اک نہ اک دن یہ وطن ہو جائے گا
ہو رہے گی پھر بنا امن و اماں کی استوار[۳۳]

مارچ ۱۹۸۵ء میں فوق صاحب کے بارے میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون مولانا عبداللہ قریشی سے لے کر راقم نے شائع کیا۔ شیخ صاحب کی رائے کتنی واضح اور مؤثر ہے:۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پاکستان اور ہندوستان کا کوئی شخص بھی فوق صاحب سے بڑھ کر کشمیر کا واقف نہ تھا۔ وہ بلا شبہ کشمیر کے متعلق مستند انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ "مجدد کشامرہ" بجا طور پر ان کا لقب تھا۔ وہ اس لقب کے پورے طور پر مستحق تھے"۔[۳۴]

فوق صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے مختلف حیثیتوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کی تمام تر توجہات کا مرکز کشمیر تھا۔ وادیِ کشمیر میں ہر طرف اپنی محبت کے انداز بکھیر دینا چاہتے تھے۔ علمی و ادبی اور تہذیبی و سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر اپنی اعلیٰ صفات کی دھاک بٹھا دی۔ وہ اپنے مزاج میں ایک لیڈر کی

خصوصیات بھی رکھتے تھے۔ یوں تو ان کی بھرپور زندگی کے اثرات پورے برِصغیر کی علمی ادبی اور سیاسی تاریخ میں نمایاں ہیں مگر انھوں نے اپنی جدّوجہد میں اوّلین حیثیت کشمیر کو دی۔

پروفیسر علم الدین سالک نے ان کو شاعری کے حوالے سے کشمیر کا حالی قرار دیا۔ اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ان کے "کشمیری میگزین" کو سرسیّد احمد خان کے "تہذیب الاخلاق" کے مماثل قرار دیا۔ ان کے جاری کردہ رسالے "کشمیری میگزین"، "اخبار کشمیری" اور "کشمیر جدید" اس بات کی شہادت مہیّا کرتے ہیں کہ کشمیر کو کس کس طرح ایک نئے دور سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔

علاّمہ اقبال کے ساتھ ان کی علمی ادبی اور سیاسی اشتراکِ عمل کی بات بھی پہلے ابواب میں ہو چکی ہے۔ فوق صاحب جب انجمن کشمیری مسلمانان کے سیکرٹری تھے تو حضرت علاّمہ جنرل سیکرٹری تھے۔ اقبال کو اس طرف مائل کرنے والے بھی وہی تھے۔ اس بارے میں افضل حق قریشی اپنے مضمون انجمن کشمیری مسلماناں اور اقبال میں لکھتے ہیں :

> "یہی وہ تنظیم ہے جس کے پلیٹ فارم سے اقبال کی شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔ اس کا ذکر پہلے پہل فوق کی تحریروں میں ملتا ہے۔"[۵۳]

لیکن فوق صاحب اپنی مختلف النوع علمی اور عملی سرگرمیوں کے حوالے سے سرسیّد کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ تحریکِ حریّت کشمیر میں فوق صاحب کے کردار میں علی گڑھ تحریک کے بیشتر انداز موجود ہیں۔ ان تحریکوں کے اثرات بھی تقریباً یکساں نوعیّت کے مرتّب ہوئے۔ ارضِ کشمیر اور اہلِ کشمیر کے لیے تحریر کردہ کتابوں میں فوق کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ فوق صاحب نے ہی لوگوں کو یہ احساس دیا کہ کشمیر ہمارا ہے۔ یہ ایک کتاب کا نام بھی ہے۔ فوق صاحب کے

بارے میں مصنف لکھتا ہے :

"مولانا محمّد دین فوق کشمیر کے ان ہونہار فرزندوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے کشمیر سے باہر رہ کر بھی اپنی زندگی کا ہر قیمتی لمحہ وطن کی خدمت کے لیے وقف رکھا۔"

کشمیر کے حکمران طبقہ میں مولانا محمّد دین فوق کو خاص عزّت اور قدر و منزلت حاصل تھی۔لیکن اس کے باوجود وہ ان کی عوام دشمنی سے چشم پوشی نہیں کرتے رہے ۔ انھوں نے کشمیری عوام کو حکمران طبقے کے مظالم کے خلاف ابھارنے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے پورا زورِ قلم صرف کیا ۔ انھوں نے نظم و نثر میں کتابیں لکھ کر کشمیر کی سیاسی، مجلسی اور معاشری اصلاح کے کاموں کے لیے زمین ہموار کی اور انھی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کشمیری عوام جاگے اور خوب جاگے۔

گزشتہ بتیس سالہ جدّوجہدِ آزادی درحقیقت انھی بزرگوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے ۔جو وہ سالہا سال تک بغیر کسی نمائش کے انجام دیتے رہے اور اسی وجہ سے ہر کشمیری ان بزرگوں کی یاد تازہ رکھنا اپنا ملّی فرض سمجھتا ہے۔" [۳۶]

تحریکِ حریت کشمیر میں فوق کے جذبے اور جدّوجہد کو ایک یاد رہ جانے والی اہمیت حاصل ہے ۔ اس ضمن میں جن مقتدر شخصیات کا ذکر لازمی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان میں علاّمہ اقبال اور شیخ محمّد عبداللہ کے ساتھ محمد الدین کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔ اس مقالے کے پہلے باب میں فوق کے بارے میں علاّمہ اقبال اور شیخ عبداللہ کی آرا کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔ شیخ عبداللہ نے ہمیشہ اقبال اور فوق کا ذکر بہت عقیدت سے کیا ہے ۔ بہت سی جگہوں پر دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ ان

کی یہ رائے بھی بہت اہم ہے جو انھوں نے اپنی خودنوشت میں تحریر کی ہے۔ اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے آدمی کسی دوسرے کی خدمات کا اعتراف اپنی پوری زندگی کے تجربات و واقعات کے آئینے میں کرتا ہے۔ شیخ عبداللہ لکھتے ہیں :

"فوق کشمیر کے مسائل اور معاملات کو ابھارنے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے کشمیر کے متعلق علامہ اقبال کے مشیر خاص کی حیثیت سے کام کیا"۔[۳۴]

شیخ عبداللہ کے اس بیان کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال کی نظر میں فوق کا مقام کیا تھا۔

۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والی کتاب "The Kashmir of Sheikh Abdullah" میں ممتاز دانشور اور ادیب ایم۔ ڈی۔ تاثیر کی برطانوی نژاد بیگم محترمہ بلقیس تاثیر نے اپنے مخصوص فکری تناظر میں مسئلہ کشمیر کو دیکھا ہے۔ انھوں نے شیخ عبداللہ کی ابتدائی زندگی کا تذکرہ علامہ اقبال، محمد الدین فوق اور پروفیسر علم الدین سالک کی مشترکہ مساعی کی روشنی میں کیا ہے۔ شیخ عبداللہ پروفیسر سالک کے شاگرد تھے۔ پروفیسر سالک فوق کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ محترمہ بلقیس تاثیر پروفیسر سالک کے صاحبزادے احسان الٰہی سالک کے حوالے سے لکھتی ہیں :

"While Sheikh Sahib was student in Lahore and Aligarh, he used to go home for the summer vacations to the valley, i.e. from 1926 on wards. From 1927 Prof. Ilmuddin Salik also used to go for the summer with his two great friends, Maulana Abdullah Qureshi and Munshi Mohammad Din Fauq (a great friend of Allama Iqbal). All these three friends were great admirers of Allama Iqbal and worked with him in the Kashmir cause".

فوق کی وفات کے چالیس برس بعد شائع ہونے والی ان دو اہم کتابوں میں فوق کی خدمات کا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ جب بھی مسئلہ کشمیر کے تاریخی تجزیے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو اس ضمن میں فوق کے فکر و عمل کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

حوالہ جات (چھٹا باب)

۱ے شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان ڈھاکا، خط بنام منشی محمد الدین فوق، ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء "نقوش" مکاتیب نمبر، ص: ۸۸۶۔

۲ے مشعل سلطان پوری، فوق۔ مختصر حالات زندگی "شیرازہ" سرینگر "فوق نمبر" ص: ۳۰۔

۳ے مولانا عاشق حسین سیماب اکبر آبادی، "نغمہ وگلزار"، (مجموعہ کلام فوق)، ص: ۳۰۔

۴ے "سرگزشت فوق" ص: ۶۲۔

۵ے "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، ص: ۲۵۲۔

۶ے "انوار اقبال"، طبع دوم، ص: ۶۵۔

۷ے بہاء الحق قاسمی، "تذکرہ اسلاف" لاہور: الہلال پریس، مارچ ۱۹۶۲ء، ص: ۹۔

۸ے ہفت روزہ لیل و نہار"، اکتوبر ۱۹۵۷ء،
۹ے "آئینۂ کشمیر"، صفحات : ۵۰ ، ۴۴۹ -
۱۰ے "سرگزشت فوق" قلمی، ص : ۶۸ -
۱۱ے "سرگزشت فوق"، ص : ۷۲-۷۳ -
۱۲ے "سرگزشت فوق"، صفحات : ۳ - ۷۵ -
۱۳ے "سرگزشت فوق"، صفحات : ۷۵ - ۷۶ -
۱۴ے "کلام فوق" : ص : ۱۹۰ -
۱۵ے "رہنمائے کشمیر"۔ ص : ۵۸۔ خادم التعلیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۱۷ء
ص : ۵۸ -
۱۵ے خوشی محمّد ناظر: "نغمہ فردوس" لاہور: بابو ناظم الدّین پرنٹرز ۱۹۳۷ء،
ص : ۱۳۹ -
۱۷ے ہفت روزہ "جدید کشمیر"، مظفر آباد۔ آزاد کشمیر، ستمبر ۱۹۵۳ء
ص : ۱۳ -
۱۸ے G.M.D. Sufi, Kashmir Vol II Lahore: Punjab University 1940 P. 767-768
۱۹ے ہفت روزہ "جدید کشمیر"، ستمبر ۱۹۵۲ء، ص : ۱۰ -
۲۰ے "کلام فوق"، طبع دوم، ص : ۱۹۰ -
۲۱ے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۲۱۔ فروری ۱۹۸۱ء
۲۲ے ہفت روزہ "انصاف"، راولپنڈی - ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء
۲۳ے دیباچہ "کلام فوق"، طبع دوم۔
۲۴ے "شیرازہ" فوق نمبر، ص : ۷۰ -

۲۵ے "شیرازہ" سرینگر کشمیر (فوق نمبر) ص : ۷ -

۲۶ے روزنامہ "جنگ"، راولپنڈی، ۲۳ ر فروری ۱۹۷۰ء

۲۷ے عبدالمجید سالک، "سرگزشت" ،لاہور : قومی کتب خانہ ، ریلوے روڈ ،
طبع اوّل، ۱۹۵۵ء - ص : ۵۰۶ -

۲۸ے شیرازہ فوق نمبر، سرینگر، ص : ۸۵ -

۲۹ے "قومی زبان" یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء ، ص : ۱۸ -

۳۰ے ہفت روزہ "جدید کشمیر" مظفر آباد ، ۱۵ر اگست ، ۱۹۵۴ء -

۳۱ے ماہنامہ "مخزن"، لاہور، جون ۱۹۰۹ء - ص : ۱۴ -

۳۲ے مُفتی ضیاء الدین ضیا، "نوحہ کشمیر"، پونچھ، سن اشاعت درج نہیں، ص : ۳ -

۳۳ے ہفت روزہ "جدید کشمیر" مظفر آباد، ستمبر ۱۹۵۳ء ، ص : ۵ .

۳۴ے "سرچشمہ" گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ، مارچ ۱۹۸۵ء ، ص : ۵ -

۳۵ے "منتخب مقالاتِ اقبال" ، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ، لاہور : اقبال اکادمی پاکستان،
طبع دوم، ۱۹۸۳ء - ص : ۴۸۹ -

۳۶ے میر غلام احمد کشفی : "کشمیر ہمارا ہے" ، لاہور : کلاسیک، طبع اوّل ، ۱۹۶۵ء -
ص : ۸۳ - ۸۲ -

۳۷ے "آتشِ چنار" طبع اوّل ، ص : ۲۷۳ -

۳۸ے

I.C.Bilqees Tasir: "The Kashmir of Sheikh Mohammad Abdullah" Lahore: Feroz Sons Ltd. Ed I, 1986. P. 287.

متفرقات فوق

باب ۷

متفرقاتِ فوق

اس باب میں متفرق موضوعات پر فوق کی مصنفہ، مؤلفہ اور مرتبہ کتابوں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ ان کی ان کتابوں کی ایک خاص تعداد سفرنامے سے متعلق ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

"سفرنامہ کشمیر"
"رہنمائے کشمیر"
"شاہی سیر کشمیر"
"دیہاتی و پنچایتی سفرنامہ"
"پنڈت جواہر لعل نہرو کا سفرنامہ کشمیر" (غیر مطبوعہ)
"سفرنامہ ڈھاکہ" (بنگال)

ان کتابوں میں سے سفر نامہ ڈھاکہ کے علاوہ تمام کتابیں کسی نہ کسی حوالے سے سیاحتِ کشمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔ سیاحتِ کشمیر فوق کا ایک مستقل مشغلہ تھا۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری ”سرگزشت فوق“ اور ان کے شعری مجموعوں ”کلام فوق“ اور ”نغمہ وگلزار“ میں بھی سیاحت کشمیر کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔

”سفر نامہ ڈھاکہ“ بھی ”سفر نامہ کشمیر“ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس سفر نامے میں فوق نے ڈھاکہ اور کشمیر کی مماثلتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ دراصل وادیٔ کشمیر فوق کے لہو میں رَچ بس گئی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتے ذہنی طور پر کشمیر سے الگ نہ ہوسکتے۔ لاہور میں مستقل قیام کے دوران وہ کشمیر کی زلف کے اسیر رہے۔

ان تمام سفر ناموں میں کشمیر سے فوق کی والہانہ محبت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فوق نے ان سفر ناموں کو اپنے مشاہدات اور تاریخی معلومات کی بنیاد پر تحریر کیا ہے۔ انھوں نے تاریخ کو اپنے مشاہدات میں سمو دیا ہے۔ اور اس طرح ماضی وحال کو باہم آمیخت کر دیا ہے۔ وہ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں بھی ہمیشہ فکر مند رہے۔ ان سفر ناموں میں بھی ان کا روایتی، بیانیہ سلوک برقرار رہا۔ البتہ مختلف جگہوں کی منظر کشی کے دوران اور اپنی کچھ ذاتی واردانوں کو بیان کرتے ہوئے ان کی تحریریں کہیں کہیں چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔

اگرچہ ہمارے ہاں ان دنوں سفر نامے نے خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور سفر نامہ پھیل کر ناول اور آپ بیتی کی حدود میں داخل ہوگیا ہے۔ کچھ ناول تو سیدھا سیدھا سفر نامہ بن گئے ہیں۔ کئی معروف لکھنے والوں کی وجہ شہرت صرف سفر نامہ ہے لیکن اُردو ادب میں سفر نامہ کچھ آج کی چیز نہیں۔ اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو سفر نامہ اُردو کے نثری ادب میں خاصی قدامت کا حامل نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں یوسف کمبل پوش کے سفر نامہ ”عجائبات فرنگ“ کا نام بطور خاص لیا

جاسکتا ہے جو ۱۸۷۴ء میں مطبع منشی نول کشور میں شائع ہوا۔[۱]

ابتدائی سفرنامے کی روایت کو استحکام بخشنے والوں میں سر سید احمد خان، سر عبدالقادر اور مولانا شبلی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں فوق کی سفرنامہ نگاری کم اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ بھی اسی دور میں سفرنامہ لکھ رہے تھے۔

اردو میں کشمیر کی سیاحت نگاری کے حوالے سے انھیں اوّلیت حاصل ہے۔ اب جب کہ ذرائع آمدورفت کی سہولتیں عام ہوگئی ہیں۔ لوگوں نے سفر کشمیر کے بعد اپنے تجربات کو تحریری شکل دینا شروع کر دی ہے۔ جب ۱۹۰۷ء میں فوق نے سفرنامہ کشمیر تحریر کیا تھا تو ذرائع آمدورفت بالکل محدود تھے اور دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ فوق کے سفرنامے میں ان مشکلات کا بیان بہت دلچسپ ہے اور اس میں وہ ہدایات بھی درج ہیں جن پر عمل کر کے لوگ اس زمانے میں سفر کی اضافی کوفت سے بچ سکتے تھے۔ ان کی کتاب "رہنمائے کشمیر" ایک ہدایت نامہ ہے جس کی افادیت آج بھی مسلمہ ہے۔ ان سفرناموں میں اہلِ کشمیر کی فلاح و بہبود کا جذبہ فوق کے ہاں بدرجہ اُتم دکھائی دیتا ہے۔ "دیہاتی اور پنچایتی سفرنامہ" کشمیر کے دیہاتی علاقوں میں تعمیر و ترقی کی راہ ہموار کرنے کے لیے اختیار کیے گئے سفر کی روداد ہے۔ البتہ "پنڈت نہرو کا سفرنامہ کشمیر (غیر مطبوعہ) نسبتاً سیاسی نوعیت کی تحریر ہے مگر یہاں بھی کشمیر کی آزادی اور خوشحالی کی لگن فوق کی ترجیحات میں شامل ہے۔ یہ سفرنامہ کشمیر کے سیاسی حالات کی کئی انوکھی تصویریں سامنے لاتا ہے۔ نہرو کی تقریروں کے اقتباسات اور مختلف جلسوں کی رپورٹوں کی وجہ سے یہ تحریر ایک مکمل سفرنامہ نہیں بن سکی مگر چونکہ فوق نے اس کتاب کا یہی نام رکھا ہے اور مختلف علاقوں میں نہرو کے سفر و قیام کے بیان نے اسے کسی حد تک سفرنامے کی شکل دے دی ہے۔ فوق کی مؤلفہ کتاب "شاہی سیر کشمیر" کی نوعیت تاریخی بھی ہے مگر فوق کے انداز بیان نے تاریخ کو سفرنامہ بنا دیا ہے۔

فوق کے سفرنامے میں تاریخ کا انداز ملتا ہے۔ یہاں ان کی گوناگوں حیثیتوں اور اہلیتوں کے اعتبار سے ایک رنگارنگی پیدا ہوگئی تھی جسے انھوں نے جامعیت کا روپ دینے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھنے کے بعد آسانی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ فوق کی تحریر ہے۔ بالخصوص کشمیر سے متعلق ان کی تحریروں میں ایک مخصوص انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ انفرادیت ہر صنف سخن میں اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ یہ انفرادیت کشمیر سے ان کی والہانہ وابستگی اور ان کی دلچسپ سادگیٔ بیان سے مل کر ترتیب پاتی ہے۔

سفرنامے کے علاوہ فوق کی متفرق تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

"امتحان پاس کرنے کا گر"

"ماتم پہلوانی"

"حالات دربار بھمبھر"

"زنانہ حاضر جوابیاں"

"دیوان حافظ کی تاریخی فالیں"

"جغرافیہ ریاست پونچھ"

"مضامین فوق" (غیر مطبوعہ)

ان کتابوں کے ناموں سے ہی موضوعات کے تنوع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "جغرافیہ ریاست پونچھ" ایک درسی کتاب ہے مگر اس میں سفرنامے کا سا انداز ملتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی اس کتاب سے جغرافیہ، تاریخ اور سفرنامہ کی یکجائی کے اسلوب کو تقویت ملتی ہے۔ فوق کی کئی دوسری کتابیں بھی کشمیر کے مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ طالب علموں کے معاملات سے فوق کی دلچسپی ان کی کتاب "امتحان پاس کرنے کا گر" سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فوق کے دیباچے کے مطابق یہ کتاب ایک

انگریزی رسالے سے ماخوذ ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ ترجمہ نہیں۔ یہ کتاب فوق کی تالیفات کے ذیل میں آتی ہے "زنانہ حاضر جوابیاں" اور "دیوانِ حافظ کی تاریخی فالیں" بھی مؤلفہ کتابیں ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت یہ ہے کہ اُردو ادب میں ان موضوعات پر اس طرح کی کتابوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ فوق نے اپنے سادہ اور دلچسپ انداز تحریر کی وجہ سے ان کتابوں میں اپنی شخصیت کا رنگ شامل کر دیا ہے چنانچہ ان تالیفات کی اہمیت تصنیفات سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔ "مضامینِ فوق" (غیر مطبوعہ) میں وہ تمام مضامین شامل کر دیے گئے ہیں۔ جو فوق کی زندگی میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ان میں سے کچھ مضامین متعلقہ کتابوں میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے ان مضامین میں زیادہ تعداد تاریخی مضامین کی ہے۔ ادبی اور تہذیبی موضوعات کے حوالے سے بھی کچھ تحریریں موجود ہیں۔ فوق کی متفرق کتابوں میں سے یہ کتاب اہم ہے کیونکہ یہ خود متفرق مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے ذریعے مضمون نگار کے طور پر فوق کی ایک اور حیثیت سامنے آئی ہے مگر یہ کوئی ان کی اضافی حیثیت نہیں بنتی۔ ان مضامین میں فوق کا کوئی نیا انداز سامنے نہیں آتا اور نہ ہی فوق کی یہ تحریریں مضمون نگاری کی تحریک کے تسلسل میں رکھ کر دیکھی جا سکتی ہیں، جسے سر سید احمد خان نے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ باقاعدہ رواج دیا۔ چونکہ اب یہ مضامین ان کی کسی کتاب کا حصہ نہیں بن سکے اس لیے انھیں علیحدہ مجموعے کی شکل میں شائع کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مصنفہ اور مؤلفہ کتابوں کے علاوہ فوق کی مرتبہ کتابیں بھی ملتی ہیں۔ چند کتابیں انھوں نے فرمائش کر کے دوسروں سے لکھوائیں اور اپنے اشاعتی ادارے "ظفر برادرس" لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیں۔ ہم نے فوق کی مرتب کی گئی کتابوں کو اقوال، شاعری اور مضامین کے عنوانات سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اقوال

"ناصح مشفق"

"آئینۂ اخلاق"

"حکمت کے موتی"

شاعری

"گلشن نوبہار"

"روایات اسلام"

"ہمدرد زمینداران"

"اذان بُت کدہ"

"قومی ترانے"

"دیہات سدھار"

مضامین

"اخبار نویسوں کے حالات"

"محمد بن قاسم"

"کشمیر کی رانیاں"

"مولانا غنی"

"جمال الدین افغانی"

"ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے"

"استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" (غیر مطبوعہ)

اگرچہ مرتبہ کتابوں کی اہمیت مصنفہ اور مؤلفہ کتابوں سے کم ہوتی ہے مگر ان سے مرتب کے ذہنی رویوں اور دلچسپیوں پر روشنی پڑتی ہے اور بہت سا مواد اکٹھا مل جاتا ہے۔

فوق صحافت سے بھی متعلق تھے۔ ان کے پاس ملک کے طول و عرض سے مضامین نظم و نثر اشاعت کے لیے آتے تھے۔ تبصرے کی غرض سے کتابیں بھی ان کو بھیجی جاتی تھیں۔ وہ یوں بھی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ ان کے پاس مختلف موضوعات پر ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ ان کے علاوہ اِن کا اپنا ایک اشاعتی ادارہ بھی تھا۔ وہ اپنے زمانے کے معروف ناشر تھے۔ اپنی اکثر کتابیں انھوں نے ظفر برادرس کے تحت خود شائع کیں۔ کچھ دوسرے لوگوں کی کتابیں بھی شائع کیں۔ ان کتابوں میں "مولانا غنی" "کشمیر کی رانیاں" "محمد بن قاسم" اور "جمال الدین افغانی" شامل ہیں۔ ان کتابوں کے نام بھی کتابیات فوق کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ کتابیں ظفر علی خاں۔ خواجہ حسن نظامی اور اکبر شاہ نجیب آبادی جیسے معروف ادیبوں نے تحریر کی تھیں۔ لوگ فوق کی وساطت سے اپنی کتابیں شائع کرانے میں عزت محسوس کرتے تھے۔ کلیم اختر اپنے مضمون "کشمیر کے ناشرین" میں لکھتے ہیں۔

> "جہاں تک علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کا تعلق ہے۔ یہاں پر یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ اس کا سہرا منشی محمد دین فوق مرحوم کے سر ہے جنھوں نے کشمیر کے مسائل کو اپنی زندگی میں سمو دیا تھا اور نہ صرف کشمیر پر کتابیں تحریر کیں بلکہ ان کی اشاعت اور فروخت کا انتظام کیا۔ اپنے بیٹوں ظفر احمد اور ظفر الحق کے نام پر ظفر برادرس تاجران کتب کے نام سے ایک ادارہ کھولا۔ اس ادارے نے بے شمار کتابیں شائع کیں۔"[۲]

فوق نے اپنے اشاعتی ادارے سے جو کتابیں شائع کیں وہ وسیع پیمانے پر

فروخت ہوتی تھیں۔ فوق کی کچھ کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ فوق کی مرتب کردہ کتابوں کو ہم نے تین علیحدہ علیحدہ حصّوں میں تقسیم کر کے جائزہ لیا ہے۔ جہاں تک اقوال پر مبنی کتابوں کا تعلق ہے تو ان کی اہمیت ہر دَور اور ہر معاشرے میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ہر زبان میں ان کا ذخیرہ موجود ہے۔ جب ناخواندہ تہذیب کا زمانہ تھا تو کہاوتیں یا اکھان گفتگو میں استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کی اہمیت آج بھی مسلّمہ ہے۔ ان کہاوتوں میں حکمتوں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اقوال اختصار اور ایجاز کا ایک امتزاج ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک قول زندگی بھر کے تجربوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ احادیث رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تاثیر اور جامعیّت اور اختصار کے اعتبار سے اقوال کی ارفع ترین مثالیں ہیں۔ خلیل جبران نے اس فن کو باقاعدہ ترویج دینے کی کوشش کی۔

ایسی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کے دوران فوق کے ذہن میں اصلاح اور فلاح کا خیال موجود تھا۔ فوق نے "ناصح مشفق" اور "آئینۂ اخلاق" اور "حکمت کے موتی" میں جو اقوال جمع کیے ہیں ان کی زیادہ تعداد دوسری کتابوں میں بھی مل جاتی ہے۔ کچھ اقوال ایسے بھی ہیں جو خاص حیثیّت رکھتے ہیں۔ البتہ یہ بات بہت اہم ہے کہ ان کتابوں میں سینکڑوں ایسے اقوال اکٹھے کر دیے گئے ہیں جو کئی کتابیں پڑھنے کے بعد بھی انسان کے پاس جمع نہیں ہو سکتے۔ فوق نے بہت ذوق و شوق سے یہ اقوال مرتب کیے جو کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ کتاب اُٹھا کر دیکھیں تو آدمی ایک اثر آفرینی کی بوقلمونی میں ڈوب جاتا ہے۔ فوق نے ہر مذہب و ملّت کے بڑے لوگوں کے اقوال کا انتخاب کیا ہے۔ بعض مقولے آفاقی حیثیت کے حامل ہیں جو ایک عالمی اور دائمی نوعیّت کی سچائی بن جاتے ہیں۔ فنی اور مقصدی پہلو سے یہ درجۂ کمال کی بات ہوتی ہے۔ فوق نے اپنی کتابوں میں جو اقوال جمع کیے ہیں وہ اخلاق و کردار کی تربیت میں مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اقوال پر مبنی

فوق کی کتابوں کے کتابوں کے نام بھی اپنے موضوع کی وضاحت کرتے ہیں۔

شاعری کے حوالے سے فوق نے متعدد کتابیں مرتب کر کے شائع کیں جن کی فہرست پہلے دی جا چکی ہے۔ مولانا حالی اور مولانا آزاد نے اصلاح قوم کے لیے موضوعاتی نظمیں لکھنے کا جو اسلوب اختیار کیا تھا نظموں کے یہ انتخاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان منتخب شعری مجموعوں کو دیکھ کر فوق کے زمانے کا شعری منظر نامہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون لوگ قومی اور ملی پس منظر میں شاعری کر رہے تھے۔ فوق کی مرتبہ کتاب "گلشن نو بہار" کو چھوڑ کر جو غزلوں کا انتخاب ہے باقی تمام کتابیں ملت اور وطن کی محبت کے جذبے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اور قوم و معاشرے کی فلاح و اصلاح کا مقصد ان کتابوں میں بھی فوق کے پیش نظر تھا۔ ان مرتبہ مجموعوں میں ایسے شعراء کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ جو غیر معروف ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ فوق اپنے زمانے میں لکھنے والے تمام لوگوں سے باخبر تھے اور اپنے معاصرین کے ساتھ مکمل رابطہ رکھتے تھے۔ شعری معیار کے لحاظ سے ان مجموعوں میں شامل نظموں کا مقام متعین کرنا ایسا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ لوگوں کو بھلائی کی طرف راغب کرنے کے لیے شاعری کا مؤثر وسیلہ اختیار کیا گیا ہے البتہ ان مجموعوں کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ فوق نے نظموں کے انتخاب میں شعری ذوق کو معیار بنایا۔ وہ خود شاعر تھے۔ لہٰذا اس کام میں انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

ہندوؤں کے نعتیہ انتخاب "اذان بتکدہ" کو چھوڑ کر تمام کتابوں کا آغاز علامہ اقبال کی نظموں سے کیا گیا ہے۔ یہ بات اقبال کے ساتھ فوق کے گہرے مراسم اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شاعری کی ان مرتبہ کتابوں کے مطالعہ سے اس زمانے کے شعری رجحان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا

ہے ۔ یہ کتابیں شعروادب کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے کے لیے بھی معاون ہو سکتی ہیں۔

فوق کی مرتبہ کتابوں میں "اخبارنویسوں کے حالات" بہت اہم اور اپنی نوعیت کی بہت منفرد کتاب ہے۔ بحیثیت مرتب کے بھی یہ کتاب فوق کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ایک ثبوت ہے۔ اس میں اس وقت کے اخبارات و جرائد کے مدیران کے حالات شائع کیے گئے ہیں۔ اکثر مدیران نے اپنے بارے میں خود تحریر کیا ہے۔ فوق نے بھی اپنے بارے میں ایک تحریر شامل کر دی ہے جو ان کی زندگی کے بعض اہم حالات سامنے لاتی ہے۔ مختلف مدیران کی یہ تحریریں ان کی مختصر خودنوشت سوانح عمریاں ہیں۔ اسے ایڈیٹروں کا آپ بیتی نمبر بھی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ کچھ مضامین ایڈیٹروں کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کی بنا پر فوق نے مرتب کیے ہیں۔ ڈاکٹر شاہ علی نے اخبارنویسوں کے حالات کا تجزیہ سوانح عمری کے طور پر کرنے کی کوشش کی ہے۔[۳۵]

ڈاکٹر شاہ علی نے موضوع کی انفرادیت کے اعتبار سے اس کتاب کو خصوصی طور پر قابلِ ذکر سمجھا ہے۔

"ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" اور "استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" لطائف کے مجموعے ہیں جو دلچسپی اور خوش طبعی کے علاوہ تہذیبی اور تعلیمی ماحول کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ لطائف صرف ہنسنے اور ہنسانے کی چیز نہیں ہوتے۔ ان میں کئی رموز پنہاں ہوتے ہیں۔ لوگوں نے ان سے اصلاح کا کام بھی لیا۔ ان تین کتابوں کے علاوہ دوسری چار کتابیں فوق کے اہم ہم عصر اہلِ قلم کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں سے صرف "محمد بن قاسم" ایسی کتاب ہے جس میں اس نوعمر سپہ سالار کے بارے میں چند شعرا کی نظمیں شامل کرکے اسے باقاعدہ ایک مرتبہ کتاب بنا دیا گیا ہے ورنہ "کشمیر کی رانیاں"، "جمال الدین افغانی"، "مولانا غنی" کے سلسلے میں فوق کی حیثیت ایک ناشر کی ہے۔

"سفرنامے"

سفرنامہ کشمیر

"سفرنامہ کشمیر" پہلی بار ۱۹۰۷ء میں ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ کتاب میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ رسالہ کس ادارے کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ ۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ٹائیٹل پر وادیٔ کشمیر کا نقشہ دیا گیا ہے۔ کشمیر کے کوہستانی علاقوں میں سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ فوق نے جس عزم و ہمت کے ساتھ کشمیر کا سفر اختیار کیا اُنھوں نے یہ سفر کئی بار اختیار کیا۔ فوق نے سفر کی مشکلات کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ سیاحتِ کشمیر کے لیے نکلنے والوں کو تمام صورتحال سے باخبر کر دینا چاہتے تھے۔

فوق نے بڑی تفصیل سے پورے راستے کی کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ راستے میں جتنے پڑاؤ پڑے جو شہر، قصبے اور گاؤں آئے فوق نے ان کا ذکر کیا ہے۔ گھوڑا گلی، مری، کوہالہ کا ذکر بڑی دلچسپی سے کیا ہے۔ اس سفرنامے میں یہ بات بڑی دلچسپ ہے۔ جو فوق نے محصول کے مسئلے پر چونگی خانے کے بارے میں لکھی ہے۔ یہ احوال آج کے محکمہ کسٹم کے معاملات سے بے حد مشابہت رکھتا ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

"علی الصبح ڈاکٹری معائنہ کے بعد چونگی خانہ میں پہنچے۔ یہاں اسباب کی خوب دیکھ بھال ہوتی ہے۔ یارقندی اور لداخی اسباب پر مہریں لگا دی گئیں۔ میرا اسباب بھی دیکھا۔ یہاں تھا ہی کیا۔ کچھ پرانے اور کچھ دھلے ہوئے کپڑے، کچھ "کشمیری میگزین" کی کاپیاں اور کچھ اشتہارات۔ ایک چھوٹے سے بنڈل میں دو سو مطبوعہ کارڈ۔ جب کوئی قابلِ محصول چیز نہ ملی تو سٹپٹائے۔ آخر کارڈوں پر ایک پیسہ محصول لگا دیا۔ میں نے بھی

اس خیال سے کہ نظر نہ لگ جائے کوئی حجت نہ کی۔ یہاں یہ بڑا ظلم ہے کہ ذاتی استعمال کے نئے سلے ہوئے کپڑوں کو بھی بغیر محصول کے نہیں چھوڑتے۔ ایک شخص کی حالت قابلِ ذکر ہے۔ راہ میں چونکہ بارش وغیرہ کا خطرہ تھا اس نے اس خیال سے کہ کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ نئے کپڑے تو گٹھڑیوں میں بند رکھے اور پرانے پہن لیے۔ مگر محصول والوں نے ایک کپڑا بھی بغیر محصول کے نہ رہنے دیا۔ یہاں تک کہ اس کی ذاتی جوتیاں۔ اس کی عورت کا دوپٹہ اور کرتہ اور اس کے بچوں کے پارچات بھی نہ بچ سکے۔ محصول جب چھ سات آنے کے قریب دینا پڑا تو بیچارے نے افسوس کے لہجہ میں کہا۔ کپڑے میلے ہو جاتے تو بلا سے۔ یہ چھ سات آنے تو نہ دینے پڑتے خراب ہونے کی صورت میں ایک آنہ کے صابن سے گھر ہی میں صاف ہو سکتے تھے۔"

(ص : ۵)

فوق نے ان مشکلات کے علاوہ کٹے پھٹے راستوں اور مخدوش پلوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ دورانِ سفر کالے اور گورے صاحبوں کی جو درگت بنتی تھی، فوق نے اپنا یہ مشاہدہ بھی بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے پل پر سواریاں رک گئیں تو فٹنوں اور تانگوں والوں نے کرائے بڑھا دیے۔ فوق نے اس حالتِ زار کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"کئی انگریز گھٹنوں تک کیچڑ میں لت پت تھے۔ دو انگریزوں نے جو آئیسکلو پر آئے تھے بڑی مشکل سے مزدوروں کو دو چار روپے دے کر بیس پچیس قدم کا فاصلہ طے کیا۔ ایک میم صاحبہ بھی صاحب بہادر کے ساتھ تھیں۔ صاحب بہادر نے بہت زور لگایا کہ کسی طرح میم صاحب دیسی مزدور کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں اور نزاکت و نفاست کا خیال نہ کریں مگر میم نے باوجود اصرار کے دیسی مزدور کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اسے بار برداری کا جانور ہی بنا لے۔ آخر میم اور صاحب ہاتھ میں ہاتھ دیے بیم ورجا کی حالت

میں گزرنے پر تیار ہو گئے تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں“ (ص : ۷)

سفر نامہ لکھتے ہوئے فوق تمام معاملات اور مناظر کی جزئیات پر نگاہ رکھتے تھے اسی لیے وہ سفر کی کہانی بڑے مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس سفر کے بعد دوسرے باب میں سرینگر اور اس کے ملحقہ علاقہ جات کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی ہیں۔ فوق لکھتے ہیں :

”شہر کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ جس میں سوا لاکھ کے قریب مُسلمان ہیں۔ بازار تو عموماً صاف ہیں مگر بعض گلیوں میں ایسی عفونت و غلاظت رہتی ہے کہ کوئی بھلا آدمی ادھر سے گزر نہیں سکتا۔ شہر میں مندر، مسجدیں، زیارتیں اور متبرک مقامات بے حد حساب ہیں۔ کمیٹیاں بھی بہت ہیں۔ حیرت ہے کہ مُسلمانوں کی انجمن صرف ایک ہے یعنی نصرت الاسلام“۔ (ص : ۱۵)

شہر کے تذکرے کے بعد فوق نے سرینگر اور کشمیر کی بعض اہم شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوق کثیر الاحباب اور مخلص انسان تھے۔ فوق صاحب نے اپنے آپ کو سرینگر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ وادئ کشمیر کے مختلف قابل دید مقامات کا تذکرہ کیا ہے جن میں لنگیٹ۔ ہندواڑہ۔ زچل ڈارا۔ راجپور وغیرہ کی سیر کا احوال بھی لکھتا ہے۔ ”سرینگر کے قابلِ دید مقامات“ کے عنوان سے ایک علیحدہ باب تحریر کیا ہے جس میں مختلف زیارت گاہوں، مقبروں، مسجدوں اور عجائب گھروں اور لائبریریوں کا ذکر کیا ہے۔ ”کشمیر کے باغ اور چشمے“ کے عنوان سے بھی ایک باب لکھا ہے جس میں فوق نے خوبصورت منظر نگاری کی ہے اور کشمیر کی دلفریبیوں کا بڑے دلآویز انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ کشمیر کے قابلِ دید مقامات کے علاوہ فوق نے کشمیری مُسلمانوں کی سماجی اور مجلسی زندگی پہ بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُنھوں نے ایک باب بعنوان ”کشمیری مُسلمان“ اس مقصد کے لیے وقف کیا ہے۔ اس باب میں اُنھوں

نے مسلمانوں کی عمومی پسماندگی غربت وجہالت کے ساتھ ان کے رسوم و رواج کا تذکرہ بھی کیا ہے جن میں پیدائش، اموات، شادی بیاہ اور دوسری مصروفیات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے انداز سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلی مرتبہ کشمیر نہیں گئے کیونکہ اتنی گہری معلومات محض ایک سیاح کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یہ باتیں تو وہی شخص جان سکتا ہے جو وہاں طویل عرصے تک رہتا رہا ہو۔ ان کے گھروں میں آیا گیا ہو اور اس نے ان کی خوشی وغم کی محفلوں میں شرکت کی ہو۔ انھوں نے کشمیری مسلمانوں میں تعلیم کے فقدان پر بہت افسوس کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کی جاہلانہ رسومات پر بڑے دکھ سے تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہت بری دیکھی۔ ان کی مالی اور اخلاقی حالت بھی قابلِ رحم ہے۔ ان لوگوں میں جن کے مذہب میں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کے لیے بھی علم جیسی نعمت کا حاصل کرنا ضروری ہے کوئی سلیقہ دیکھا نہ کوئی ہنر۔ نہ بات کرنے کی تمیز۔ نہ ان کے بدن پر کوئی کپڑا نظر آیا جو ان کے افلاس کا بین ثبوت تھا۔"

(ص : ۵۱)

فوق نے اس تلخ حقیقت کے اظہار کے بعد کشمیر کے ان باکمال لوگوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جنھوں نے دینی مدارس میں روایتی قسم کی تعلیم حاصل کی لیکن بڑا نام کمایا اور علاقے کا نام بھی روشن کیا۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کے نام بھی تحریر کیے ہیں جن میں غنی کاشمیری۔ ملّا فائق۔ مرزا طالب کلیم۔ خواجہ محمّد اعظم۔ حیدر ملک اور حسن شاہ کے علاوہ بھی کئی لوگ شامل ہیں جن کی شہرت فوق کے بقول پورے ہندوستان تک اپنا اثر رکھتی ہے۔ فوق نے کشمیر کی شاعرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے جہاں کشمیر کے اولیائے کرام کا بڑی عقیدت سے تذکرہ کیا ہے، وہاں پیر پرستی اور تعویذ گنڈوں کے کاروبار پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ تعلیم کے فقدان اور عمومی جہالت کے باوجود

فوق اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کشمیری بحیثیت مجموعی نیک دِل اور سیدھے سادھے ہوتے ہیں البتہ مفاد پرست لوگوں نے ان کی عادتوں کو بگاڑ دیا۔ فرقہ پرستی اور فتنہ پردازی کی بنیاد پر ان میں باہمی نفاق اور عداوت پیدا کر دی جس سے کئی بُری رسمیں، روایتیں جڑ پکڑ گئیں۔ دیہاتوں اور قصبوں میں کھُلے عام مُسلمان مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں بلا تمیز سِن وسال جوا کھیلتی ہیں۔ مختلف تہواروں پر اسے اجتماعی طور پر ایک رسم کی شکل دے دی گئی ہے۔ فوق نے بڑے دُکھ سے بتایا ہے کہ حاکموں اور امیروں کو غریب کشمیریوں پر اتنے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ جب اور جسے چاہتے ہیں زبردستی بیگار میں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ یہ سفرنامہ صرف ایک سیاح کے مشاہدات ہی نہیں بلکہ فوق جب سفر پر نکلتے تو ایک تاریخ کو جاننے والا شخص بھی ان کا ہم سفر بن جاتا تھا۔ ایک دردمند آرٹسٹ بھی ان کے اندر جاگ پڑتا، ان کی نگاہیں نہ صرف منظروں میں سمٹ جاتی، بلکہ وہ پس منظر کا سراغ لگانے کی بھی مکمل کوشش کرتے۔ ان کا یہ سفرنامہ آج کے کشمیر کے بھی کئی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سفرنامے کے بارے میں رسالہ ''اصلاح سخن'' کی یہ رائے بہت بھرپور ہے۔

''منشی محمد دین صاحب فوق ایڈیٹر ''کشمیری میگزین'' لاہور پچھلے دنوں کشمیر گئے تھے۔ وہاں سے واپس آ کر انھوں نے اپنی سیاحت کے حالات ''سفرنامہ کشمیر'' کے نام سے مرتب کیے ہیں۔ اس میں سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ چشم دید واقعات ہیں اس لیے ہم اس کتاب کو سفر کشمیر کا بہترین رہنما کہہ سکتے ہیں۔ کشمیر ایسی جگہ ہے جس کی سیاحت کا شوق کم وبیش ہر زندہ دِل ہندوستانی میں پایا جاتا ہے۔ سیاحان کشمیر کو اثنائے سفر میں اس رسالے سے کافی مدد مل سکتی ہے اور جن لوگوں کو اس خطۂ جنت نظیر کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ اس سفرنامہ کی بدولت گھر بیٹھے سیر کا لُطف

اٹھا سکتے ہیں۔ یہ سفرنامہ اہل ہند کے لیے ایک دلچسپ و مفید کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سفر کشمیر کے لیے کتنے روپیہ کی ضرورت ہے، کس کس مقام پر قیام کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جملہ لوازم سفر پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ کشمیر کے مشہور قابلِ دید مقامات کا نہایت صحیح نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے۔ اس کے ساتھ یہاں کے باشندوں کے اخلاق و عادات، رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت پر بھی کافی بحث کی ہے۔ ہمیں کشمیر جانے کا اتفاق نہیں ہوا مگر ہم منشی محمد دین فوق کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیں گھر بیٹھے سیر کرا دی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سفرنامہ بہت سے لوگوں کو سفر کشمیر پر آمادہ کرنے کا محرک ہوگا۔"[۲۵]

"رہنمائے کشمیر"

ایک سو اٹھانوے صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں خادم التعلیم برقی پریس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ "رہنمائے کشمیر" فوق کے "سفرنامہ کشمیر" کی بنیاد پر لکھی گئی تھی۔ فوق نے اپنی کئی دوسری کتابیں بھی اسی انداز میں مرتب کیں۔ "رہنمائے کشمیر" اپنے نام کی مناسبت سے کشمیر میں سفر و سیاحت کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ وہاں کی تہذیب و ثقافت سے آشنائی حاصل کرنے میں بھی رہبری کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک معلوماتی کتاب ہے مگر فوق نے اپنے دلچسپ اسلوب کی بدولت اس میں سفرنامے کی دلچسپی بھی پیدا کر دی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے آدمی اپنے آپ کو کشمیر میں محسوس کرتا ہے۔ جو لطف کشمیر کے نظاروں کو دیکھنے کے بعد میسر آتا ہے وہی لطف اس کتاب کو پڑھنے کے دوران محسوس کیا جا سکتا ہے اور آدمی سیر کشمیر

کی خواہش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب کشمیر کی طرف سفر کی دعوت دیتی ہے۔ علامہ اقبال اپنے ایک خط میں فوق صاحب کو لکھتے ہیں :

"رسالہ" رہنمائے کشمیر" جو حال ہی میں آپ کے قلم سے نکلا ہے۔ نہایت مُفید اور دلچسپ ہے۔ طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مُفید ہوگا۔ افسوس کہ مَیں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی لیکن اب ممکن ہے کہ آپ کا یہ رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچے "۔[۵]

علامہ اقبال نے اس کے بعد کشمیر جا کر اسے سچ کر دکھایا۔[۶] یہ واقعہ اس کتاب کے اندر چھپی تاثیر کو ظاہر کرتا ہے ورنہ بالعموم ایسے موضوعات پر کتابیں خشک ہوتی ہیں اور سوائے سامنے کی معلومات کے ان میں کچھ نہیں ہوتا۔ "رہنمائے کشمیر" کے آغاز ہی میں جو انداز فوق نے اختیار کیا ہے اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نہ صرف کشمیر سے محبت رکھنے والا شخص بلکہ علم و ادب سے شغف رکھنے والا شخص ہم کلام ہو رہا ہے۔ فوق فصل اوّل میں سفر کے "قدیم ذریعے" کے عنوان سے لکھتے ہیں :

"کشمیر کے پہاڑوں میں اب بھی ایسی ایسی پگڈنڈیاں اور ایسے ایسے مقامات موجود ہیں جو برسوں اور صدیوں کے پامال شدہ گیاہِ سبز کی طرح مٹنے اور مٹائے جانے کے باوجود اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ آج سے سال ہا سال پہلے اس مٹی ہوئی لکیر کے اور تو اور بادشاہ اور شہنشاہ تک فقیر تھے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی"

ان رستوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فوق تاریخ کے مرغزاروں میں سفر

کرنے لگتے ہیں اور کشمیر کی طرف کھلنے والا دروازہ کشمیر کی تاریخ کی طرف بھی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی یلغاروں سے لے کر مہاراجہ گلاب سنگھ کی مدد کو پہنچنے والے سر لارنس ریذیڈنٹ لاہور کی فوج کشی تک تمام واقعات آنکھوں کے سامنے بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ قدیم راستوں کے علاوہ جدید سڑکوں کا تذکرہ بھی کتاب میں موجود ہے اس کے ساتھ نقشہ اور کرایہ نامہ تک درج ہے جس کی مدد سے کوئی آدمی باآسانی کشمیر پہنچ سکتا ہے۔ گھوڑوں کے قافلوں کے "تذکرے کے علاوہ موٹروں اور لاریوں کے اوقات بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ وہ کتاب کی تاریخی اور ادبی حیثیت بنانے کی دُھن میں یہ نہیں بھولتے کہ لوگوں نے یہ کتاب وادیٔ کشمیر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پڑھنی ہے۔ فصل چہارم میں مسافروں اور سیّاحوں کے لیے عام ہدایتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔ فوق اب سیدھے سادے انداز میں کشمیر کے بارے میں معلومات اور اطلاعات فراہم کرنے لگ جاتے ہیں۔ ڈاک خانے، تار گھر، شفاخانے، ڈاک بنگلے اور پھر مختلف اطراف سے کشمیر پہنچنے کے راستوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی کشمیر کا دلدادہ دشوار گزار رستوں میں بھٹک کر رہ جائے حتیٰ کہ کئی شہروں سے کشمیر کے مختلف مقامات تک پہنچنے کے لیے مکمل ہدایات تحریر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں خطۂ کشمیر کے نام سے جو بیان درج ہے اس کا عنوان "کشمیر آج سے چھ ہزار سال پیشتر" ہے۔ اب فوق کا سفر ماضی کی طرف ہے اور وہ اپنے قاری کو تاریخ کشمیر کے بہانے سے ماضی کی سیر کرانے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے خوبصورت مناظر پوری آب و تاب کے ساتھ آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ مناظر اس شخص کے دیکھے ہوئے ہیں جو کشمیر سے دلی محبت رکھتا ہے۔ صفحہ چونسٹھ (۶۴) پر رائے بہادر پنڈت شو نرائن صاحب شمیم ایڈووکیٹ

ہائی کورٹ لاہور کے بقول لکھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو زندگی میں ایک بار کشمیر ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ پھر "تزکِ جہانگیری" میں کشمیر کے لیے بادشاہ کی خصوصی محبت اور والہانہ پن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پہاڑوں، دریاؤں، چشموں، وادیوں، درختوں اور پھولوں کی بستی کشمیر کو "رہنمائے کشمیر" میں دیکھیں تو اس شعر پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

کتاب میں سترہ ابواب ہیں۔ کئی ابواب مختلف فصلوں پر پھیل گئے ہیں۔ کشمیر کے ہوٹلوں اور مسافروں کی عام ضرورت کے لیے کئی اہم معلومات کتاب میں موجود ہیں۔ وادیِ کشمیر کے قابلِ دید مقامات کی تفصیل شاید اس لیے لکھی گئی ہے تاکہ بے خبری میں کوئی سیاح کوئی مقام دیکھنے سے محروم نہ رہ جائے۔ الغرض "رہنمائے کشمیر" ایک مکمل گائیڈ کا درجہ رکھتی ہے۔ البتہ فوق نے اس معلوماتی کتاب کو ایک ایسی کتاب بنا دیا ہے جسے پڑھتے ہوئے آدمی لطف بھی محسوس کرتا ہے۔

میر ارشاد علی ارشد کی "کشمیر گائیڈ" رائل بک سٹال لاہور سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے دیباچے میں فوق کی کتابوں سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب بھی ادبی ہے۔ جگہ جگہ اشعار بھی موجود ہیں مگر اس کے مطالعہ سے کشمیر کے ساتھ تعلقِ خاطر محسوس نہیں ہوتا۔ جب کہ فوق نے نہ صرف قاری کی سہولت کا خیال رکھا ہے بلکہ اسے بیزار بھی نہیں ہونے دیا۔ ارشد صاحب کی یہ کتاب فوق کی کتاب کا چربہ نظر آتی ہے۔

"شاہی سیرِ کشمیر"

یہ کتاب دوسری بار ۱۹۳۰ء میں کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ

پرنٹرز شائع ہوئی۔ طبع اوّل دستیاب نہیں ہو سکی۔ نہ اس کتاب میں اس کی تاریخ اشاعت کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے۔ کتاب کی ضخامت بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتابچے میں فوق نے چار مغل بادشاہوں اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کی سیاحت کشمیر کا احوال تحریر کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں سر عبدالقادر کا ایک مضمون "عہد اکبری میں سفرِ کشمیر" شامل کیا گیا ہے۔ جو ان کے رسالہ "مخزن" کے اپریل ۱۹۱۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس کتاب کے دیباچے کا کام بھی دیتا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون اس کتاب کے لیے نہیں لکھا گیا تھا اس کے باوجود کتاب سے متعلق نظر آتا ہے۔

ہم نے اس باب کے پہلے صفحات میں بتایا ہے کہ اصل میں یہ مغل بادشاہوں کا سفرنامہ کشمیر ہے جو مختلف کتابوں کی مدد سے فوق نے مرتب کیا ہے اور یہ سیاحت کشمیر سے فوق کی وابستگیوں اور دلچسپیوں کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ کتاب دلچسپ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے فوق بھی ان بادشاہوں کے ہم سفر تھے۔ فوق کئی بار اپنے اس محبوب خطے کے کونے کونے میں خود گھوم چکے تھے۔ وہ تاریخی واقعات کے علاوہ تمام علاقے کی جزئیات سے واقف تھے۔ چنانچہ جب وہ کسی شخصیت کے سفرِ کشمیر کا حال بیان کرتے ہیں تو وہ اپنے بیان کی دلبستگی کی بدولت پڑھنے والوں کو بھی شریکِ سفر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ "شاہی سیر کشمیر" میں جس بادشاہ کا انھوں نے ذکر کیا ہے اس کے عہد کے کشمیر کی عمومی اور مجموعی حالت کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ خطے کی معاشی اور معاشرتی صورتِ حال کی عکاسی بھی کی ہے کبھی کبھی اپنے زمانے کے ساتھ ان حالات کا موازنہ بھی کرتے ہیں۔ شاہجہان کے ذکر میں امورِ انصاف کے واقعات کے بعد لکھتے ہیں:

"دوستو! یہ خالی باتیں ہی نہ تھیں۔ طفل تسلیوں کے لیے کاغذی ناؤ ہی نہیں چلتی تھی۔ حصولِ انصاف کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہا دینے کے باوجود مہینوں اور

برسوں تک انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ان باتوں پر عمل ہوتا تھا اور فوراً ہوتا تھا۔" (صفحہ: ۲۰)

"شاہی سیر کشمیر" میں علاقے کی زرعی اور صنعتی ترقی کا وہ ذکر بھی موجود ہے جو مغلوں سے پہلے شاہانِ کشمیر بالخصوص مسلمان زین العابدین کے زمانے کی یاد دلاتا ہے شہنشاہ اکبر کے ذکر میں صفحہ نمبر دس پر فوق لکھتے ہیں :

"بادشاہ کو کشمیر کی صنعت میں ایک سیاہی دکھائی گئی جو پانی اور ہاتھ کے مَلنے سے محو نہ ہوتی تھی اور لکھنے میں خط کو خراب نہ کرتی تھی۔ بادشاہ کشمیریوں کی اس صنعت سے بہت خوش ہوا اور ان کی ذہانت کی تعریف کی۔ اس سفر میں بادشاہ نے زینہ لنک کی سیر کی جو جھیل وُلر کے درمیان سلطان زین العابدین نے پانی سے ایک جریب کے قریب بلند چبوترہ پر بڑے تکلف سے ایک سو اُنیس گز لمبا اور بیاسی گز چوڑا بنوایا تھا۔" فوق نے سیر کشمیر میں جہانگیر کے حوالے سے بہت خوبصورت باتیں تحریر کی ہیں۔ جہانگیر عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ حسن و عشق کے معاملے میں مغل بادشاہوں میں خاص شہرت کا مالک تھا۔ اس نے کشمیر جنت نظیر کے نظاروں اور حسن پرور کیفیتوں سے جس طرح لطف اُٹھایا اس کا ذکر "تزک جہانگیری" میں بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب بذاتِ خود ایک ادبی شاہکار ہے۔ فوق نے "شاہی سیر کشمیر" میں جگہ جگہ "تزک جہانگیری" سے حوالے پیش کیے ہیں۔ وہ صفحہ سولہ پر لکھتے ہیں۔

"جہانگیر اکثر کہا کرتا تھا کہ کشمیر میری قلمرو میں بہشت رُوئے زمین ہے۔ اسی لیے وہ ہر سال کشمیر کی سیر کو جاتا تھا اس نے کشمیر کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کشمیر ایک باغ ہے سدا بہار ــ قلعہ ہے۔ آہنی حصار۔ بادشاہوں کے لیے ایک گلشن عشرت افزا ـــ درویشوں کے لیے خلوت کدۂ دلکشا ــ "تزک جہانگیری"، کا ایک ترجمہ "سیاحت کشمیر" کے نام سے میر غلام دستگیر نامی

نے مکتبہ دین و دنیا لاہور سے شائع کیا۔ ڈائری کے انداز میں کشمیر کے احوال و آثار جس میں بیان کیے گئے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں تاثرات اور روایات اس کتاب میں اسی انداز میں ملتی ہیں جو "شاہی سیر کشمیر" کے مطالعہ سے محسوس ہوتی ہیں۔ میر غلام دستگیر نامی کی اس کتاب کے بارے میں فوق صاحب کی رائے موجود ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

"میرے دوست میر غلام دستگیر صاحب نامی نے "تزک جہانگیری" کے اس حصہ کا جو جہانگیر کی سیاحت کشمیر کے متعلّق ہے۔ سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک جلیل القدر شہنشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ کتاب تحقیق اور راستی پر مبنی ہے۔ اس لیے ہر کسی کے مطالعہ کے قابل ہے۔ "تزک جہانگیری" بظاہر شہنشاہ کی سیر و سیاحت کا تذکرہ ہے لیکن اس کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں مظاہر فطرت و مناظر قدرت کی نیرنگیاں بھی نظر آئیں گی۔ بادشاہ نے اہل ہنر اور اہل فن کی جو قدر افزائیاں کی ہیں۔ ان کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ رستے کی تمام منزلوں کا ذکر اور ہر مقام کی وجہ تسمیہ اس کی آب و ہوا اور دیگر خصوصیات کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ وہاں کے باشندوں کی معاشرت ان کے تمدن اور ان کے دیگر حالات کو اس وضاحت سے اور ایسے دِل نشین انداز میں لکھا ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع و عظیم ملک کا شہنشاہ تصنیف و تالیف اور علمی مشاغل کے لیے کس طرح وقت نکال لیتا تھا۔"[۴۵]

چونکہ "شاہی سیر کشمیر" میں فوق نے جہانگیر کی سیاحت کا تذکرہ زیادہ کیا ہے اور تزک جہانگیری سے استفادہ بھی کیا ہے، اس لیے یہاں فوق کی یہ رائے نقل کی گئی ہے۔ فوق کی اس رائے کی روشنی میں "شاہی سیر کشمیر" کے جائزے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

"شاہی سیر کشمیر" کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ فوق کہیں بھی کشمیر کے سماجی حالات کو نظر انداز نہیں کرتے اور غلط رسوم و روایات اور معاشرتی بے اعتدالیوں کو بڑے دُکھ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور ان کی اصلاح کے لیے کی گئی کوششوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔

"شاہی سیر کشمیر" میں ایک مقام اسلام آباد کا ذکر ملتا ہے۔ اسلام آباد مملکت پاکستان کا صدر مقام بھی ہے۔

سیاحت کشمیر میں سب سے مختصر حال اورنگ زیب کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اورنگ زیب صرف ایک بار کشمیر کے سفر پر آیا تھا۔ بادشاہوں کی سیر کشمیر کے دوران خلق خدا کی مصیبتوں، تکلیفوں کا فوق نے اس کتاب میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ دشوار گزار رستوں پر بہت بڑے لاؤ لشکر سمیت بادشاہ کے آرام و آسائش کے لیے انتظام کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس پر کشمیر کے موسمی حالات، بارشیں اور سیلاب کی وجہ سے لوگ عذاب میں پھنس جاتے تھے۔ کئی موقعوں پر سینکڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ فوق لکھتے ہیں:

"لیکن کچھ رستے کی تکلیفات، آدمیوں اور جانوروں کے اتلاف، وزیر اور دیوان کی موت کی وجہ سے اورنگ زیب کا غُنچۂ خاطر چمنستان، کشمیر میں ناشگفتہ ہی رہا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ضروری امورات ملکی کے بغیر یہاں صرف سیر و شکار کے لیے بادشاہوں کا آنا رائے صائب کے خلاف ہے۔ آخر بادشاہ تین ماہ کے قیام کے بعد لاہور واپس چلا آیا۔" (صفحہ: ۳۰)

اسی صفحہ پر فوق پرانے زمانے کی عمارات اور دلآویز مقامات کو یاد کرتے ہیں جو کھنڈرات بن چکے ہیں۔ یہاں وہ دُنیا کی بے ثباتی پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ خطۂ کشمیر کا چپہ چپہ جو مغلوں کی گزرگاہ رہا اور وہاں بادشاہوں کے عیش و آرام کے لیے

کیا گیا سامان مہیا نہ کیے گئے اب ان کے نام ونشان تک نہیں ملتے ۔فوق کی یہ کتاب ان یادگاروں کو محفوظ کرنے کی ایک کوشش ہے۔

"دیہاتی وپنچایتی سفرنامہ"

ماہنامہ" دیہاتی دنیا" سرینگر کے ستمبر اور اکتوبر ۱۹۴۱ء کے شماروں میں فوق کی ایک تحریر" دیہاتی وپنچایتی سفرنامہ" کے نام سے دستیاب ہوئی ہے جو دو قسطوں پر مشتمل ہے۔ اس تحریر پر ابوظفر کشمیری کا نام درج ہے جو فوق ہی کا قلمی نام ہے۔ وہ اپنے صاحبزادوں ظفر الحق اور ظفر احمد کے حوالے سے ابوظفر کی کنیت سے بھی لکھا کرتے تھے۔ اسی رسالے کے جولائی ۱۹۴۲ء کے شمارے میں" پنچایتوں کی برکات اور ان کے فوائد" اور اگست ۱۹۴۲ء کے شمارے میں "کشمیر کے تین دیہات" کے نام سے فوق کے مضامین شامل ہیں۔ یہ شمارے راقم کو ظفر احمد مرحوم کے گھر سے دستیاب ہوئے ہیں۔ فوق کشمیر کی دیہاتی زندگی کی فلاح وبہبود کے لیے بہت سرگرم تھے۔ دیہاتی معاشرے میں ان رسوم ورواج کے بھی خلاف تھے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ شہروں کے مقابلے میں دیہاتوں میں لوگوں کے آرام وآسائش کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ دیہاتی سفرنامہ کی پہلی قسط کے آغاز میں درج کیا گیا شعر اس پورے مسئلے کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔

دیہاتوں میں بھی آبادی ہے واں بھی لوگ بستے ہیں
انھیں بھی دیکھ اے شہروں کی رونق دیکھنے والے

فوق کے مضمون "کشمیر کے تین دیہات" سے پہلے رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے نوٹ میں فوق کی خدمات کا اس طرح اعتراف کیا۔

"یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ منشی محمد دین صاحب فوق نہ صرف اپنے

اخباروں کے ذریعے ریاست کشمیر کی خدمت کرتے رہے ہیں بلکہ آپ
نے کشمیر کے دُور دراز علاقوں کا سفر بھی کیا ہے۔ آپ نے کئی کتابیں
تصنیف فرمائی ہیں جن میں کشمیر کے حالات و مسائل قلم بند کیے گئے ہیں۔
محکمہ پنچایت کے قیام سے آپ نے تقریروں اور مضامین کے ذریعے
دیہاتی بھائیوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس محکمہ کے اغراض و
مقاصد کی اشاعت میں آپ ہمیشہ ممد و معاون رہے ہیں۔" [۵]

"پنڈت جواہر لال نہرو کا سفر نامہ کشمیر" (غیر مطبوعہ)

"پنڈت جواہر لال نہرو کا سفر نامہ کشمیر" کے نام سے فوق کا غیر مطبوعہ مسودہ
عبداللہ قریشی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس مسودے کا سرورق
موجود نہیں۔ پہلے صفحہ پر ایک کونے میں پنسل سے ستمبر ۱۹۴۴ء کی تاریخ درج ہے۔ سفرنامہ
میں نہرو کا وہ مضمون بھی شامل ہے جو انھوں نے سفر کشمیر کے بعد "نیشنل ہیرلڈ" لکھنؤ
میں انگریزی زبان میں لکھا تھا اور جس کا اُردو ترجمہ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے "ہمدرد"
سری نگر میں شائع کیا۔ "ہمدرد" سری نگر ان دِنوں "نیشنل کانفرنس" کا ترجمان تھا۔ اس
کے علاوہ مسودے میں وہ تقریریں بھی شامل کی گئی ہیں جو مختلف مقامات پر نہرو
نے کی تھیں۔ کشمیر کے سفر میں نہرو کے ساتھ خان عبدالغفار خان، شیخ محمد عبداللہ
اور فوق بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور تحریک حریت کشمیر
کی روشنی میں اور آج کے کشمیر اور مُسلم کشمیر میں سیاسی صُورت حال کے آئینے میں فوق کا
یہ غیر مطبوعہ مسودہ بہت اہم ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت نہرو
کی سوچ کیا تھی اور بعد میں عملی طور پر اس کے نظریات کی کیا شکل بنی۔ اس طرح
ماضی، حال اور مستقبل کی سیاست کا ایک نقشہ آدمی کے سامنے آتا ہے۔ نہرو کے

اس سفر کو فوق نے اپنے الفاظ میں جس طرح بیان کیا ہے ان کے ماہر وقائع نگار ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ ایک فکر انگیز مطالعہ ہے۔ فوق نے اپنے سفر کشمیر کے حالات "سفر نامہ کشمیر" میں لکھے ہیں مگر کسی کے سفر کے حالات کو اپنے مشاہدات کے ساتھ آمیخت کر کے بیان کرنا خاصا مشکل فن ہے۔

"پنڈت نہرو کا سفر نامہ کشمیر" اگرچہ ایک خستہ مسودہ کی شکل میں ہے مگر اسے مرتب کر کے چھاپ دیا جائے تو حالات کے کئی چھپے ہوئے گوشے سامنے آسکتے ہیں۔ حضوری باغ سری نگر میں نہرو کے پہلے جلسہ کا حال فوق نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"نہرو جب جلسہ گاہ میں پہنچے اور سٹیج پر بیٹھ گئے تو خوبصورت نوجوان کشمیری لڑکیوں نے بندے ماترم کا ترانہ گانا شروع کیا۔ نہرو نے انھیں فوراً روک دیا اور پوچھا کہ کیا تمھیں اقبال کا ترانہ ہند ہی یاد نہیں۔ لڑکیوں نے انکار میں سر ہلایا تو نہرو نے انھیں پیچھے ہٹا دیا اور خود مائیک پر آکر ترانہ سنانا شروع کر دیا۔ لوگوں نے بھی ان کے ساتھ اپنی آواز ملا دی۔

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ترانے کے بعد انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقبال ہندوستان کے ایک بہت بڑے شاعر اور مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ آپ سوچیے کہ ہندوستان کے متعلق انھوں نے کیا کہا ہے"

یہ واقعہ اور نہرو کے یہ الفاظ اس کے سیاسی ذہن کے ایک خاص رُخ کو سامنے لاتے ہیں۔

سیم پور میں ۴ ار اکتوبر کو نہرو نے جو تقریر کی وہ سیاست کشمیر کے پس منظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس تقریر کا خلاصہ فوق نے اس طرح تحریر کیا ہے۔

"کشمیریوں کی خوش قسمتی سمجھنی چاہیے کہ ان کو شیخ محمد عبد اللہ جیسا اصلی رہنما ملا ہے۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ کشمیر کے مفلس اور بے کس لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنا، ایک باحوصلہ شخص کا کام تھا۔ یہ مشکل کام شیخ محمد عبد اللہ نے کر دکھایا اور صحیح معنوں میں شیرِ کشمیر کا لقب حاصل کیا۔"

ہندوستان کی آزادی کے بعد کشمیر اور کشمیر کے لیڈر کے ساتھ نہرو نے جو سلوک کیا اس کی روشنی میں نہرو کے ان الفاظ پر غور کرنا چاہیے۔ آج بھی یہ بات برِصغیر کے تمام مسلمانوں اور مسلمان لیڈروں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ سفر نامہ ایک سیاسی دستاویز ہے اور نامکمل شکل میں ہے۔ یہ کشمیر میں ایک شخص کی مصروفیات کا احوال ہے اس لیے اسے رپورتاژ کا نام دیا جا سکتا ہے اور رپورتاژ میں سفر نامہ کی صفات موجود ہوتی ہیں۔ بہر حال اس کتاب کی اشاعت سے تحریک کشمیر کا ایک مختلف پہلو سامنے آئے گا۔ یہ تحریر بھی کشمیر سے فوق کی وابستگیوں کا ایک اظہار ہے۔ اس مسودے میں کشمیر کے حسن و جمال کے منظروں کا بیان نہیں ملتا کیونکہ فوق کشمیر کے اُجڑے ہوئے لوگوں کی کہانی بیان کرنا چاہتے تھے۔ وہ برِصغیر کی آزادی سے دو سال قبل فوت ہو گئے ورنہ وہ اس کتاب کو خود شائع کرتے اور شاید اس میں ترمیم و اضافہ بھی کرتے کیونکہ تقسیم ہند سے ایک سال پہلے اس تیزی سے سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ لوگ دیکھتے رہ گئے بالخصوص کشمیری تو بہت بد قسمت نکلے کہ ان کے محبوب لیڈر کو پنڈت نہرو نے ہی پسِ دیوارِ زنداں بھیج دیا اور کشمیریوں کو کوئی بڑا مفکر بھی نہ مل سکا۔

"سفر نامہ ڈھاکہ" (بنگال) (مطبوعہ "کشمیری میگزین")

---

۱۴ مئی ۱۹۱۷ء سے ۷ جون ۱۹۱۷ء تک کشمیری میگزین لاہور کی چار قسطوں میں "سفر نامہ ڈھاکہ" دستیاب ہوا ہے۔ چوتھی قسط کے آخر میں "جاری" کا لفظ درج

ہے اس کا مطلب ہے کہ فوق نے اس سفرنامہ کی اور بھی کچھ قسطیں تحریر کی ہوں گی یا شاید وہ لکھنے کی خواہش کے باوجود مزید نہ لکھ سکے۔ باوجود کوشش کے چار قسطوں کے علاوہ اس ضمن میں کچھ بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔

فوق نے اپنی آپ بیتی "سرگزشت فوق" میں بھی ڈھاکہ کے سفر کا مختصر حال تحریر کیا ہے۔ "کشمیری میگزین" کی ان چار قسطوں کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوا کہ دونوں تحریروں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فوق کے اس "سفرنامہ ڈھاکہ" کا انداز ان کے "سفرنامہ کشمیر" سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ یوں بھی وادیٔ کشمیر کی طرح خطۂ بنگال خوبصورت نظاروں سے مالامال ہے۔ خاص طور پر دریاؤں اور ان کے کناروں پر بستیوں کا منظر اپنے اندر حسن و مستی کا خزانہ رکھتا ہے۔ چوتھی قسط میں فوق "کشمیر اور ڈھاکہ کی مماثلت" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"ڈھاکہ، سرینگر سے دو ہزار میل (صحیح انیس سو ستر میل) کے فاصلہ پر واقع ہے لیکن باوجود اس بُعد اور اس دُوری کے بہت سی باتیں ڈھاکہ میں ایسی ہیں جو کشمیر سے ملتی جلتی ہیں۔ کشمیر میں پیر پرستی کا بڑا زور ہے۔ مشرقی بنگال میں بھی (جس کا دارالخلافہ ڈھاکہ ہے) کمی نہیں ہے۔ پنجاب میں تو ہندوؤں کے نئے فرقے پتھروں کی پُوجا کے خلاف ہیں لیکن چونکہ اب تک ان کے سماجی خیالات کو قبولیت نہیں ہوئی اس لیے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی پُوجا بھی کثرت سے ہوتی ہے۔ یہی حال کشمیر کے ہندوؤں کا ہے جس طرح کشمیر میں سرینگر، بارہ مولا، اسلام آباد میں دریا کے دونوں طرف کشتیوں کا دلچسپ نظارہ نظر آتا ہے وہی کیفیت ڈھاکہ نرائن گنج، باریسال اور مشرقی بنگال کے کئی دوسرے شہروں میں نظر آتی ہے۔ سرینگر میں ندی نالے بھی چلتے ہیں جن پر پُل بنے ہوئے ہیں، جن

کے نیچے کشتیاں موسم برسات میں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ڈھاکہ میں بھی دریا کے علاوہ کئی ندی نالے ہیں۔ موسم برسات میں ان کا نظارہ بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔ کشمیر میں ہوا چلتی ہے اور اکثر نہایت تیز ہوتی ہے اور باوجود اس تیزی کے ایام گرما میں اس میں مطلق لُو نہیں ہوتی۔ ڈھاکہ میں بھی سخت ہوائیں چلتی ہیں لیکن گرمی اور لُو سے خالی ہوتی ہیں۔ کشمیر میں بھی لوگ بارہ مہینے مکانوں کے اندر سوتے ہیں۔ ڈھاکہ میں بھی یہی رواج ہے۔ ڈھاکہ میں مچھروں کی زیادتی ہے۔ کشمیر میں بھی مچھر کثرت سے ہوتے ہیں۔"

اس طویل اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فوق کہیں بھی جائیں وہ کشمیر کو دل سے نہیں بھلا سکتے۔ فوق نے ڈھاکہ کا سفر نواب ڈھاکہ خواجہ حبیب اللہ کی دعوت پر کیا تھا۔ نوابان ڈھاکہ فوق کی تحقیق کے مطابق کشمیری النسل تھے۔ فوق کی سوانحی کتاب "مشاہیر کشمیر" میں نوابان ڈھاکہ کا تذکرہ موجود ہے جس میں ان کی کشمیر سے ہجرت اور ڈھاکہ میں عروج و کمال کا ذکر فوق نے تعریفی انداز میں کیا ہے۔ "سفرنامہ ڈھاکہ" کی تیسری قسط میں فوق نے نوابان ڈھاکہ کا ذکر کیا ہے۔ "مشاہیر کشمیر" اور "سفرنامہ ڈھاکہ" میں نوابان ڈھاکہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ذرا بھر فرق نہیں۔ فوق نے "سفرنامہ ڈھاکہ"، "سرگزشت فوق" اور "مشاہیر کشمیر" میں چونکہ نوابان ڈھاکہ اور سفر ڈھاکہ کا تذکرہ بہرصورت شامل کرنا تھا اس لیے اس تکرار کا جواز موجود ہے۔ فوق اس طرح کی صورتِ حال میں یہ خیال رکھتے تھے کہ مختلف جگہوں پر ایک ہی بات ایک ہی انداز میں بیان کر دی جائے البتہ "سفرنامہ ڈھاکہ" میں نوابان ڈھاکہ کی خوش خلقی، مہمان نوازی اور قدردانی کے بیان کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ نوابان کے علاوہ "سفرنامہ ڈھاکہ" میں جس شخصیت کا بڑی اپنائیت سے فوق نے ذکر کیا ہے وہ حکیم حبیب الرحمٰن ہیں جو نوابان ڈھاکہ کے مشیر طبی تھے اور فوق سے ان کے پرانے مراسم تھے فوق لکھتے ہیں:

"آپ حبیب الرحمٰن ہی نہیں بلکہ اپنے خلق و ہر دلعزیزی کی وجہ سے حبیب مخلوق بھی ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار ڈھاکہ کے نامور آدمیوں میں سے تھے۔ ان کی صوفی منشی اور صلح کل پالیسی نے ان کا درجہ بہت بلند کر رکھا تھا۔ آپ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ آپ کا مطب ڈھاکہ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے ڈھاکہ سے "المشرق" کے نام سے ایک رسالہ اور سلیمی پریس کے نام سے اردو کا پریس جاری کیا۔ آپ کے پاس مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسے ایک چھوٹی سی لائبریری کہنا زیادہ موزوں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کتب خانے کی سیر اس وقت کرائی جب کہ میری روانگی میں دو ایک دن رہ گئے تھے اور پھر مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ سر درد وغیرہ کی وجہ سے میری طبیعت بھی قدرے ناساز ہو گئی"

اس سفر کے بعد بھی حکیم صاحب سے فوق کا رابطہ قائم رہا۔ حکیم صاحب کے کئی خطوط "سرگزشت فوق" کے آخر میں موجود ہیں۔ ان میں کچھ "نقوش" لاہور کے مکاتیب نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں مسٹر گپتا (مصنف ڈرامہ "انارکلی" و ایڈیٹر رسالہ "بنگالی میگزین") کی رائے ہے کہ آپ کا سفرنامہ ترجمہ کر کے "بنگالی میگزین" میں بالاقساط چھاپا جائے۔ ہم اور وہ مل کر ترجمہ کر لیں گے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر سفرنامہ کا سلسلہ لمبا ہو تو میری تجویز ہے کہ بعد میں اسے کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ ہم لوگ اس کے مصارف ادا کرنے کو تیار ہیں۔ چینی کے برتنوں کے ٹکڑوں کے متعلق آپ نے مسجدوں کے سلسلہ میں جو ذکر کیا ہے اس میں اتنا اور اضافہ کر دیجیے کہ اس صنعت کی ایجاد کا سہرا ڈھاکہ کے سر ہے اور یہیں سے یہ صنعت اور جگہوں میں گئی۔ ڈھاکہ کے متعلق آپ نے جو تاریخی کہانیاں لکھی ہیں وہ کب اور کہاں چھپوائے گا؟ خدا کرے آپ ٹھیک ہوں

اور ایک بار پھر ڈھاکہ میں آپ سے ملاقات ہو‘‘ ۹

جہاں تک ’’سفر نامہ ڈھاکہ‘‘ کی کتابی صورت میں اشاعت کا تعلق ہے یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔ اغلب گمان ہے کہ فوق ’’کشمیری میگزین‘‘ میں بھی یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکے ورنہ اس کتاب کی عدم اشاعت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ڈھاکہ کے متعلق جن تاریخی کہانیوں کی طرف حکیم صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ بھی کہیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ ’’تاریخ بنگال‘‘ کا نام کتابیاتِ فوق میں ملتا ہے۔ ’’سفر نامہ ڈھاکہ‘‘ اور حکیم صاحب کے اس خط سے بھی دھیان اس کتاب کی طرف جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ کتاب فوق صاحب نے تحریر کی ہو مگر اصل صورتِ حال یہ ہے کہ ’’تاریخ بنگال‘‘ کے نام سے ایک کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں فوق صاحب کی فہرستِ کتب میں شامل ہے۔ کیٹلاگ میں اس کتاب کا نمبر ۲۹۵۴ ۸ / ت ۸ ۴ہ ہے — مگر جو کتاب شیلف میں پڑی ہے اس پر مصنف کا نام اور سن اشاعت درج نہیں۔ یہ کتاب مطبع العلوم سٹیفنز کالج دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ فوق صاحب کی کوئی دوسری کتاب ان کی زندگی میں دہلی سے شائع نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ تر کتابیں لاہور سے اور چند ایک سرینگر سے شائع ہوئیں۔

تاریخی اور سوانحی موضوعات پر انھوں نے متفرق کتابیں لکھی ہیں۔ لہٰذا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے بنگال کی تاریخ بھی لکھی ہو۔ مگر ان کی ہر کتاب پر نمایاں طور پر ان کا نام درج ہوتا ہے۔ ان کی کئی کتابوں کے آخر میں ان کی کچھ دوسری کتابوں کی فہرست موجود ہے مگر کہیں بھی ’’تاریخ بنگال‘‘ کا نام درج نہیں۔ اس نام کی کتاب پر موجود لائبریری کیٹلاگ نمبر کے حوالے سے داخلہ رجسٹر نمبر بھی چیک کیا گیا۔ وہاں مصنف کا نام نامعلوم درج ہے۔ اس کا نمبر ۱۰۸۸۹ ہے۔ کتاب کے اوپر فوق صاحب کی ذاتی مہر لگی ہوئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی ملکیت تھی۔ کتابت کا انداز،

اشاعتی نقطۂ نظر سے کتاب کی ظاہری صورت کے علاوہ تاریخی واقعات کی پیش کش کا اسلوب بھی فوق صاحب کے مخصوص اسلوب سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ دیباچے کے نیچے بھی کوئی نام درج نہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ فوق صاحب کے اپنے ہاتھ سے حواشی درج ہیں۔ راقم کے پاس چونکہ فوق صاحب کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے غیر مطبوعہ مسودات موجود ہیں۔ اس لیے ان کا خط پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ راقم کے خیال کے مطابق یہ کتاب ان کے زیر مطالعہ رہی۔ اور ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اپنی کتابوں کے ساتھ یہ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں پہنچ گئی اور لائبریرین نے اسے بھی فوق صاحب کی کتاب سمجھ کر ان کی کتب میں درج کر لیا۔ "نقوش" لاہور کے "لاہور نمبر" میں فوق صاحب کی جو فہرست کتب شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس کتاب کا ذکر نہیں۔ بہر حال "تاریخ بنگال" کے ضمن میں ایک تحقیقی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے یہ تفصیل بیان کی گئی ہے اور چونکہ یہ سفر نامہ ارض بنگال کے حوالے سے فوق نے تحریر کیا ہے اس لیے یہ وضاحت اسی موقع پر مناسب سمجھی گئی ہے۔

"سفر نامہ کشمیر" کی طرح "سفر نامہ ڈھاکہ" میں بھی فوق نے اس علاقے کی تہذیبی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور یہاں کے موسم عمارات بالخصوص مساجد، صنعتیں، باغات، تھیٹر، اخبارات و رسائل کا بھی ذکر کیا ہے حتیٰ کہ سفر کے دوران کرایہ جات اور دوسری مشکلات کا بیان بھی ملتا ہے۔ پہلی قسط میں لکھتے ہیں۔

"کلکتہ کا سب سے بڑا اسٹیشن ہوڑہ ہے۔ ریلوے مسافروں سے ٹکٹ ہوڑہ سے پیشتر ایک چھوٹے سے سٹیشن پر لے لیے جاتے ہیں اور یہیں سے عام پنجابی مسافروں کی خصوصی دیکھ بھال شروع ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ پنجاب اور پشاور سے خصوصاً کابلی پٹھان جن کی ظالمانہ سود خوریاں اور بعض خلافِ قانون حرکتیں ان کو کسی

ہمدردی کا مستحق قرار نہیں دیتیں ۔ یہ لوگ افیم، چرس وغیرہ ناجائز طور پر کلکتہ میں لے آتے ہیں۔"

فوق کا سفر نامہ اپنے اندر ایک رہبر کا کردار اختیار کرلیتا ہے ۔ لیکن اس بیانیہ اور معلوماتی مزاج کی تحریر میں بھی فوق منظر کشی کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔

"کلکتہ کے قریب پالوں کے باغات دیکھنے میں آئے ۔ نرائن گنج میں بھی ان کی کثرت نظر آئی ۔ بارش کی وجہ سے موسم نہایت اچھا تھا ۔ ریل کے چاروں طرف سبزہ زار لہلہاتے ہوئے نظر آرہے تھے ۔ جی بہت خوش ہوا ۔"

باغات کے ذکر میں ڈھاکہ کے تمام باغات کا تفصیلی بیان ملتا ہے جس طرح سرینگر کے تمام باغات کا تذکرہ فوق نے "سفر نامہ کشمیر" میں کیا ہے ۔ سفر ڈھاکہ کے دوران فوق نے بحیثیت صحافی شہر کے اخبارات و رسائل کا تذکرہ کیا ہے جس سے بنگال میں صحافت اور خاص طور سے مسلم صحافت اور اردو صحافت پر روشنی پڑتی ہے ۔ فوق اگر اس سفر نامہ کو مکمل کرکے کتابی صورت میں شائع کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو مطالعۂ بنگال کے سلسلہ میں ان کی یہ کتاب خاصی اہمیت کی حامل ہوتی ۔

"متفرق مصنّفہ اور مؤلّفہ کتابیں"

امتحان پاس کرنے کا گُر

یہ پینتیس صفحات کا کتابچہ پہلی بار ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا ۔ دوسرا ایڈیشن معمولی ترمیم کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں شائع کیا گیا ۔ دونوں اشاعتوں پر کسی ادارے کا نام درج

نہیں لیکن اتنی بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ لاہور سے شائع ہوئیں۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا مطالعہ اشاعت سے پہلے علامہ محمد اقبال نے بھی کیا۔ فوق نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"یہ رسالہ دراصل "ہاؤ ٹو پاس انگلش پیلنشن" سے اخذ کیا گیا ہے۔"

لیکن کتاب کے مطالعہ سے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے مختلف انگریزی مصنفین کے بعض قابلِ قدر مقولوں سے کتاب کو مفید اور وقیع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

"یہ مختصر رسالہ ان ضروری ہدایات کا مجموعہ ہے جن کا جاننا طلبہ کے لیے از بس مفید ہے۔ علاوہ ان ہدایات و اشارات کے جو امیدواران امتحانات یونیورسٹی کے لیے ضروری ہیں مؤلف نے اپنے رسالہ کو انگریزی مصنفین کے بعض قابلِ قدر مقولوں سے آراستہ کیا ہے جس سے اس چھوٹی سی کتاب کی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کی کتابوں کا بچوں کے ہاتھ میں دینا تعلیم کی بنیاد کو بہت استحکام دے گا۔" (صفحہ نمبر ۳)

علامہ اقبال کے اس بیان کی روشنی میں اس کتاب میں لکھی گئی ہدایات پر عمل کرنے کے بعد کسی طالب علم کے لیے کوئی امتحان پاس کرنا مشکل نہیں۔ امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں فوق لکھتے ہیں:

"ہر طالب علم کو اپنے خیال میں اس بات کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ امتحان کے واسطے تیاری کرنے کا وقت جماعت تبدیل کرنے کے پہلے دن سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھوے اور خرگوش کی دوڑ کی کہانی ہر فرد بشر کو اپنے سامنے رکھنی چاہیے۔"

فوق جسمانی صحت اور قلبی اطمینان پر بھی زور دیتے ہیں۔ امتحان پاس کرنے

کے بعد بھی نوجوانوں کو جس طرح زندگی میں جدوجہد جاری رکھنی چاہیے اس کی اہمیت پر بھی فوق نے روشنی ڈالی ہے۔ فوق نے شرافت، خاطر داری، اخلاق، ثابت قدمی، اُمید، کفایت شعاری، وقت کی پابندی، باقاعدگی، محنت، استقلال اور تمیز کے چھوٹے چھوٹے عنوانات سے بھی ہدایتیں درج کی ہیں۔ طالب علموں کے فرائض کے عنوان سے ایک اچھا طالب علم بننے کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ مختلف موقعوں پر کچھ داناؤں کے اقوال تحریر کیے ہیں۔ ایک مقولہ کتاب میں سے نقل کیا جاتا ہے جسے فوق نے آب زر سے لکھنے کے قابل کہا ہے۔

"کامل انسان بننے کے لیے مطالعہ کتب بہت ضروری ہے"۔ کتاب کے آخر میں "اخبار ہندوستان" لاہور، "لائل پور گزٹ" لائل پور، "خالصہ بہادر" لاہور، "پبلک گزٹ امرتسر"، "پنجاب ریویو" لاہور، "سیالکوٹ پیپر" سیالکوٹ، "لاہور پنچ" لاہور میں اس کتاب کے بارے میں شائع ہونے والے تبصرے جمع کر دیے گئے ہیں۔ تمام تبصرے کتاب کی افادیت اور اہمیت پر متفق ہیں۔ "لائل پور گزٹ" لائل پور کی رائے اس طرح ہے۔

"ایسا نادر رسالہ جو طالب علموں کا حامی اور امتحان پاس کرنے کا ذریعہ ہے اس سے پہلے اُردو زبان میں تیار نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کسی کو ایسا رسالہ لکھنے کا خیال ہوا۔ اس رسالہ میں طالب علموں کے لیے وہ ہدایتیں درج ہیں جو ابتدائے تعلیم سے لے کر امتحان کے پاس ہوتے تک کام آتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ رسالہ ہر ایک سکول ماسٹر اور ہر ایک طالب علم کے پاس ہونا چاہیے۔

ماتم پہلوانی

"ماتم پہلوانی" ۱۹۰۱ء میں پہلی بار بھائی دیا سنگھ تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ

لاہور والوں نے شائع کی۔ اس کی ضخامت چالیس صفحات ہے۔ اگرچہ فوق نے اس کتابچے کو رستمِ ہند میاں غلام محمد عرف غلام پہلوان امرتسری کی سوانح عمری کہا ہے مگر اصل میں یہ کتابچہ غلام پہلوان کی جوانی میں دل دوز موت کا نوحہ ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک پہلوان کے ماتم میں لکھی گئی کتاب ہے لیکن اس کے ساتھ فوق نے غلام پہلوان کے حالات زندگی اور مختلف میدانوں میں اس کی کامیابیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

پہلوانی کا فن ایک زمانے میں خاص دلچسپی کا حامل تھا اور اس میدان میں کئی نامور لوگ نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک غلام محمد پہلوان رستم ہند ہوا ہے جو غلام پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے کم عمری میں بڑے بڑے میدان جیتے۔ برِصغیر کے اندر اور باہر اس نے کئی کشتیوں میں کئی معرکے سر کیے مگر بدقسمتی سے وہ جوانی میں فوت ہو گیا۔ ہیضہ کے موذی مرض نے اس شاہ زور پہلوان کو سات آٹھ گھنٹے میں ختم کر دیا۔ اس کی اچانک جوان مرگی پر پورے ملک میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی۔ ہمارے لوگ چونکہ کھیلوں کے میدان کے ہیروز سے بہت پیار کرتے ہیں اس لیے غلام پہلوان کی موت کو بہت بری طرح محسوس کیا گیا۔ فوق بھی ماتم کرنے والوں میں شامل تھے۔ وہ چونکہ ایک ادیب و شاعر، مؤرخ اور صحافی تھے اس لیے انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ایک مختصر کتاب تحریر کی جو اس زمانے میں بڑی مقبول ہوئی۔ فوق کی ایک نظم بھی اس کتابچے میں شامل ہے۔ یہ نظم ایک مکمل مرثیہ ہے جس میں فوق نے بہت دردانگیز انداز میں رستمِ ہند کی موت پر اظہار افسوس کیا۔ فوق کی نظم کے کچھ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

پہلوانی ہو گئی بے تاج آج
لٹ گیا ہر پہلوان کا راج آج

منتظر دیدار کے تھے خاص و عام:

تیری شہرت سے تھے ہم بھی شاد کام

عمرِ طبعی تک نہ پہنچا تُو غلام

اس لیے نوحہ بھی لکھا نا تمام

یہ کتاب غلام پہلوان کی موت کے فوراً بعد ایک جذباتی کیفیت میں لکھی گئی ہے جو ایک تاثراتی تحریر ہے اور پڑھنے والوں کو اداس کر دیتی ہے۔ فوق نے رستمِ ہند کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کے مختلف معرکوں کا حال لکھا ہے اور فنِ پہلوانی میں اس کے کمالات پیش کیے ہیں۔ غلام پہلوان کی مقبولیت اور اس کے ساتھ لوگوں کی محبت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"یورپ، امریکہ اور ترکی کے قریباً کل اخباروں نے رستمِ ہند کی شہ زوری اور اس کی بے نظیر فتح مندی کا نہایت اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ جب پیرس کی نمائش ختم ہونے کو پہنچی اور غلام کے مقابلے میں دُنیا کا کوئی پہلوان نہ نکلا تو آخر اسے وطن کی یاد آئی۔ بمبئی پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ ہزارہا مخلوق اِدھر اُدھر ٹہل رہی ہے۔ غلام کو جہاز سے اُترے ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ پھولوں، گلدستوں اور ہاروں سے اس کو قدم اُٹھانا محال ہو گیا۔ پبلک کی اس عزت افزائی اور قدردانی سے اس کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف میری ہی خاطر آئے ہوئے ہیں۔ بمبئی سے امرتسر تک جس قدر بڑے بڑے سٹیشن ہیں اور جس جس سٹیشن پر غلام کی آمد کی خبر پہنچی وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔" (صفحہ : ۲۶)

اس وابستگی کے بعد لوگ اپنے اس محبوب پہلوان کی موت کا دُکھ کس طرح آسانی سے برداشت کر سکتے تھے۔ اس کے جنازے کے ساتھ بیس ہزار سے زیادہ لوگ تھے جن میں ہر مذہب و ملت کے آدمی شامل تھے۔ فوق نے یہ بھی لکھا ہے کہ

مرحوم کی غمناک وفات پر بیسیوں نوحے، مرثیے اور قطعات موت لکھے گئے۔

"حالات دربار بھمبر"

یہ رسالہ ۱۹۱۸ء کو جارج سٹیم پریس لاہور باہتمام لالہ ایشور داس طبع ہوا اور مُفت تقسیم کیا گیا۔ اس رسالہ کی ضخامت چوبیس (۲۴) صفحات ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں حکومت برطانیہ کی اپیل پر تمام ممالک محروسہ ہندوستان اور اس کی ملحقہ ریاستوں نے جانی اور مالی قربانیاں دیں۔ بہت سے نوجوان فوج میں بھرتی ہُوئے۔ قیمتی اسلحہ پیش کیا گیا اور دیگر ضروریات کے لیے بیش بہا رقوم نذر کی گئیں چونکہ ضلع میرپُور کی تحصیل بھمبر میں بڑی تعداد میں نوجوان رنگروٹ بھرتی کرائے گئے تھے اس لیے حکومت ہند نے یہاں کے بعض سرکردہ افراد کی حسن خدمات کا اعتراف کرنے اور بعض دوسروں کی ہمت افزائی کی غرض سے انعامات اور سندات تقسیم کرنے کے لیے ۱۱۔ فروری ۱۹۱۸ء کو بھمبر میں ایک دربار منعقد کیا۔ فوجی اہمیت کا یہ علاقہ ریاست جموں و کشمیر کی حدود میں واقع ہے۔ ریاست کے بڑے بڑے عہدیدار معزز رئیس اور جاگیردار اس میں شریک ہوئے۔ راولپنڈی ڈویژن کے چیف ریکروٹنگ آفیسر میجر ٹینکرڈ خاص طور پر دربار میں شریک ہُوئے۔ فوق نے اس اجلاس میں ایک نظم پڑھی اور دربار کی پُوری کیفیت قلم بند کر کے ایک کتابچہ "حالات دربار بھمبر" کے نام سے شائع کرایا۔ اس مختصر کتابچے میں بھمبر کی اہمیت شہر کی رونق، حکام اور معززین کی آمد اور ریاست کی مہمان نوازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ میجر ٹینکرڈ، دیوان بدری ناتھ ریکروٹنگ سیکرٹری، منشی بال اور انسپکٹر مدارس خواجہ جمال الدین کی تقریروں کے خلاصے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ آخر میں تقسیم انعامات و اسناد کا ذکر کیا گیا ہے۔ بظاہر اس فوجی دربار کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی مگر فوق کے اس کتابچے کے طفیل یہ تاریخ کا ایک

حصّہ بن گیا ہے۔

اس کتابچہ میں فوق کا فکری انداز ان کی کتاب "ہندوستانی وی۔سی" سے مختلف نہیں ہے۔ وہ ان کتابوں میں انگریز سرکار کی حمایت میں پُرجوش دکھائی دیتے ہیں۔ راقم نے فوق کی کتاب "ہندوستانی وی۔سی" کا تجزیہ کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ وہ شاید اس طرح برِصغیر کے مُسلمانوں کے اس گروہ سے متأثر دکھائی دیتے ہیں جو انگریزوں کی حمایت کر کے مُسلمانوں کے لیے مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سرسیّد اس گروہ کے سب سے بڑے نمائندہ ہیں۔ انسپکٹر مدارس خواجہ جمال الدین کی تقریر کی رپورٹنگ کرتے ہُوئے فوق لکھتے ہیں:

"ریاست پونچھ کی مثال تمھارے سامنے موجود ہے وہاں جو لوگ بھرتی ہُوئے تھے اور ہو رہے ہیں ان کی مالی حالت اب کیسی اچھی ہے۔ بہت سے لوگ ان میں کمیشنڈ افسر ہیں"

یہ تحریر بس ایک جلسہ کی روداد کی حیثیت رکھتی ہے جسے شائع کر کے مفت تقسیم کیا گیا۔ راقم کے خیال میں وادیٔ کشمیر میں غربت بے روزگاری اور بُرے رسوم رواج کے عذابوں سے لوگوں کو نجات دلانے کے لیے فوق نے فوج میں بھرتی کی اس قدر حمایت کی تھی۔

"دیوانِ حافظ کی تاریخی فالیں"

۳۲ صفحات پر مشتمل یہ چھوٹی سی کتاب پہلی بار دسمبر ۱۹۲۲ء میں ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام خادم التعلیم پریس سے شائع ہُوئی۔ جس میں لسان الغیب حافظ شیرازی کے وہ اشعار درج کیے گئے ہیں جو ہندوستان، ایران اور افغانستان کے فرماں رواؤں اور عام لوگوں نے بطور تفاؤل و استخارہ استعمال کیے اور صحیح نکلے۔ یہ اشعار فوق نے

مختلف تذکروں اور تاریخوں سے اخذ کیے ہیں۔ کتاب کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ "تاریخ ہند" اقبال نامہ اکبری"۔
۲۔ " بادشاہ نامہ عالمگیری" از ذکاء اللہ،
۳۔ " حیات حافظ" از مولانا اسلم جے راجپوری،
۴۔ "تذکرہ امیر عبدالرحمان" مرتبہ محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار"،
۵۔ " وجدانی نشتر" از فوق۔
۶۔ "تاریخ اعظمی"،
۷۔ " فسانۂ عبرت" از رجب علی بیگ سرور،
۸۔ " اسرار الابرار" از مولانا داؤد مشکواتی۔
۹۔ " نفحات الانس" از مولانا جامیؒ۔

کتاب میں فالنامہ بھی درج ہے جس کے ذریعے ہر آدمی خود دیوان حافظ سے فال نکال سکتا ہے۔ "فال نکالنے کے طریقے" کے نام سے جو مضمون کتاب میں شامل ہے۔ اس کے مصنف مولانا اسلم جے راجپوری ہیں۔ یہ مضمون ان کی کتاب "حیاتِ حافظ" سے لیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں حافظ کی نہایت مختصر سوانح عمری بھی تحریر کر دی گئی ہے۔ حافظ شیرازی قرآن شریف کے حافظ تھے۔ وہ بہت بڑے شاعر اور دانائے راز تھے۔ چھہتر برس کی عمر میں انھوں نے سات انقلابات یعنی سات حکومتوں کے دور دیکھے۔ ان کے کلام کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ فوق نے لکھا ہے کہ عربی، فارسی اور ترکی میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں وہ اشعار درج کیے گئے جو بطور فال یا شگون لوگوں کو اپنے حسبِ مطلب نظر آئے۔ لیکن اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔

"دیوان حافظ" سے پہلی فال کے واقعے کو فوق نے اس طرح بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"خواجہ صاحب نے ۷۹۱ھ میں شیراز میں وفات پائی۔ ان کے بعض اشعار اور ان کی رندانہ طبیعت کی وجہ سے اکثر لوگ ان کو ملحد کہتے تھے۔ کچھ فقہا نے ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ وقت منصور بن مظفر کو بھی اس جھگڑے کا علم ہوا۔ کہا، اچھا ان کی غزلوں کے مسودے منگا کر دیکھے جائیں۔ چنانچہ پہلے اس شعر پر نظر پڑی۔

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہست می رود بہ بہشت

معترض دم بخود ہو گئے۔ جنازہ کی نماز ادا کی گئی۔ جس میں خود بادشاہ بھی شامل تھا۔ یہ پہلی فال تھی جو حافظ کے کلام سے دیکھی گئی۔ اسی بناء پر خواجہ صاحب کی وفات کے پچاسی سال بعد جب مولانا جامی نے "نفحات الانس" ۸۷۵ھ میں تصنیف کی تو ان کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا خطاب دیا۔ مولانا آزاد بلگرامی (میر غلام علی) تو ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

مرداں زخاک ہم خبر آسماں دہند
فال کلام حافظ شیراز کن لحاظ

(صفحہ : ۲)

فوق کی اس کتاب میں چالیس کے قریب ایسے واقعات ہیں جو دیوان حافظ میں دیکھی گئی فال کے مطابق پیش آئے۔ اس ضمن میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے۔ ان میں تقریباً تمام مغل بادشاہ (ہمایوں سے اورنگ زیب تک) اور ان کے وزراء و زعماء شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی محمود حسین داناپوری۔ حکیم فتح اللہ خسرو۔ شیخ

بابا داؤد خاکی۔ واجد علی شاہ۔ مولانا سید احمد بریلوی اور کشمیر کا آخری چک بادشاہ۔ یوسف شاہ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض واقعات حیرت انگیز حد تک دلچسپ ہیں۔ فوق لکھتے ہیں:

"۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں ہیضہ کا بڑا زور تھا۔ مدرسۃ العلوم میں بھی کثرت سے وارداتیں ہوئی تھیں۔ یہ جولائی کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے۔ اگست میں تعطیلات گرما ہونے والی تھیں۔ کالج کے اعلیٰ منتظمین نے ۴ جولائی کو ایک جلسہ اس غرض سے کیا کہ تعطیلات ابھی سے دی جائیں۔ مولانا اسلم جے راجپوری لکھتے ہیں کہ پروفیسر محمد شفیع میرے پاس آئے اور کہا دیکھیے منتظمین کالج جو فیصلہ کرنے والے ہیں حافظ ان کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ دیوان کھولا تو جواب ملا۔

بخواہ دفترِ اشعار و راہ صحرا گیر

چہ وقت مدرسہ و بحث کشف کشاف است

ترجمہ: اشعار کی کتاب لے لو اور میدان کی طرف نکل جاؤ۔ یہ مدرسہ کا کیا وقت اور کشاف میں غور و بحث کرنے کا کیا موقع ہے۔)

شام کو بابو رفیع اللہ آئے اور کہنے لگے۔ تعطیلات کی منظوری ہو گئی ہے۔"

(صفحہ: ۱۵)

فوق کی یہ کتاب بے حد دلچسپ ہے۔ جو فوق کے علمی و ادبی مزاج کے تنوع کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ انسانی حیات میں بکھری ہوئی رنگینیوں سے آشنا تھے۔ وہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جو نسبتاً نیا ہوتا ہے۔ کسی لکھنے والے کی صلاحیتوں کا اندازہ بھی انہی میدانوں میں ہوتا ہے۔ جہاں وہ پہلی بار داخل ہوا ہو۔ فوق نے متفرق اور متنوع علمی کام کرنے کی کوشش کی۔ "دیوان حافظ کی تاریخی فالیں" ایک ایسی کتاب ہے جس کا اختصار کھٹکتا ہے۔ فوق اس کتاب کو جتنا بڑھاتے۔ اس کی دلچسپی قائم

رہتی۔ انھوں نے بہرحال اُردو زبان میں نئے موضوعات کی راہ ہموار کی۔

"زنانہ حاضر جوابیاں"

۷۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام ۱۹۲۲ء میں شائع ہُوئی۔ فوق نے عورتوں کے اس وصف کی وضاحت اور ثبوت کے لیے یہ کتاب تحریر کی ہے کہ وہ بہت اچھی اور برمحل گفتگو کرسکتی ہیں۔ وہ وابستگی اور وارفتگی میں بھی درجۂ کمال رکھتی ہیں اور بے ساختگی اور برجستگی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ بات وہی ہے جو برموقع ہو۔ فوراً ہو۔ فی البدیہہ ہو۔ سوال ختم ہونے سے پہلے اس کا جواب مِل جاتے۔ اس کے لیے فہم و فراست، ذہانت اور فطانت اور فصاحت و بلاغت کی ضرورت ہے۔ بدیہہ گوئی میں بڑے بڑے ماہر لوگوں کے نام آتے ہیں۔ عورت بھی کسی طور مردوں سے پیچھے نہیں۔ فوق نے مختلف کتابوں سے ایسے واقعات منتخب کرکے "زنانہ حاضر جوابیاں" میں جمع کردیے ہیں جن میں عورتوں کی یہ خصوصیت عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ان واقعات میں زیادہ تعداد عرب خواتین سے متعلق ہے۔ عرب اپنے مقابلے میں دوسروں کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ ان کی عورتیں بھی ایسی بات کرتی تھیں جسے سُن کر مخاطب مطمئن ہو جائے اور محظوظ و متاثر بھی ہو۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس مکالمے کے دوران وہ اپنے عورت ہونے کی حیثیت کا بھی پُورا پُورا خیال رکھتے۔ حتیٰ کہ عورتوں نے حسن و عشق کے معاملات میں بھی بات کرتے ہوئے اپنے مقام و مرتبے کا لحاظ رکھا ہے۔ اس مقصد کے لیے کبھی کبھی عورتوں نے اپنے یا کسی دُوسرے شاعر کے اشعار کا استعمال بھی کیا ہے۔ اُردو ادب میں غزل کی ایک تعریف عورتوں سے باتیں کرنا بھی ہے۔ غزل کے حوالے سے اس جملے کی اہمیت کا اندازہ "زنانہ حاضر جوابیاں" کا مطالعہ کرکے ہوتا ہے۔

"زنانہ حاضر جوابیاں" میں درج تمام واقعات اِدھر اُدھر سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ مگر فوق نے یہ واقعات بہت دلچسپ سادہ رواں اور برجستہ انداز میں تحریر کیے ہیں موضوع کے تقاضوں کے مطابق زبان واسلوب استعمال کیا ہے۔ کتاب کو حروف تہجی کے اعتبار سے عورتوں کے ناموں کے ساتھ مختلف عنوانات میں بھی تقسیم کر دیا ہے۔ مثلاً ردیف الف میں الف سے شروع ہونے والی عورتوں کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ جو حاضر جوابی میں طاق تھیں۔ الف سے ی تک تقریباً ۸۴ عورتوں کے واقعات درج کیے گئے ہیں پندرہ واقعات ایسے ہیں جن میں عورتوں کے نام نہیں لکھے گئے۔ مگر یہ واقعات بھی کسی نہ کسی عورت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ تمام واقعات مسلمان عورتوں سے منسوب ہیں۔ جن میں عرب ایران اور ہندوستان کی عورتیں شامل ہیں۔ عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کا اظہار اس انداز میں ہوا ہے کہ فوق نے ترجمے کے علاوہ اصل شعر مقولہ آیت یا حدیث عربی زبان میں بھی تحریر کر دی ہے۔ تاکہ اس زبان کے جاننے والے صحیح لطف اٹھا سکیں۔ اس طرح سے فارسی زبان کی لطافتوں سے بہرہ مند ہونے والوں کے لیے بھی یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ البتہ اردو زبان کے حوالے سے ایک ہی واقعہ کتاب میں موجود ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی تحقیق وتلاش کے بعد اس طرح کے کچھ اور واقعات مل سکتے تھے۔ جو ایک واقعہ فوق نے کتاب میں شامل کیا ہے۔ وہ بھی عربی، فارسی اشعار پر مشتمل واقعات کے مقابلے میں کمتر درجے کا ہے۔ فوق لکھتے ہیں:

"بیگم جان۔ نواب قمر الدین کی دختر کا نام ہے۔ جو بیگمات اودھ میں بہو بیگم کے نام سے ممتاز تھی۔ ایک دفعہ بیمار ہوئی۔ ہمدم نام کا خواجہ سرا عیادت کو آیا۔ بیگم جس کا تخلص جانی تھا۔ برجستہ کہا۔

کیا پوچھتا ہے ہمدم اس جسم ناتواں کی
رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہیے کہاں کہاں کی (صفحہ: ۱۲)

بادشاہوں، نوابوں کے درباروں میں ہونے والے مکالموں کے حوالے سے قصے اس کتاب میں زیادہ ہیں۔ بعض اوقات ان مکالموں سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ یہ بھی ہوا کہ ایک عورت نے اپنے حسنِ بیان اور کمال حوصلے سے بڑی نازک صورتحال میں سرخروئی حاصل کی۔ حکمرانوں اور جابر سلطانوں کے سامنے بات کرنا جرأت مندی کی مثال ہے۔ اس جرأت مندی کے لیے دانشمندی بھی ضروری ہے۔ فوق لکھتے ہیں۔

"نور بائی۔ ایک عالمہ و فاضلہ طوائف محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی میں ہوگزری ہے۔ جب نادر شاہ، محمد شاہ کا زبردستی مہمان بن کر دہلی آپہنچا۔ اور وہاں عیش و نشاط کے جلسے ہونے لگے۔ تو نور بائی کا گانا اس کو بہت پسند آیا۔ نادر شاہ نے اس کو ایران ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا۔ تو نور بائی دل میں بہت ہراساں ہوئی کہ ایسے سنگدل بادشاہ کے تلطف کی امید موہوم پر کہیں وطن مالوف سے جدا نہ ہونا پڑے۔ نہ اقرار کرسکتی تھی نہ انکار کی تاب لاسکتی تھی۔ لیکن نہایت ذہین اور حاضر جواب تھی۔ فوراً یہ اشعار اپنے حسبِ حال موزوں کر لیے اور سرِ تسلیم خم کر کے ستار چھیڑا اور دلکش آواز میں گانا شروع کیا۔

من شمعِ جانگدازم تو صبحِ دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دور آنچناں کہ گفتم
نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ اس کے مطلب کو سمجھ گیا اور اس کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

(صفحہ : ۵۹)

اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فوق نے بات کی برجستگی کو مؤثر طریقے سے بیان کرنے کے لیے کیا انداز اختیار کیا ہے۔ یہاں دوسرے ایسے واقعات درج کرنا ممکن نہیں۔ البتہ ان عورتوں کے نام لکھے جارہے ہیں جن سے یہ واقعات منسوب ہیں:

(۱) آرام، (۲) آمنہ، (۳) امیر بیگم اسیر، (۴) اسما، (۵) امانی بیگم، (۶) ام البلاء، (۷) ام عفیبہ، (۸) برکمیہ، (۹) بزرگی، (۱۰) بلقیس بیگم، (۱۱) منان، (۱۲) بنت عقیل، (۱۳) بنت مہلهل، (۱۴) بیگم جان، (۱۵) جہاں خاتون، (۱۶) جمیلہ، (۱۷) جہاں ملک، (۱۸) دلِ آرام، (۱۹) دتانیر، (۲۰) دولت، (۲۱) حفصہ (۲۲) خنسا، (۲۳) ذلقا، (۲۴) رباب، (۲۵) رابعہ بصری، (۲۶) زوجہ سالم (۲۷) زیب النساء بیگم مخفی، (۲۸) سلامہ، (۲۹) سورۃ ہمدانیہ، (۳۰) صدقہ، (۳۱) عائشہ، (۳۲) عبادیہ، (۳۳) عقیلہ، (۳۴) فاطمہ سلطان، (۳۵) فضل، (۳۶) گنا بیگم، (۳۷) لطیفہ حدانیہ، (۳۸) ماہ چوچک بیگم، (۳۹) محبوبہ، (۴۰) مریم، (۴۱) میری ہریہ میتی، (۴۲) مکتوم، (۴۳) ممتاز محل، (۴۴) نور جہاں بیگم، (۴۵) نور بائی۔

کتاب میں دتانیر اور ذلفا کے نام سے دو مختلف عورتوں کا ذکر ہے۔

فوق نے "زنانہ حاضر جوابیاں" کی ترتیب و انتخاب میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں مولانا محمد عباس کی "مشاہیر خواتین" سید ناظر حسن بلگرامی کی "بدیہہ گوئی" اور رسالہ "خاتون" علی گڑھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"جغرافیہ ریاست پونچھ"

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۸ء میں ظفر برادرس لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ ایک درسی کتاب ہے جو ریاست پونچھ کے مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔ فوق کی کئی دوسری کتابیں کشمیر کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی تھیں مگر "جغرافیہ ریاست پونچھ" ایک ایسی کتاب ہے۔ جو خصوصی طور پر اس مقصد کے لیے لکھوائی گئی۔ اسی لیے اس کا انداز اسلوب تدریسی اصولوں کے مطابق اختیار کیا گیا ہے۔

برِصغیر کے مدارس میں بالعموم ابتدائی جماعتوں میں اپنے ضلع کا جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے۔ ہر ضلع کے گزیٹر میں بھی جغرافیائی معلومات مل جاتی ہیں۔ ریاست پونچھ بھی ایک بڑے ضلع کے برابر تھی۔ آج بھی یہ علاقہ آزاد کشمیر کا ایک ضلع ہے۔ اس کا کچھ حصّہ مقبوضہ کشمیر میں واقع ہے۔

جغرافیہ کا علم بڑوں اور بچّوں کے لیے ضروری ہے۔ یوں بھی ہر بچہ فطری طور پر جغرافیہ داں ہوتا ہے۔ اس شعور کے بغیر کوئی آدمی اپنے گھر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ فوق نے اس بنیادی حقیقت کو "جغرافیہ ریاست پونچھ" کے آغاز ہی میں بہت دلچسپ اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ تاکہ بچّوں کو اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ فوق لکھتے ہیں:

"عزیز بچو! اگر تم سے کوئی پوچھے کہ تمھارا گھر کہاں واقع ہے تو تم اسے کس طرح سمجھاؤ گے۔ تم یہی کہو گے کہ شہر کے فلاں محلّے فلاں گلی کے داہنے یا بائیں طرف واقع ہے۔ اور اس کے قریب فلاں عمارت یا سکول یا کوئی اور چیز ہے۔ اس طرح اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ تمھاری ریاست پونچھ کہاں واقع ہے تو تم کیا کہو گے؟" (صفحہ ۱)

اس کے بعد فوق نے ریاست کے نقشے کی معرفت بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دو ابواب کئی فصلوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے باب میں پانچ اور دوسرے باب میں چار فصلیں ہیں۔ اس کتاب میں ریاست پونچھ کے بارے میں تمام بنیادی معلومات درج ہیں۔ پہلے حصّے میں ریاست کا حدودِ اربعہ۔ سطح۔ پہاڑ۔ دریا۔ آب و ہوا۔ پیداوار۔ پیشے۔ ذرائع آمد و رفت۔ باشندوں کی قسمیں۔ تجارت۔ صنعت و حرفت۔ معدنیات۔ حیوانات۔ تاریخی حالات اور ملکی انتظام کے بارے میں مختلف عنوانات کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصّے میں ریاست کی تحصیلیں مشہور شہر۔ قصبے۔ مشہور مقامات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری

حصّے پر ریاست کا نقشہ بنایا گیا ہے۔

بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل فن ہے۔ اور پھر ایسا انداز اختیار کرنا کہ اس تحریر میں بچوں کے علاوہ بڑے بھی یکساں دلچسپی لیں۔ اور بھی مشکل بات ہے۔ درسی کتاب کی اپنی ایک انفرادیت اور افادیت ہوتی ہے۔ اسے بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ فوق کی یہ کتاب اس لحاظ سے ایک کامیاب پیشکش ہے۔ اور اب جب کہ یہ درسی کتاب نہیں۔ اس کے باوجود اس کی اہمیت اور دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ اس علاقے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں اب بھی بہت کچھ ہے۔

جغرافیے کی اس کتاب میں ایک مضمون فوق نے ریاست کے تاریخی حالات کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ تو جغرافیہ تاریخ بن گیا۔ اب تہذیبی اور تاریخی معاملات میں جغرافیہ کا دخل بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ فوق نے جغرافیے اور تاریخ کو باہم آمیخت کر دیا ہے۔ فوق لکھتے ہیں :

"راجہ گلاب سنگھ کا بڑا بھائی راجہ دھیان سنگھ (جس کے نام پر لاہور میں ایک حویلی راجہ دھیان سنگھ بھی مشہور ہے) مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وزیر اعظم تھا۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانہ میں قتل ہو چکا تھا۔ اس لیے راجہ گلاب سنگھ جو انگریزوں سے عہد نامہ کرنے کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ والیٔ جموں و کشمیر کہلانے تھے۔ اپنے بھائی راجہ دھیان سنگھ کے بیٹے راجہ موتی سنگھ کو پونچھ کا علاقہ حکومت کے لیے دے دیا۔ چنانچہ وہ کئی سال تک بہت اچھی طرح حکومت کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد راجہ بلدیو سنگھ گدی پر بیٹھے جنھوں نے پونچھ کو کشمیر سے الگ کر کے اپنے احکام و قوانین جاری کر دیے۔" (صفحہ : ۲۵)

"مضامین فوق" (غیر مطبوعہ)

کتابی صورت میں غیر مطبوعہ اس مسودے میں شامل فوق کے اکثر مضامین مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کو فوق نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ غیر مطبوعہ مجموعہ مضامین فوق کے صاحبزادے ظفرالحق صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ راقم نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ظاہر ہے فوق اسے کتابی صورت میں طبع کرانا چاہتے تھے۔ فوق کی دوسری غیر مطبوعہ کتابوں کے برعکس اس مسودے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ کچھ مضامین کے آخر میں ان رسالوں کے نام ہیں جن میں وہ شائع ہوئے تھے۔ مگر کئی مضامین میں ایسا کوئی حوالہ موجود نہیں کے مضامین شائع ہوئے۔

(۱) "پیسہ اخبار"، لاہور۔ (۲) "سیاست" لاہور۔ (۳) "قوس قزح" لاہور (۴) "نیرنگ خیال"۔ لاہور۔ (۵) "زمیندار" لاہور۔ (۶) "انقلاب" لاہور۔ (۷) "اخبار عام" لاہور۔ (۸) "مخزن" لاہور۔ (۹) "ادیب" لاہور۔ (۱۰) "ہمایوں" لاہور۔ (۱۱) "اخبار ہمدرد" سرینگر۔ (۱۲) "صوفی" منڈی بہاؤالدین (۱۳) "زمانہ" کانپور۔

اس مسودے میں ساٹھ کے قریب مضامین ہیں جو ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحات بڑے سائز کے ہیں۔ چونکہ یہ مضامین کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ اس لیے ان کی مکمل فہرست اس جائزے میں پیش کی جا رہی ہے۔

(۱) لاہور کا میلہ بسنت پنچمی۔ (۲) حکومت انگلشیہ کو کشمیر کی پیشکش۔ (۳) ہندو عہد قدیم کے چند تاریخی شذرے (۴) مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ہولیاں۔ (۵) بنگال اور پرتگیز۔ (۶) دنیا کے تین طویل القامت آدمی۔

(۷) تازی بٹ سپہ سالار افواج کشمیر - (۸) محمد رضا مشتاق - (۹) امیر تیمور اور کشمیر - (۱۰) شاعرانہ حاضر جوابیاں - (۱۱) خطۂ کشمیر کے تاریخی شکر پارے - (۱۲) آغا مہدی کاشمیری - (۱۳) اہلِ کشمیر کا قومی گیت - (۱۴) شاہ جہان اور پابندی شریعت - (۱۵) امیر تیمور کی سب سے پہلی بیگم - (۱۶) رانی روپ متی - (۱۷) اکبر اور جہانگیر کے اُستاد اور ہم سبق - (۱۸) مُسلمان بادشاہ کی مُنہ بولی ہندو بہن - (۱۹) آخری شاہان مغلیہ کے عہد میں کشمیر کی حالت - (۲۰) ایک فرانسیسی عورت - (۲۱) سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر - (۲۲) عرب خاتون - (۲۳) راجہ راج روپ ڈوگرہ (۲۴) قہر الٰہی کی بجلی - (۲۵) صاحب جی - (۲۶) مراد بیگم - (۲۷) مہاراجہ رنجیت سنگھ اور مُسلمان فقراء - (۲۸) بے علم بادشاہ کے علمی کارنامے - (۲۹) صوفیانہ نکتے اور چٹکیاں - (۳۰) نوابی میں درویشی - (۳۱) شوامی رام تیرتھ کے یک صد اقوال - (۳۲) قدیم دلچسپ تاریخی شکر پارے؟ (۳۳) ریاست کشمیر کے اہم تغیرات - (۳۴) صدرِ ہند شہنشاہ اکبر - (۳۵) امراء و سلاطین ہند کے سبق آموز تاریخی لطیفے - (۳۶) چند لطیفے اور دلچسپ شاعرانہ حاضر جوابیاں - (۳۷) آئینۂ خود شناسی - (۳۸) ہندوؤں کے تیوہاروں پر مُسلمانوں کی خوشیاں - (۳۹) بادشاہت اور دیوانگی - (۴۰) بادشاہوں کی شاعری - (۴۱) سلہری پُوربیہ - (۴۲) اکبر اور جہانگیر کے استاد اور ہم سبق - (۴۳) جعلی شہزادے - (۴۴) لاہور آج سے ستاسی سال پیشتر - (۴۵) ہمایوں کی ایجادیں - (۴۶) محمُود غزنوی اور خرقانی درویش - (۴۷) تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ - (۴۸) ایک عارف باللہ کینزک - (۴۹) جنید اور شبلی کے عارفانہ نکتے - (۵۰) بادشاہی میں فقیری - (۵۱) بانسری کی فریاد - (۵۲) سلطان نیمروز - (۵۳) تخت اور تختہ - (۵۴) بادشاہ گر درویش - (۵۵) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جشن ہائے نشاط - (۵۶) بھیشم پتامہ کا اپدیش - (۵۷) اکبری

جشن نوروزی - (۵۸) ایک مردہ ماں کا بچّہ -

ان مضامین کی ایک بڑی تعداد تاریخی نوعیت کی ہے - اور ان میں فوق نے وہی انداز اختیار کیا ہے جو ان کی تاریخی کتابوں میں ملتا ہے - موضوعات کے تنوع کے باوجود لگتا ہے کہ یہ مضامین ایک ہی کتاب کے لیے لکھے گئے ہیں - کئی مضامین کے عنوانات دیکھ کر فوق کی دوسری کتابوں کی طرف دھیان چلا جاتا ہے - مثال کے طور پر یہاں بھی کشمیر کے حوالے سے چند مضامین موجود ہیں - اور کشمیر فوق کا محبوب موضوع ہے - اور ان کی بیشتر کتابیں براہِ راست کشمیر سے متعلق ہیں - اس طرح عورتوں کے بارے میں فوق نے بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں - مضامین فوق میں چند مضامین عورتوں کے بارے میں ہیں - اقوال پر مبنی مضامین ہیں اور باقاعدہ کتابیں بھی ہیں - مہاراجہ گلاب سنگھ کے بارے میں اس مسودے میں دو مضامین ہیں جب کہ اس مہاراجہ کے بارے میں فوق کی ایک غیر مطبوعہ کتاب دستیاب ہوئی ہے - لطائف اور حاضر جوابیوں پر مشتمل کتابوں میں بھی یہی کیفیت ہے - فوق کے مضامین اور کتابوں کے ضمن میں یہ موازنہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ مضامین مختلف نوعیت کی چیز نہیں - یہ بھی اس علمی و ادبی تسلسل کا حصہ ہے جو ساری عمر فوق کا مشغلہ اور معمول رہا - البتہ چند ایک موضوعات ایسے ہیں جو قدرے مختلف روپ رکھتے ہیں - اور جن کی نوعیت ادبی بھی ہے - اس ضمن میں "بادشاہوں کی شاعری" اور "بانسری کی آواز" کا نام لیا جا سکتا ہے - جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ مضامین علی گڑھ اور "تہذیب الاخلاق" کی تحریک کے زیرِ اثر لکھے گئے مضامین سے مختلف ہیں - فوق کے موضوعات اور اسلوب بیان اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا -

---

"مرتبہ کتابیں"

"ناصحِ مشفق"

نصیحت آموز اقوال پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۰ء میں مطبع منتر ولاس لاہور والوں نے شائع کی تھی۔ کتاب کا نام اپنے موضوع کی وضاحت کرتا ہے۔ فوق اس حقیقت کے آشنا تھے کہ جو نصیحت شفقت کی مٹھاس میں گھلی ہوئی ہو۔ وہ دِل پر اثر کرتی ہے۔ اسے سن کر طبیعت بھی مکدر نہیں ہوتی۔ جب سُننے والے کو یہ یقین ہو جائے کہ نصیحت کرنے والا مخلص اور ہمدرد ہے۔ تو وہ اس کی بات دِل کے کانوں سے سنتا ہے۔ فوق نے ساری عمر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا۔ اور ایک درد آشنا معاشرے کے قیام کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ لوگوں کو ایک اچھا شہری اور ایک بہترین انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کتاب میں جو اقوال فوق نے جمع کیے ہیں وہ پند و نصائح کے ذیل میں آتے ہیں۔ دوستانہ مشورہ بھی نصیحت ہوتی ہے اسے قبول کر لینے میں آدمی کے اندر ردِ عمل نہیں پیدا ہوتا۔

"ناصحِ مشفق" ایک ایسی اخلاقی اور علمی کتاب ہے۔ جس میں دُنیا بھر کے مذہبی رہنماؤں حکیموں داناؤں مدبروں اور فلاسفروں کے قابلِ قدر مقولے اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ بہت سے اقوال کسی شخصیت کے ساتھ منسوب نہیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں متفرق اشعار پر مشتمل حصّۂ نظم ہے۔ جس میں مختلف شعراء کا وہ کلام شامل ہے جس میں اخلاقی مضامین بیان کیے گئے ہیں۔

"آئینۂ اخلاق" (غیر مطبوعہ)

اس کتاب کا مسودہ مولانا عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے۔ یہ مسودہ فوق کے دوسرے غیر مطبوعہ مسودوں کی طرح محفوظ شکل میں نہیں ہے۔ "آئینۂ اخلاق" کے کئی اوراق پھٹ چکے ہیں صفحوں کی ترتیب درست نہیں ہے۔ کوشش کی جائے تو ان اقوال کو نئے سرے سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا انداز "ناصح مشفق" سے ملتا جلتا ہے۔ اس کتاب کے نام سے اس کی اہمیت اور مقصدیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اخلاق و کردار کی تربیت کے لیے، اقوال ایک مفید ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب ایک ایسے آئینے کی طرح ہے۔ جس میں ہم اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری اصل کیا ہے۔ اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ کتاب اصلاح و احوال کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ کہیں کہیں کسی قول کے ساتھ مختصراً پس منظر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ جو اس کی افادیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ کتاب میں مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگوں کے اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ سچائی اور بھلائی جہاں بھی ہے وہ ہر انسان کی میراث ہے۔ کورو اور پانڈو کی لڑائی کے پس منظر میں یہ قول بہت اہمیت کا حامل ہے۔

"راجاؤں کو چاہیے کہ رموزِ مملکت میں صاحبانِ دُور اندیش سے صلاح لیں اور اس پر عمل بھی کریں"

کتاب میں احادیث رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ۔ بدھ۔ سری کرشن جی۔ گرو نانک اور اکبرِ اعظم کے علاوہ بہت سے بڑے انسانوں کے اقوال موجود ہیں۔ کچھ اقوال نئے زمانے کے تقاضوں سے حیرت انگیز حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً اکبر کے اس قول کو ایک اہم مسئلے خاندانی منصوبہ بندی کی روشنی میں دیکھا

جائے تو محسوس ہوتا ہے۔ کہ دانش ایک قدیم سچائی ہے۔ اکبر کا قول ہے۔

"چھوٹی عمر میں بچّوں کی شادی کر دینا خدا کو ناخوش کرنا ہے۔"

"آئینۂ اخلاق" میں سینکڑوں کی تعداد میں اقوال ہیں۔ اِس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ اسے دوبارہ مربُوط و مرتّب کر کے شائع کیا جائے۔

"حکمت کے موتی"

اڑتالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام پہلی بار ۱۹۲۶ء میں شائع ہُوئی۔

یہ کتاب اہلِ کشمیر کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کی ترجمان ہے۔ یہ اقوال کشمیر کے تاریخی خزانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان اقوال میں جو کارآمد باتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ عام لوگوں اور راجاؤں دونوں کے لیے یکساں طُور پر مُفید ہیں۔ تمام اقوال سنسکرت زبان کی نہایت مستند اور مشہور تاریخ "راج ترنگنی" کے ترجمے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ تاریخ کشمیر لکھتے ہُوئے بھی فوق نے "راج ترنگنی" سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ اور کئی جگہوں پر "راج ترنگنی" کے مصنّف پنڈت کلہن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ "پچھلے ابواب میں یہ تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں فوق نے پنڈت کلہن کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں۔ ان کے مذہب۔ شاعری۔ علمی و ادبی کارنامے اور ان کے زمانے میں کشمیر کے سماجی حالات کا مختصر جائزہ بھی پیش کر دیا ہے۔ "تاریخ کشمیر" جلد اوّل کے دیباچے میں بھی یہ تفصیل ملتی ہے۔

"حکمت کے موتی" میں کل ۵۵ اقوال ہیں۔ یہ بات توطے ہے کہ یہ اقوال "راج ترنگنی" سے لیے گئے ہیں۔ مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی، کہ یہ اقوال پنڈت کلہن کے ہیں۔ یا

انھوں نے کشمیر کے مختلف دانشمندوں کے اقوال اپنی کتاب میں تحریر کر دیے تھے۔

"گلشن نو بہار"

مختلف شاعروں کے کلام پر مبنی یہ کتاب منشی رام اگروال پریس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ سال اشاعت درج نہیں مگر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحہ نمبر ۳۶ پر فوق نے علامہ اقبال کے بارے میں جو تحریر لکھی ہے۔ اس سے بھی یہی سال اشاعت ثابت ہوتا ہے۔ اس مقالے کے پہلے باب میں اقبال اور فوق کے روابط کے ضمن میں یہ بحث کی جا چکی ہے۔

یہ کتاب شعری انتخاب کے اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں حصۂ چہارم حصۂ پنجم اور حصۂ ششم شامل ہیں۔ یہ حصے پہلے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کے دو سرورق ہیں۔ پہلا نو بہار سٹیم پریس ملتان میں شائع ہوا ہے۔ اس پر یہ تحریر درج ہے۔

پھڑکتی ہوئی غزلیات کا سلسلۂ جدید دَور۔

دوسرے سرورق پر یہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

وہ گلچیں ہیں کہ ہم باغ سخن میں پھول چُن چُن کر
بنایا کرتے ہیں گلدستہ گر دیوں کی محفل میں

وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر
شعر جو انتخاب ہوتے ہیں

اس کتاب میں جن شعراء کا کلام شامل ہے۔ ان کے نام یہ ہیں :

(۱) داغ دہلوی - (۲) جلال لکھنوی - (۳) امیر مینائی - (۴) احسان شاہ جہان پوری - (۵) یاس لکھنوی - (۶) شمشاد لکھنوی - (۷) شوق سہارنپوری - (۸) فغاں اشرف علی خاں - (۹) تاباں - (۱۰) سودا - (۱۱) درد - (۱۲) سوز - (۱۳) میر - (۱۴) جرأت - (۱۵) انشار - (۱۶) ناسخ - (۱۷) مطیر - (۱۸) متین مچھلی پوری - (۱۹) مفطر خیر آبادی - (۲۰) کوثر خیر آبادی - (۲۱) بیدل شاہجہان پوری - (۲۲) محزوں مراد آبادی - (۲۳) رمیز - (۲۴) کمال لکھنوی - (۲۵) جلیس مچھلی پوری - (۲۶) نظیر مرزا آبادی - (۲۷) فہیم گورکھپوری - (۲۸) اعجاز لکھنوی - (۲۹) انگرا جیگڈھی - (۳۰) اختر دہلوی - (۳۱) ریاض گورکھپوری - (۳۲) شہرت حیدر آبادی - (۳۳) تسلی تھانوی - (۳۴) مکیش تھانوی - (۳۵) ہلال لکھنوی - (۳۶) گستاخ میرٹھی - (۳۷) شہید لکھنوی - (۳۸) اُمید لکھنوی - (۳۹) فدا تھانوی - (۴۰) صابر نگوریؒ - (۴۱) مشتاق باقی - (۴۲) قضا لکھنوی - (۴۳) اقبال غازی پوری - (۴۴) عاقل کانگڑوی - (۴۵) اقبال ایم اے - (۴۶) محمد الدین فوق -

اس مجموعے میں شامل غزلیات شعراء کے اسلوب شعر کی نمائندگی کرتی ہیں - یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ فوق کے زمانے میں شعر کا ذوق کس انداز کا تھا اور خود فوق کی شعری ترجیحات کیا تھیں - یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک دَور میں موجود تقریباً سب شاعروں کا کلام اس میں اکٹھا کر دیا گیا ہے - اس طرح ہمیں اس زمانے کے مجموعی شعری مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے - فوق نے اقبال کے علاوہ بھی چند ایک شعراء کے بارے میں دو دو فقرے تحریر کیے ہیں - اگر وہ تمام شاعروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے اور ان شاعروں کو تاریخ پیدائش کے حوالے سے ایک ترتیب میں لے آتے تو یہ کتاب تذکرے کے ذیل میں بھی آسکتی تھی - چونکہ یہ تمام شعراء ایک

دوسرے کے ہمعصر تھے ایک خاصی تعداد تو ایک دوسرے کی ہم عمر بھی ہوگی۔ شاید اسی لیے فوق نے کوئی خاص التزام قائم رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"روایاتِ اسلام"

۹۶ صفحات کی یہ کتاب اسلامی تاریخ کے سبق آموز واقعات اور نتیجہ خیز شاندار روایات کا منظوم مجموعہ ہے۔ چند مشہور قومی شعرا، کم مشہور، غیر معروف اور کچھ نامعلوم شعرا کی وہ نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ جن میں خُلقِ محمدی۔ اسلامی حریت ومساوات، عدل و انصاف اور ایثار و قربانی کے زریں واقعات نظم کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مختلف واقعات پر مبنی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ واقعات جب منظوم شکل میں سامنے آتے ہیں۔ تو ان میں زیادہ جوش اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ نظموں کی تعداد ۵۷ ہے۔ کچھ شعرا کی ایک سے زیادہ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ کچھ نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں۔

(۱) "فاروقِ اعظمؓ اور ایک بڑھیا"۔
(۲) "ماں کی نصیحت بیٹے کو"۔
(۳) "قوتِ ایمان اور جوشِ عمل"۔
(۴) "مکالمہ خالدؓ بن ولید اور عکرمہؓ بن ابوجہل"۔
(۵) "جنگ یرموک"۔

نظموں کے اس مجموعے کی اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوق اسلامی روایات کے کتنے دلدادہ تھے۔ ان کی ساری عمر تاریخ اسلام میں اخلاق و کردار کا چراغ لے کر عظمتیں تلاش کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے گزری۔ یہ کتاب اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئی۔ ہمیں اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن دستیاب ہوا ہے جو ۱۹۳۵ء

میں حمایت اسلام پریس لاہور میں طبع ہوا۔ فوق اس کا چھٹا ایڈیشن بھی شائع کرنا چاہتے تھے۔ پانچویں ایڈیشن کا جو نسخہ ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ وہ ان کے اپنے ہاتھ کا نظرثانی شدہ نسخہ ہے۔ انھوں نے بعض نظمیں قلم زد کی ہوئی ہیں۔ اور کئی نئی نظموں کے عنوان فہرست میں درج کر رکھے ہیں۔ مگر وہ چھٹا ایڈیشن شائع نہ کرا سکے۔ اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب بھی فوق کسی کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کرتے تھے تو اس میں حسبِ منشا ردو بدل اور ترمیم و اضافہ کرتے تھے۔ ان کا ذہن و فکر مسلسل ارتقا پذیر رہتے تھے۔ یہ بات ان کی خوب تر کی تلاش کی خواہش کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ جن شعرا کی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) علامہ شبلی۔ (۲) حکیم افتخار علی جگر۔ (۳) ملک نصر اللہ خان عزیز (۴) مولوی انوار حسین رسوا۔ (۵) مولانا کیفی چریاکوٹی۔ (۶) علامہ سر اقبال۔ (۷) حضرت اَوج گیاوی۔ (۸) مولانا اظہار الحق سہیل عباسی۔ (۹) مولانا ظفر علی خان۔ (۱۰) بابو شمبھو دیال دانش۔ (۱۱) محمد اشرف علی خان صاحب۔ (۱۲) مولوی عبدالودود بریلوی۔ (۱۳) محمود اسرائیلی۔ (۱۴) مولانا ضیا احمد ایم۔ اے۔ (۱۵) باسط بسوانی۔ (۱۶) اسلم جے راج پوری۔ (۱۷) سہیل لدھیانوی۔ (۱۸) حضرت شفق۔ (۱۹) قومی امروہی۔ (۲۰) چوہدری دلو رام کوثری۔ (۲۱) منظور الحق کلیم۔ (۲۲) شفق عمار پوری۔ (۲۳) مولانا محمد علی خاں اثر۔ (۲۴) سیماب اکبر آبادی۔ (۲۵) مخدومی فیروز پوری۔ (۲۶) نجم آفندی اکبر آبادی۔ (۲۷) محمود اعظم فہمی ترمذی۔ (۲۸) سید شریف حسن۔ (۲۹) طالب سہارنپوری۔ (۳۰) مولوی حامد حسین قادری۔ (۳۱) مولانا بشر الدین۔ (۳۲) مولوی عبدالمتین متین۔ (۳۳) پروفیسر محمد دین تاثیر۔ (۳۴) ڈاکٹر سعید الدین سعید دہلوی۔

"ہمدرد زمینداران"

ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام پہلی بار ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی اس کتاب کی ضخامت ۵۶ صفحات ہے۔ یہ کتاب اصلاحی نظموں کا ایک انتخاب ہے۔ اور اپنے نام سے اپنی افادیت کی مظہر ہے۔ برِصغیر میں زراعت کی اہمیت سے سب واقف ہیں۔ زرعی معاشرت کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ صنعتی ترقی کے آثار کے باوجود غالب آبادی کا دارومدار زراعت پر ہے۔ فوق کے زمانے میں لوگوں کا ذریعۂ معاش زیادہ تر یہی تھا۔ کسانوں اور زمینداروں کی انجمنیں مختلف وقتوں میں بنائی گئیں۔ آج بھی زمیندار اور کاشتکار بھائیوں کے لیے ذرائع ابلاغ کے ذریعے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں فوق نے اپنی اور دوسرے شاعروں کی نظموں کے ذریعے کاشتکاروں اور زمینداروں اور عام باشندوں کو دیہات سدھار۔ اصلاحِ رسوم۔ مسئلۂ تعلیم بالغاں۔ امداد باہمی صحت وصفائی۔ پنچایت اور زمیندارہ بنکوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور ان میں تعلیمی بیداری۔ حب الوطنی اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کو خوشحال اور معزز دیہاتی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ یہ اصلاحی اور مقصدی شاعری کا ایک نمائندہ انتخاب ہے۔ فوق کے زمانے میں زمینداروں اور کاشتکاروں کو جن مسائل کا سامنا تھا۔ ان کے حوالے سے یہ چھوٹی سی کتاب ایک بڑی خدمت تصور کی جانا چاہیے۔ اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کا واحد مجموعہ ہے۔ اس طرح کے شعری انتخاب کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس طرح کی نظمیں بھی ایک جگہ پر اکھٹی نہیں ملتیں۔

برِصغیر پاک و ہند میں خواندگی کی شرح بہت نیچے ہے۔ اس کے لیے تعلیم بالغاں پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ کاشتکاروں کو بھی تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ زراعت

کے جدید آلات اور نئی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھاکر زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کریں۔ تاکہ لوگ خوراک کے میدان میں خود کفیل ہو سکیں "ہمدرد زمینداران" میں تعلیم بالغاں، کے عنوان سے تین نظمیں ہیں اور تینوں فوق کی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے مختلف موضوعات پر فوق کی آٹھ نظمیں کتاب میں شامل ہیں۔ اور یہ کسی شاعر کی سب سے زیادہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا ذکر فوق کی شاعری کے باب میں بھی کیا گیا ہے۔ فوق نے ملک کے دوسرے شعراء کو بھی اصلاح معاشرہ کے اس پروگرام میں شریک کیا ہے۔ فوق کی گیارہ نظموں کے علاوہ دوسرے شاعروں کی چھبیس نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ پہلی نظم ڈاکٹر علامہ اقبال کی ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تُو کھیتی بھی تُو باراں بھی تُو حاصل بھی تُو

کتاب میں مولانا محمد بخش مُسلم کی نظم "دہقاں کی بے چارگی" بھی شامل ہے جبکہ مولانا مُسلم صاحب ایک عالمِ دین اور خطیب کے طور پر معروف ہیں۔ اور بھی کئی غیر معروف شعراء کا کلام موجود ہے۔ جب کہ کئی نظمیں شاعر کے نام کے بغیر ہیں۔ فوق نے لکھا ہے۔ کہ بعض اخبارات و رسائل کے بوسیدہ و دریدہ کاغذات سے شاعر کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ اور کئی نظموں کو خود مکمل کرنا پڑا ہے۔ گمنام شعرا کے علاوہ مندرجہ ذیل شعرا کا کلام کتاب میں شامل ہے۔

علامہ سر محمد اقبال، چوہدری محمد یوسف ناظر، مولانا انعام اللہ خاں ناصر، سید ہادی حسن نقدی، پریم پجاری، منشی برکت علی شہید، پنڈت دینا ناتھ، محمد الدین فوق۔

"اذانِ بُتکدہ"

۳۰ صفحات کی اس کتاب پر سال اشاعت درج نہیں۔ یہ کتاب ظفر برادرس

لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ اس میں مختلف ہندو شاعروں کا نعتیہ کلام شامل ہے۔

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت اتنی عظیم، ہمہ گیر اور محبوب ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی نعتیہ شاعری میں عقیدت و احترام کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو پڑھنے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ اشعار کسی غیر مسلم کے ہو سکتے ہیں۔ فوق نے ہندو شاعروں کی نعتوں کا یہ انتخاب مرتّب کر کے ایک قابلِ قدر اور قابلِ تقلید کام کیا ہے۔

"اذانِ بُتکدہ" میں جن ہندو شاعروں کا کلام شامل ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔

بھودیال عاشق، پنڈت گپتی لال خستہ، پنڈت راگھو ندر جذب نظامی، بابو روشن لعل نعیم، پنڈت بشن نرائن جامی بریلوی، ماسٹر مہا دیو پرشاد سامی جبلپوری، منشی رام پرشاد کائستھ لکھنوی، چوہدری دلورام کوثری، ہمدم اکبر آبادی، منشی شنکر لال ساقی، مہاراجہ سرکشن پرشاد، پنڈت ہری چند اختر، مصر رام داس قابل لاہوری، تارا چند تارا، لالہ اردڑا رائے، لالہ لال چند فلک لاہوری، ڈاکٹر ما بلا رام، شریمتی لوارتی۔

کچھ شاعروں کے مختصر حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ نعتیں دلورام کوثری کی ہیں۔ دلورام بلاشبہ عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس نے مختلف اسلامی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اس کی دو نظمیں فوق کی مرتبہ کتاب "روایاتِ اسلام" میں بھی موجود ہیں۔ "اذانِ بُتکدہ" میں شامل دلورام کوثری کی نعت کے اشعار دلآویز کیفیت رکھتے ہیں۔

کوثری تنہا نہیں ہے مصطفٰے کے ساتھ ہے
جو نبی کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے

نکلے دلورام کو حضرتؐ لیے جنّت ہیں جب
غل ہوا ہندو بھی محبوبِ خدا کے ساتھ ہے

فوق نے کتاب کے سرورق پر ہندو شاعروں کے لیے برادر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دنیا میں وہ سب لوگ ہمارے بھائی ہیں۔ جو ہمارے ساتھ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت میں شریک ہیں۔ یہ کتاب ہندو مسلم اتحاد کے نظریے سے بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔

"قومی ترانے"

۸۴ صفحات کی یہ کتاب علی محمد تاجر کتب حبہ کدل سرینگر کشمیر والوں نے شائع کی۔ کتاب پر سال اشاعت درج نہیں۔ اس شعری انتخاب میں مختلف شاعروں کے ۴۳ قومی ترانے شامل ہیں۔ یہ سب ترانے حب الوطنی کے جذبے کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر ملک ہر زبان کے شاعروں نے حبِ وطن سے سرشار ہو کر نغمے اور نظمیں لکھی ہیں۔ آدمی جہاں رہتا ہے اس جگہ کی خیر مانگتا ہے۔ اس زمین کی خوبصورتی اور خوشحالی کے گیت گاتا ہے۔ فوق نے اس انتخاب میں صرف وہ نغمے شامل کیے ہیں۔ جن میں اپنے وطن کی تعریف کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ اور اپنی سرزمین سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ کتاب میں مندرجہ ذیل شعرا کے ترانے شامل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ محمد شفیع الدین بریلوی۔ مولانا سیماب اکبر آبادی۔ پروفیسر حامد اللہ اختر میرٹھی۔ پنڈت برج نرائن چکبست کشمیری لکھنوی۔ مولانا وقار انبالوی۔ آغا حشر کاشمیری۔ سید محمد مہدی امروہی۔ راز شانت۔ پنڈت میلا رام وفا۔ منشی غلام قادر فرخ امرتسری۔ رحم علی ہاشمی علی گڑھی۔ خواجہ دل محمد ایم اے۔ پنڈت سروپ نرائن ایمن۔ تلوک چند محروم۔ سرور جہاں آبادی۔ سائل دہلوی۔ لالہ سکھدیو پرشاد سہنا بسمل الہ آبادی۔

سید امجد علی اشہری - ممتاز علی الہ آبادی - قمر جلال آبادی - ماسٹر نثار حسین نثار سیمابی اٹاوی۔ مولانا انعام اللہ خان ناصر حسن پوری - محمد زبیر روحی الہ آبادی - خیام العصر ساغر علی گڈھی - ڈاکٹر اعظم کریوی - محمد الدین فوق -

کتاب کا آغاز علامہ اقبال کے مشہور و معروف گیت سے ہوتا ہے -

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یہ نغمہ اقبال کی شاعری کے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب وطنیت کا تصور ان کی فکر کا مرکز تھا - مگر ان کے ذہن میں مسلم ہندوستان کا نقشہ کہیں نہ کہیں موجود تھا - اس گیت کے کئی شعروں میں ہماری ملی تاریخ کی جھلکیاں موجود ہیں -

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

مولانا وقار انبالوی بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں - ان کے ترانے کا عنوان "بندۂ مادرم" بہت معنی خیز ہے - گیت میں ٹیپ کا مصرعہ بھی یہی ہے - اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم اپنی ماں کے بیٹے ہیں - دھرتی ماتا کے حوالے سے کئی اور شعرا اور ہندو شعرا کے نغمے بھی کتاب میں موجود ہیں - مگر اپنے صوتی تاثر کے حوالے سے ذہن ہندوؤں کے مذہبی گیت "بندے ماترم" کی طرف چلا جاتا ہے - اس گیت میں ملی احساس نمایاں ہے -

میری نظر کا نور ہے ، صورتِ مادرِ وطن
دل کا مرے سرور ہے ، عظمتِ مادرِ وطن
بندۂ مادرم ، بندۂ مادرم

"قومی ترانے" ایک دلچسپ اور اچھا انتخاب ہے۔ اپنے زمانے میں اس انتخاب کی ایک خاص اہمیت تھی۔

"اخبار نویسوں کے حالات"

۱۹۱۲ء میں رفاہ عامہ سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب میں کئی مدیران اخبارات ورسائل کی تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔ کتاب کی پیشانی پر یہ فقرہ درج کیا گیا ہے۔

"پریس اور اخبارات سلطنت کا چوتھا رکن ہیں"۔

اس کے علاوہ یہ اطلاع بھی مرتب کی طرف سے فراہم کی گئی ہے۔ کہ

"پنجاب صوبہ سرحدی صوبہ متحدہ اور مغربی ہند کے بعض اور اخبارات و رسائل کے مدیران کے حالات مرتب کر کے جمع کیے گئے ہیں۔ جس میں سے کئی ایک کے حالات خود نوشتہ ہیں"۔

دو مدیروں کے بارے میں مضامین ساتھی مدیران کے تحریر کردہ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مضامین فوق نے مدیران کی طرف سے دیئے گئے کوائف کے مطابق مرتب کیے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ یہ اصل میں فوق کے رسالے "کشمیری میگزین" کا ایڈیٹر نمبر ہے جسے بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ کسی اردو رسالے کی اس طرح کے خصوصی شمارے کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ حکیم محمد یوسف حسین نے اپنے رسالے "نیرنگ خیال" (لاہور) کا جو ایڈیٹر نمبر شائع کیا تھا۔ وہ دراصل یوسف حسین نمبر تھا۔ اس میں شامل تمام مضامین حکیم صاحب کے تحریر کردہ تھے۔ اسی لیے اسے انھوں نے ایڈیٹر نمبر کہا۔ اس کے علاوہ الہ آباد سے شائع ہونے والے رسالے "چاند" کے ایڈیٹر نمبر میں بھی مختلف ایڈیٹروں سے مضامین لکھوا کر شامل کیے گئے۔ "نیرنگ خیال" کا یہ

شمارہ جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔

"کشمیری میگزین" کا ایڈیٹر نمبر اس لیے ایک مختلف شمارہ ہے کہ یہ صحیح معنوں میں ایڈیٹر نمبر ہے۔ اس میں مختلف ایڈیٹروں کے حالاتِ زندگی پیش کیے گئے ہیں اس کے علاوہ ان کی صحافیانہ زندگی کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک الگ حیثیت کے علاوہ اُردو صحافت کی تاریخ میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اُردو صحافت کے تذکروں میں اس کتاب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی کتاب "ظفر علی خاں۔ ادیب و شاعر" میں "اخبار نویسوں کے حالات" کے صفحہ نمبر ۱۲ پر درج ظفر علی خاں کے بارے میں لکھے گئے مضمون سے حوالہ دیا ہے جو دلچسپ ہے۔

"کچھ عرصے کے لیے انھیں اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار تھی۔" سلہ

کتاب میں جن مدیران کا ذکر ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔

مولوی محبوب عالم چیف ایڈیٹر "پیسہ اخبار"۔ بابو دینا ناتھ ایڈیٹر "اخبار ہندوستان"۔ مولوی ظفر علی خان ایڈیٹر "زمیندار"۔ لالہ بانکا دیال ایڈیٹر "جھنگ سیال"۔ مولوی وجاہت حسین اسسٹنٹ ایڈیٹر "زمیندار"۔ پنڈت ہیری لال شرما ایڈیٹر اخبار "ہندو"۔ مولوی محمد انشاء اللہ ایڈیٹر "وطن"۔ پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی ایڈیٹر اخبار "ارجن"۔ مولوی محمد شجاع اللہ ایڈیٹر اخبار "ملت"۔ ٹھاکر مکھرام داس صاحب ایڈیٹر "راجپوت گزٹ"۔ حکیم محمد فیروز الدین ایچ پی ایل ایڈیٹر "رفیق الاطباء"۔ منشی منور خاں ساغر اکبر آبادی علیگ جرنلسٹ۔ منشی طالب علی پابند قریشی ایڈیٹر رسالہ "رہنمائے تعلیم"۔ (خود نوشتہ) لالہ ہیرالال کپور ایڈیٹر اخبار "پنجاب سماچار"۔ لالہ کرم چند ایڈیٹر رسالہ "دربار" (خود نوشتہ) پنڈت ٹھاکر دت شرما وید ایڈیٹر اخبار "دیش اپکارک"۔

(نوشتہ ایڈیٹر اخبار برہمن)۔

محمد الدین فوق ایڈیٹر "کشمیری میگزین" (خود نوشتہ)

ان کے بعد فوق کے مطابق بیرونجات کے اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں کے حالات بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

منشی غلام حسین شاعر ایڈیٹر اخبار "المنیر" جھنگ۔ مولوی فقیر محمد ایڈیٹر "سراج الاخبار" جہلم (خود نوشتہ)۔ ملک محمد الدین آوان ایڈیٹر رسالہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین (منڈی)۔ حکیم سید محمد عبداللہ ایڈیٹر اخبار "افغان" پشاور (خود نوشتہ)۔ سردار محمد اسلم خاں ایڈیٹر "اخبار المعین" امرتسر (خود نوشتہ)۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ ایڈیٹر اخبار "الحدیث" امرتسر۔ مولوی غلام احمد اخگر ایڈیٹر اخبار "اہل فقہ" امرتسر۔ منشی غلام قادر فرخ ایڈیٹر "انسان" امرتسر۔ مولوی محمد مصباح الدین احمد ایڈیٹر "سول اینڈ ملٹری نیوز" لدھیانہ (خود نوشتہ)۔ مُلّا محمد الواحدی ایڈیٹر رسالہ "نظام المشائخ" دہلی۔ مسٹر ظفر الملک علوی ایڈیٹر رسالہ "الناظر" لکھنو (خود نوشتہ)۔ مولوی فضل الحسن حسرت موہانی ایڈیٹر رسالہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ۔ ایس ابن علی ایڈیٹر اخبار "نیر اعظم" مُراد آباد۔ لالہ دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ایڈیٹر رسالہ "ادیب" الٰہ آباد۔ مرزا بشیر الدین محمود ایڈیٹر رسالہ "تشحیذ الاذہان" قادیان۔ نوشتہ شیخ یعقوب علی تراب احمدی۔ سید محمد عبدالقادر ایڈیٹر "مخبر دکن" مدراس (خود نوشتہ) زبدۃ الحکما حکیم حاجی ڈاکٹر غلام نبی ایڈیٹر رسالہ "حافظ صحت" لاہور جالب دہلوی جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور۔ (خود نوشتہ) جالب دہلوی نے اپنے حالات "جالب ناکام" کے نام سے لکھے ہیں۔ انھوں نے برِ صغیر میں صحافیوں کے مسائل و مشکلات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

"محمد بن قاسم"

۳۲ صفحات کا یہ کتابچہ ظفر برادرس لاہور کے زیر اہتمام فوق نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ یہ خواجہ حسن نظامی کے پچیس صفحوں کے مضمون اور ساغر نظامی، مولانا سیماب صاحب وارثی اکبرآبادی۔ مولانا ابوالکمال عبدالودود بریلوی۔ محمّد افضل خان بھٹی خلف الرشید جناب کشتہ امرتسری۔ محمود اسرائیلی کی نظموں پر مشتمل ہے۔ مرتّب کی طرف سے دیباچہ یا پیش لفظ شامل نہیں کیا گیا۔ کتاب کے اوپر بحیثیت مرتّب کے بھی کوئی نام نہیں لکھا گیا۔ صرف فوق کے اشاعتی ادارے ظفر برادرس کا نام درج ہے۔ فوق اس کتاب کے ناشر ہیں اور ظاہر ہے کہ مرتّب بھی وہی ہیں۔ انھوں نے مضمون اور نظمیں اکٹھی کر کے شائع کی ہیں۔ کتاب میں خواجہ حسن نظامی کا جو مضمون شامل ہے۔ اس میں محمّد بن قاسم کے ساتھ رانی لادی کی شادی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ رانی راجہ داہر کی بیوی تھی۔ اس رانی کا تذکرہ فوق کی سوانحی کتاب "بتانِ حرم" میں بھی شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مضمون میں یہ بات محمّد بن قاسم کے ساتھ ان کی عقیدت کو ظاہر کرتی ہے۔

"محمّد بن قاسم سکندر اعظم سے زیادہ بڑا جرنیل ہے۔"

مولانا سیماب کی نظم "غازئ ہندوستان" کا پہلا شعر اس طرح ہے۔

سب سے پہلے تُو نے جیتی بازئ ہندوستان
اے محمّد ابن قاسم غازئ ہندوستان

"کشمیر کی رانیاں"

اس کتاب میں کشمیر کی حکمران ہندو رانیوں کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے دو مختلف نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک طبع دوم ہے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ اور طبع چہارم جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ طبع اول باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوسکی۔ طبع دوم پر مؤلف کے طور پر محمد اسمٰعیل ہاتف بھوپالی کا نام درج ہے۔ جب کہ طبع چہارم پر یہ نام درج نہیں ہے۔ مؤلف کے بجائے ظفر برادرس لاہور لکھا ہوا ہے۔ یہ کتابیں فوق نے اپنے اشاعتی ادارے کے لیے دوسروں سے لکھوائی تھیں۔ مگر طبع چہارم پر مؤلف کے نام درج کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی آدمی کو اگر طبع چہارم والا نسخہ ہی دستیاب ہو تو وہ اسے فوق کی کتاب تصور کرے گا۔ کئی دوسری کتابوں کے آخر میں کتابیات فوق کے اشتہار میں "کشمیر کی رانیاں" بھی شامل کر دی گئی ہے۔ طبع دوم کے دیباچے میں اسماعیل ہاتف لکھتے ہیں۔

"میرے عزیز دوست مولوی محمد الدین فوق ایڈیٹر "اخبار کشمیری" مصر ہوئے کہ میں ایک کتاب کشمیر کی رانیوں پر لکھوں۔ یہ کام جس قدر مفید تھا۔ اتنا ہی مشکل بھی تھا۔"

دیباچے پر ۲۶ر اپریل ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج ہے۔ صفحہ نمبر ۸ پر رانی جیشومتی کے اپنے بچے کی تعلیم کے ضمن میں فوق نے ہاتف صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے ایک وضاحتی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے۔ طبع دوم میں حمید محمد خان ارم بھوپالی نے دو صفحوں کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "میرے ہموطن اور محترم دوست محمد اسماعیل ہاتف نے اس مجموعہ میں عورت کی اعلیٰ خصوصیات پر کافی زیادہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب تاریخ کشمیر میں بیش بہا اضافہ ثابت ہوگی۔" طبع چہارم میں دیباچہ اور مقدمہ دونوں شامل نہیں کیے گئے۔ اس کے علاوہ دونوں نسخوں میں کچھ فرق نہیں۔ اس بحث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب فوق کی تحریر

کردہ نہیں ۔ یکے از مطبوعاتِ ظفر برادرس ہے۔

فوق نے یہ کتاب خاص طور پر اس لیے لکھوائی کہ وہ کشمیر کی تاریخ کے اس پہلو کو بھی لوگوں کے سامنے لانا چاہتے تھے ۔ اس کتاب میں شامل کچھ رانیوں کا تذکرہ فوق کی کتاب "خواتین کشمیر" اور "تاریخ کشمیر" میں موجود ہے ۔ لیکن وہ اس موضوع پر الگ ایک کتاب کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے۔ "کشمیر کی رانیاں" ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عورتیں راجوں مہاراجوں سے کسی طور کم نہ تھیں ۔ بعض اوقات راجے مہاراجے صرف اپنی رانیوں سے صلاح مشورے کے بعد مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے ۔ اور جب ان کی موت کے بعد ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے نازک کندھوں پر آپڑا تو انھوں نے ہمت و استقلال ، ذہانت و دور اندیشی اور حوصلے و جرأت سے حالات کا مقابلہ کیا ۔ یہ رانیاں صرف حسن و جمال کی مالک نہ تھیں ۔ جاہ و جلال کی مالک بھی تھیں ۔ دلوں پر راج کرنے والیاں رعایا پر راج کرنے کے بھی سارے انداز جانتی تھیں ۔ یہ کتاب اس حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ برِصغیر میں حکمرانی کرنے کا سب سے زیادہ کشمیر کی عورتوں کو موقع ملا ۔ ان رانیوں کے تذکرے میں یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ کسی رانی نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے باپ یا شوہر کی زندگی ختم کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ اس کتاب میں جن رانیوں کے حالات تحریر کیے گئے ہیں ان کے نام یہ ہیں :

رانی جینشومتی ، کتابون ، ہی مال ، لولری ، چکرا رانی ، ایشائی رانی ، رانی واگ پشٹا ، رانی نارمہ ، اننگ لیکھا ، سرندر پربھا ، رانی کملا دیوی ، رانی کلیان دیوی ، رانی جیا دیوی ، سوگندا رانی ، بلپٹ دیوی ، ہنسنی ، دیدا رانی ، رانی شری لیکھا ، رانی شری یتی۔

"مولانا غنی"

۶۶ صفحات کی یہ کتاب "ظفر برادرس لاہور" سے شائع ہوئی ۔ تاریخ اشاعت

درج نہیں۔

"کشمیر کی رانیاں" کی طرح یہ کتاب بھی تصنیفات فوق کے تحت مختلف کتابوں کے آخر میں دی گئی فہرستوں میں درج ہے۔ تمام فہرستوں میں کتاب کا نام "غنی کاشمیری" لکھا گیا ہے۔ جب کہ کتاب کا نام "مولانا غنی" ہے۔ سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے ظفر برادرس لکھا گیا ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فوق اس کتاب کے ناشر ہیں۔ یہ کتاب فوق نے اکبر شاہ نجیب آبادی سے لکھوائی تھی۔ کتاب کے آغاز میں "موجب نگارش" کے نام سے اکبر شاہ نے اُردو زبان کی روز افزوں ترقی اور ہمہ گیری کی بدولت ہر علاقے اور ہر طبقے میں اس کی مقبولیت کی بات کی ہے۔ اُردو اور فارسی کے گہرے روابط کا ذکر کیا ہے۔ اُردو کے فروغ کے لیے فارسی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں غنی کاشمیری کے فارسی کلام کا مطالعہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اکبر شاہ نے اس دُکھ کا بھی اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شعرا کے کلام سے لُطف لینے والے بہت کم ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ اکبر شاہ فوق کی خدمات کا اعتراف کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:

"میرے محترم دوست اور میرے ہم ذوق مولوی محمد الدین فوق جو اپنی کثیر التعداد نافع ملک و ملت تصانیف اور قومی و وطنی خدمت میں خوشی کے ساتھ مصروفیت و انہماک رکھنے کی وجہ سے پنجاب و کشمیر کے لیے مایۂ ناز اور اپنی خوش اخلاقی اور اخلاقی وضعداری کے سبب محبوب احبا ہیں۔ اس عاجز کو اس امر کے لیے مجبور کرنے میں کامیاب ہُوئے کہ غنی کاشمیری کی نسبت ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دوں۔ چُوں کہ امتثال امر کے سوا چارہ نہ تھا۔ لہٰذا اپنے عزیز مولانا تاجور ایڈیٹر "مخزن" کی ناراضی اور خفگی کے مرتبہ کو ان کی عفو و درگزر کے بلند مقام سے پست تر یقین کرتا ہُوں (کہ یہ مضمون "مخزن" میں پُورا ہونا چاہیے تھا) اپنے اس مضمون کو جو فروری ۱۹۱۹ء کے "مخزن"

میں چھپا تھا۔ اس تحریر کا جزو بنا کر حضرت فوق کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

چمن آید بہ چمن بہر تماشائے بہار

بلبل آید بر بلبل بہ تمنائے غزل

اس عبارت کے نیچے اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے نام کے ساتھ ۲۷ مارچ ۱۹۱۹ء کی تاریخ درج ہے۔ لیکن تاریخ اشاعت کہیں درج نہیں۔ البتہ اکبر شاہ کے آخری الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب ۱۹۱۹ء ہی میں شائع ہوئی ہوگی۔ غنی کاشمیری کا تذکرہ فوق کی کتاب "مزار الشعرائے کشمیر" میں ملتا ہے۔ جو انھوں نے ۱۹۴۴ء میں لکھی تھی۔

"استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" (غیر مطبوعہ)

"استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" کے دیباچے میں فوق نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں ان کی طرف سے شائع کی گئی کتاب "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" کی توقع سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔ "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" دستیاب نہیں ہوسکی۔ "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" "مجموعۂ لطائف" کا پہلا حصہ تھا۔ اس کے بعد فوق "استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مسودہ انھوں نے تیار کر لیا تھا۔ اس مسودے کے صفحۂ اول یا دیباچے پر فروری ۱۹۴۰ء کی تاریخ درج ہے۔ فروری کے لفظ پر لکیر پھری ہوئی ہے۔ مگر بوجوہ "مجموعۂ لطائف" کا یہ دوسرا حصہ طبع نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ اس سلسلے کے کچھ اور حصے فوق مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ان کا سراغ نہیں ملا۔ "استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" کا مسودہ بہت فرسودہ حالت میں عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے۔ اس مسودے میں تقریباً پونے تین سو لطیفے جمع کیے گئے ہیں۔ فوق کے بقول لطیفوں کا بیشتر حصہ مختلف اخباروں۔ تحریرو

کتابوں اور رسالوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے زمانۂ طالب علمی اور ایام پروفیسری کے بعض نکتہ رس لطائف بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اہل علم و ادب کے لطائف بھی مسودے میں موجود ہیں۔ آخر میں ایک چھوٹا سا ضمیمہ "عقل و دانش" کے نام سے درج کیا گیا ہے۔ اس میں سوالات اور جوابات کی شکل میں کچھ لطیفے شامل کیے گئے ہیں۔ کچھ دلچسپ معمّے بھی ہیں۔ فوق کے بقول یہ معمّے اور سوال وجواب "خزانۂ عقل" سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اور "خزانۂ عقل" ہر شخص کے دماغ میں موجود ہے۔ اس مضمون کا ذکر صرف دیباچے میں موجود ہے۔ مسودے میں ایسی کوئی تحریر نہیں ملی۔

مکالمے کے انداز میں جو لطیفے تحریر کیے گئے ہیں۔ بہت شگفتہ اور دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک لطیفہ پیش کیا جاتا ہے۔

"اُستاد۔ آندھی کی تعریف کرو۔

شاگرد۔ ہوا جب دوڑ کر چلتی ہے تو اس کو آندھی کہتے ہیں۔"

کچھ لطیفے ایسے ہیں جو فوق کے زمانے کی تہذیبی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے بالواسطہ طور پر اصلاح کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے لطیفوں میں مزاح کے ساتھ ہلکا پھلکا طنز بھی پایا جاتا ہے۔ ایک لطیفہ ملاحظہ کیجیے۔

"ایک شہری لڑکی دیہات میں چھٹیاں گزارنے گئی۔ کسان کا بیل جب اُسے دیکھتا۔ مارنے کو دَوڑتا۔ لڑکی نے زمیندار سے شکایت کی تو اس نے کہا۔ بیٹی تم نے لال رنگ کی کُرتی جو پہنی ہُوئی ہے۔ اس پر لڑکی نے کہا۔ مَیں پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ کُرتی آؤٹ آف فیشن ہوگئی ہے۔"

کچھ واقعات زندگی میں اس طرح پیش آتے ہیں کہ اچھے خاصے لطیفے بن جاتے ہیں ظرافت اور ذہانت لازم و ملزوم ہیں۔ لطائف پر مشتمل کتابیں شگفتگی کے ساتھ ساتھ طالب علموں کی تربیت کا کام بھی کرسکتی ہیں۔ ہر زمانے میں تعلیمی اداروں میں اُستادوں

اور شاگردوں کے باہمی معاملات کے لطیفے بھی بنتے رہتے ہیں۔ لطائف ماحول کی گھٹن اور افسردگی کو زائل کرکے ایک خوشگوار فضا پیدا کرتے ہیں۔ استادوں اور شاگردوں کے درمیان دوستانہ رابطے کے لیے کشادہ رویہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی شخصیت گھٹ کے رہ جاتی ہے۔ فوق کی مرتبہ یہ کتاب "استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" شائع ہونی چاہیے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں ترمیم و اضافہ ہوتے رہنا چاہیے۔ تاکہ اسے نئے زمانے کی تعلیمی اور تہذیبی صورتِ حال سے ہم آہنگ رکھا جاسکے۔ اس کتاب کی ضخامت ۹۷ صفحات ہے۔ اس غیر مطبوعہ کتاب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی سامنے آتی ہے کہ یہ صرف لطیفوں کی کتاب ہی نہیں کہ اس کا مطالعہ تفریح کا باعث ہو۔ اس کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے زمانے کی معاشرتی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔ بالخصوص تعلیمی ماحول کی بہتری کے لیے ایک سازگار فضا فراہم کرتی ہے۔

"جمال الدین افغانی"

۲۶ صفحات پر مشتمل یہ مضمون تاریخ حریت کے بطل جلیل مولانا ظفر علی خان نے تحریر کیا تھا۔ فوق نے ظفر برادرس لاہور کے زیرِ اہتمام چارج سٹیم پریس لاہور سے شائع کی۔ تاریخ اشاعت درج نہیں۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب عالمِ اسلام میں مسلم اتحاد کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔

نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

مسلمانوں کے ایک ہونے کی خواہش دلوں میں تڑپ رہی تھی۔ جمال الدین افغانی اتحادِ اسلامی کی ایک علامت بن کر ابھرے تھے۔ جنھوں نے مصر، ترکی، ایران اور ہندوستان کے علاقوں کو مرکز بنا کر تمام عالم اسلام میں آزادی

اور اتحاد کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ظفر علی خان بھی اتحادِ اسلامی کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں افغانی صاحب کے حالات تحریر کیے اور ان کی عظیم خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ "زمیندار" لاہور میں شائع شدہ اس مضمون کو فوق نے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کی اشاعت سے فوق صاحب کے ملّی شعور اور دردمندی کا اظہار ہوتا ہے۔

حوالہ جات (ساتواں باب)

۱۔ "عجائبات فرنگ" مصنفہ یوسف خان کمبل پوش مرتبہ تحسین فراقی، لاہور: مکتبہ عکس اُردو بازار، مطبوعہ، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۔

۲۔ ماہنامہ "کتاب" لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء

۳۔ "اُردو میں سوانح نگاری" طبع اوّل، ص: ۲۵۷۔

۴۔ رسالہ "اصلاح سخن" لاہور جنوری ۱۹۰۸ء۔

۵۔ "انوار اقبال" طبع اوّل، ص: ۶۵۔

۶۔ بابت سہ ماہی "اقبال" لاہور: اکتوبر ۱۹۵۶ء۔

۷۔ میر غلام دستگیر نامی، "سیاحت کشمیر"، لاہور: مکتبہ دین و دنیا، طبع اوّل ۱۹۵۸ء صفحہ: ۱۳۳۔

۸۔ "دیہاتی دُنیا" سرینگر۔ اگست ۱۹۴۲ء

۹۔ "نقوش" لاہور مکاتیب نمبر صفحہ: ۸۸۲۔ تحریر کردہ ۲۷ مئی ۱۹۱۷ء

۱۰۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "ظفر علی خان ادیب و شاعر" لاہور: مکتبہ خیابان ادب، طبع اوّل، ۱۹۶۷ء، ص: ۷۴۔

کتابیاتِ فوق

کتابیاتِ فوق

تاریخ:۔

۱۔ "تاریخ کشمیر" جلد اوّل، لاہور: رفاہ عام سٹیم پریس، طبع اوّل، مئی ۱۹۱۰ء۔

۲۔ " " " جلد دوم، لاہور: رفاہ عام سٹیم پریس، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۱۰ء

۳۔ " " " جلد سوم، لاہور: رفاہ عام سٹیم پریس، طبع اوّل، جولائی ۱۹۱۲ء۔

۴۔ "تاریخ اقوام کشمیر" جلد اوّل، لاہور: ظفر برادرس،

طبع اوّل، جولائی ۱۹۳۴ء۔

۵۔ "تاریخ اقوامِ کشمیر" — جلد دوم، لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، جولائی ۱۹۳۴ء

۶۔ " " " " — جلد سوم، لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ستمبر ۱۹۴۵ء

۷۔ "تاریخ اقوامِ پونچھ" — جلد اوّل، لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ۱۹۳۶ء

۸۔ " " " — جلد دوم، لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ستمبر ۱۹۴۳ء

۹۔ "تاریخ شالامار" — لاہور: خادم التعلیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۰۰ء

۱۰۔ "یادِ رفتگاں" — لاہور: رفاعِ عام سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۰۴ء

۱۱۔ "تذکرہ العلماء والمشائخ لاہور" — لاہور: گلزار محمدیؐ سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۲۰ء

۱۲۔ "لاہور عہدِ مغلیہ میں" — لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ۱۹۲۷ء

۱۳۔ "مآثرِ لاہور" — مطبوعہ "نقوش" لاہور: لاہور نمبر ۱۹۶۲ء

۱۴۔ "بے نشاں نامور" — (غیر مطبوعہ)

۱۵۔ "تاریخ ریاست ہائے بگھیل کھنڈ مع تحقیقات طلسم بکاؤلی"
لاہور: پنجۂ فولاد پریس، طبع اول، ۱۹۰۵ء

۱۶۔ "تاریخ انگورہ" لاہور: ظفر برادرس، سن ندارد۔

۱۷۔ "وجدانی نشتر" لاہور: انجمن معین الاسلام، طبع اوّل ۱۹۱۵ء

۱۸۔ "تاریخ عربیت اسلام" لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، مارچ ۱۹۲۱ء

۱۹۔ "تاریخ کا روشن پہلو" لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۲۶ء

سوانح:-

۲۰۔ "سلطان زین العابدین" لاہور: رفاہ عامہ سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۱۰ء

۲۱۔ "مشاہیر کشمیر" لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ۱۹۱۱ء

۲۲۔ "ملّا دو پیازہ" لاہور: " " " " " "

۲۳۔ "نواب دبیر الدولہ" لاہور: ہندوستان سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۱۲ء

۲۴۔ "تذکرۃ الصالحین" لاہور: ہندوستان سٹیم پریس،

طبع اوّل، ۱۹۱۲ء

۲۵۔ "حیات مولانا روم" — منڈی بہاؤالدین: جلالی سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۱۴ء

۲۶۔ "شمس تبریز" — " " " "

۲۷۔ "ابراہیم ادھم" — لاہور: راجپوت پرنٹنگ ورکس، طبع اوّل، ۱۹۱۴ء

۲۸۔ "داتا گنج بخش" — لاہور: اسلامیہ سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۱۴ء

۲۹۔ "خاتون جنّت" — پنڈی بہاؤالدین: مطبوعاتِ فوق، طبع اوّل، ۱۹۱۴ء

۳۰۔ "حیات نورجہاں و جہانگیر" — لاہور: راجپوت پریس، طبع اوّل ۱۹۱۴ء۔

۳۱۔ "لوڈر مل" — لاہور: کتب خانہ جرّی بوٹی لوہاری دروازہ، طبع اوّل، ۱۹۱۴ء

۳۲۔ "مہاتما بُدھ" — لاہور: کارپردازان ناول ایجنسی، طبع دوم، ۱۹۱۶ء

۳۳۔ "حیات فرشتہ" — لاہور: گلزار محمدی سٹیم پریس، طبع اوّل، ۱۹۱۹ء

۳۴۔ "تذکرہ خواتین دکن" — لاہور: گلزار محمدی پریس، طبع اوّل، ۱۹۲۰ء

۳۵۔ "محب وطن خواتین ہند" — لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ۱۹۲۱ء

۳۶۔ "سعد زاغلول پاشاہ" — لاہور: " " " ۱۹۲۲ء

۳۷۔ "مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی" — لاہور: " " " ۱۹۲۴ء

۳۸۔ "تذکرہ رہنمائے ہند"	لاہور: ظفر ... طبع اوّل، ۱۹۲۶ء
۳۹۔ "بتان حرم"	لاہور: ... ۱۹۲۶ء
۴۰۔ "فاتح ملتان"	لاہور: حکیم ... شن جنرل بک مرچنٹ، طبع اوّل،
۴۱۔ "راجہ بیربر"	لاہور: کشور ... جنرل بک مرچنٹ، طبع اوّل، ۱۹۲۸ء
۴۲۔ "شباب کشمیر"	لاہور: لاہور ظفر برادرس، طبع دوم، ۱۹۲۹ء
۴۳۔ "للہ عارفہ"	لاہور: لاہور ظفر برادرس، طبع اوّل، ۱۹۲۹ء
۴۴۔ "خواتین کشمیر"	سرینگر: علمی محمد تاجر کتب، طبع اوّل ۱۹۴۰ء
۴۵۔ "اہلیا بائی"	لاہور: اتحاد پریس ... بل روڈ، طبع اوّل، ۱۹۴۱ء
۴۶۔ "ہندوستانی وی۔سی۔"	لا... ر: ظ... برادرس، طبع اوا...
... "تاریخ بڈشاہی"	لاہور:
۴۸۔ "حسن بصری"	پنڈی بہاؤالدین: مطبوعات فو...
۴۹۔ "مجدد الف ثانی"	
۵۰۔ "سر جگدیش چندر بوس"	سرینگر: علمی محمد تاجر کتب ...
۵۱۔ "تان سین"	دستیاب نہیں
۵۲۔ "مہاراجہ رنجیت سنگھ"	

۵۳۔ "ایڈورڈ ہشتم" — دستیاب نہیں

۵۴۔ "کشمیر کا نادر شاہ" — (غیر مطبوعہ) تحریر کردہ ۱۹۴۰ء

۵۵۔ "موجد اور ایجادیں" — (غیر مطبوعہ) " " "

۵۶۔ "مہاراجہ گلاب سنگھ" — (غیر مطبوعہ) " " ۱۹۴۲ء

۵۷۔ "شیخ نورالدین ولی"

۵۸۔ "راجہ سکھ جیون مل" — (نایاب غیر مطبوعہ)

۵۹۔ "سرگزشت فوق" — (خود نوشت غیر مطبوعہ)

۶۰۔ "مزارالشعرائے کشمیر" — (تذکرہ) مطبوعہ "آئینۂ کشمیر" لاہور اتحاد پریس، طبع اوّل: ۱۹۶۶ء

شاعری:۔

۶۱۔ "کلام فوق" — لاہور: راجپوت پرنٹنگ ورکس، طبع اوّل ۱۹۰۹ء

۶۲۔ "سکاؤٹوں کے گیت" — لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل ۱۹۲۶ء

۶۳۔ "نغمہ وگلزار" — لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل ۱۹۴۰ء

ناول:-

۶۴۔ "انارکلی"	لاہور: منروالاس، طبع اوّل، ۱۹۰۰ء
۶۵۔ "رام کہانی"	لاہور: 〃 〃 〃 〃 ۱۹۰۰ء
۶۶۔ "اکبر"	لاہور: راجپوت گزٹ مشین پریس، طبع اوّل، ۱۹۰۹ء
۶۷۔ "نیم حکیم خطرۂ جان"	لاہور: راجپوت پرنٹنگ ورکس، طبع اوّل، ۱۹۱۳ء
۶۸۔ "خانہ بربادی"	〃 〃 〃 〃
۶۹۔ "عصمت آرا"	〃 〃 〃 ۱۹۱۴ء
۷۰۔ "ناکام"	لاہور: صدائے ہند پریس، تاریخ اشاعت درج نہیں۔
۷۱۔ "غم نصیب"	〃 〃 〃 〃 〃
۷۲۔ "محرومِ تمنا"	لاہور: ظفر برادرس، تاریخ اشاعت درج نہیں۔
۷۳۔ "مہذب ڈاکو"	لاہور: 〃 〃 〃 〃
۷۴۔ "مسٹریز آف امرتسر"	لاہور: 〃 〃 〃 〃
۷۵۔ "غریب الدیار"	دستیاب نہیں
۷۶۔ "سٹوڈنٹس لائف"	دستیاب نہیں
۷۷۔ "حرفِ مطلب"	دستیاب نہیں

۷۸۔ "حکایاتِ کشمیر" لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ۱۹۲۸ء

۷۹۔ "سبق آموز کہانیاں" لاہور: " " " ۱۹۳۵ء

۸۰۔ "دبستانِ اخلاق" لاہور: مولوی فیروز سنز اینڈ پبلشرز، طبع اوّل، ۱۹۳۵ء

۸۱۔ "چودہ حکایتیں" (غیر مطبوعہ)

۸۲۔ "زمیندار کی سرگزشت" (غیر مطبوعہ ڈرامہ) مصنفہ۔ ۱۹۴۰ء

متفرق تصانیف و تالیفات:۔

۸۳ "سفر نامۂ کشمیر" (ادارہ اشاعت درج نہیں) طبع اوّل ۱۹۰۷ء

۸۴ "رہنمائے کشمیر" لاہور: خادم التعلیم برقی پریس، طبع اوّل، ۱۹۲۳ء

۸۵۔ "شاہی سیر کشمیر" لاہور: کریمی پریس، طبع دوم ۱۹۳۰ء

۸۶۔ "دیہاتی و پنچایتی سفر نامہ" مطبوعہ ماہنامہ "دیہاتی دُنیا" سرینگر: ستمبر ۱۹۴۱ء

۸۷۔ "پنڈت جواہر لال نہرو کا سفر نامۂ کشمیر" (غیر مطبوعہ) مصنفہ ۱۹۴۴ء

۸۸۔ "سفر نامۂ ڈھاکہ" مطبوعہ "کشمیری میگزین" لاہور: ۱۴ مئی ۱۹۱۷ء

۸۹۔ "امتحان پاس کرنے کا گُر" (ادارہ اشاعت درج نہیں)

طبع اوّل ١٩٠٠ء

٩٠- "ماتم پہلوانی" — لاہور: بھائی دیا سنگھ تاجر کتب، طبع اوّل ١٩٠١ء

٩١- "حالات دربار بھمبر" — لاہور: جارج سٹیم پریس، طبع اوّل ١٩١٨ء

٩٢- "زنانہ حاضر جوابیاں" — لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل، ١٩٢٢ء

٩٣- "دیوان حافظ کی تاریخی فالیں" — ایضاً ″ ١٩٢٢ء

٩٤- "جغرافیہ ریاست پونچھ" — ایضاً ″ ١٩٢٨ء

٩٥- "مضامین فوق" — (غیر مطبوعہ)

مرتبہ کتابیں :-

(اقوال)

٩٦- "ناصح مشفق" — لاہور: مترولاس، طبع اوّل ١٩٠٠ء

٩٧- "آئینۂ اخلاق" — (غیر مطبوعہ)

٩٨- "حکمت کے موتی" — لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل ١٩٢٦ء

(شاعری)

٩٩- "گلشن نوبہار" — لاہور: منشی رام اگروال، پریس۔

١٠٠۔ "روایات اسلام" لاہور: حمایت اسلام پریس، طبع پنجم، ١٩٣٥ء

١٠١۔ "ہمدرد زمینداران" لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل ١٩٣٩ء

١٠٢۔ "اذان بتکدہ" ایضاً (سال اشاعت درج نہیں)

١٠٣۔ "قومی ترانے" سرینگر: علمی محمد تاجر کتب حبہ کدل۔ (سال اشاعت درج نہیں)

١٠٤۔ "دیہات سدھار" (غیر مطبوعہ) نایاب

(مضامین)

١٠٥۔ "اخبار نویسوں کے حالات" لاہور: رفاہ عامہ پریس، طبع اوّل ١٩١٢ء

١٠٦۔ "محمد بن قاسم" لاہور: ظفر برادرس، طبع اوّل ١٩٢٧ء

١٠٧۔ "کشمیر کی رانیاں" ایضاً طبع چہارم ١٩٣١ء

١٠٨۔ "مولانا غنی" لاہور: ظفر برادرس، (تاریخ اشاعت درج نہیں)

١٠٩۔ "جمال الدین افغانی" ایضاً

١١٠۔ "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے"

١١١۔ "استادوں اور شاگردوں کے لطیفے" (غیر مطبوعہ)

"محمد الدین فوق کے اخبارات و رسائل"

۱۔ "پنجۂ فولاد"	لاہور:	[illegible]
۲۔ "کشمیری میگزین"	لاہور:	۱۹۰۶ء
۳۔ "اخبار کشمیری"	"	۱۹۱۳ء
۴۔ "طریقت"	"	۱۹۱۴ء
۵۔ "نظام"	"	۱۹۱۶ء
۶۔ "کشمیر جدید"	سرینگر:	۱۹۳۳ء

"روایات اسلام" لاہور، حمایت اسلام پریس، طبع پنجم، ١٩٣٥ء

لاہور، ظفر برادرس، طبع اوّل ١٩٣٩ء

ایضاً (سال اشاعت درج نہیں)

کتابیات

کتابیات

(اس کتابیات میں ان کُتب کا اندراج کیا گیا ہے جن کا کوئی حوالہ اس مقالے میں موجود ہے یا جن کا مقالے کے مباحث سے گہرا تعلق ہے۔)

۱۔ آزاد، جگن ناتھ : "اقبال اور اس کا عہد" الہ آباد : ادارہ رئیس اُردو، مطبوعہ ، ۱۹۶۰ء

۲۔ " " : "اقبال اور کشمیر" سرینگر کشمیر: میسرز علی محمد اینڈ سنز بک سیلرز، طبع اوّل ۱۹۷۷ء

۳۔ آزاد، محمد حسین : "دربار اکبری" لاہور : دارالاشاعت . طبع اوّل ۱۸۹۸ء

۴۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن : "مقدمہ ابن خلدون" کراچی : کارخانہ تجارت کتب، (اُردو ترجمہ۔ مولانا سعد حسن خاں یُوسفی) سن ندارد۔

۵۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: "اقبال اور مسلک تصوف" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان .

طبع اوّل ، ۱۹۷۷ء

۶۔ احمد دین ، مولوی : "اقبال" (مرتبہ مشفق خواجہ) کراچی :
انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان ، سال طباعت ۱۹۷۹ء

۷۔ احسن مارہروی (مرتّب) : "انشار داغ" دہلی : انجمن ترقی اُردو (ہند)
طبع اوّل ، ۱۹۴۱ء

۸۔ احسن فاروقی ، ڈاکٹر : "اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ" لاہور :
سندھ ساگر اکیڈیمی ، مطبوعہ ، ۱۹۶۸ء

۹۔ احمد، صلاح الدّین : "صریر خانہ" جلد دوم ، لاہور : المقبول پبلیکیشنز ،
طبع اوّل ، ۱۹۶۹ء

۱۰۔ اختر دہلوی ، مرزا محمّد : "تذکرہ اولیائے ہندوستان" دہلی :
مکتب خانہ رشید ، مطبوعہ ، ۱۹۴۶ء

۱۱۔ اختر ، ہدایت اللّٰہ : "کشمیر کے فنون لطیفہ" سیالکوٹ :
التعلیم ریلوے روڈ ، طبع اوّل ، ۱۹۷۷ء

۱۲۔ ارشد ، میر ارشاد علی : "کشمیر گائیڈ" لاہور : رائل بک سٹال ،
طبع اوّل ، ۱۹۲۹ء

۱۳۔ اقبال ، علامہ محمّد : "کلیات اقبال" علی گڑھ : ایجوکیشنل بک ہاؤس ،
مطبوعہ ، ۱۹۷۵ء

۱۴۔ اکبر حیدری کاشمیری ، ڈاکٹر : "تحقیقی نوادر" لکھنو : اُردو پبلیشرز ،
طبع اوّل ، ۱۹۷۷ء

۱۵۔ اکرام ، شیخ محمّد : "موج کوثر" لاہور : ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ،
مطبوعہ ، ۱۹۸۶ء

۱۶- الطاف فاطمہ: "اُردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء" کراچی:
اُردو اکیڈمی سندھ، طبع اوّل، ۱۹۶۱ء

۱۷- امداد صابری: "تاریخ صحافت اُردو" دہلی: تحفظ اُردو جامع مسجد،
(جلد اوّل) طبع اوّل، ۱۹۵۳ء

۱۸- " " (جلد دوم) دہلی: جدید پرنٹنگ پریس،
طبع اوّل، ۱۹۶۰ء

۱۹- " " (جلد چہارم) دہلی: جمال پریس،
طبع اوّل، ۱۹۷۴ء

۲۰- اے۔بی۔اشرف، ڈاکٹر: "ادب اور سماجی عمل" ملتان: کارواں ادب،
طبع اوّل، ۱۹۸۰ء

۲۱- اچھر چند، شاہ پوریہ: "راج ترنگنی" نئی دہلی: لائٹ اینڈ لائف پبلشرز،
ٹھاکر، (مترجم): (مصنف پنڈت کلہن) طبع اوّل، ۱۹۷۹ء

۲۲- بلگرامی، سیّد علی: "تمدن ہند" آگرہ: مطبع شمسی،
طبع اوّل، ۱۹۱۳ء

۲۳- تاج، امتیاز علی: "انارکلی" لاہور: دارالاشاعت پنجاب،
طبع نہم، ۱۹۷۳ء

۲۴- ترمذی، امام: "سنن ترمذی" بیروت: دارالکتاب العربیہ، سن ندارد۔

۲۵- ٹمپل، آر۔سی: "حکایات پنجاب" لاہور: مجلس ترقی ادب،
طبع اوّل، ۱۹۶۲ء

۲۶- جاوید اقبال، جسٹس "زندہ رود" (پہلی جلد) لاہور: غلام علی اینڈ سنز،
طبع اوّل، ۱۹۷۵ء

۲۷۔ حالی : "مقدمہ شعر و شاعری" دہلی : ہندوستانی کتب خانہ، سن ندارد۔

۲۸۔ " "حیات جاوید" لاہور : عشرت پبلشنگ ہاؤس، مطبوعہ، ۱۹۶۵ء

۲۹۔ حبیب کیفوی : "کشمیر میں اردو" لاہور : مرکزی اردو بورڈ، طبع اول ، ۱۹۷۹ء

۳۰۔ حسرت، چراغ حسن : "حیات اقبال" لاہور : تاج کمپنی لمیٹڈ، طبع اول، ۱۹۳۸ء

۳۱۔ " " " "اقبال نامہ" (مرتبہ) لاہور : تاج کمپنی لمیٹڈ، (سن ندارد)

۳۲۔ حسن اختر، ڈاکٹر : "تہذیب و تحقیق" لاہور : یونیورسل بک، طبع اول، ۱۹۸۵ء

۳۳۔ حمید احمد خاں : "ارمغان حالی" لاہور : ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اول، ۱۹۷۱ء

۳۴۔ خستہ، پنڈت ہرگوپال کول : "گلدستۂ کشمیر" لاہور : فارسی آریہ پریس، طبع اول ، ۱۸۸۳ء

۳۵۔ خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام : "صحافت پاک و ہند میں" لاہور : مکتبہ کارواں، طبع دوم، ۱۹۶۷ء

۳۶۔ خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام : "سرگزشت اقبال" لاہور : اقبال اکادمی پاکستان، مطبوعہ ، ۱۹۷۷ء

۳۷۔ دِدہ مری، محمد اعظم : "تاریخ اعظمی" سرینگر : کشمیری بازار، (سن ندارد)

۳۸۔ دہلوی، سید احمد: "فرہنگ آصفیہ" لاہور: مکتبہ حسن سہیل،
طبع سوم، ۱۹۱۸ء

۳۹۔ ڈار، بشیر احمد: "انوار اقبال" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،
طبع دوم، ۱۹۷۷ء

۴۰۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین: "ظفر علی خان" لاہور: مکتبہ خیابان ادب،
طبع اول، ۱۹۶۷ء

۴۱۔ رائے کنہیالال: "تاریخ لاہور" لاہور: کوہ نور پریس،
طبع اول، ۱۸۸۴ء

۴۲۔ رفیق مارہروی، سید: "زبان داغ" لکھنؤ: لانوش روڈ بکڈپو،
طبع اول، ۱۹۵۵ء

۴۳۔ روشن آرا راؤ، ڈاکٹر: "ادبیات اردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار"
مقالہ (پی۔ایچ۔ڈی) پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۵ء

۴۴۔ سالک، عبدالمجید: "سرگزشت" لاہور: قومی کتب خانہ،
طبع اول، ۱۹۵۵ء

۴۵۔ " " "ذکر اقبال" لاہور: بزم اقبال،
طبع اول، ۱۹۵۵ء

۴۶۔ سالک، علم الدین: "نگارشات" (مرتبہ گیتی آرا) لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز،
طبع اول، ۱۹۷۵ء

۴۷۔ " " "دختران ہند" لاہور: ملک بک ڈپو،
طبع اول، ۱۹۳۶ء

۴۸۔ سکسینہ، رام بابو: "تاریخ ادب اردو" لاہور: علمی کتب خانہ،

طبع دوم ، ۱۹۷۸ء

۴۹ سلیم اختر، ڈاکٹر : "باغ وبہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" لاہور: میری لائبریری، طبع اوّل ، ۱۹۶۸ء

۵۰۔ سلیمان ندوی، سید : "سیرت النبیؐ" لاہور : ناشران قرآن لمیٹڈ، عام کتابی تقطیع میں، طبع اوّل ، ۱۹۷۵ء

۵۱۔ " " " "یادِ رفتگاں" کراچی : مکتبہ الشرق، طبع اوّل ، ۱۹۵۵ء

۵۲۔ " " " "حیات مالک" اعظم گڑھ : معارف، طبع اوّل ، ۱۹۱۷ء

۵۳۔ " " " "حیات شبلی" اعظم گڑھ : مطبع معارف، مطبوعہ ، ۱۹۴۱ء

۵۴۔ " " " "سیرت عائشہ" اعظم گڑھ : مطبع معارف، طبع چہارم ، ۱۹۵۲ء

۵۵۔ " " " "خواتین اسلام کی بہادری" اعظم گڑھ : مطبع معارف، طبع اوّل، ۱۳۹۱ھ

۵۶۔ سلیم، وحید الدین : "مضامین حالی" پانی پت : بلالی پریس، پانی پتی (مرتب) : (سن ندارد)

۵۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر : "ناول نگاری" لاہور : مکتبہ میری لائبریری، طبع اوّل ، ۱۹۶۶ء

۵۸۔ سید احمد خاں ، سر : "اسباب بغاوت ہند" کراچی : سلیمان اکیڈیمی ، (سن ندارد)

۵۹- سید احمد خاں، سر : "سرکشی ضلع بجنور" کراچی : سلیمان اکیڈیمی، (سن ندارد)

۶۰- " " " "آثار الصنادید" دہلی : مکتبہ سید الاخبار، طبع اوّل ، ۱۹۴۶ء

۶۱- سید محمد، مولوی : "ارباب نثر اُردو" لاہور : مکتبہ معین الادب، طبع سوم ، ۱۹۵۰ء

۶۲- شاہ ، عبدالقادر (مترجم و مفسر) : "قرآن مجید" لاہور : تاج کمپنی لمیٹڈ، (سن ندارد)

۶۳- شاہ علی ، ڈاکٹر : "اُردو میں سوانح نگاری" کراچی : گلڈ پبلشنگ ہاؤس، طبع اوّل ، ۱۹۶۱ء

۶۴- شبلی نعمانی : "الغزالی" لاہور: شیخ مبارک علی، (سن ندارد)

۶۵ " " "سوانح مولانا روم" " " " "

۶۶- " " "سفرنامہ مصر و شام" دہلی : قومی پریس ، ۱۸۹۲ء

۶۷- " " "المامون" لاہور : حامد اینڈ کمپنی ، ناشران و تاجران، سن ندارد-

۶۸- شجاع ، حکیم احمد : "خون بہا" لاہور: فیروز سنز ، ۱۹۵۱ء

۶۹- شرر، عبدالحلیم : "مضامین شرر" لاہور: گیلانی پریس ، سن ندارد-

۷۰- " " "فردوس بریں" لاہور: ادبی مارکیٹ ، سن ندارد-

۷۱- " " "الوالحسنین" لکھنؤ : رنگدار پریس ، ۱۹۲۵ء

۷۲- " " "حسن بن صباح" لاہور : حافظ محمد دین سن ندارد-

۷۳۔ شرر، عبدالحلیم : "تاریخ اسلام" حصہ دوم ، حیدرآباد دکن: جامعہ عثمانیہ،
(سن ندارد)

۷۴۔ صابر آفاقی ، ڈاکٹر : "اقبال اور کشمیر" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،
طبع اول ، ۱۹۷۷ء

۷۵۔ ضیاء، ضیاء الدین منشی : "نوحۂ کشمیر" پونچھ: مکتبہ و سن ندارد۔

۷۶۔ طارق، عبدالرحمٰن : "جہان اقبال" لاہور: ملک دین اینڈ سنز،
طبع اول ، ۱۹۴۷ء

۷۷۔ طاہر فاروقی، محمد : "سیرت اقبال" لاہور : قومی کتب خانہ،
طبع اول ، ۱۹۳۹ء

۷۸۔ عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر : "لاہور سکھوں کے عہد میں" لاہور: کتب خانہ کالی بک شاپ،
طبع اول ، ۱۹۶۴ء

۷۹۔ " " "تاریخ مساجد" لاہور: کبیر سٹریٹ کالی بازار،
طبع اول ، ۱۹۷۶ء

۸۰۔ " " "اقبال کی صحبت میں" لاہور : مجلس ترقی ادب،
طبع اول ، ۱۹۷۷ء

۸۱۔ " " "تاریخ اماکن لاہور" لاہور: مجلس ترقی ادب،
طبع اول ، ۱۹۸۱ء

۸۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد : "سرسید اور اس کے نامور رفقاء" لاہور: مکتبہ کارواں،
طبع دوم ، ۱۹۶۵ء

۸۳۔ " " " "اشارات تنقید" لاہور : مکتبہ خیابانِ ادب،
مطبوعہ ، ۱۹۷۲ء

۸۴- عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد: "طیف نثر" لاہور: لاہور اکیڈیمی،
طبع دوم، ۱۹۶۸ء

۸۵- ؍ ؍ ؍ ؍ "اُردو دائرہ معارف اسلامیہ" لاہور: پنجاب یونیورسٹی،
(مرتبہ) کراسہ ۷، جلد۱۹- طبع اوّل، ۱۹۸۶ء

۸۶- عبداللہ قریشی، محمد: "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" لاہور: بزم اقبال،
طبع اوّل، ۱۹۸۲ء

۸۷- ؍ ؍ ؍ ؍ "باقیات اقبال" (مرتبہ) لاہور: آئینۂ ادب،
طبع سوم، ۱۹۷۸ء

۸۸- ؍ ؍ ؍ ؍ "معاصرین اقبال کی نظر میں" لاہور: مجلس ترقی ادب،
طبع اوّل، ۱۹۷۷ء

۸۹- ؍ ؍ ؍ ؍ "شاعر کشمیر" لاہور: ظفر برادرس،
(سن ندارد)

۹۰- ؍ ؍ ؍ ؍ "آئینۂ اقبال" لاہور: آئینۂ ادب،
طبع اوّل، ۱۹۶۷ء

۹۱- ؍ ؍ ؍ ؍ "رُوحِ مکاتیب اقبال" (مرتبہ) لاہور: اقبال اکادمی لاہور،
طبع اوّل، ۱۹۷۷ء

۹۲- ؍ ؍ ؍ ؍ "آئینہ کشمیر" (مرتبہ) لاہور: اتحاد پریس،
طبع اوّل، ۱۹۶۶ء

۹۳- عبدالوحید، ڈاکٹر: "اُردو انسائیکلوپیڈیا" لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ،
(مرتب): طبع اوّل، ۱۹۶۲ء

۹۴- عتیق صدیقی، پروفیسر: "اقبال جادوگر ہندی نژاد" نئی دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ،

طبع اوّل، اگست ۱۹۸۰ء

۹۵۔ عثمانی، محمد واصل : "شبلی نقادوں کی نظر میں" کراچی : صفیہ اکیڈیمی،
(مرتب) : طبع اوّل، ۱۹۶۷ء

۹۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر : "اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" لاہور:
مجلس ترقی ادب، طبع اوّل، ۱۹۷۲ء

۹۷۔ " " " "اُردو کی منظوم داستانیں" کراچی : انجمن ترقی اُردو پاکستان،
طبع اوّل، ۱۹۷۹ء

۹۸۔ قادری، حامد حسن : "داستان تاریخ اُردو" آگرہ : لکشمی نرائن اگروال،
طبع دوم، ۱۹۵۷ء

۹۹۔ قادری، محمد دین کلیم : "مدینۃ الاولیاء" لاہور : اسلامک بک فاؤنڈیشن،
طبع اوّل، ۱۹۶۷ء

۱۰۰۔ قاسمی، بہاؤالحق : "تذکرہ اسلاف" لاہور : الہلال پریس،
طبع اوّل، ۱۹۸۲ء

۱۰۱۔ قاسم محمود، سید (مرتب) : "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کراچی : بک فاؤنڈیشن،
طبع اوّل، ۱۹۸۴ء

۱۰۲۔ کشفی، میر غلام احمد : "کشمیر ہمارا ہے" لاہور : کلاسیک،
طبع اوّل، ۱۹۶۵ء

۱۰۳۔ کمبل پوش، یوسف خاں : "عجائبات فرنگ" لاہور : مکہ بکس،
(مرتبہ تحسین فراقی) طبع اوّل، ۱۹۸۳ء

۱۰۴۔ گل، صادق علی : "سرگزشت تاریخ" لاہور : عزیز بک ڈپو،
طبع اوّل، ۱۹۷۱ء

۱۰۵۔ گمی، سلیم خاں : "اقبال اور کشمیر" لاہور: یونیورسل بکس، طبع دوم، ۱۹۸۵ء

۱۰۶۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: "اُردو کی نثری داستانیں" کراچی: انجمن ترقی اُردو، مطبوعہ، ۱۹۵۴ء

۱۰۷ محمد ابراہیم، مولوی (مترجم): "تاریخ حسن" (حصہ اول) سرینگر: غلام محمد نور محمد تاجران کتب، طبع اول، ۱۹۵۷ء

۱۰۸۔ " " "تاریخ حسن" (حصہ سوم) طبع اول، ۱۹۶۰ء

۱۰۹۔ محمد اسلم جے راج پوری، حافظ "حیات حافظ" علی گڑھ: مطبع فیض عام، ۱۹۰۹ء

۱۱۰۔ محمد عبداللہ، شیخ: "آتش چنار" لاہور: چوہدری اکیڈیمی، طبع اول، ۱۹۸۶ء

۱۱۱۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: "پنجاب میں اخبار نویسی" (مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۱۲۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر: "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" دہلی: رونق پبلشنگ ہاؤس، طبع اول، ۱۹۸۴ء

۱۱۳۔ ممتاز بنگلوری، ڈاکٹر: "شرر کے تاریخی ناول" لاہور: مکتبہ خیابان ادب، طبع اول، ۱۹۷۸ء

۱۱۲۔ مہدی افادی: "افادات مہدی" لاہور: مبارک علی، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء

۱۱۳۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید: "جامعات میں اقبال کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"

لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،
طبع اوّل، ۱۹۷۷ء

۱۱۴۔ معینی، سید عبدالواحد: "نقش اقبال" لاہور: آئینہ ادب،
مطبوعہ، ۱۹۶۹ء

"مقالات اقبال" لاہور: آئینہ ادب،
طبع دوم، ۱۹۸۲ء

۱۱۵۔ نذیر احمد، ڈپٹی: "مرآۃ العروس" دہلی: ہندوستانی کتب خانہ،
(سن ندارد)

۱۱۶ 〃 〃 "ابن الوقت" لاہور: قابل بک ہاؤس اُردو بازار،
مطبوعہ، ۱۹۶۵ء

۱۱۷۔ 〃 〃 "فسانۂ مبتلا" لاہور: اُردو مرکز، سن ندارد۔

۱۱۸۔ ناظر، خوشی محمد: "نغمۂ فردوس" لاہور: بابو ناظم الدین پرنٹرز،
مطبوعہ، ۱۹۲۷ء

۱۱۹۔ ناظم سیوہاروی، قاضی ظہور الحسن: "نگارستان کشمیر" دہلی: جید برقی پریس،
مطبوعہ، ۱۳۵۲ھ

۱۲۰۔ نذیر نیازی، سید: "دانائے راز" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان،
طبع اول، ۱۹۷۷ء

۱۲۱۔ نامی، میر غلام دستگیر: "سیاحت کشمیر" لاہور: مکتبہ دین و دنیا،
طبع اوّل، ۱۹۵۸ء

۱۲۲۔ نسائی، امام: "سُنن نسائی" بیروت: دارالاحیا التراث العربیہ،
مطبوعہ، ۱۹۶۲ء

۱۲۳۔ نسیم، دیاشنکر: "گلزار نسیم" الہ آباد: رام نرائن، مطبوعہ ۱۹۲۹ء

۱۲۴۔ وحید قریشی ڈاکٹر (مرتب): "منتخب مقالات اقبال ریویو" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۸۳ء

۱۲۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: "اردو ادب میں طنز و مزاح" لاہور: مکتبہ عالیہ، طبع سوم، ۱۹۷۷ء

۱۲۶۔ وقار عظیم، سید: "فن اور فنکار" لاہور: اردو مرکز، طبع اوّل، ۱۹۶۶ء

۱۲۷۔ " " "فورٹ ولیم کالج" لاہور: یونیورسل بکس، (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) طبع اوّل، ۱۹۸۴ء

۱۲۸۔ ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین: "تصانیف اقبال" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۸۲ء

۱۲۹۔ ہاشمی فرید آبادی، سید: "ماثر لاہور" لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اوّل، ۱۹۵۹ء

۱۳۰۔ یوسف بخاری، ڈاکٹر سید: "عالم تصوف اور کشمیر" لاہور: کلیم یوسف فہیم یوسف، طبع اوّل، ۱۹۸۴ء

۱۳۱۔ " " "کاشیر شاعری" لاہور: " " " " "

۱۳۲۔ " " "صوفیائے کشمیر" (زیر طبع) لاہور: اردو سائنس بورڈ۔

۱۳۳۔ " " "کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی جائزہ" لاہور: مرکزی اردو بورڈ، طبع اوّل، ۱۹۸۳ء

"اخبارات ورسائل"

۱۔ "ادب"، (شبلی نمبر) علی گڑھ	ستمبر ۱۹۶۰ء
۲۔ "اُردو"، دلی:	اپریل ۱۹۳۵ء
۳۔ "استقلال"، لاہور:	۹۔فروری ۱۹۸۶ء
۴۔ "اصلاح سخن"، لاہور:	جنوری ۱۹۰۸ء
۵۔ "اقبال"، لاہور:	اکتوبر ۱۹۵۶ء
۶۔ " "	اپریل ۱۹۶۰ء
۷۔ " " "	اپریل ۱۹۸۲ء
۸۔ " "	اپریل ۱۹۸۴ء
۹۔ "الناظر"، لکھنؤ:	ستمبر ۱۹۳۶ء
۱۰۔ "امروز"، لاہور:	۹۔نومبر ۱۹۸۵ء
۱۱۔ "انصاف"، راولپنڈی:	۲۵۔ ۱۹۶۹ء

۱۲۔ "انصاف"، راولپنڈی: ۲۱ مارچ ۱۹۷۸ء

۱۳۔ "پیسہ اخبار"، لاہور: ۳ جنوری ۱۹۰۰ء

۱۴۔ "تخلیق"، لاہور: دسمبر ۱۹۸۵ء

۱۵۔ "جدید کشمیر"، مظفر آباد: ستمبر ۱۹۵۳ء

۱۶۔ " " ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء

۱۷۔ "جنگ"، راولپنڈی: ۲۳ فروری ۱۹۷۰ء

۱۸۔ "چٹان"، لاہور: ۳ اگست ۱۹۸۱ء

۱۹۔ "حمایت اسلام"، لاہور: ۲۰ ستمبر ۱۹۴۵ء

۲۰۔ "خدمت"، سرینگر: ۴ نومبر ۱۹۴۵ء

۲۱۔ "دیہاتی دنیا"، سرینگر: ستمبر ۱۹۴۱ء

۲۲۔ " " اکتوبر ۱۹۴۱ء

۲۳۔ " " جولائی ۱۹۴۲ء

۲۴۔ " " اگست ۱۹۴۲ء

۲۵۔ "راوی" ادبی مجلہ، (محمد حسین آزاد نمبر) گورنمنٹ کالج لاہور: ۱۹۸۳ء

۲۶۔ "زمانہ"، کانپور: فروری ۱۹۱۰ء

۲۷۔ "زمیندار"، لاہور: ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء

۲۸۔ " " ۱۶ جولائی ۱۹۲۰ء

۲۹۔ "سرچشمہ"، (ادبی مجلہ، گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ) مارچ ۱۹۸۵ء

۳۰۔ "شیرازہ"، سرینگر: جلد ۱۷ شمارہ ۵، ۶ ۔ (سن ندارد)

۳۱۔ "صحیفہ"، لاہور: جولائی ۱۹۷۳ء

۳۲۔ "صوفی"، پنڈ بہاؤالدین: جنوری ۱۹۱۱ء

۳۳۔ "صوفی"، پنڈی بہاؤالدین:	جنوری ۱۹۱۲ء
۳۴۔ " " "	اپریل ۱۹۱۲ء
۳۵۔ " " "	جون ۱۹۱۲ء
۳۶۔ " " "	دسمبر ۱۹۲۳ء
۳۷۔ " " "	نومبر ۱۹۲۶ء
۳۸۔ " " "	دسمبر ۱۹۲۶ء
۳۹۔ " " "	نومبر ۱۹۲۷ء
۴۰۔ "قوس قزح"، لاہور:	فروری ۱۹۲۷ء
۴۱۔ "قومی زبان"، کراچی:	یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء
۴۲۔ "کتاب"، لاہور:	اکتوبر ۱۹۶۹ء
۴۳۔ " "	اکتوبر ۱۹۷۹ء
۴۴۔ "لیل و نہار"، لاہور:	یکم نومبر ۱۹۵۷ء
۴۵۔ "مخزن"، لاہور:	اکتوبر ۱۹۱۲ء
۴۶۔ "مرغزار، ادبی مجلہ، گورنمنٹ کالج شیخوپورہ،	۱۹۸۱ء
۴۷۔ "مشرق"، لاہور:	۱۶ر جولائی ۱۹۸۴ء
۴۸۔ "نقوش"، لاہور: (شخصیات نمبر)	۱۹۵۶ء
۴۹۔ " " (دس سالہ نمبر)	جون ۱۹۵۸ء
۵۰۔ " " (طنز و مزاح نمبر)	فروری ۱۹۵۹ء
۵۱۔ " " (لاہور نمبر)	فروری ۱۹۶۲ء
۵۲۔ " " (آپ بیتی نمبر)	جون ۱۹۶۴ء
۵۳۔ " " (مکاتیب نمبر)	نومبر ۱۹۷۵ء

۵۴۔ "نوائے وقت"، لاہور:	۲۱۔ فروری ۱۹۸۱ء
۵۵۔ "نیرنگِ خیال"، لاہور: (ایڈیٹر نمبر)	جولائی ۱۹۳۰ء
۵۶۔ "وکیل"، امرتسر:	۱۵ر جنوری ۱۹۱۶ء

ضمیمہ

۵۷۔ "آستانہ"، لاہور:	جولائی ۱۹۴۴ء
۵۸۔ "الفضل"، قادیان:	۲۹ر جون ۱۹۱۵ء
۵۹۔ "مساوات"، الٰہ آباد:	۲۴ر جون ۱۹۱۵ء
۶۰۔ "نیا دَور"، کراچی:	مارچ ۱۹۸۵ء

"ضمیمہ کُتب"

اختر علی، ڈاکٹر: "سید سلیمان ندوی اور ان کی علمی و ادبی و دینی خدمات" مقالہ: پی۔ایچ۔ڈی پنجاب یونیورسٹی، لاہور: ۱۹۸۳ء

سیّد سُلطان محمود حسین، ڈاکٹر: "اقبال کی ابتدائی زندگی" لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۸۶ء

عسکری، محمد حسن: "ستارہ یا بادباں" کراچی: مکتبہ سات رنگ، طبع اوّل، ۱۹۶۳ء

" ENGLISH BOOKS "

1. BAZAZ, PREM NATH, The History of Struggle for Kashmir, New Delhi: Kashmiri publishing Co. Ed. I, 1954.

2. BILQEES TASIR, C, The Kashmir of Sheikh Mohammad Abdullah, Lahore: Feroz Sons Ltd, Ed.I, 1986.

3. CARLYLE, THOMAS, Heroes, Hero worship and Heroic in History, London: Ed. 1945.

4. JAFFER, S.M, History of History, Vol.I Peshawar: Sadiq Sons, Ed, I 1961.

5. JHA, AMARA NATHA, Some Autobiographies, London: Oxford University Press, Ed, I 1930.

6. KENT. SHEMAN, Y Writing History, New York. Appleton Century, Ed,I, 1941.

7. MOHAMMAD BAQAR,DR, Lahore past and present, Lahore: Punjab University, Ed, I, 1952.

8. ROSE, H.A, A gllossary of tribes and casts, Vol II, Lahore: Civil and Military Gazette Ed, 1911.

9.

ماہرِ کشمیریات محمد الدین فوقؔ ایک ممتاز اور جامع حیثیات شخصیت تھے۔ شاعرِ کشمیر اور مؤرخِ کشمیر ہونے کے علاوہ مدیر "کشمیری میگزین" اور سکرٹری "انجمن کشمیری مسلماناں" کی حیثیت سے انھوں نے اہلِ کشمیر کے لیے ناقابلِ فراموش کام کیا۔ علامہ اقبال نے انھیں مجدد کشامرہ کا خطاب دیا۔ تحریکِ حریت کشمیر اُن کی قلمی معرکہ آرائیوں سے دمک رہی ہے۔ اُن کے بارے میں اس کتاب کا نام "فوق الکشمیر" بجا طور پر بامعنی اور خیال افروز ہے۔

صاحبِ اسلوب شاعر اور ادیب محمد اجمل نیازی نے فوقؔ کے علمی و ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ادبی تنقید و تحقیق کے میدان میں اجملؔ نیازی کی تخلیقی شخصیت کے نئے جوہر کھلے ہیں۔ وہ اپنی بے مثال اہلیتوں کے جلو میں ہر کہیں مختلف اور ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کتابیں "جل تھل"، "مندر میں محراب"، "تشخص"، "بازگشت" اور "شعار" اپنی خوبصورت نثر اور فکری خیال آرائی کی بدولت بے حد مقبول ہوئی ہیں۔

"فوق الکشمیر" میں انھوں نے نہ صرف فوقؔ کی فوقیت کو عام کیا ہے بلکہ ذکرِ کشمیر کو بھی بلند کر دیا ہے۔

پروفیسر پریشان خٹک
وائس چانسلر
آزاد جموں و کشمیر یونیورسٹی، مظفر آباد

محمد الدین فوق کشمیری

ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی